[redacted] تم عقلمندی سے جواب دو۔
[redacted] آخر ایسی کیا بات ہے۔
[redacted] تھوڑی دیر خاموش رہ کر بیٹی اب تم
جوان ہو گئی ہو۔ تمہاری عمر اب سترہ سال کی ہے۔ دُنیا کے قاعدے کے مطابق اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیئے۔ میرا ارادہ ہے کہ تمہاری شادی دیوان ہیرالال کے لڑکے شولال سے کر دی جائے۔ شولال کو تم جانتی ہو۔ اچھا ہنس مکھ اور خوش مزاج لڑکا ہے۔ اور اسی سال اس نے بی۔ اے پاس کیا ہے۔ مگر میں نے مناسب سمجھا کہ تمہاری مرضی معلوم کر لوں"

یہ کہہ کر وکیل صاحب نے گردن نیچی کر لی۔ وہ کہتے تو کہہ گئے۔ مگر اب شرمندہ ہو رہے تھے۔

کنولا کا رنگ یہ الفاظ سُن کر اُڑ گیا۔ اس کا شگفتہ گلاب سا چہرہ کسی کشمکش کی وجہ سے زرد پڑ گیا۔ اور وہ مسرت جو چند لمحے پہلے اس کے چہرے پر کھیل رہی تھی رنگ حسرت سے بدل گئی۔ لیکن اس نے اپنے ان جذبات کو روکا۔ اور پژمردہ آواز میں کہا: "جیسی آپ کی مرضی"۔

(۳)

سٹر صاحب کا لڑکا سلیم بھی جوان ہو گیا۔
ی میں ابھی تک وہی ربط ضبط قائم تھا لیکن جب سلیم ایف۔ اے کے امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ بیرسٹر صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اور چونکہ ان کا کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ وہ لالہ امرناتھ کو سلیم کا سرپرست بنا گئے۔

تھوڑے عرصے تک تو سلیم کے دل پر اس حادثہ کا بڑا اثر رہا۔ مگر وہ نوجوان تھا۔ جوانی کی عمر میں انسان بڑے سے بڑے نقصان کو جلد بھول جاتا ہے۔ امتحان کے فکر اور مطالعہ کی مصروفیت نے اس رنج کے ساتھ پانی کا کام کیا۔ اور سلیم کو کچھ کچھ تسکین ہو گئی۔ کیونکہ وہ اس واقعہ کو بھول گیا۔

لیکن جب امتحان ختم ہو گیا۔ تو اس کے دل میں پھر وہی کانٹا کھٹکنے لگا۔ اور اس کی حالت پہلے سے بھی بدتر ہو گئی۔ وہ لالہ امرناتھ کے گھر اکثر جاتا رہتا تھا۔ کیونکہ کنولا کی صحبت میں اس کے دل کو بہت سکون حاصل ہوتا تھا۔ کنولا اس کے ساتھ گھنٹوں محبت اور ہمدردی کی باتیں کیا کرتی تھی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کا غم غلط ہو جائے۔ سلیم کے دل پر کنولا کی ان باتوں نے فتح پالی تھی۔ اس کی وہ بچپنے کی بے مطلب محبت اب تبدیل ہو گئی۔ اس کے دل میں نیا احساس ہو گیا تھا۔ وہ کنولا کے خوبصورت چہرہ کو دیکھ کر مسرور ہوتا تھا۔ اس کی صحبت میں بیٹھ کر اسے ایک خاص لطف حاصل ہوتا

تھا۔ اب اس کا خیال عشق سے بدل گیا تھا۔ یہ جوانی کا جذبہ اور اصلی محبت کا پہلا احساس تھا۔ رات کو وُہ کنولا کے خواب دیکھتا تھا۔ صبح اُٹھتے ہی اُسے یہی خیال ہوتا تھا۔ کنولا کے دل میں ابھی کوئی اس قسم کا خیال پیدا نہیں ہُوا تھا۔ اس کی محبت ابھی تک ایک بچے کی محبت کی مانند تھی۔ وہ سلیم کو اس لئے چاہتی تھی کہ سلیم اس کا بھائی تھا۔

ایک روز جب سلیم بہت زیادہ مغموم اور خاموش تھا کنولا نے اس کا دل بہلانے کے لئے ہارمونیم بجانا شروع کیا۔ جوں جوں نغمہ کی آواز بلند ہوتی گئی سلیم کی حالت متذبذب ہونے لگی۔ اس کی نظروں میں ایک غیرمعمولی قوت آگئی۔ ملائمت۔ محبت۔ خواہش اور تمام انسانی جذبات ایک ساتھ جمع ہو کر سلیم کی آنکھوں کے راستہ کنولا کے چہرے کی طرف بڑھنے لگے۔ سلیم بے خودی کے عالم میں کنولا کی پرستش کر رہا تھا . . . . . اتنے میں راگ ختم ہُوا۔ کنولا نے اپنی نگاہیں ساز کی طرف اٹھائیں دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ کنولا نے شرمندہ ہو کر اپنی آنکھیں جھکا لیں۔ سلیم بھی عالم بیخودی سے چونک اُٹھا۔

کنولا کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ اس کی زبان بند ہو گئی اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہ بیگناہی جو چند لمحہ پہلے سلیم کے راستے میں حائل تھی۔ معدوم ہو گئی۔ معاً ایک نئے حجاب کی چادر اس کی آنکھوں کے آگے پڑ گئی۔ سچ تو یہ ہے کہ آج سلیم کے جذبے نے اپنا اثر پیدا کیا۔ آج عشق کا دیوتا فتحمند ہُوا۔ اور دونوں دلوں میں ایک ہی آگ جلنے لگی۔

چند لمحہ دونوں عالم سکوت میں رہے۔ مرد طبعاً دلیر ہوتا ہے سلیم نے اپنے دل پر قابو پا کر کہا۔ "کنولا چپ کیوں ہو گئیں۔"

کنولا سے کچھ جواب بن نہ پڑا۔ سلیم نے دوبارہ محبت آمیز لہجہ میں کہا۔ "کیا آج بولنے کی قسم کھائی ہے؟"

کنولا نے لبوں کو جنبش دی۔ مگر آواز اتنی آہستہ تھی کہ لفظ سمجھ میں نہ آئے۔ سلیم نے کرسی پاس کھینچ لی۔ اور کنولا کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیکر کہا۔ "آج تم میرے راز سے واقف ہو گئیں۔ کیا تم میرا قصور معاف کر دو گی؟"

کنولا نے دبی آواز میں کہا کہ "تم نے قصور ہی کونسا کیا ہے"؟

سلیم۔ آہ کنولا۔ کیا مَیں تمہارے خوش نما چہرے کی طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ سکتا ہوں۔ مجھے تمہاری ناراضی کا بڑا خوف تھا۔ مگر اب مَیں بڑا خوش نصیب ہوں۔ کنولا کیا مَیں امید کر سکتا ہوں۔ کہ تم میری ہو جاؤ گی"

ان الفاظ کو سُنکر کنولا چونک اُٹھی۔ اس نے اپنے جذبات کو ایک سخت کوشش کے ساتھ دبا دیا۔ اور

سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ "سلیم آج تم یہ کیا کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں ہمیشہ اپنا بھائی سمجھتی رہی ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو مگر برادرانہ"۔

یہ سُنکر سلیم نے اپنے چہرہ کو ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اور چند لمحہ کے سکوت کے بعد کہا کہ "ہاں کنولا تم سچ کہتی ہو۔ اس کے سوا اور میں تمہیں کس نظر سے دیکھ سکتا ہوں"۔

اس وقت اس کی آنکھیں پُر آب تھیں۔ اس کا چہرہ جل رہا تھا۔ دل پارہ کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ وہ اُٹھا ٹوپی پہنی اور دروازہ کی طرف چلنے لگا۔ دروازہ کے قریب پہنچکر وہ مُڑا اور اس نے التجا کے ساتھ کہا کہ "کنولا اس وقت کی گفتگو کا ذکر بابو جی سے بالکل نہ کرنا۔ میں اس وقت ہوش میں نہ تھا۔ امید ہے کہ تم مجھے معاف کرو گی"۔

(۴)

کئی ہفتے گذر گئے۔ سلیم لالہ امرناتھ کے مکان پر نہیں گیا۔ وہ کنولا کی بھولی بھولی صورت دیکھ کر اپنے جذبات کو تازہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کالج کی زندگی میں اپنے عشق کو بُھلا دے۔ عشق کا قاعدہ ہے کہ مخالفت کرنے سے اور زیادہ ہوتا ہے۔ محبّت ایسی چیز نہیں جو اتنی آسانی سے بھلائی جا سکے۔ سلیم اپنی کوششوں میں اکثر ناکامیاب رہتا تھا۔ دن بھر کی مصروف زندگی کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں اکیلا بیٹھتا تھا۔ تو وہی محبّت کے خیال وہی کنو[illegible] کر دیتی تھی۔ مگر سلیم ارادہ [illegible] خیال کو معدوم کرنا چاہتا تھا۔ [illegible] کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ناکامی، حسرت، اور یاس [illegible] کے مذہب میں اختلاف ہے۔ دُنیا کی نظروں [illegible] رشتہ قائم نہیں ہو سکتا۔ اور پھر وہ کچھ امید نہیں دلاتی . . . . اور دلائے بھی کیوں۔ اگر تیرے لئے یہ عشق باعث مصیبت ہے تو اُس کے لئے باعثِ بدنامی۔ دُنیا کہے گی کہ ایک مسلمان سے محبت کرتی ہے۔ اس کے خاندان کا نام بدنام ہوگا . . . . اس کی قوم کو بٹہ لگیگا۔ جگ ہنسائی ہوگی . . . . لالہ امرناتھ نے مجھ پر کتنا اعتبار کیا۔ دُنیا کی انگشت نمائی کو بالائے طاق رکھکر مجھے اپنی لڑکی سے ملنے دیا۔ اور اب میں اس اعتبار کا یہ بدلہ دوں؟ . . . . نہیں نہیں ایسا کبھی نہ ہوگا۔ میں اپنے دل سے یہ خیالات نکال دونگا . . . . "

ادھر تو سلیم کی یہ کیفیت تھی۔ ادھر کنولا کی حالت دگرگوں۔ جب سلیم چلا گیا تو اس نے اس تمام واقعہ پر غور کیا۔ وہ حیران تھی کہ اس کے دل کو کیا ہو گیا۔ سلیم کا خوبصورت چہرہ۔ اُس کی پُر محبت نگاہیں اُس کے دل میں چٹکیاں لے رہی تھیں۔ وہ اپنے دل پر جبر کرتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ سلیم پھر اظہارِ محبت کرے۔ اور مسکرا کر اپنی رضامندی

تھا۔ اب اس کا خیال آتے۔ مگر شرم روکتی تھی حیا
مانع ہوتی۔ وہ چپ ہو گئی۔

کنولا اب وہ اگلے اتوار کا انتظار کرنے لگی۔ جوں جوں دن
گذرنے لگے۔ کنولا کا اضطراب بڑھنے لگا۔ اس کو یہ خوف
تھا کہ کہیں سلیم اس سے ناراض نہ ہو گیا ہو۔

اتوار آیا۔ تمام دن کنولا نے انتظار میں کاٹا مگر سلیم
نہ آیا۔ دوسرا اتوار بھی گذر گیا۔ ناامیدی تو کنولا کی قسمت میں
لکھی تھی سلیم نہ آنا تھا نہ آیا۔ اب تو کنولا بہت بے چین
ہوئی طرح طرح کے وسوسے دل میں پیدا ہونے لگے۔ آخر
اُس سے نہ رہا گیا۔ اس نے ہوسٹل آدمی کے ہاتھ پرچہ
لکھ کر بھیجا۔

"پیارے سلیم۔ شاید تم مجھ سے اس روز
ناراض ہو گئے۔ اس دن سے کیوں نہیں
آتے۔ مجھے تم سے ضروری کام ہے اگر
تم نہ آؤ گے تو میں سمجھونگی تم ناراض ہو"

(کنولا)

سلیم اس پرچہ کو پڑھ کر بے چین ہو گیا۔ اس کے تمام مصمم
ارادے خاک میں مل گئے۔ پہلے اس نے عہد کیا تھا کہ
اب کنولا کے پاس نہ جاؤنگا۔ لیکن اب یہ ناممکن تھا۔

× × × × × × × × × × × ×

اتوار آیا۔ سلیم نے اس کا بڑا انتظار کیا تھا۔ آخر الغرض تھ
کے بنگلے پر پہنچا۔ کنولا تو اس کی راہ دیکھ ہی رہی تھی۔ دیکھکر
دل ہی دل میں خوش ہونے لگی۔ جب سب کھانا کھا چکے
اور لالہ صاحب اپنے کمرے میں آرام کرنے کے لئے چلے
گئے۔ سلیم اور کنولا کمرے میں اکیلے رہ گئے۔

کنولا نے نیچی نظر کر کے پُوچھا۔ "سلیم تم ناراض کیوں
ہو گئے۔ اتنے دن تک کیوں نہیں آتے۔"

سلیم نے گردن جُھکا کر جواب دیا۔ "یونہی عدیم الفرصت تھا
کالج کے کام میں لگا رہتا تھا۔"

کنولا۔ "مگر پہلے بھی تو کالج کا کام ہوتا تھا۔"

یہ سُنکر سلیم کا دل بھر آیا۔ اس سے نہ رہا گیا۔ اس نے
پُرجوش آواز میں کہا۔ "کنولا سچ تو یہ ہے کہ تم سے بچنے
کے لئے میں تمہارے پاس نہیں آیا۔ مجھے اپنی طبیعت پر
اعتبار نہیں۔ میں اپنی نظروں کو تمہاری صورت دیکھنے کی
اجازت نہیں دے سکتا۔ میں اپنی آنکھوں کو موقع ہی نہ
دُونگا۔ کہ تمہارا عشق تازہ ہو۔ . . . . اب میرا
یہاں آنا جانا تمہارے جواب پر منحصر ہے۔ اگر تم مجھ سے
نفرت کرتی ہو تو میں کبھی نہ آؤنگا۔ . . . . بولو جواب دو۔"

کنولا نے ایک گہرا سانس لیکر شرمیلی نگاہوں سے
دیکھا۔ اس کا دل زور سے دھڑک رہا تھا۔ اس نے ہلکی
آواز میں جواب دیا۔ کہ "نہیں ایسا نہ کرنا کہ نہ آؤ۔ میں تو
تمہارا انتظار کرتی ہوں۔ مجھے تو تم خود اچھے معلوم ہوتے ہو"

* * *

...بت روز بروز بڑھنے
...گھنٹوں ایک دوسرے
کی صحبت میں گذار دیتے تھے۔ اِن کی محبت پاکیزہ تھی
ان کے دل گناہ کے خیال تک سے خالی تھے۔ وہ ایک
دوسرے کے لئے جیتے تھے۔ وہ ایک دوسرے پر جان
تک فدا کرنے کے لئے تیار تھے۔

ادھر سلیم نے بی۔ اے بمشکل تمام پاس کیا۔ ادھر کنولا
انٹرنس میں کامیاب ہوئی۔ مگر اب ان کی محبت اس حد
تک پہنچ گئی۔ جب اس کے آگے بڑھنے کے لئے کوئی جگہ
سوائے شادی کے نہیں ہوتی۔

لیکن ان کو انجام کا خیال نہ تھا۔ وہ اس کا خیال
کرکے اپنی موجودہ خوشی کو خاک میں ملانا نہ چاہتے تھے۔
دُنیا انگشت نمائی کرنے لگی۔ ہر طرف ان دونوں کے بارے
میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ مگر محبت اندھی ہے۔ وہ
ان تمام باتوں سے بے خبر تھے۔

(۵)

بھادوں کی پہلی جھڑی آئی۔ برسی اور چلی گئی۔ پہلے تو
چاروں طرف سے سیاہ سیاہ بادل دھوئیں کی طرح اٹھے
سرد ہوا کے جھونکوں سے ہرے بھرے درختوں کی نازک
ٹہنیاں لچکنے لگیں۔ دلوں میں خوشی اور مسرت کے غنچے
کھلنے لگے۔

... اُداسی
باگ بازاروں اور ...
سے چلنے لگے۔ اب تو مینہ ... ہمران ہیں
سے سوندھی سوندھی خوشبو نکلنے لگی ...
ہر ایک کا چہرہ شگفتہ ہو گیا۔

مگر افسوس ایک کمرے میں کھڑکی کے پاس ایک ...
کرسی بچھائے بیٹھا ہے۔ قدرت کے مناظر اور برسات
کے سبزے نے اس کے دل پر کوئی اثر نہیں کیا۔ وہ ایک
غم کی صورت اور حسرت کا مرقعہ ہے۔ سب دیکھتا ہے مگر
دل کی اُداسی۔ طبیعت کی پریشانی۔ جذبات کا تلاطم خیالات
کی سراسیمگی۔ یہ سب مل کر اس کو قدرت کی خوشی میں شامل
ہونے سے روکتے ہیں۔ یہ سلیم ہے۔

سلیم کے ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ ہے۔ اس کی
نگاہیں بتا رہی ہیں کہ یہ پرزہ اس کی پریشانی کا سبب ہے
آج صبح پوسٹمین ایک سربمہر لفافہ لایا۔ دیکھتے ہی سلیم کا
ماتھا ٹھنکا۔ وہ تحریر کو پہچانتا تھا۔ کنولا کی تحریر تھی۔ مگر اس
کی وجہ ؟ دھڑکتے ہوئے دل اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے
سلیم نے لفافہ کھولا۔ اس کے دل میں طرح طرح کی بدگمانیاں
اور وسوسے پیدا ہو گئے۔ وہ کل ہی تو کنولا سے ملا تھا
آج یہ لفافہ کیسا ؟

آخر سلیم نے بے صبری کے ساتھ خط کو پڑھا۔ کنولا نے

یم۔ اَب تک ہم اور تم ایک دوسرے کی محبت
...یں مغرور سے ہم نے کبھی مستقبل کا خیال ہی نہیں
کیا۔ ہم نے اپنے فرائض زندگی فراموش کر دئے۔ ہم نے
اپنے اختلافِ مذہب کو بھلا دیا۔ ہم اندھے ہو گئے۔ ہم نے
انجام پر کبھی نظر تک نہیں ڈالی۔ ... لیکن آج بابو جی
کے الفاظ نے مجھے جگا دیا۔ اُنھوں نے آج مجھ سے میری مرضی
معلوم کی۔ وہ میری شادی شو لال کے ساتھ کرنی چاہتے ہیں۔
میں سوائے رضامندی کے اور کیا کہہ سکتی تھی۔ مجھ میں اتنی
جرأت نہ ہوئی۔ کہ میں اپنی اور تمہاری محبت کا اظہار کر دیتی
... میں آج محبت کی میٹھی نیند سے اس طرح اُٹھی۔
جیسے کوئی قیدی جیلخانہ میں ایک خوشگوار خواب دیکھ کر اُٹھتا
ہے ... میں انکار بھی کر دیتی۔ تمہارے ساتھ
شادی کر لیتی۔ مگر عزت کا خیال آتا ہے۔ دُنیا کیا کہے گی۔
بیشک دُنیا میں محبت ایک بہت بڑی چیز ہے۔ مگر آخر
عزت بھی کچھ ہے۔ میں اپنی زندگی تمہارے لئے دے سکتی
ہوں۔ مگر عزت نہیں۔ میری مجبوریاں تم کو معلوم ہیں۔ اختلاف
مذہب۔ رسوائی۔ بدنامی اور دُنیا کی انگشت نمائی۔ امید ہے
اب تم مجھے معاف کرو گے۔ تم مجھ سے ملنے کی کوشش
نہ کرنا۔ کبھی تمہاری پیاری پیاری صورت دیکھ کر میرا دِل
نہ نکل جائے اور میں اپنا فرض پورا کرنے سے ہٹ جاؤں۔
اب ہم اور تم دوسری دُنیا میں ملیں گے۔ جہاں ہم ہمیشہ کے
لئے ایک دوسرے سے مل جائینگے ... آہ
میرا دل بھر آیا ... آنسو اُمنڈ آئے کلیجہ پھٹنے لگا۔ رخصت
سلیم ہمیشہ کے لئے رُخصت ... تمہاری کنولا"

اس خط کو پڑھکر سلیم کی تمام قوتیں سلب ہو گئیں۔ اس
کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔

تھوڑی دیر میں اسے ہوش آیا۔ آج وہ بھی بیدار ہوا۔
محبت کا خواب کہر کی طرح صاف ہو گیا۔ سلیم اس وقت وہ ایک
غریب ملاح کی مانند تھا۔ جس کا جہاز ٹوٹ چکا تھا۔ جس
کی تمام امیدیں منقطع ہو چکی تھیں۔ جو ایک طوفانی سمندر کی
لہروں میں تھپیڑے کھا رہا تھا ... اتنے میں اسے
ایک تختہ دکھائی دیا۔ وہ اس سے چمٹ گیا۔ یہ آخری
امید تھی۔

یہ امید خود غرضی پر مبنی تھی۔ وہ کنولا سے ملکر اسے پہلی
محبت کی یاد دلا کر ساتھ چلنے پر آمادہ کریگا۔ وہ اس سے
اس قربانی کے لئے بھیک مانگیگا۔ اگر وہ رضامند ہو گئی۔ تو
یہ دونوں فرار ہو جائیں گے۔ تھوڑے عرصے کے لئے دُنیا
بدنام ضرور کریگی۔ مگر پھر سب بھول جائینگے۔ اور یہ باقی عمر
امن اور چین کے ساتھ بسر کرینگے۔ محبت کی خاطر کیا تھوڑی سی
بدنامی اُٹھانا کیا بڑی بات ہے۔

ابھی یہ خیال مضبوط نہ ہوا تھا کہ اس کے ضمیر نے اسے

بہت ملامت کی۔ کیا وہ کنولا کی بدنامی اور رسوائی صرف اپنی خوشی کے لئے چاہتا ہے۔ کیا وہ اس خوشی پر کنولا کی مقدس عزت کو بدنام کر دیگا۔ آہ! کیا وہ اس قدر خود غرض اور مطلب پرست ہے۔ جب ایک عورت عزت پر محبت کو قربان کر سکتی ہے۔ تو کیا ایک مرد اس قدر بزدل ہے۔ کہ وہ اس سے دریغ کرے۔ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ وہ کبھی ایسا نہ کریگا۔ زندگی کیا ہے کچھ نہیں۔ دُنیا ایک سرائے فانی ہے۔ بہت سے آتے اور چلے گئے۔

اب سلیم نے مصمم ارادہ کر لیا۔ کہ کنولا کے لکھے پر عمل کریگا وہ اٹھا اور اُس نے کنولا کے نام ایک چھوٹے سے پُرزے پر یہ الفاظ لکھ کر بھیج دئے۔

"پیاری کنولا۔ تمہارے خیالات درست ہیں میں تمہاری مرضی کے مطابق عمل کرنے کی کوشش کرونگا مگر تم بھی ثابت قدم رہنا" سلیم

دوسرے روز سلیم بغیر کسی کو خبر کئے ہوئے اپنے ایک نوکر کو ساتھ لیکر نہیں معلوم کہاں چلا گیا۔

کنولا کی شادی شولال کے ساتھ ہو گئی۔ سلیم ابھی تک لاپتہ ہے۔ ان تمام واقعات کو کوئی تین مہینے گذر گئے۔ شولال کنولا سے بہت محبت کرتا تھا۔ مگر کنولا کی عجب حالت ہے۔ وہ ہر وقت اُداس اور پژمردہ رہتی ہے اس کا دل بہلانے کے لئے شولال کی تمام کوششیں ناکام رہتی ہیں۔ کنولا نے آجتک بھی ... ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے بھول گئی۔ اس کی یہ اُداسی ایک راز ہے۔ شولال اور لالہ امرناتھ دونوں حیران ہیں۔ شولال ہر طرح اپنی بیوی کی دلجوئی اور خوشی کو مدِ نظر رکھتا ہے۔

آہستہ آہستہ کنولا کی اُداسی بخار میں تبدیل ہو گئی۔ بخار اب ہر وقت رہنے لگا۔ کنولا جو پہلے کافی صحت مند اور جسیم تھی۔ روز بروز لاغر ہونے لگی۔ اس کا سرخ اور سفید رنگ زرد پڑ گیا۔

شولال بہت متفکر تھا۔ اُس نے کنولا کے علاج میں کوئی کسر نہ رکھی۔ ہر طرح کوششیں کیں۔ وید بلائے حکیموں کو دکھایا۔ ڈاکٹروں سے معالجہ کرایا۔ مگر مرض روز بروز بڑھتا گیا۔ آخر بخار نے دق کی صورت اختیار کر لی ڈاکٹروں نے صلاح دی کہ پہاڑ پر لے جاؤ تو بہتر ہوگا سفر کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اب کنولا کو کھانسی بھی ہو گئی۔ اور دل بے چین رہنے لگا . . . .

ایک روز ہوا تیزی سے چلنے لگی۔ بادل گھر آئے۔ بجلی چمکی۔ اندھیری رات میں دُھواں دھار مینہ خوفناک آواز کے ساتھ برسنے لگا۔ صبح جب دن نکلا مینہ رُک چکا تھا۔ آسمان صاف تھا۔ بازاروں اور سڑکوں میں پانی پر سورج کی کرنیں منعکس ہو رہی تھیں۔ چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ درخت

لہلہا رہے تھے۔

کنولا کوٹھی کے ایک کمرے میں مسہری پر بے حس و حرکت پڑی تھی۔ پاس کی میز پر دوا کی شیشیاں پانی کا گلاس اور تھرما میٹر رکھے تھے۔ کمرہ آراستہ تھا۔ تمام کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ کنولا کی آنکھیں دروازہ کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اتنے میں اُس کا زرد چہرہ دمک اُٹھا۔ اس کے رخسار جو ایک عرصے سے زرد اور کملا گئے تھے۔ خون کے جوش سے سُرخ ہو گئے۔ پاس کرسی پر شولال بیٹھا تھا۔ وہ اس تبدیلی کو دیکھ کر حیران ہو گیا۔

کنولا نے مُسکرا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ باہر کسی آدمی کے آنے کی آواز سُنائی دی۔ × × × ×

× × × × × × × × آہ! محبت انسان میں کیا کیا قوتیں پیدا کر دیتی ہے۔ منتظر عاشق کی نگاہیں گہری سے گہری تاریکی میں دیکھ سکتی ہیں۔ اس کے کان ہلکی سے ہلکی آواز کو سُن سکتے ہیں۔ کنولا کی چمکدار آنکھوں میں حلقے پڑ گئے تھے۔ دق نے اسے گھلا گھلا کر کمزور کر دیا تھا۔ مگر اس وقت فرطِ مسرت سے اس کے چہرے پر سُرخی آ گئی تھی۔

اتنے میں دروازہ کھلا سلیم اندر داخل ہوا۔ شولال حیران رہ گیا۔ کسی کو اب تک معلوم نہ تھا کہ سلیم کیا ہوا اور کہاں ہے۔ صرف کنولا کو کسی غیر معمولی ذریعہ سے اس کی آمد کی خبر مل گئی تھی۔

سلیم کا چہرہ زرد تھا۔ وہ برسوں کا بیمار معلوم ہوتا تھا۔ آتے ہی وہ کنولا کی مسہری کے پاس دوزانو ہو کر بیٹھ گیا اور کنولا کا ہاتھ جو بیماری کی وجہ سے بہت نازک ہو گیا تھا اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

کنولا مُسکرائی اور اُس نے بہت ہی ضعیف مگر مسرت آواز میں کہا کہ "سلیم آج میں اپنی زندگی اپنے فرض پر قربان کرتی ہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ تم مجھ سے ضرور ملو گے۔ اور مجھے اسی گھڑی کا انتظار تھا۔"

کنولا نے سب کی طرف محبت بھری نگاہ سے دیکھا۔ باپ کو سلام کیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے چہرے پر وہی سُرخی اور مسکراہٹ موجود تھی۔ لیکن اس کی رُوح جسم کی قید سے آزاد ہو کر عالمِ بالا میں محوِ پرواز تھی۔

× × × × × × × ×

× × × × × × ×

آج کنولا کو رخصت ہوتے ایک مہینہ گذر رہا ہے۔ سلیم کے دل پر ایک چوٹ لگی۔ اس روز سے اس کی قوت دِن بدن زائل ہونے لگی۔ کسی نے اس کی آنکھ سے ایک آنسو نکلتے نہ دیکھا۔ آخر وہ کمزوری کی وجہ سے پلنگ پر پڑ گیا۔

ایک روز چاندنی رات تھی باغ میں طرح طرح

کے پھول کھل رہے تھے۔ سرد ہوا کے خوشگوار جھونکے چاندنی کے ساتھ مل کر عجب لطف پیدا کر رہے تھے سلیم اپنے پلنگ پر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ کہہ رہا تھا "کنولا سے ملنے کا وقت آگیا۔ وہ باغ میں کھڑی انتظار کر رہی ہے میں جلد جاؤں" نوکر نے روک کر پلنگ پر لٹا دیا۔ سلیم نے "پیاری کنولا۔ پیاری کنولا" کہہ کر کسی کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ اور وہ دونو ہمیشہ کے لئے مل گئے۔

حاتم

افکارِ نسیم

یار اغیار پہ شیدا نظر آتا ہے مجھے
اک بُت آئینہ سیما نظر آتا ہے مجھے
مَیں وہ مجنوں ہوں کہ جاتی ہے جدھر میری نگاہ
جلوۂ عارضِ لیلا نظر آتا ہے مجھے
اشک تر میں مرے مضمر ہیں ہزاروں طوفاں
یہ وہ قطرہ ہے جو دریا نظر آتا ہے مجھے
دِل کے آئینے کو اللہ سلامت رکھے
اس میں وہ جانِ تمنّا نظر آتا ہے مجھے
نظر افروزِ تمنّا ہے تری بزمِ جمال
ہر کوئی محوِ تماشا نظر آتا ہے مجھے
وہی خوشرو ہے جو خوشرو ہے مری نظروں میں
وہی اچھا ہے جو اچھا نظر آتا ہے مجھے
ہم نشین ساغرِ خالی کو تُو خالی نہ سمجھ
اس میں تو خونِ تمنّا نظر آتا ہے مجھے
دِل ہی آگاہ ہے کچھ آنکھ ہی کچھ جانتی ہے
کیا کہوں کیا ہے وہ کیسا نظر آتا ہے مجھے
ہائے اے بیکسی یہ کیا نظر آتا ہے مجھے
دل کے پردے میں دلآرا نظر آتا ہے مجھے
ملتفت ہے نگہ یار رقیبوں پہ نسیم
ختم ہنگامۂ دُنیا نظر آتا ہے مجھے

تنقید

مخزن مرحوم کے دورِ اولیں میں جب اس کی عنانِ ادارت شیخ عبدالقادر صاحب (اب خان بہادر) کے ہاتھ میں تھی۔ اس ڈراما کے چند سین شائع ہوکر بہت مقبول ہوئے تھے۔ یہ سنہ ۱۹۰۶ء کا واقعہ ہے۔ جب مولنٰا آزاد زندہ موجود تھے۔ گو عوارضِ دماغ کے باعث ادبیات سے اُنہیں کوئی علاقہ نہ رہا تھا۔ مولانا آزاد کا نام ان سینوں کے ہر دلعزیز ہونے کے لئے کافی ضمانت تھا۔ مولانا آزاد؟ سبحان اللہ نام لیتے ہی آبِ حیات۔ دربارِ اکبری۔ قصصِ ہند آنکھوں کے سامنے آگئے۔ اور ارادت کا سرِ نیاز جھک گیا۔ مولانا نے زبانِ اُردو کی جو خدمت کی وہ محتاجِ تصریح نہیں۔ جنابِ ممدوح ان چند قدسی نفوس میں سے ہیں جنہوں نے اُردو کی جڑیں پنجاب میں مستحکم کر دیں۔ اور اسے مادری زبان کی حد تک پہنچا دیا۔ جس وقت یہ سین شائع ہوئے اس زمانہ میں پنجاب بلکہ ہندوستان حضرت آزاد کی اس بے ہنگام عزلت گزینی پر ماتم کناں تھا۔ لہٰذا ان سینوں نے مجروح دلوں کے لئے مرہم کا کام کیا۔ اور سب نے اُنہیں آنکھوں پر رکھا سینہ سے لگایا۔ لیکن اس کی عدم تکمیل کی پھانس سب کے دلوں میں کھٹک رہی تھی۔

اکثر اہلِ قلم نے اس کے تکمل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن آزاد کی زبان میں پیوند لگانے کی کسی کو ہمت نہ پڑی۔ اور یہ کام معرضِ التوا میں پڑا رہا۔ آخر یہ بیل منڈھے چڑھی۔ اور آزاد مرحوم کے باہمت پوتے آغا محمد طاہر صاحب نے اگر پدر نتواند پسر تمام کند پر عمل کر دکھایا۔ اور دہلی کے مشہور فسانہ گو حکیم ناصر نذیر صاحب فراقؔ دہلوی سے اس ڈراما کو مکمل کرا کے مُلک کے شکریّہ کے مستحق ہوئے۔

مولانا آزاد اور حکیم فراقؔ کی زباندانی اور انشاپردازی کے جھنڈے گڑے ہوئے ہیں۔ اور ہر دو اپنی اپنی طرزِ تحریر کے بادشاہ ہیں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا۔ کہ وہ ہر صنفِ لٹریچر پر قدرتِ تامہ رکھتے ہیں۔ مثلاً شمس العلما کو الٰہیات میں کوئی تبحر نہیں اور ان کی نظم ان کی نثر سے لگّا نہیں کھا سکتی۔ اسی طرح حکیم فراقؔ بھی پیشہ داستاں گوئی کے شبیر ہیں۔ سچ ہے۔ ہر کسے را بہر کارے ساختند مگر اس وقت یہ ہر دو بزرگ بحیثیت ڈراما نگار کے ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ اور ہم انہیں اسی پہلو سے پرکھنا چاہتے ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر وہ امتحان میں پورے نہ اتریں۔ تو ان کے ازالہ شان کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ ڈراما ان کے

قصرِ کمال کا کوئی رکن نہیں۔

حسن صوری کے لحاظ سے ڈراما اکبر سینکڑوں کتابوں میں ایک ہے۔ کتابت اچھی۔ طباعت نگاہ افروز۔ مجلد دیدہ زیب سنہری نام سونے پر سہاگہ۔ سرورق پر مولانا آزاد کو رشک شیکسپیر و ملٹن ظاہر کیا ہے۔ ممکن ہے کہ آزاد کا درجہ اپنے رنگ میں اُن سے بہت اعلیٰ و ارفع ہو۔ لیکن شیکسپیر اور ملٹن سے انہیں کوئی وجہ مشابہت نہیں شیکسپیر ایک ڈراما نگار و ایکٹر ہے۔ حالانکہ مولانا کو ڈراما سے کوئی نسبت نہیں۔ اور وہ کبھی حضرت سرسید اور مولانا شبلی کی طرح سٹیج پر ایک ایکٹر کی حیثیت سے جلوہ گر نہیں ہوئے۔ ملٹن کا سرمایۂ کمال اس کی دو نظمیں "جنتِ گم گشتہ" اور "جنتِ بازیافتہ" ہیں۔ جن کے مقابلہ کی کوئی چیز مولانا آزاد کی کلیات میں نہیں۔

سرورق سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ ڈراما صرف حضرت آزاد ہی کی رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ تاجرانہ حکمتِ عملی آغا صاحب کے شان کے شایاں نہیں۔

آغا صاحب دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔ "اُردو میں ڈراما لکھنا آج کچھ بڑی بات نہیں۔ جس نے چند انگریزی ہی اُردو کی کتابیں پڑھی ہوں۔ کچھ ناول دیکھے ہوں تھیئٹر کی زیارت سے مشرف ہوتا ہو۔ کہیں دل دیا ہو۔ کہیں لیا ہو۔ اچھا خاصہ ڈرامالسٹ ہو سکتا ہے۔"

قطع نظر اس بات کے کہ ڈراما نگار کی جو تعریف آغا صاحب نے وضع فرمائی ہے۔ وہ ازبس سوقیانہ ہے۔ یہ مولانا آزاد کی ذاتِ والاصفات پر ایک بے ادبانہ حملہ تصوّر ہو سکتا ہے۔ انہیں ڈراما نگار کی حیثیت سے پیش کرنا۔ اور پھر ڈراما نگار پر یہ آوازہ کسنا صریح منطق کے لحاظ سے مولانا کو اس کا آماجگاہ بنانا نہیں تو اور کیا ہے۔ علمی طبقوں میں یہ عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے۔ کہ تمام اصنافِ ادبیات میں ڈراما مشکل ترین صنف ہے۔ باوجود اس کے آغا صاحب نے ڈرامانویسی کے لئے جو کلیہ قائم کیا ہے اس کی نسبت کیا عرض کیا جائے۔ وہ خود ہی بکر رغور فرمائیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ اور ان کے قلم سے کن کن بزرگوں کی توہین ہوتی ہے۔ شاید انہیں دھیان نہیں رہا کہ ڈراما نگاروں کی جماعت میں۔ احسن۔ عزیز مرزا۔ طالب۔ کیشب چندر سین۔ عبدالحلیم شرر۔ ظفر علی خاں۔ عبدالماجد برجموہن دتاتریہ کیفی۔ کنور سین اور ٹیگور کے ایسی عظیم الشان ہستیاں شامل ہیں۔ بہرحال شوخیِ طبع یا تقاضائے سن سے یہ دلخراش فقرہ ان کے قلم سے نکل گیا ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں۔ کہ وہ آیندہ ایڈیشن میں "خدا کرے کہ اسکی نوبت جلد آئے۔" اس تنگ نظری کے ثبوت کو محو کر دیں گے۔

آغا صاحب فرماتے ہیں۔ "جبکہ انشار پردازی کے

درخت میں یہ شاخ بالکل نہ تھی۔ ایسی حالت میں زمین سخن
میں نئی قلم لگانا بڑی بات ہے۔"

معلوم ہوتا ہے کہ آغا صاحب مولانا آزاد کو اُردو کا پہلا
ڈرامانویس قرار دینا چاہتے ہیں۔ لیکن علم ڈراما سے مس
رکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ اُردو زبان میں ڈراما لکھنے کا
تاجِ اوّلیت "امانت" کے سر ہے۔ اور مولانا آزاد کے
عہد میں احسن اور طالب اچھے خاصے ڈرامانویس موجود
تھے۔ اس لئے یہ بات تحسینِ ناشناس سے زیادہ وقعت
نہیں رکھتی۔

اگرچہ صاحبِ دیباچہ ہمیں نہیں بتاتے۔ مگر قرائن
سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلے چار سین مولانا آزاد کے قلم کے
مرہونِ منت ہیں۔ اور باقی کے ذمہ وار حکیم فراق ہیں۔ اب
ہم دیکھتے ہیں کہ اُستاد اور شاگرد اپنے اپنے فرائض سے
کیسے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

پہلی جھلک

آزاد نے سین کا ترجمہ جھلک فرمایا ہے۔ اہلِ فارس
"مجلس" کہتے ہیں۔ ظریف۔ رونق اور طالب کے
عہد میں اس کا نام "پردہ" تھا۔ حکیم احمد شجاع صاحب
اپنے ڈراموں میں "منظر" لکھتے ہیں۔ ہندی نواز احباب
"جھانکی" کو مروج کرنا چاہتے ہیں۔ احسن اور حشر "سین"
ہی قائم رکھتے ہیں۔ اور یہی سٹیج اور عام ڈراموں میں متداول
ہے۔ اگر سین کا ترجمہ کرنا ہی ہو۔ تو اربابِ نظر کو یہ فیصلہ
کرنا ہوگا۔ کہ جھلک۔ منظر اور مجلس میں سے کونسا لفظ
قابلِ قبول ہے۔

یہ سین ایک پرولوگ (Prologue)
سے شروع ہوتا ہے۔ جو اپنے رنگ میں خوب اور
بے عیب ہے۔ اور آزاد مرحوم کی یاد دلوں میں تازہ کرنے
کے لئے کافی ہے۔ اس میں اکبر کو ہیمو کے دہلی پر
قبضہ کرنے کی اطلاع ملتی ہے۔ اور مجلس مشاورت منعقد
ہوتی ہے۔ سترہ صفحہ کی وسط تک ڈراما کے تسلسل میں
کوئی فرق نہیں آتا۔ اور جو کچھ لکھا گیا ہے۔ آزاد کے کمال
پر دال ہے۔ مگر اس کے بعد نظر قلمی تشریف لاتے ہیں۔
اور ہیمو کی شکست کا حال بطور تذکرہ بیان کر کے ڈراما
کو ملیامیٹ کر دیتے ہیں۔ صرف یہی حکایت راویانہ اس
ڈراما کو ڈراما کی محفل سے نکال کر ناول کی صف میں لے جا
کھڑا کرتی ہے۔ کیونکہ ڈراما میں کوئی بات تذکرۃً بیان
نہیں کی جاتی۔ بلکہ عملاً کر کے دکھائی جاتی ہے۔ یہی ڈراما
اور ناول کا مابہ الامتیاز ہے۔ یہی نقشہ ہیمو کی گرفتاری کی
کیفیت کا ہے۔ جسے ایک سوار آ کر بیان کرتا ہے۔
مجلس مشاورت کے ساتھ ہی ہیمو کی شکست کی اطلاع
اور ہیمو کا گرفتار ہو کر پیش ہونا' ایک ہی سین میں درج
کئے گئے ہیں۔ یہ تواتر واقعات مذاقِ ڈراما کے

نقیض ہے۔

دوسری جھلک

اس سین کا نصف حصہ محض تذکرہ ہے۔ جسے ڈراما سے کوئی لگاؤ نہیں ہو سکتا۔ مینا بازار کی کیفیت لفظوں میں دکھانا ڈراما سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ اس کے ساتھ ہی بازارِ حسن کے عنوان سے مینا بازار میں جہانگیر اور مہر النسا کی ملاقات کا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ ڈراما میں عنوان بے معنی چیز ہے۔ نتیجہ سین بھی پرولوگ سے شروع ہوتا ہے۔ جہانگیر اور مہر النسا کا مکالمہ عین ڈراما ہے۔ مگر کورس سے راوی کا کام لینا فرائضِ کورس سے ناآشنائی کا اظہار کرنا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا سے جس نے کورس کا ذکر کیا۔ وہ خود "کورس" کے فرائض سے نابلد تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ایک چلتے ہوئے ڈراما کا حلیہ بگڑ گیا۔

پہلی اور دوسری جھلک کے مقابلے سے ظاہر ہوگا۔ کہ ان کا کوئی تعلق ایک دوسرے کے ساتھ نہیں ہے۔ اور پہلا سین ادبی لحاظ سے خواہ کیسا ہی گرانمایہ کیوں نہ ہو۔ اس ڈراما میں نہیں سما سکتا۔

تیسری جھلک

اس کا "پرولوگ" ہدایات سٹیج کا پہلو لئے ہے۔ اس میں جہانگیر شراب کو منہ لگاتا ہے۔ اور بس۔ اس تھوڑے سے کام کے لئے ایک سین کا سین وقف کر دینا بہت غیر ضروری ہے۔

چوتھی جھلک

اس مقام پر جھلک کے نیچے پہلا سین درج کیا گیا ہے۔ لیکن سطور آئندہ میں دوسرے سین کا کوئی ذکر نہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ اس کے کیا معنی ہیں شاید جھلک سے مطلب ایکٹ ہو۔ مگر سیاقِ عبارت سے اس کی بھی چول ٹھیک نہیں بیٹھتی۔ اس میں ڈراما کا رنگ اچھا رہا ہے۔

اس کے بعد جو کچھ ہے۔ وہ حکیم فراق صاحب کی جدت طبع کا نتیجہ ہے۔ اور بالکل اس طرح لکھا ہے گویا وہ کوئی ناول یا تاریخ لکھ رہے ہیں۔ جسے ڈراما کہنا یا اس پر ڈراما کی حیثیت سے غور کرنا اس قابلِ توقیر فن کی ہتک ہے۔ ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ کہ حضرتِ فراق کی محنت ادبی یا تاریخی لحاظ سے کیا وقعت رکھتی ہے۔ لیکن ہمیں بالاستکراہ کہنا پڑتا ہے کہ جہاں تک ڈراما کا تعلق ہے۔ ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی۔ اور یہ از بس ناکام کوشش ہے۔

بہتر ہوگا کہ آغا صاحب اس ڈراما کو کسی ماہرِ فن سے تحریر کرائیں۔ تاکہ آزاد کی یہ معنوی اولاد پروان

چڑھے۔ موجودہ صورت میں جو مشورہ ان کے علم دوست احباب نے دیا تھا۔ ہم بھی اس پر صاد کرتے ہیں اور یہ کہنے پر مجبور ہیں۔ کہ اس کتاب کو شائع کرنا مولانا آزاد کو بدنام کرنا ہے۔

ڈرامی

غزل

دِل کو ترے خیال سے مضطر بنا دِیا
ذرّے کو ہم نے مہرِ منوّر بنا دِیا

پاتے جراحتِ نگہ یار کے مزے
رگ رگ کو ہم نے عشق میں نشتر بنا دِیا

اتنی لبِ نگار میں شیرینیاں نہ تھیں
پر تلخیوں نے قند مکرّر بنا دِیا

دامن کو ہم نے دیدۂ خوں نابہ ریز سے
رشکِ نگار خانۂ آزر بنا دِیا

دیکھا انہیں تو گر کے تڑپنے لگے وہیں
بزمِ رقیب کو صفِ محشر بنا دِیا

چھلنے لگی ہیں دیدۂ جوہر سے مستیاں
شیشے کو تو نے دیکھ کے ساغر بنا دِیا

اِک بُت کو پُوجنے کی یوں ہی بات اڑ گئی
کہہ سُن کے خلق نے مجھے کافر بنا دِیا

اب صورت آفریں سے کرے کیا کوئی گلہ
جیسا بنا دیا، مجھے بہتر بنا دِیا

ہے ناز دلفریب، تو انداز دلستاں
دونوں کو تُو نے کاٹ میں خنجر بنا دِیا

عابدؔ پہ اسقدر بھی وہ نامہرباں نہ تھے
اس کی ستم کشی نے ستمگر بنا دِیا

عابدؔ

جستجو

(۱)

کلکتہ میں ایک جگہ برابر برابر دو مکان واقع تھے۔ جو اپنی ظاہری تعمیر کے لحاظ سے بالکل یکساں تھے۔ ان میں سے ایک صاحبِ مکان کا نام بیپن تھا۔ جو علاوہ مالدار ہونے کے شان و شوکت کا بھی بہت لحاظ رکھتا تھا لیکن تھا ذرا تند مزاج۔ دوسرا مکان ایک شخص ہمندر لال کا تھا۔ جو ایک معمولی حیثیت کا آدمی تھا۔ اور کسی دفتر میں ملازم تھا۔ اس کا ذریعۂ معاش صرف اس کی تنخواہ تھی۔ اور چونکہ وہ فضول خرچ بھی تھا۔ اس وجہ سے اس کے مصارف ہمیشہ آمدنی سے زیادہ رہا کرتے تھے۔ ہر چند بیپن اور ہمندر لال کے عادات و مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ مگر ان دونوں میں شدید ارتباط قائم تھا۔ جس کی وجہ بھی اسی طرح نامعلوم رہی جس طرح دُنیا کے اور بہت سے واقعات کے اسباب پردۂ خفا میں رہتے ہیں۔ الغرض ان کا رشتہ اتحاد و اُلفت نہ صرف ان کی زندگی تک قائم رہا۔ بلکہ اس کا اثر ان کے بعد بھی قائم رہا۔

اتفاقاً ایک سال وبا پھیلی اور ہمندر لال اس میں مبتلا ہو گیا۔ لیکن مرنے سے قبل وہ اپنی بیوی اور شیر خوار بچّی کو اپنے دوست بیپن کے سپرد کر گیا۔ اسی روز شام کو بیپن کی بیوی بھی مر گئی۔ اور اب بیپن بہت متفکر ہُوا۔ کہ اپنے مرحوم دوست کی وصیّت کو کیونکر پورا کرے۔ وہ اسی فکر میں مبتلا تھا۔ کہ اس کے پڑوسی ازراہِ ہمدردی آئے۔ اور آجو کی نگرانی کی طرف سے اسے مطمئن کر دیا۔ لیکن ابھی ہمندر لال کی بیوہ اور اس کی شیر خوار بچّی کا انتظام پیشِ نظر تھا۔

چونکہ ہمندر لال بہت مقروض مرا تھا۔ اس لئے سب سے پہلے بیپن نے اس کا قرض ادا کیا۔ پھر اس کی بیوہ اور بچّی کو اپنے گھر میں لے آیا۔ اسی اثنا میں بیپن کی بہن اپنے بھتیجے کی نگرانی اور گھر کا انتظام کرنے کے لئے آگئی۔ ہر چند اس کو ہمندر لال کی بیوی اور لڑکی کا گھر میں آنا پسند نہیں آیا۔ لیکن فی الحال اس نے اس کا اظہار مناسب نہیں سمجھا۔

چونکہ آجو کی تعلیم و تربیت کی طرف ابھی کسی کو چنداں توجہ نہ تھی۔ اس لئے فی الحال صرف ایک ضعیف اتالیق اس کے لئے مقرر تھا۔ اور کوئی ساتھی اس کا نہ تھا۔ اس لئے جب سُلتا گھر میں آئی۔ آجو کو بہت خوشی ہُوئی کیونکہ

اب اس کو دل بہلانے کے لئے ایک ساتھی مِل گیا تھا سُلتا کی عمر اس وقت پانچ سال کی تھی۔ اور آجو کی عمر نو سال کی۔ اس لئے ان دونوں میں بہت جلد محبت پیدا ہو گئی۔

ان دونوں کا نشو ونما عجیب انداز سے ہُوا تھا اور وہ صفات جو نسل کے لحاظ سے ان میں منتقل ہونی چاہئے ان میں سے کسی میں نہ پائے جاتے تھے۔ آجو باوجود اس کے کہ اس کا باپ نہایت تند مزاج شخص تھا بہت حلیم الطبع ہوتا جاتا تھا۔ اور سُلتا جو ایک بے ضرر شخص کی لڑکی تھی۔ غیر معمولی طور سے درشت مزاج ہوتی جاتی تھی۔ جس کو دیکھ کر لوگوں کو سخت صدمہ ہوتا تھا۔ سُلتا کی حالت ایسی تھی۔ جیسے کوئی پہاڑی چشمہ سنگین حصار کو توڑ کر اپنی پوری طاقت و شورش کے ساتھ بہ نکلتا ہے۔ آجو کی آنکھیں ایسی معلوم ہوتی تھیں۔ کہ گویا خواب دیکھ رہی ہیں۔ یا کسی فکر میں مبتلا ہیں لیکن سُلتا کی نگاہیں اپنے تاریک عمق میں بجلیاں لئے ہوئے محسوس ہوتی تھیں۔ بیپن اس حالت کو دیکھ دیکھ کر بہت پریشان تھا۔ لیکن آخر کار اس نے جلد ہی فیصلہ کر لیا۔

ایک روز ایسا اتفاق ہُوا کہ آجو نے اپنی قیمتی کلائی کی گھڑی کسی غریب دوست کو ہدیۃً پیش کر دی اور اس کی اطلاع اپنے باپ سے نہیں کی۔ جب بیپن کو یہ معلوم ہُوا۔ تو وہ سخت برہم ہُوا۔ اور بولا کہ "میں کل تم کو بورڈنگ ہاؤس میں یقیناً داخل کر دُونگا۔ میں روپیہ کمانے میں اس لئے عرق ریزی اور جانکاہی نہیں کرتا کہ تُم اُسے فضول ضائع کرو۔ سُلتا کو بھی بورڈنگ ہاؤس بھیجونگا۔ کیونکہ گھر پر اس کی تربیت ہونا غیر ممکن ہے"

سُلتا کی ماں کو یہ بات سُنکر سخت صدمہ ہُوا۔ کیونکہ سُلتا اب تیرہ برس کی ہو گئی تھی۔ اور وہ اس کی شادی کے فکر میں تھی۔ بورڈنگ ہاؤس میں بھیجنا اس کے نزدیک ایسی بات تھی۔ جس کا وہ کبھی خیال بھی نہ کر سکتی تھی۔

آجو کی پھوپھی سُلتا کی ماں کی ہمخیال تھی لیکن بیپن کی مخالفت کرنا آسان بات نہ تھی۔ تاہم یہ مسئلہ خلاف امید سُلتا ہی کی گفتگو سے حل ہو گیا۔ کیونکہ اس نے صاف طور سے انکار کر دیا۔ کہ میں بورڈنگ ہاؤس کبھی نہیں جاؤں گی۔

بیپن کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ لیکن وہ یہ سُن کر ناخوش نہیں ہُوا اور کہا۔ "اچھا تم مت جانا۔"

آجو کے روانہ ہونے سے اس کی پھوپھی اور سُلتا کی ماں کو سخت صدمہ تھا۔ اور سُلتا جس کے چہرہ پر بھی برہمی کے آثار نمایاں تھے۔ پہلے ہی سے آجو کی

گاڑی میں اپنی گھوڑی لیکر جا بیٹھی تھی۔ جب آجو وہاں پہنچا
تو بولی۔ "میں بھی تمہارے ساتھ چلونگی۔"

آجو نے اس کو سمجھایا کہ "جب تم بورڈنگ ہاؤس میں میرے ساتھ نہیں رہ سکتیں تو پھر کیوں بچوں کی سی ضد کرتی ہو۔ خدا کے۔ لئے تم چلی جاؤ۔ ورنہ لالہ جی بہت خفا ہونگے۔"

سُلتا نے یہ سُنا اور بُت کی طرح خاموش بیٹھی رہی اتنے میں بیپن آیا۔ اور اس نے زبردستی اسے اُتار لیا اب سُلتا کی برہمی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے اپنی گھوڑی پھینک دی۔ اور اپنے کمرہ میں جاکر چھپ گئی آجو تھوڑی دیر کے بعد اس سے رخصت ہونے آیا لیکن سُلتا نے دروازہ نہ کھولا۔ اور نہ کوئی جواب دیا۔ آخر آجو مایوس ہوکر چلا گیا۔ اور سُلتا اس صدمہ میں دن بھر بھوکی پیاسی پڑی رہی۔ اپنی تمام کتابیں پھاڑ ڈالیں اور کاغذات کے پرزہ پرزہ کر دیئے۔ اور اپنی گریہ زاری سے گھر والوں کی زندگی تلخ کر دی۔ صرف بیپن البتہ مسرور تھا۔ وہ سُلتا کی ضد سے اس نتیجہ پر پہنچا۔ کہ یہ لڑکی بڑی مستقل مزاج ہے۔ اور اسے لڑکا ہونا چاہیئے تھا۔

دوسرے روز وہ بستر سے اُٹھتے ہی اپنی ماں کے پاس گئی اور خوش ہوکر دریافت کیا۔ کیا آجو کا کوئی خط آیا ہے؟"

اس سوال پر اس کی ماں نے اس کو ڈانٹا۔ اور کہا۔ "تو اس کا نام کیوں لیتی ہے۔ وہ تجھ سے بہت بڑا ہے۔ اس کو بھائی کہنا چاہیئے۔"

سُلتا نے کہا۔ "میں نہیں کہونگی۔ اس کو میں لڑائی میں ہرا سکتی ہوں۔ ہاں تو بتاؤ کہ کوئی خط بھی آیا ہے یا نہیں۔"

اس کی ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور یونہی ٹال دیا۔ سُلتا اب چونکہ تنہا تھی۔ اس لئے اب بہت آزردہ خاطر رہتی تھی۔ اور جب وہ آجو کے کمرہ کو دیکھتی تھی تو اُس کو سخت وحشت ہونے لگتی تھی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے۔ آخرکار اس کا رنج غُصّہ سے بدلنے لگا۔ اور اس کی وحشیانہ حرکات نے اس کی ماں اور آجو کی پھوپھی دونوں کو سخت پریشان کر دیا تھا۔

سُلتا زینہ پر بیٹھی ہوئی ایک تصویر بنانے میں محو تھی۔ اور اس میں وہ رنگ بھر رہی تھی۔ جسے صرف ایک نوجوان دماغ ہی تجویز کر سکتا ہے۔ اس نے بیٹھے بیٹھے سوچا کہ شاید وہ آجو کے آنے سے قبل ہی مر جائیگی اور جب وہ آکر مجھے مُردہ پائیگا۔ تو کس قدر تاسف کریگا اِس خیال کے ساتھ ہی وہ رونے لگی۔ لیکن عین اُس

وقت ڈاکیہ کی آواز نے اس کے خوابیدہ خیالات کو بیدار کر دیا۔ وہ جلدی سے نیچے اُتر آئی۔ اور اُس نے اجو کی پھوپھی سے جس کے نام وہ خط تھا چھین لیا۔ اور پڑھنے لگی لیکن سُلتا کا ذکر تو درکنار اس کا کہیں نام تک اس میں نہ تھا۔ اس وقت سُلتا اپنے آنسو ضبط نہ کر سکی۔ اور زار زار رونے لگی۔ وہ سمجھتی تھی۔ کہ سوائے میرے دُنیا میں کسی کو برہم ہونے اور عملی طور پر اس کے ظاہر کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔ وہ خود تو دوسروں کو تکلیف پہنچانا پسند کرتی تھی لیکن اسے یہ گوارا نہیں تھا کہ کوئی اور اس کو ایذا دے۔ وہ اس وقت کچھ برہم تھی۔ اور کچھ محجوب لیکن چونکہ اجو اس سے بہت دُور تھا اس لئے وہ کچھ نہ کر سکتی تھی۔

اجو کو خلافِ امید سُلتا کا خط ملا۔ اس میں لکھا تھا۔ جب تم گرمیوں کی تعطیلوں میں آؤ گے۔ تو میں تم کو گھر پر نہیں ملونگی۔ چونکہ میں اپنے چچا کے ہاں جانے والی ہوں۔ اس لئے تم مطمئن ہو جاؤ کہ میں تم کو ستانے کے لئے یہاں موجود نہ ہونگی۔" اجو پہلے تو خط کو پڑھکر بہت رویا۔ اور پھر زیادہ غور کے بعد وہ سُلتا کے اس طنز کو سمجھا۔

اجو اور سُلتا دونوں بے چینی سے گرمیوں کی تعطیل کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر کار خدا خدا کر کے وہ دن آگیا جب اجو ریل سے اُترا تو اُسے کوئی شخص اسٹیشن پر نہیں ملا۔ اور اس لئے اُس نے اپنا اسباب قلی کی مدد سے گاڑی میں رکھوایا۔ اور نہایت مایوس ہو کر چل دیا۔ چونکہ مکان اسٹیشن سے بہت دُور تھا۔ اور گھوڑے بھی تھکے ہوئے تھے اس لئے تیز نہ چل سکتے تھے۔

اثنائے راہ میں دفعتاً گاڑی کی کھڑکی میں ایک پتھر لگا۔ جس سے اجو چونک پڑا۔ اور جب اس نے چاروں طرف دیکھا تو معلوم ہوا کہ سُلتا برگد کے درخت کے قریب سڑک پر کھڑی ہوئی ہے۔ لیکن جب وہ گاڑی سے اُتر کر اس کی طرف دوڑا۔ تو وہ جلدی سے چھپ گئی۔

اجو نے اس کو بہت جلد ڈھونڈ لیا۔ اور خوش ہو کر پوچھا۔ "آخر سُلو (سُلتا) تم آہی گئیں ابھی تک تم یہیں ہو؟"

سُلتا نے بظاہر اس کا کچھ اثر نہیں لیا۔ اور بے پروائی سے جواب دیا۔ "جی ہاں میں بہت جلد دو ایک روز میں جانے والی ہوں۔ میں تو یہاں صرف تفریح کرنے آگئی تھی۔" باوجود اس اندازِ بے پرواہی کے اس نے اجو کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور گاڑی میں سوار ہو گئی راستہ بھر وہ فضول باتیں کرتی رہی۔ لیکن اس فرضی چچا کا جہاں وہ جانے والی تھی کوئی ذکر نہیں کیا۔

جب گاڑی گھر کے دروازہ پر رُک گئی۔ تو سُلتا کی

ماں باہر آئی۔ اور سلتنا کو گاڑی میں دیکھ کر اس کے ایک تھپڑ مارا اور غضبناک لہجہ میں پوچھا۔ کہ "تو ابتک کہاں غائب رہی۔ مَیں تیرا کیا علاج کروں تجھ میں ذرا بھی تہذیب نہیں ہے۔ پھوپھی نے بھی یہ سُنا اور اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

سُلتنا تھپڑ کھانے کے بعد ماں کی گرفت سے نکل گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے سرکشی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اور دروازہ سے ٹک کر اس طرح کھڑی ہو گئی۔ جس طرح کوئی ہرن مجبور ہو کر مقابلہ پر آ جاتا ہے۔ جب اس کی ماں دوبارہ اس کو پکڑنے کے لئے بڑھی تو اجو نے آ کر یہ کہتے ہوئے اس کو چھڑا لیا۔ "کیا سُلتنا اسی سزا کی مستحق ہے۔ حالانکہ سارے گھر میں صرف یہی ایک ہستی ہے۔ جس کو میرے مرنے جینے کی پروا ہے"۔ یہ کہہ کر اجو رونے لگا۔

اس وقت بیپن بھی اپنے لڑکے کا خیر مقدم کرنے کی غرض سے آگیا۔ اور اُس کو روتا ہوا دیکھ کر نہایت ہی غیظ و غضب کی حالت میں بولا۔ "کیا چار مہینہ تک بورڈنگ ہاؤس میں رہ کر تم نے یہی تہذیب سیکھی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ تم ایسے ضدی اور ناتجربہ کار لڑکے کی تربیت کیونکر ہو سکتی ہے۔ تم سے تو سُلتنا ہی بہتر ہے"۔

اتنے میں سُلتنا بھی آ گئی اور کہنے لگی۔ "مجھ کو اماں جان نے مارا تھا۔ اس لئے یہ روتا ہے۔ آپ ان کو تو تنبیہ کرتے ہی نہیں۔ اس بیچارے پر فضول ناراض ہوتے ہیں۔ مَیں بھی خوب روؤنگی۔ اور چلاؤنگی۔ آپ جو چاہے کیجئے۔ مَیں اس کی مطلق پروا نہیں کرتی"۔

جب کنبہ کی عورتیں اجو سے ملنے کو آئیں۔ تو اُس وقت بیپن بھی کسی ضروری کام سے باہر چلا گیا۔ اور اس لئے یہ معاملہ تھوڑی دیر کے لئے ختم ہو گیا۔ سُلتنا اجو کے کمرہ میں دن بھر سنجیدگی کے ساتھ بیٹھی رہی۔ اور اپنی ماں کے غضبناک چہرہ کا کچھ خیال نہ کیا۔ اور نہ اجو کی پھوپھی کے طعن و تشنیع کی کچھ پروا کی۔ جب کبھی اس کی ماں غُصّہ ہوتی۔ تو وہ فوراً شور و غل کر کے بیپن کو بلا لیتی تھی۔ وہ ایسے معاملات میں ہمیشہ اس کی طرفداری کیا کرتا تھا۔

چھٹیاں بہت جلد ختم ہو گئیں۔ اجو پھر بورڈنگ ہاؤس چلا گیا۔ اس مرتبہ سُلتنا غیر معمولی طور پر سنجیدہ بن گئی اور اُس نے اجو کے جانے کے بعد کسی قسم کی ضد وغیرہ نہیں کی۔ جیسے کہ وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔

درحقیقت سُلتنا کی ماں بہت متفکر تھی۔ کیونکہ سلتنا اب جوان ہو گئی تھی۔ بیپن کو تو کچھ خیال تھا ہی نہیں۔ اور لطف یہ کہ وہ ابھی اس کو شادی کے قابل

ہی نہیں سمجھتا تھا۔ سُلتا کی ماں اور آجو کی پھوپھی نے اس کے دل سے یہ خیال نکالنے کی بہت کوشش کی لیکن اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ ایک روز جب وہ ان دونوں کی باتوں سے تنگ آگیا تو بولا۔ "میں سُلتا کی شادی آجو کے ساتھ کرونگا کسی غیر شخص کے ساتھ کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ سُلتا کی ماں جس کو بیپن کے وعدہ پر بڑا اعتماد تھا۔ یہ سُنکر کچھ مطمئن ہوگئی۔

ایام جلاوطنی میں آجو کی تنہا تسکین کا ذریعہ صرف سُلتا کا خط ہوتا تھا۔ اگرچہ اس کی عبارت طفلانہ ہوتی تھی۔ اور نہ اس میں کوئی خاص بات ہوتی تھی۔ لیکن آجو کو سلتا کے خط دیکھ کر اُس کی بڑی بڑی رسیلی آنکھیں اور ہنس مکھ چہرہ یاد آجاتا تھا۔ اور اس کے تنگ و تاریک کمرہ میں تھوڑی دیر کے لئے روشنی اور زندہ دلی محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کے ساتھی ان خطوط کا مذاق اُڑاتے تھے۔ لیکن وہ کچھ پروا نہیں کرتا تھا۔ اگرچہ وہ طعن آمیز فقرات سُنکر غمگین ضرور ہوجاتا تھا۔ لیکن آخر کار شریر لڑکے اس کو مایوس چھوڑکر بھاگ جاتے تھے۔ بیپن نے جس جگہ آجو کو تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ حقیقتاً ایسی ہی جگہ تھی۔ جہاں وہ زندگی کی عملی راہیں حاصل کرسکتا تھا۔ لیکن اجو کی حالت بدستور غیر عملی اور جذباتی رہی۔

آجو نے کسی نہ کسی طرح انٹرنس پاس کرلیا۔ جب نتیجہ شائع ہوا۔ تو بیپن نے آجو کو لکھا۔ کہ "سیاحت کرنے سے تم کو معلومات حاصل کرنے میں بڑی مدد ملے گی۔ اس لئے کالج میں داخل ہونے سے پہلے تم کو دو ایک مہینہ تک سیاحت کرنا چاہئے۔" چنانچہ آجو نے سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ اگرچہ اس کا دل وطن جانے کے لئے بہت تڑپ رہا تھا۔ آجو اپنے باپ سے ناراض تھا۔ یہاں تک کہ اُس نے دوران سفر میں اسے ایک بھی خط نہیں لکھا۔ لیکن قبل اس کے وہ اپنی سیاحت کو ختم کرتا اس کا روپیہ اور اسباب سفر میں کسی شخص نے چُرا لیا اور اس لئے اس کو مجبوراً اپنا سفر ختم کرنا پڑا۔ اور فونٹن پن فروخت کرکے راستہ کے لئے خرچ مہیا کیا۔ اور بمشکل کالج پہنچکر ہوسٹل میں رہنے لگا۔

لیکن بیپن کے ارادے کامیابی کی حد تک نہ پہنچ سکے۔ آجو کالج اور ہوسٹل کی سخت پابندی کے باوجود بھی غیر عملی ہی بنا رہا۔ اس نے محنت کرنا چھوڑ دی۔ اور کالج سے غیر حاضر رہنے لگا تھا۔ اُس نے اپنے کمرہ میں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ اور اپنا تمام وقت صرف کسی تصوّر و خیال میں بسر کرنے لگا۔ اس کے ساتھی اس کی ہنسی اُڑاتے اور فقرے کستے تھے۔ نیز اُنھوں نے اس بات کی خفیہ طور سے تحقیق کی۔ کہ اس کا

دل کس طرف مائل ہے۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس لئے انھوں نے اب اس کی طرف سے اپنی توجہ ہٹالی۔

آجو انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں فیل ہو گیا۔ اس کے باپ کو اس کا سخت صدمہ ہوا۔ اب اس نے آجو کو بمبئی سائنس پڑھنے کے لئے بھیجدیا۔ اور اس سختی سے ہدایت کی۔ کہ بغیر امتحان پاس کئے گھر واپس نہ آئے۔

ادھر سلتا کی یہ حالت تھی۔ کہ وہ تنہا ہونے کی وجہ سے بیپن کے کتبخانہ میں جاکر کتب بینی میں مشغول رہتی۔ اور جو وقت اس سے بچتا وہ باغ کی تفریح میں صرف کرتی۔ اب اس نے آجو کو خط لکھنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ کیونکہ بیپن نے اس کو منع کر دیا تھا۔ کہ تم آجو کے پاس زیادہ خط نہ بھیجا کرو۔ اب چونکہ سُلتا آجو کو مہینوں خط نہیں بھیجتی تھی۔ اس لئے آجو اس کے پُرانے خطوط ہی دیکھ کر دل بہلالیا کرتا تھا۔ اور جب دوسرا خط پہنچ جاتا۔ تو وہ اس کا جواب سوچنے میں لگ جاتا تھا۔ اور اس طرح سے اس کی نوجوان زندگی عبارت تھی۔ صرف سُلتا کے چند نقوش تحریر سے۔

چونکہ آجو کی پھوپھی بہت ضعیف ہو گئی تھی اس لئے اس نے یہ ارادہ کیا کہ میں اپنی باقیماندہ زندگی کو مقدس بنارس میں بسر کروں لیکن اپنے جانے سے پہلے وہ آجو کو دیکھنا چاہتی تھی بیپن نے پہلے تو اسکے بُلانے سے انکار کر دیا لیکن پھر اپنی بہن کی گریہ وزاری سے متاثر ہو کر اس نے آجو کو خط لکھا۔ کہ "چار پانچ روز کے لئے تم آجاؤ" اسی روز اس کو ایک خط سلتا کا بھی ملا۔ اس میں لکھا تھا کہ "چند ہی روز میں میری سالگرہ ہونے والی ہے۔ یعنی میں سولہ سال کی ہونے والی ہوں۔ اور سالگرہ کے دن سے میرا شمار بھی گھر کی خواتین میں ہونے لگیگا۔"

کلکتہ روانہ ہونے سے ایک روز قبل آجو تمام دُکانوں پر سُلتا کی سالگرہ کے واسطے کوئی تحفہ خریدنے کے لئے پھرتا رہا۔ لیکن چونکہ وہ نسوانی ذوق سے بالکل ناآشنا تھا۔ اس لئے وہ کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ آخرکار اس لے ایک دوست نے کہا "اس وقت تو بغیر کسی ہدیہ کے کلکتہ چلے جاؤ۔ میں اپنی بہن سے مشورہ کر کے بہت جلد تم کو کوئی چیز ڈاک کے ذریعہ سے بھیجدونگا۔"

اس مرتبہ آجو کو اسٹیشن سے گھر جاتے ہوئے سُلتا نہیں ملی۔ بلکہ گھر پر بھی اس کو نہیں دیکھ سکا۔ جس سے وہ سخت ملول تھا۔ اور سمجھتا تھا۔ کہ شاید وہ خفا ہو گئی ہے جب آجو کو اپنی پھوپھی سے چھٹکارا نصیب ہوا تو وہ سُلتا کی تلاش میں باہر آیا۔ اُس نے یہاں آکر دیکھا کہ وہ ایک پتھر پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اور اس کے چہرے سے

سنجیدگی ظاہر ہو رہی ہے۔ آجو جس کا لب ولہجہ شکوہ و شکایت سے بھرا ہوا تھا۔ بولا "ذرا ادھر دیکھنا کیا اگر تم مجھ سے ملنے آجاتیں تو کوئی گناہ تھا؟"

سلتا نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "کیا میں نے آپ سے کہا ہے کہ میں اسے جرم خیال کرتی ہوں۔ میں اس واسطے اسٹیشن پر نہیں گئی۔ کہ مجھے یقین تھا کبھی نہ کبھی تم سے ملاقات ہو ہی جائیگی۔"

سلتا کی اس قدر بے پروائی سے آجو کو سخت صدمہ ہوا اور کہا "اگر میں تم سے ملنا چاہوں تو مجھی کو تمہارے پاس آنا چاہیے۔ نہیں تو ۔ ۔ ۔ ۔؟" سلتا نے بڑی حقارت سے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ہمیشہ تمہاری وجہ سے کیوں بے چین رہتی ہوں۔ جب کہ تم مجھ سے ملنا اپنے مرتبہ سے کم خیال کرتے ہو"

یہ راز و نیاز جلد ختم ہو گیا۔ لیکن اس کے بعد بھی آجو محسوس کرتا تھا۔ کہ سلتا کی حالت اب وہ نہیں رہی۔ جو پہلے تھی۔ مگر اب اس کو سلتا سے بیحد محبت ہو گئی تھی۔ اس لئے اب وہ اس کی پچھلی باتوں پر زیادہ توجہ نہیں کرتا تھا۔

سلتا نے سالگرہ کے دن اپنی چند سہیلیوں کو بھی اس تقریب میں مدعو کیا تھا۔ جس سے گھر میں ہر طرف چہل پہل نظر آتی تھی۔ ہر چند آجو کی پھوپھی اس جشن سے ناخوش تھی۔ لیکن اس نے اس کا ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ آجو نے بھی اس رسم میں شریک ہونے کے لئے سلتا کی بہت خوشامد کی لیکن اُس نے منظور نہیں کیا۔

اس روز سلتا کچھ ناراض سی معلوم ہوتی تھی۔ اور جونہی اس کی سہیلیاں اپنے اپنے گھر چلی گئیں اس کا غصہ بھڑک اُٹھا۔ اور اُس نے پھر حسبِ عادت گھر میں ہر ایک سے لڑنا بھڑنا شروع کر دیا۔ یہانتک کہ کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا۔ اس حالت کو دیکھ کر آجو دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ سلتا کی سالگرہ کے روز مہمانوں نے اس کو کچھ تحائف پیش کئے تھے۔ وہ انہیں آجو کے سامنے اس قدر اہمیت دے رہی تھی۔ کہ اس کو سلتا کی برہمی کا اصلی سبب معلوم ہو گیا۔

آجو کی آمد کے کچھ روز بعد اس کو ایک وزنی پارسل ملا۔ جس کو حسبِ وعدہ اس کے دوست نے بمبئی سے روانہ کیا تھا۔ اگرچہ کسی قدر دیر ضرور ہو گئی تھی۔ آجو نے جلدی سے اس کے اُوپر کا کاغذ کھولا۔ جس کے اندر ایک خوبصورت صندل کی لکڑی کا صندوقچہ تھا۔ اس میں کانوں اور بالوں میں پہننے کے لئے کچھ سونے کے چھوٹے چھوٹے زیور تھے۔ اس وقت سلتا گھر میں نہیں تھی۔ بلکہ باغ میں گئی ہوئی تھی۔ آجو بھی مع صندوقچہ کے وہاں پہنچ گیا۔ اس نے

اس کو گلاب کی کیاری کی مٹی کو کھودتے ہوئے پایا۔ اس کے سامنے صندوقچہ رکھ کر کہا۔ "سلتا ہر چند وقت گذر گیا تاہم میں تم کو بھولا نہیں۔"

سلتا نے بغیر کسی دلچسپی کا اظہار کئے ہوئے کہا۔

"اس صندوقچہ کو یہاں رکھ دو۔"

اجو کو اپنے ہدایا کے ساتھ اسقدر نفرت آمیز سلوک دیکھ کر بہت رنج ہوا۔ اور دریافت کیا "کیا یہ چیزیں آپ کے دیکھنے کے لائق بھی نہیں ہیں۔ اور کیا یہ اُن تمام تحائف سے زیادہ حقیر ہیں جو تم کو نذر کئے گئے ہیں۔"

سلتا نے قصداً ان الفاظ کے معنی غلط سمجھے اور اپنے کام کو ادھورا چھوڑ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے بولی۔ "اچھا جناب اب بہتر یہی ہے کہ آپ اپنے بیش بہا تحائف واپس لے جائیں۔ میں ان کے لینے کے قابل نہیں ہوں۔" یہ کہکر وہ باغ سے فوراً بھاگ گئی۔ اور صندوقچہ وہیں پڑا رہا۔ اور اجو بھی بے حس و حرکت اپنی جگہ کھڑا رہا۔

اس کے بعد اجو کے حواس پھر اس وقت درست ہوئے کہ جب اس نے سلتا کو وہیں واپس آتے ہوئے دیکھا۔ اُس وقت تک اس کو یہ خبر نہ ہوئی۔ کہ اس جگہ پڑے ہوئے اُسے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ سلتا نہایت احتیاط سے منتشر زیورات کو زمین پر دوزانو ہو کر جمع کرنے لگی۔ اس کے بعد ان کو اجو کے پاس لائی۔ اور اپنا سر شرم سے نیچے جھکاتے ہوئے بولی "ان کو صندوقچہ میں رکھ دیجئے"

الغرض اس طرح یہ دونوں ہنستے روتے اپنی منزلِ محبت طے کر رہے تھے۔ کہ دفعتاً ایک کی کشتی منزلِ مقصود تک پہنچنے سے پہلے ہی غرق ہو گئی۔ یعنی سلتا چند ساعت کی تکلیف نزع برداشت کرنے کے بعد اس جہان سے رخصت ہو گئی۔

اجو سلتا کے مرنے سے دیوانہ سا ہو گیا۔ وہ چاروں طرف حسرت کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ اور سلتا کے غم میں دن دن بھر رویا کرتا تھا۔ سلتا نے نزع کے وقت اجو کا ہاتھ پکڑ کر آہستہ سے کہا تھا۔ کہ "میں تم سے جدا نہیں رہ سکتی کچھ عرصہ بعد پھر آؤنگی"

سلتا کی ماں اجو کی پھوپھی کے ساتھ بنارس چلی گئی اور اب اس بڑے سنسان گھر میں صرف اجو اور بیپن ہی رہ گئے۔

جب کچھ دن گذر گئے۔ تو بیپن نے اجو سے پوچھا۔ کہ "تم اپنی آئندہ زندگی میں کیا کرو گے۔"

اس نے جواب دیا۔ کہ "میں آبائی پیشہ اختیار کروں گا۔"

بیپن یہ جواب سنکر متحیر ہوا۔ اور کہا "کیا تم ٹھیکیداری

کرنا چاہتے ہو؟"

آجو نے جواب دیا۔ "جی ہاں"

بیپن نے کہا "تم اس کو کیوں ترجیح دیتے ہو۔ یونیورسٹی کی تعلیم کی تکمیل کیوں نہیں کرتے؟"

آجو نے جواب دیا۔ "مجھ کو روپیہ کی ضرورت ہے اگر میں نے کوئی ڈگری حاصل کر لی تو زیادہ سے زیادہ پروفیسری کی جگہ مل سکتی ہے"

بیپن نے پوچھا "آخر تم کو روپیہ کی اسقدر ضرورت کیوں ہے۔ تمہارے مصارف تو اس قدر زیادہ نہیں ہیں؟"

کچھ دیر تک آجو خاموش بیٹھا رہا۔ تب وہ بیپن سے مخاطب ہوا۔ "مجھ کو اتنا کما لینا چاہئے۔ کہ اگر سلتا کسی راجہ کے گھر میں جنم لے تو بھی میں اس کی شان کے لائق اس کے (شاہانہ) مصارف کا کفیل ہو سکوں۔ اور اس کو غربت کی تکلیف نہ برداشت کرنے دوں"

بیپن یہ سنکر تھوڑی دیر تک عالم حیرت میں اپنے لڑکے کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد وہ کچھ سوچکر رونے لگا۔ یہ پہلا موقعہ تھا۔ کہ آجو نے اپنے باپ کو روتے ہوئے دیکھا۔

(۲)

ایک عظیم الشان عمارت کلکتہ کے ایک شاہراہ عام پر ابھی تک قائم ہے۔ جس کی رونق دوبالا کرنے کے لئے وہاں ہر چیز موجود تھی۔ لیکن رہنے والوں کی تعداد کافی نہ تھی۔ اس مکان کا مالک آجو تھا۔ جو تنہا مع اپنے نوکروں کے رہتا تھا۔ اور صرف رات کو سونے یہاں آتا تھا۔ اور وہ دن بھر اپنے کاروبار میں مصروف رہتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ روزانہ جب وہ گھر میں آتا۔ تو پہلے تمام گھر میں اس غرض سے چکر لگاتا۔ کہ آیا کسی جگہ آرائش کی ضرورت تو نہیں ہے۔ اس کے دیکھنے کے بعد وہ دوسری منزل پر ایک چھوٹے سے کمرہ میں چلا جاتا۔ جہاں وہ رات بسر کرتا تھا۔ اس کمرہ میں کسی قسم کی زینت نہیں تھی۔ نہ تو بجلی کی روشنی تھی نہ بجلی کے پنکھے تھے۔ اور نہ فرنیچر تھا۔ البتہ اگر کمرہ ناز کر سکتا تھا تو صرف سلتا کی ایک تصویر پر جو دیوار پر لگی ہوئی تھی۔

آجو اب ضعیف ہو گیا تھا۔ اس کی خوابیدہ آنکھیں مثل باز کی آنکھوں کے چمکنے لگی تھیں۔ عمر کے آخری حصہ میں وہ ایک عملی آدمی ہو گیا تھا۔ اسکی زندگی کی فیروزمندی کا کافی ثبوت اس کی بے شمار گاڑیاں۔ اس کا مکان۔ اور بنک کی کتابیں تھیں۔ وہ لوگوں سے بھی بہت کم ملتا تھا۔ وہ بھی صرف اپنے کاروبار کی وجہ سے۔ بازار میں جب کوئی قیمتی فرنیچر یا تصویر فروخت ہونے کو آتی۔ تو آجو اس کو سب سے پہلے خرید لیتا تھا۔ اس کے

متعلق یہ بھی افواہ تھی۔ کہ وہ جواہرات کی جستجو میں بھی لگا رہتا ہے۔

کاروبار کے سلسلہ میں اس کی ملاقات بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ اس لئے اکثر اسے دعوتوں میں بھی شریک ہونا پڑتا تھا۔ حتے الامکان وہ دعوت سے بہت انکار کیا کرتا تھا۔ اگر مجبوراً کہیں جایا بھی کرتا تھا تو بہت جلد چلا آیا کرتا تھا۔

لیکن اس کا ایک اصول اور بھی تھا کہ جب کبھی اس کے کسی دوست کے ہاں لڑکی پیدا ہوتی تو وہ بغیر بلائے اس کے مکان پر اسے دیکھنے جاتا۔ اور ایک اشرفی دے آتا۔ لوگ اس کے اس عجیب و غریب خصلت کی نمائش کا ذکر کیا کرتے تھے۔ یہ دستور ہے کہ جب کسی شخص کے لڑکی ہوتی ہے تو اس کے والدین کو لڑکی ہونے کی تعزیت کی جاتی ہے لیکن آجو تہنیت پیش کرتا تھا طبقہ نازک میں وہ اپنی اس عادت کی وجہ سے بہت مشہور ہو گیا تھا۔

ایک روز شام کو جب چاروں طرف تاریکی اور اُداسی چھائی ہوئی تھی۔ آجو معمول سے پہلے گھر واپس آ گیا۔ اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی۔ اس کو چند روز سے زکام کی شکایت تھی۔ جس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ ایک فقیر کی لڑکی کے پیچھے (جس کی صورت سلتا سے مشابہ تھی) بارش میں مسلسل دو دن تک کلکتہ کے تمام گلی کوچوں میں پھرتا رہا تھا۔ آج گھر پہنچنے پر اس نے حسبِ عادت کسی چیز کی تلاش بھی نہیں کی۔ بلکہ سیدھا اپنی خوابگاہ میں چلا گیا اور اس کو بند کر لیا۔ تھکا ہوا زیادہ تھا اس لئے خاموش بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اور دیوار پر لگی ہوئی سُلتا کی تصویر سے مخاطب ہو کر بولا "تم کیوں نہیں بتلاتیں کہ تم کہاں ہو۔ کیا تم مجھ کو کچھ بھی پتہ نہیں بتا سکتیں۔ میں تلاش کر رہا ہوں۔ اور ہمیشہ اسی جستجو میں رہتا ہوں۔ خدا کے واسطے میری پیاری سُلتا بتلا دو کہ میں تم کو کہاں پا سکتا ہوں"۔

آجو کے آنے کے بعد ایک نوکر دبے پاؤں سے اس کمرہ کی طرف آیا۔ لیکن دروازہ کو بند دیکھ کر بغیر آواز دئے ہوئے واپس چلا آیا۔ اجو نے اس رات کچھ نہیں کھایا۔

دوسرے دن صبح کو ڈاکٹر آیا۔ اور ایک نسخہ لکھ کر اُسے تنگ و تاریک کمرہ سے دوسرے کشادہ کمرہ میں منتقل کر دیا۔ ڈاکٹر نے فوراً ایک تجربہ کار عیسائی نرس کو بھیجدیا۔ آجو کی بیماری بہت جلد مثل امیروں کی بیماری کے ہو گئی کلکتہ میں اُس کا کوئی بھی رشتہ دار تیمارداری کرنے کے لئے نہ تھا۔ البتہ اس کے احباب اس کو پوچھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ جو لوگ زیادہ متجسس تھے۔ وہ ڈاکٹر سے مریض کی حالت پوچھتے تھے۔ وہ جواب دیتا آہستہ سے کہا

سے آرام نہیں ہوتا۔ کیونکہ مریض بہت کمزور ہے۔ وہ ایک عرصہ دراز سے بیمار ہوگا۔ اس کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔

بیماری کی پہلی منزل میں آجو بالکل بیہوش تھا۔ اور اس کو کچھ خبر نہیں تھی۔ کہ اس کی مسہری کہاں منتقل کی گئی ہے۔ اور تیمارداری کے لئے کس کو مقرر کیا گیا ہے۔ لیکن جب اس کو ہوش آیا۔ تو وہ ہر ایک بات پر نکتہ چینی کرنے لگا۔ اور اس کا مزاج بہت چڑچڑا ہوگیا۔ اس کے لگا تار سوالات کرنے سے خدمتگار قریب قریب پاگل ہوگئے تھے۔ "وہ مجھ کو اس کمرہ میں کیوں لائے کس کے حکم سے یہ نرس داخل ہوئی۔ یہ میرے ملازم کس کام کے ہیں جب ان کی موجودگی میں نرس بلانے کی ضرورت ہوئی۔"

آجو ایک روز تک تو بالکل خاموش رہا لیکن اس کے بعد یکایک اس کو ایک نئے خبط نے گھیرا۔ وہ کسی عیسائی نرس کے ہاتھ سے دوا کا استعمال پسند نہیں کرتا تھا اس نے ضد کی کہ یا تو کوئی بنگالی نرس بھیجی جائے یا پھر اس کی تیمارداری اس کے نوکروں کے سپرد کی جائے چنانچہ ڈاکٹر نے دوسری نرس بھیجدی۔

شام کے وقت اجو کو کچھ یونہی بے چین سی نیند آئی تھی۔ کہ اس کی آنکھ دفعتاً ٹریم کے شور سے کھل گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ ایک نرم ہاتھ اس کی پیشانی اور سہان رکھا ہوا ہے۔ شام کی تاریکی کمرہ میں چھائی ہوئی تھی۔ اس نے اسی تاریکی میں ایک لڑکی کو اپنے سرہانے بیٹھے ہوئے دیکھا۔ جو سفید لباس پہنے ہوئے تھی۔ اس نے پوچھا۔ "کیا تم نئی نرس ہو۔"

اس نے نہایت نرم آواز سے جوابدیا۔ "جی ہاں"

اس رات آجو نے کھانا کھانے اور دوا پینے میں ضد نہیں کی۔ اس کو اس طرح تسکین ہوگئی جس طرح کہ ایک بچّہ کو اپنے حسب منشا کھلونے پانے سے ہو جاتی ہے لیکن جونہی اس نے کھانا ختم کیا۔ تو اس نے کہا۔ "تم روشنی کیوں نہیں کرتی ہو۔ مجھ کو اس اندھیرے سے نفرت ہے۔"

نرس کو حکم دیا گیا تھا کہ مریض کو خوش رکھنے کی حتی الامکان کوشش کرے۔ اس لئے اس نے فوراً روشنی کردی۔ جیسے ہی نرس واپس آکر مسہری کے سرہانے اپنی جگہ پر بیٹھی ویسے ہی مریض نے کہا "میرے سامنے آکر کھڑی ہوجاؤ میں تم کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

نرس فرمانبردارانہ طریقہ سے آکر اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اجو نے اس کو اچھی طرح دیکھنے کے لئے اپنا سر اٹھایا۔ وہ ایک دلکش لڑکی تھی۔ نازک اور حسین اس کے پرشباب چہرہ سے مایوسی ٹپک رہی تھی۔ چند منٹ تک اس کو غور سے دیکھنے کے بعد آجو نے کہا۔ "تم اب بیٹھ سکتی ہو۔"

جب وہ اپنی جگہ پر واپس چلی گئی۔ تو آجو نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

لڑکی نے جواب دیا "پورنیما"

نئی نرس نے بہت جلد مریض پر پورے طور سے اپنا اثر قائم کر لیا۔ اور اس کے مزاج میں بھی خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اب نہ تو وہ فرش پر زیادہ پیالیاں پھوڑتا تھا اور نہ دوا ناپنے کے گلاس نوکروں کو بھی اب ہر وقت کی جھڑکیوں سے چھٹکارا مل گیا تھا۔ اور ڈاکٹر کو بھی اپنے امیر مریض کے شکوہ و شکایت سے آزادی نصیب ہو گئی جب وہ سخت درد کی وجہ سے کروٹیں بدلتا اور کراہتا تو پورنیما کے آنے سے اور اس کا ہاتھ پیشانی پر رکھنے سے اس کو سکون ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ بہت خشمگین ہوتا تھا۔ اگر وہ ایک منٹ کے لئے بھی اس کی نظر کے سامنے سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ پورنیما نے اپنا کھانا بھی مریض کے کمرہ ہی میں کھانا شروع کر دیا۔

آجو کی پھوپھی بھی اس کی بیماری کا حال سنکر آ گئی۔ لیکن ناسپاس آجو اس کے دیکھنے کا بھی روادار نہ تھا جس نے اس کی پھوپھی کو نرس کی طرف سے بہت برہم کر دیا۔ کہ اس نے کیوں اس کے حق تیمار داری کو چھین لیا۔ وہ موقعہ کی منتظر تھی کہ اس کو بتلائے کہ تیرا مرتبہ کیا ہے۔ چنانچہ اس کو موقعہ بھی جلد مل گیا۔ ایک روز شام کو اس نے بیمار کے کمرہ میں جھانک کر دیکھا کہ آجو سو رہا ہے۔ اس نے نرس کو کمرہ سے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

ابھی اس نے اپنی تقریر کی تمہید ہی شروع کی تھی۔ کہ ایک غضبناک آواز نے پورنیما کو پکارا۔

پورنیما دوڑ کر کمرہ میں چلی گئی۔ جب وہ مسہری کے پاس پہنچی۔ تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینہ تک کھینچ لایا اس طرح پکڑے ہوئے اس نے اس سے تیزی سے پوچھا۔ کہ "تم وہاں کیا کر رہی تھیں"

کانپتی ہوئی لڑکی نے جواب دیا۔ "آپ کی پھوپھی نے بلایا تھا"

آجو نے پھر زور سے پوچھا "اور ڈاکٹر نے صبح تم سے کیا کہا تھا"

پورنیما کو اب گریز کا موقعہ نہیں تھا۔ اس نے جوابدیا۔ "ڈاکٹر نے مجھ کو آرام کرنیکا حکم دیا تھا"

آجو چلایا "تو کیا سب یہی مشورہ کر رہے ہیں۔ کہ تم کو مجھ سے جدا کر دیں۔ لیکن تم کو ہرگز نہیں جانے دونگا۔ یہاں تک کہ میں مر جاؤں اور جلا دیا جاؤں"

پورنیما کچھ نہ کہہ سکی۔ آجو نے اس کا بازو پکڑ کے زور سے ہلایا۔ اور کہا "کیا تم نے سنا کہ تم نہیں جا سکتی ہو"

پورنیما نے اپنے آپ کو آہستہ سے آجو کی گرفت سے چھڑا لیا۔ اور اپنی جگہ چلی گئی۔ تب اس نے آہستہ سے کہا

"نہیں میں نہیں جاؤنگی۔ جبتک کہ آپ مجھ کو جانیکی اجازت نہ دینگے۔ وہ اپنے نازک ہاتھوں سے اس کا سر دبانے لگی۔ اجو کو رفتہ رفتہ سکون ہوتا گیا لیکن وہ اس بات کو نہ دیکھ سکا۔ کہ اس کی نرس کے چہرہ پر آنسو بہ رہے تھے۔

اس کے بعد نہ تو ڈاکٹر کے احکام اور نہ اجو کی پھوپھی کے طعن و تشنیع اس کو آرام لینے پر راغب کر سکے۔ اس نے اپنی مدد کے لئے بھی کسی دوسری نرس کو نہیں بلایا۔ کچھ دن تو اس طرح مصیبت میں گذر گئے۔ اجو کو بھی اب روز بروز افاقہ ہونے لگا۔ یکایک اس کی حالت میں ایک غیر متوقع تغیر پیدا ہو گیا۔ اس نے گفتگو کرنا قطعاً بند کر دی۔ وہ مسہری پہ بالکل بیہوش پڑا رہتا۔ کبھی کبھی صرف اپنی آنکھیں کھول دیتا۔ اور پوربیا کو وحشیانہ نظروں سے دیکھنے لگتا تھا۔

ایک دن صبح کو یکایک وہ نیند سے بیدار ہوا۔ پوربیا کو آواز دی۔ تو جلدی سے اس کے پاس آگئی۔ اس نے کہا" دوسری منزل پر میرے کمرہ میں جاؤ۔ اور سلتا کی تصویر جو تم کو وہاں پر ملیگی لے آؤ۔

پوربیا اجو کو مضطرب نگاہوں سے دیکھتی ہوئی جلدی سے تصویر لینے چلی گئی۔ اور فوراً اس تصویر کو لاکر اجو کی مسہری کے پاس والی کرسی پر رکھ کر بولی۔ کہ" میں یہ تصویر لے آئی"

اجو نے چاروں طرف دیکھ کر اس تصویر کو اٹھایا اور اس کو دیکھنے لگا لیکن پھر فوراً ہی اس نے تصویر کو نیچے پھینکدیا اور پوربیا سے پُر حسرت لہجہ میں پوچھا" کیا تم جانتی ہو یہ کس کی تصویر ہے؟"

پوربیا نے جوابدیا" نہیں"

اجو نے اپنا ہاتھ بڑھا کر پوربیا کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اس کے چہرہ کو اپنے ہاتھوں میں پکڑ کر پوچھا" کیا تم مجھ کو جانتی ہو۔ میری ضعیفی پر خیال نہ کرو۔ اور اس وقت سے بیس برس قبل کی عمر پر غور کرو۔ بولو مجھ کو اب بھی پہچانتی ہو تم نے سنا؟"

پوربیا نے بھرّائی ہوئی آواز میں عرض کیا" جی نہیں"

اجو نے پوربیا کو مثل ایک دیوانہ آدمی کے دھکیل دیا۔ اور نہایت ترشروئی سے پوچھا" تب تم کون ہو۔ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میرے ساتھ فریب کیا۔ میری نظر سے دور ہو جا۔"

پوربیا بدقت تمام کمرہ سے باہر آگئی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔ جس سے دریافت کیا کہ" اجو کی حالت اب کیسی ہے؟"

ڈاکٹر نے ترش روئی کے ساتھ جواب دیا" اس کی زیست کی امید نہیں ہے۔ لیکن میں نے تمام مناسب ہدایتیں کر دی ہیں۔ اور ابھی جا کر دوسری نرس بھیجتا ہوں جو اس قسم کے مریض کی تیمارداری اچھی طرح جانتی ہے"

پوربیا ابھی تک گاڑی کے انتظار میں دروازہ ہی پر کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں روتے روتے سرخ ہو گئی

تھیں۔ بال چہرہ پر بکھرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر نے اس کو تسلّی دی۔ کہ بیمار آدمی بچّوں کی طرح ہوتے ہیں۔ ان کی بات کا خیال نہیں کرنا چاہئے۔"

پوربیا پھر مریض کے کمرہ میں بلائی گئی۔ اس وقت اجو کی حالت کچھ پُرسکون تھی۔ ہوش بھی آگیا تھا۔ اس نے اشرفیوں کا ایک توڑا پوربیا کو دیا۔ مگر اس نے منظور نہیں کیا۔ پوربیا نے کہا: "مجھ کو میرے حقوق ڈاکٹر سے مل گئے ہیں۔"

اجو اس کو تھوڑی دیر تک حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اپنا مُنہ پھیر لیا۔ اس نے کہا "فی الحال اس کو لے لو۔ تم نے میری خدمت بہت کی ہے۔ تم ضرور انعام کی مستحق ہو۔ اس توڑے کو قبول کر لو۔"

پوربیا کی آنکھیں یکایک چمکنے لگیں۔ اس نے توڑا پھینک دیا۔ اور یہ کہتی ہوئی کمرہ سے باہر آگئی:۔

"اس کو آپ ہی رکھیں۔"

اجو دیوانہ وار یہ کہتا ہوا دوڑا۔ "کیا یہ پوربیا تھی۔ کیا یہ چمکتی ہوئی آنکھیں اور یہ آواز واقعی اسی کی تھی؟" اس خیال کے ساتھ ہی اس کو وہ منظر یاد آگیا۔ جب باغ میں وہ سلتنا کے ساتھ کھیلا کرتا تھا۔

وہ مسہری سے کود پڑا اور سیدھا زینہ کی طرف سُلتنا۔ سُلتنا چلاتا ہوا دوڑا۔ "سلتنا میں نے تم کو پہچان لیا ہے۔ واپس آجاؤ۔ اب مجھ کو مت تڑپاؤ" لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

اُس نے اُترنا شروع کیا۔ جب وہ نیچے اُتر رہا تھا تو اس کو چکّر آنے لگے۔ اس لئے اُس نے وحشیانہ طریقہ سے زینہ کی منڈیر کو پکڑ لیا۔ اور بھاری آواز سے چلانے لگا۔ "سلتنا"

دوسری مرتبہ وہ سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے گر پڑا اور ایک غیر متحرک ڈھیر کی طرح وہیں پڑا رہا۔

× × × × × × × ×

× × × × × × × ×

ایک شاندار مکان ابھی تک مثل پہلے کے قائم ہے۔ لیکن ہر جگہ نئی نئی صورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ اجو کے تمام عزیز و اقارب اس کی بیماری کا حال سُن کر چاروں طرف سے آگئے ہیں۔ اور تمام گھر کی حالت بالکل بدل گئی ہے۔ سوائے دوسری منزل کے جہاں اجو اب بھی رہتا ہے۔ لیکن ساری دُنیا نے اس کے وجود کو بھلا دیا ہے۔

محمد مشہود فاروقی

سہارنپوری

~~~~~~~~
~~~~~~~~

مے قدیم

(۱)

نمیگرود جدا فکر سخن از طبع ناشادم　　مگر کردند از خاک زمین شعر بنیادم

دگر غیر از تماشائے بہار گلشن رو بست　　چہ کردم ملا سرنگ بوئے گل داند بربادم

سراپایم ندارو جز بہ پیچ وخم سرو کارے　　مگر گیسوئے پیچان ترا اے ترک ادم

چو طفل اشک پروردند در آغوش اندوہم　　زبیم پیر تعلیم و ز بند مکتب آزادم

تنگ ظرفی چوں من در عالم امکاں کجا باشد　　کہ تحریک نفس مانند نے آرد بفریادم

زہر موئے تن ناشاد من جوشد رم آہو　　زخاک کوچۂ شوخے مگر کردند بیشادم

چو طفل اشک دادندم ہمہ درس الم صولت
بجز بیتابی واز خود گذشتن نیست در یادم

(۲)

نقاب حسن فزاید رخ فرنگ ترا　　کند دو آتشہ مینا شراب رنگ ترا

دمے قرار نگیرد بکنج سینہ من　　مگر پر از رم آہو بود خدنگ ترا

بود جفائے تو خوشتر ز لطفہائے ددکون　　بصلح کل نفروشم ادائے جنگ ترا

چنانکہ می کشد آہن ربا مر آہن را　　دلم کشد طرف خویشتن خدنگ ترا

بسوئے غنچہ گل ننگرد گہے بلبل　　بحسرتے کہ بہ بینم قبائے تنگ ترا

خدنگ تو نہ ہمیں میکشد دلم بخودش　　دلم مدام بخود می کشد خدنگ ترا

زبس لطافت زیبندہ جلوہ است اے گل　　چو بوئے گل نتواں دید آب و رنگ ترا

وفائے صولت رضوی نگر کہ می گوید
بہ از ہزار گل باغ خلد سنگ ترا

قزاق

شلر کے ڈرامہ موسومہ رابرس سے ماخوذ — مؤلفہ جناب نور الٰہی و جناب محمد عمر

ارکانِ ڈرامہ

نواب جمشید جاہ ثالث والیِ ریاست جمشید آباد

شیر دل ولیعہد ریاست

اختر۔ نواب جمشید جاہ کا فرزندِ ثانی

جمیلہ۔ نواب جمشید جاہ کی بھتیجی

بہادر سنگھ، مان سنگھ، قاسم بیگ — قزاقان

منصور۔ قاصد

شہاب۔ اختر کا مشیر جمیلہ کا دلدادہ

دانیال۔ ملازم نواب جمشید جاہ

بادشاہ۔ شہنشاہِ ہند

قائم الدولہ۔ مدار المہام

ظہیر الدولہ۔ مشیرِ سلطنت

صمصام جنگ۔ سپہ سالار

مسرور۔ ندیم خاص

چند نوکر و ڈاکو . . .

مقام . . . . . . جمشید آباد سرحدِ اودھ

مدت . . . . . . دو سال اور چند مہینے

زمانہ . . . . . . عہدِ مغلیہ

سٹیج کے لئے وقت . . ۲½ گھنٹہ

پہلا باب

پہلا منظر

(نواب جمشید جاہ کے محل کا ایک کمرہ)

(جمشید جاہ اور اختر بیٹھے ہیں۔ جمشید جاہ اداس سا معلوم ہوتا ہے۔ وقت آٹھ بجے صبح)

اختر۔ ابا! آج دشمنوں کا چہرہ کیوں اترا ہوا ہے روئے انور پر غم والم کی گھٹا کیوں چھائی ہے۔ خدارا کیفیت مزاج سے مطلع فرمائیں۔ اگر نصیب اعدا طبیعت بے مزہ ہو۔ تو زبان پر لائیں۔

جمشید جاہ۔ بیٹا! خدا کا فضل شامل حال ہے میری طبیعت بالکل بحال ہے تمہارے بھائی کی تنہائی کا خیال آیا۔ اس لئے دل ذرا بےچین ہوگیا۔ کہو۔ ڈاک کا ہرکارہ کیا خبر لایا۔

اختر۔ حضور! مہیش رام نے خدمت قابل انعام کی۔ صبح دہلی میں گجر بجایا۔ اور یہاں پہنچکر شام کی۔

جمشید۔ پہلے یہ بتاؤ۔ شبیر دل اداس تو نہیں۔

اختر۔ بھائی جان کے متعلق کچھ عجیب سی خبر آئی ہے۔ میرے نزدیک کسی دشمن نے اڑائی ہے۔ صداقت کہتی ہے سچ کہو۔ مصلحت کہتی ہے چپ رہو۔ بھائی جان کی محبت اور آپ کی صحت کا خیال مانع تقریر ہے۔ یہ خبر . . . . .

جمشید جاہ۔ میری صحت کی طرف سے اطمینان رکھو۔ اور جلد کہو کہ پرچہ نویس کیا پرچہ لکھتا ہے۔

اختر۔ قبلہ نہ سنئے۔ جو کچھ میں نے سنا ہے نہ سنئے۔ اپنی وفادار رعایا پر کرم فرمائیے۔ اور یہ خبر سنکر اپنی جان کو روگ نہ لگائیے۔

جمشید۔ شبیر دل! تمہاری یہ نادانی اس ضعیف کے خرمن امید پر کیا بجلیاں گرائیگی۔ اور تمہاری جوانی کی ترنگ کیا رنگ لائیگی۔ بیٹا اس قدیمی خاندان کو بٹہ لگا بیٹھو گے لاکھ کی عزت خاک میں ملا بیٹھو گے۔ اختر! جذبۂ اخوت کو دباؤ۔ اپنے خاندان کے ناموس کا خیال کرو۔ اور تمام ماجرا صاف صاف کہہ سناؤ۔

اختر۔ گو مجھے بھائی جان کا ازحد خیال ہے۔ مگر حضور کے حکم سے سرتابی کروں۔ کیا مجال ہے۔ حضور جانتے ہیں کہ پرچہ نویس مسلمہ راست گفتار۔ ہمارے خاندان کا دیرینہ ملازم اور وفاشعار ہے۔ لکھتا ہے (جیب سے ایک کاغذ نکالتا ہے اور پڑھتا ہے)

"اگر میں نے تمام حالات تحریر کرنے کا وعدہ نہ کیا ہوتا تو یہ ماجرا نہ سناتا۔ آپ کے آئینہ دل کو ٹھیس نہ لگاتا۔ مگر کیا کروں سچ کہنے پر مجبور ہوں۔ آپ کے بھائی نے لچھوں

شہدوں میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ اپنے خاندان کو بدنام
کیا ہے۔ کل رات کی بات ہے کہ آنجناب نے چالیس
ہزار (۴۰۰۰۰) اشرفی اُڑائی۔ اور چمپت ہوئے۔ ابا...
جمشید۔ پڑھے جاؤ۔
اختر۔ اس سے پہلے آپ نے سربازار ایک شریف زادی
کی عصمت پر حملہ اور اُس کے شوہر پر تلوار کا وار کیا۔

(جمشید جاہ کے چہرہ پر مردنی سی چھا جاتی ہے)

ابا۔ ابا ....
جمشید۔ بس بیٹا۔ بس (ہاتھ سے اشارہ کرکے)
اختر۔ لوگ بگڑے بیٹھے ہیں۔ انتقام پر تلے بیٹھے ہیں
اشتہار گرفتاری جاری ہو چکا ہے۔ جمشید جاہ کے خاندان
کا نام ....

(کاغذ کو مسل کر پھینک دیتا ہے)

معاذ اللہ۔ سراپا جھوٹ۔ سراسر بہتان۔
جمشید (دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپتا ہے) آہ میرا
خاندان سے

تاراج نہ اس طرح سے ہو باغ کسی کا
اب مجھ کو دکھائے نہ کوئی داغ کسی کا (انیس)

اختر۔ نادان بھائی! باپ کی سفید ڈاڑھی کی بھی لاج
نہ آئی۔ افسوس میرا کہا نہ مانا۔ چھوٹے بھائی کی باتوں کو حقیر
جانا۔ آخر بھائی کا آئینہ دل چکنا چور کیا۔ باپ کے جگر میں
ناسور کیا۔
جمشید۔ اختر! افسوس ہے۔ کہ اس کی محبت نے مجھے
اندھا کر دیا۔ ہیرے اور کنکر میں تمیز نہ کر سکا۔ بیٹا اُس
نے گھاؤ لگایا ہے۔ تم مرہم کی پٹی چڑھاؤ۔ اس نے درد
دیا ہے۔ تم دوا بن جاؤ۔
اختر۔ یہ سر آپ کے قدموں پر نثار ہے۔ زمانہ خود بول
اُٹھیگا کہ اختر کس قدر فرمانبردار ہے۔ بڑے نے خانماں
برباد کیا۔ تو پروا نہیں۔ چھوٹا ان کھنڈرات پر نئی عمارتیں
کھڑی کریگا۔ جن کا کنگرہ بام فلک کی ہمسری کریگا۔
جمشید۔ جب وہ ننھا نادان تھا۔ میرے لئے سرمایۂ
راحت اور دل بہلانے کا سامان تھا۔ جس وقت دایہ
اُسے میرے پاس لاتی تھی۔ میرے دل کی کلی کھل جاتی
تھی۔ اُس کی پیاری پیاری باتیں سُنکر باغ باغ ہو
جاتا تھا۔ اور اپنی خوش نصیبی پر نازاں ہوتا تھا۔
اختر۔ "تھا" مگر اب وہ خوش نصیبی کا زمانہ عالم خواب
نکلا۔ دریائے الفت موج سراب نکلا۔ سرکار! اُس کی
یاد سود نہیں زیاں ہے۔ حضور کا دھیان کہاں ہے۔
یاد رکھئے۔ جب تک آپ شیر دل کو بھول نہ جائیں گے۔
راحت نہ پائیں گے۔
جمشید۔ وہ راحت جو اُسے بھول جانے سے ملے۔ سو
درد کا ایک درد ہے۔ کوئی باپ اپنے بیٹے کو بھول

جانے کبھی دُنیا میں ایسا ہُوا ہے ؟

اختر۔ حضور۔ لوگ اپنے مفاد کے لئے خدا کو بھول جاتے ہیں۔ اور آپ صرف ایک ناخلف بیٹے کو فراموش کرنے میں تامل فرماتے ہیں۔

جمشید۔ آہ ! میرا نورِ چشم !

اختر۔ قبلہ ! وہ نور کس کام کا جو وفورِ ضو سے آنکھ کو بے بصر کر دے۔ وہ دانت کس کام کا جو درد کے مارے زندگی دوبھر کر دے۔

جمشید۔ نالائق بیٹا ! مگر پھر بھی میرا بیٹا !

اختر۔ عالیجاہ ! وہ آپ کا بیٹا ہے۔ تو میرا بھی بھائی ہے مگر کیا کیا جائے۔ اب تو ننگ و ناموس پر آ بنی ہے۔

جمشید۔ اچھا میں خط کے ذریعہ اظہارِ نفرت کرونگا۔

اختر۔ بہت اچھا خیال ہے۔

جمشید۔ میں اُسے لکھونگا۔ مجھے اپنی شکل نہ دکھائے جبتک . . . . .

اختر۔ بجا ہے۔ مگر تحریر کا کام مجھے سپرد فرمائیں۔ ایسا نہ ہو کہ آپ زیادہ کھینچیں۔ اور وہ شیر بپھر جائے۔ کیوں نہ ایسا کیا جائے کہ سانپ بھی مرے۔ اور لاٹھی بھی ٹوٹنے نہ پائے۔ میں کچھ ڈراؤنگا۔ دھمکاؤنگا۔ کچھ محبتِ پدری کا یقین دلاؤنگا۔ اور دو چار باتیں اپنی طرف سے ملا کر وحشی کو رام کر دکھاؤنگا۔

جمشید۔ ماشاء اللہ ! کیا طبیعت پائی ہے۔ بیٹا ! تم نے تو میرے دل کی کہہ سُنائی ہے۔

اختر۔ حضور کوئی اندیشہ نہ کریں۔ اور جا کر آرام فرمائیں۔

(جمشید جاہ چلا جاتا ہے۔ اختر عالمِ خیال میں اسے مخاطب کر کے کہتا ہے)

بُڈھوں کو نسیان ہو جاتا ہے۔ مرنے کا دھیان تک نہیں آتا ہے۔ اس لئے نوجوانوں کا فرض ہے۔ کہ انہیں اُنگلی پکڑ کر لیجائیں۔ اور عدم آباد کا سیدھا راستہ دکھائیں۔ شیر دل عاق ہُوا۔ پُرانا حساب بیباق ہُوا۔ ابا اُس کے غم میں یا تو گھُل گھُل کر مر جائینگے۔ ورنہ کسی اور ترکیب سے ٹھکانے لگائے جائینگے۔ قدرت نے مجھ کو چھوٹا بیٹا بنایا۔ ملک و مال سے محروم کیا۔ تو کیا ہُوا۔ میں اپنی مدد آپ کرونگا۔ اپنی قسمت کا محل اپنے [illegible] خداوندانِ قضا و قدر نے مجھے دُنیا کے طوفانی [illegible] میں غرق ہونے کے لئے پھینکا ہے۔ میں تیر کر نکل جاؤنگا۔ ضمیر ! ضمیر وہی ہے جو میرے دل میں آئے۔ ایمان وہی ہے جو میری زبان سے نکل جائے۔ دین۔ ایمان۔ عزت۔ انسان جو میرے تخت کے آڑے آئیگا خاک میں ملا دیا جائیگا۔ اب جا کر سوتا فتنہ جگاؤں اور شیر دل کو وہ خط روانہ کروں جس کی ہر سطر خطِ تقدیر اور ہر لفظ صورتِ تدبیر ہو (چلا جاتا ہے)

پردہ

دوسرا منظر

(صبح۔ دہلی کے اور جمشید آباد کے ڈانڈے پر ایک باغ۔ شیر دل کتاب دیکھ رہا ہے۔ بہادر سنگھ شراب پی رہا ہے۔ شیر دل کا خط بنا ہوا ہے۔ صبح نو بجے کا وقت)

شیر دل۔ آج کل کی آرام طلب اور کاہل زندگی ہمیں دلفریب تباہی کے غار کی طرف لیجا رہی ہے۔ مگر کوئی خوابِ غفلت سے بیدار نہیں ہوتا۔ بادہ نوشین کا کوئی متوالا ہوشیار نہیں ہوتا۔ شاہنامہ اور مہابھارت میں جن جانبازوں کا ذکر ہے۔ اُن سے کوئی سبق نہیں لیتا قلم نے باتیں بنا کر آبِ شمشیر پر پانی پھیر دیا۔ ابرو اور غیرت کو ملیا میٹ کر دیا۔

بہادر۔ بھائی! وقت کی شہنائی بجاؤ تو کوئی سُنے۔ بے وقت کی راگنی پر کون سر دُھنے۔ شاہنامہ اور مہابھارت کی روائتیں مدت ہوئی نظروں سے اُتر گئیں۔ اب تو عشقیہ مضامین۔ غزل۔ واسوخت اور مثنوی کا وقت ہے۔

شیر دل۔ سچ ہے۔ زمانہ کا مذاق بگڑ گیا۔ علم و ہنر کی قدر گھٹ گئی۔ اب متملق اہلِ دربار ہیں۔ اور ماہرینِ فن بیکار ہیں۔ ایک پجاری جس نے کبھی لقمہ سے بھاری کوئی چیز نہیں اُٹھائی سکندرِ اعظم کی فتوحات کو رہزنی خیال کرتا ہے۔ اور ایک مدقوق مدرس اپنے شاگردوں کو ورزش کے گُر بتاتا ہے۔

بہادر۔ میں پھر کہونگا۔ کہ لیلیٰ مجنوں اور بہار دانش پڑھا کرو۔ اور خدا توفیق دے۔ تو گاہے گاہے پیا بھی کرو۔

ہم میں باقی نہیں اب خالدِ جانباز کا رنگ
دل پہ طاری ہے فقط حافظِ شیراز کا رنگ (اکبر)

شیر دل۔ مگر جانتے ہو۔ آجکل دُنیا کا کیا رنگ ہے۔ کسی کی چڑیا مر جاتی ہے۔ تو مرثیہ کہا جاتا ہے۔ اور کوئی انسان جان سے جائے۔ جس سے ترکہ ملنے کی امید ہو تو رتجگا منایا جاتا ہے۔

بہادر۔ سمجھا۔ خوب سمجھا۔ تمہارا ارادہ ہے۔ کہ کہیں ڈاکہ ڈالا جائے۔ روپیہ اُڑا کر رام رنگی کی بھینٹ چڑھایا جائے اور رنگیلے بادشاہ کی رُوح کو ثواب پہنچایا جائے۔

شیر دل۔ توبہ۔ توبہ۔ ایسی باتیں میرے وہم و گمان میں بھی نہیں۔ جو شخص قانون شکنی کرے۔ میرے نزدیک انسان ہی نہیں۔ میں اُس قانون کے آگے سرِ نیاز خم کرونگا۔ جو امیر و فقیر کو ایک آنکھ دیکھے جس کے میزانِ عدل میں جاہ و ثروت جگہ نہ پائے۔ دُودھ کا دودھ پانی کا پانی ہو جائے۔ میں اس قانون کو سر آنکھوں پر رکھونگا۔ جو خودداری کا معین ہو۔ نہ کہ بے حمیت بنانے کی مشین ہو۔ میں اس قانون کی پرستش کرونگا۔ جو جذبہ راست گفتاری کو اُبھارے۔

لیکن اُس قانون کو دور ہی سے سلام کرونگا جو سچ بات کہنے والے کے منہ پر قفل ڈالے۔

بہادر۔ شیر دل تمہارے جیب شخص جس نے مظلوموں کی حمایت کی اور اس لئے قانون کی پناہ سے محروم کیا گیا۔ اُس عالم سے اچھا ہے جس نے سلطنوں پر جزیہ لگانے کا قانون بنا کر انعام پایا۔ اور اس روپے سے جج کا نواب خرید لے گیا۔ یاد ہے وہ دن جب نواب فیروز جنگ کے بیٹے کے ہاتھ سے ؎

عصمتیں نالاں تھیں نمانونانِ عفت کیش کی
چادریں تھیں چاک مستورات سینہ ریش کی
خلق پر ناقابلِ برداشت جب ہر جور تھا
عہدِ نوابی تھا یا چنگیز خانی دور تھا
ہو رہی تھی ظلم کی بارش زمیں کے فرش پر
رو رہی تھی بیکسوں کی آہ جا کر عرش پر

شیر دل۔ آہ دنیا ـ بے غیرت دنیا۔

بہادر۔ نواب کے رعب سے کوئی لب تک نہ ہلاتا تھا ہر شخص سہما جاتا تھا۔ یکایک تم نے تلوار سنبھالی۔ اور تمہارے دیکھا دیکھی ہم نے بھی تیغ نیام سے نکالی نتیجہ یہ ہوا۔ کہ بزدل نواب زادہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔

شیر دل۔ آج کیا دل میں سمائی ہے۔ بہادر! یہ تو سراسر خودستائی ہے۔

بہادر۔ بس اب باتیں نہ بناؤ۔ اور خدا کا نام لے کر میدانِ عمل میں اتر آؤ۔

شیر دل۔ یعنے۔

بہادر۔ یعنے بیکسوں کی حمایت کا بیڑا اُٹھاؤ۔ ظالموں کو ظلم کا مزا چکھاؤ۔ امیروں کی وہ دولت چھین لو۔ جو محض ان کے خزانہ کا سنگھار ہے۔ اور اُن محتاجوں کو دے دو۔ جنہیں زندگی بسر کرنا دشوار ہے ؎

خوش ہیں غریب اپنے ان جھونپڑوں کے اندر
جو دھوپ کی تپش سے دوزخ کی بھٹیاں ہیں
شاکی ہیں اہلِ دولت حالانکہ ان کے گھر میں
پنکھا بھی کھنچ رہا ہے اور خس کی ٹٹیاں ہیں
(اسمٰعیل)

شیر دل۔ یہ مشکل کام اور مجھ سا بے سر و سامان۔

بہادر۔ کیا کہا۔ مشکل؟ مشکل تو شمشیرِ ہمت کی فسان ہے۔ مشکل پیش آنے سے جو ڈرے۔ وہ بزدل انسان مصافِ ہستی کی رموز سے ناواقف ہے۔ نادان ہے۔ اب باتیں نہ بناؤ ہاتھ پاؤں ہلاؤ۔ کسی غریب کا دل چیر کر دیکھو۔ تو تمہیں معلوم ہو۔ کہ دفترِ مصیبت میں ایک نقطہ کی بھی گنجائش نہیں ؎

مظلوم ہے باعثِ نفسِ سرد کا پوچھو
گر پوچھو تو بسمل سے مزا درد کا پوچھو (انیس)

شیردل۔ مظلوموں سے ہمدردی میرا ایمان ہے جس دل میں یہ تڑپ نہ ہو۔ وہ مُردہ ہے۔ بے جان ہے خیر اس وقت یہ باتیں جانے دو۔ اور سُنو۔ ایک ہفتہ ہُوا میں نے ابّا جان کو ایک معذرت نامہ لکھا تھا۔ اس لئے مجھے ہر وقت اس کے جواب کا انتظار ہے۔

(قاسم اور مان سنگھ گھبرائے ہُوئے داخل ہوتے ہیں)

مان سنگھ۔ بھائیو۔ ہمارا راز طشت از بام ہوگیا اب وقت کا ہر ایک لمحہ اپنی رفتار کے ساتھ ہمارے زندان کو نزدیک سے نزدیک تر کرتا جاتا ہے۔

شیردل۔ آخر اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ ہاں یہ تو بتاؤ منصور سے ملے ہو؟

مان سنگھ۔ وہ آپ ہی کی تلاش میں ہے۔ پہنچا ہی سمجھئے۔

(شیردل جانا چاہتا ہے مان سنگھ روکتا ہے)

ٹھیریئے آپ ناحق پریشان ہو رہے ہیں۔

شیردل۔ مَیں اور پریشان! میرے لئے تو آج روزِ عید ہے۔ قبلہ و کعبہ کی یہ چٹھی قصرِ مسرت کی کلید ہے۔

(منصور آتا ہے۔ شیردل اُس کی طرف بڑھتا ہے)

شیر۔ بھائی! بھائی! چٹھی!!

(منصور لفافہ دیتا ہے۔ شیردل جلدی سے کھولتا ہے)

(کانپ کر) میرے بھائی کے قلم سے۔

(شیردل خط پڑھتا ہے۔ اور خاموش کھڑا رہتا ہے۔ بہادر سنگھ قلا بازیاں لگاتا اچھلتا کودتا ہے)

منصور۔ ہیں؟ بہادر سنگھ کو کیا ہوگیا۔

قاسم۔ کہیں اس کا دماغ تو نہیں چل گیا۔

مان سنگھ۔ بہادر سنگھ۔ بہادر سنگھ! ابلو وہ تو کان ہی نہیں دھرتا۔

قاسم (بہادر سنگھ کا بازو پکڑ کر ہلاتا ہے) دوست! کیا شعر کہہ رہے ہو۔ (بہادر سنگھ ٹیٹوا دباتا ہے اور اُسے دھکا دے کر پرے پھینکتا ہے۔ شیردل چٹھی کو مسل کر پھینکدیتا ہے تمام چونک اُٹھتے ہیں۔ منصور بھی شیردل کے پیچھے چلا جاتا ہے)

مان سنگھ۔ شیردل کہاں گیا؟

قاسم۔ اور کیوں گیا؟

بہادر (چٹھی کی طرف اشارہ کرکے) سب راز اس چٹھی میں ہے اسے پڑھو گے تو یہ عقدہ آپ سے آپ حل ہو جائیگا۔

مان سنگھ (چٹھی اُٹھا کر پڑھتا ہے) "ناشاد بھائی" بسم اللہ ہی غلط۔ "مَیں مختصر الفاظ میں آپ کو مطلع کرتا ہوں کہ حصولِ معافی کی امید محض خیالِ خام ہے۔ ابّا جان کی طرف سے آپ کے عریضہ کا یہی جواب ہے۔ کہ آپ اپنے ہاتھوں خواہ جہنم کو جاؤ۔ مگر اُنہیں بھول کر بھی چہرہ نہ دکھاؤ۔

کانٹوں میں نہ ہو اگر اُلجھنا
تھوڑا لکھا بہت سمجھنا (نسیم)

کمال محبت سے ختم کرتا ہوں۔ اور اپنی خلوص اور عقیدت کا یقین دلاتا ہوں۔

"انقضا ختم"

قاسم - واہ - بھائی کیا ہے۔ محبت کا خزانہ - اخوت کی کان ہے۔ لوگ یوسفؑ کے بھائیوں کو کوستے ہیں۔ مگر یہ تو ان کا بھی چچا جان ہے۔

مان سنگھ - یہ تو ہوا۔ مگر بہت بڑھ گئی۔ اب کریں تو کیا کریں۔

بہادر سنگھ - اندیشہ بے سود۔ فکر بیکار ہے۔ شبیر دل کا بھائی نہ سہی۔ باپ نہ سہی مگر پروردگار ہے۔

(شبیر دل آتا ہے)

شبیر دل - ہاں - ہاں - میرا پروردگار ہے۔ اور یہ عاصی اسی کی رحمت کا طلبگار ہے۔

بہادر - دوستو - ذرا ہمت کرو۔ تو بیڑا پار ہے۔ اگر تمہاری منقل شجاعت میں کوئی چنگاری باقی ہے (تلوار کھینچکر) تو آؤ اپنی تلواروں کو میری قوت بازو بناؤ۔ اور دنیا کو دکھادو۔ کہ ایک اور ایک مل کر کس طرح گیارہ ہوتے ہیں ہم قزاقوں کا لشکر تیار کرینگے۔ اور تمام ستمگروں کو فی النار کریں گے۔ ہیں تم میرا منہ کیا تکتے ہو۔ کیا تمہاری شجاعت کی بندوق ابھی سے انجک چاٹ گئی۔ شجاعت! اللہ میاں کی سب سے اعلیٰ خصلت اور افسوس اس سے یہ نفرت

شبیر دل - نہیں مجھے نفرت تو نہیں۔ مگر میں اسے بے سود ضرور خیال کرتا ہوں۔

مان سنگھ - یہ اس لئے کہ آپ کو کبھی اس کی ضرورت نہیں پڑی۔

قاسم - دلی اور آگرہ کی سیر کرو۔ تو معلوم ہو۔ کہ اس جذبہ کی موت نے سب کو جیتے جاگتے - چلتے پھرتے مردے بنا دیا ہے۔

بہادر - حضرت وہاں قابل احترام کی عزت کرنیوالا - گولی مار دیا جاتا ہے۔ اور بیوقوف کا مدح سرا ملک الشعرا کا خطاب پاتا ہے۔ قدرت کو مجھ سے ضرور کوئی بڑا کام لینا ہے۔ جو میں ہر کام میں ناکام رہا۔ ٹھیرو! بہادر تمہیں بتائیگا کہ تالے کیسے ٹوٹتے ہیں۔ اور خزانے کیسے لٹتے ہیں۔

شبیر دل - اوہو - تمہاری امنگیں تو بہت بڑھ گئیں۔ مگر یہ بھول گئے۔ کہ مجھے دنیا کی چاہ نہیں۔ دولت و حشمت کی پروا نہیں۔

بہادر - میں بھی روپیہ کو ہاتھ کا میل سمجھتا ہوں۔ ہاں عزت کا بھوکا ضرور ہوں۔ میرا تو یہ دھرم ہے کہ مال جاتے جان جاتے۔ مگر آن نہ جاتے۔

شبیر دل - میں یہ سنکر بہت مسرور ہوا۔ شکر ہے کہ ایک بہت بڑا شک میرے دل سے دور ہوا۔ مگر بھائی تم حکومت

کا شیرازہ بکھیرنے اور قانون شکنی کے درپے تو ہو۔
بہادر۔ ہرگز نہیں۔ مجھے بادشاہ سے کوئی پرخاش نہیں
مَیں جہاں پناہ کے لئے ہر وقت جان و مال قربان کرنے
کے لئے تیار ہوں۔ مگر اُن سرداروں اور امیروں کے خون کا
پیاسا ہوں۔ جو حکومت کی آڑ میں غریبوں کا شکار کرتے ہیں
صاحب! ہم راجپوت ہیں۔ گھوڑوں کی پرستش کرتے ہیں
تلوار کو پوجتے ہیں۔ بادشاہ کو ایشور کا سروپ مانتے ہیں
اور اُس سے دغا کرنا مہا پاپ جانتے ہیں ؎

ہم وہ نہیں کرتے جو زمانہ کا چلن ہے
دنیا میں وفا اپنے گھرانے کا چلن ہے

(انیس)

شیر دل۔ اگر یہ بات ہے۔ تو شیر دل تمہارے لئے
جینے مرنے کے لئے تیار ہے۔
(سب تلواروں کی نوکیں جوڑ کر محراب بناتے ہیں شیر دل
اُس کے نیچے کھڑا ہوتا ہے)

پردہ

صدائے سروش

(۲)

غلبۂ کفر سے دل کیوں ہے پریشاں تیرا — غم نہ کھا تو کہ خدا خود ہے نگہباں تیرا
اک زمانے کو کیا جس سے مسخّر تُو نے — کیا ہوا آج وہ غافل سروساماں تیرا
اپنی ہستی کو نہ کر صرف نمودِ باطل — وقف گلچیں کے لئے کب ہے گلستاں تیرا
آئینہ داریِ کاشانۂ ہستی تجھ سے — مطلعِ صبحِ ازل چاک گریباں تیرا
شوقِ راحت طلبی۔ ذوقِ تن آسانی سے — زندہ در گور ہے ہر بلبلِ بستاں تیرا
ہر گل و برگِ چمن حلقۂ دامِ صیّاد! — کم نہیں گوشۂ زنداں سے گلستاں تیرا
ایک بجلی تھی کبھی آہ شرر بار تری — ایک طوفاں تھا کبھی دیدۂ گریاں تیرا
حسرتِ بادیہ پیمائی مقصد معلوم — صورتِ گوشۂ داماں ہے بیاباں تیرا
کیوں نہ ہو منزلِ مقصد پہ رسائی مشکل — کارواں راہ میں ہے بے سروساماں تیرا
اب بھی منظور ہو گر طرزِ وفائے اسلاف — شاہدِ بخت ہے پھر بندۂ فرماں تیرا
واقفِ نغمہ ہو ہر تارِ ربابِ ہستی — پیر گردوں کو نہ کھا پھر وہ شبابِ ہستی

باقی

عورت

عورت مرد کی زندگی کا جزو لاینفک ہے اور فطرتاً وجود انسانی کا بہترین نصف ہے۔ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیئے ہیں۔ جس طرح پہیوں کے بغیر گاڑی نہیں چل سکتی۔ اسی طرح مرد اور عورت کے ملاپ کے بغیر مکمل انسان نہیں بن سکتا۔ زندگی کے تمام شعبے حیات انسانی کی تمام حالتیں، ہمارے تخیلات اور حسیات غرضیکہ ذرہ ذرہ سے قدرت کی اس نازک مخلوق کا ایک مستحکم رشتہ قائم ہے۔ جو اگر ٹوٹ جائے تو ہماری ہستیوں کو بیکار کر دے۔ ہماری زندگیوں پر ایک ایسا غبار حسرت برسا دے۔ جو نہ ہمارے آب تمدن کے دھونے دھل سکے۔ اور نہ ہماری عقل کے ہٹائے ہٹ سکے۔

کیمبل کا قول ہے۔

"جبتک آدمؑ کی شادی نہ ہوئی گلزارِ عدن (جنّت) پرخار ہی رہا۔ فرشتوں کے گیت، پرندوں کے چہچہے، پھولوں کے قہقہے، باد بہاری کے جھونکے سب پھیکے نظر آتے تھے۔ مگر جب حوّاؑ آئی تو سب دکھ درد کافور ہو گیا۔"

عورت بہترین نازش کائنات اور گرانبہا سے موجودات آفرینش ہے۔ جو نازک نازک پھولوں اور لطیف لطیف خوشبوؤں سے مرکب ہے۔ اگر عورت نہ ہوتی تو اس آباد جگہ آلام ہیں، اس دار کوالف، ہیں اور ہماری صعوبتوں بھری زندگی میں اطمینان کا ایک ذرّہ نہ ہوتا۔ ہماری تاریک رُوحیں ایسی تاریک ہوتیں کہ اُن میں کبھی بھول کر بھی شعاع مسرت کا گذر نہ ہوتا۔

اوٹ وے کا قول ہے:-

"اے عورت! قدرت نے تجھے مرد کو ٹھیک کرنے کے لئے بنایا۔ تجھ بن اگر ہم ہوتے بھی تو وحشی ہوتے، بہشت میں کیا ہے جو ہم تجھ میں نہیں پاتے۔ اعجاز نمائی پاکیزگی، صداقت، ازلی راحت اور ابدی محبّت سب کچھ تجھ میں موجود ہے۔"

عورت قدرت کی صنعت کا اعلےٰ نمونہ ہے۔ دُنیا کی تینوں نعمتیں (نیکی۔ مسرت اور دولت) عورت ہی کے سبب سے حاصل ہوتی ہیں۔

زمرمن کا قول ہے۔

اے عورت! تیرے اثر سے ہمارے دل کی سوئی ہوئی طاقتیں جاگ اُٹھتی ہیں۔ اور دِل پاکیزہ خیالات سے بھرپور ہوجاتا ہے۔ تیرے تبسّم سے ہمارے حوصلے بڑھتے ہیں۔ اور تیری امداد سے کامیابی کی امید بندھ جاتی ہے علوہمتی اور اولوالعزمی رُوح میں بھر جاتی ہے۔ اور تیری

ہی بدولت ہم نیک کام کرنے پر کمربستہ ہو جاتے ہیں"

عورت کی عفت، عصمت۔ پاکدامنی۔ پاکیزگی، شرم و حیا یہی ایک خاصہ ہے۔ جو عورت کی عزت، حرمت دنیا میں قائم کرتا ہے۔ یہی ایک اعلےٰ وصف ہے۔ جو عورتوں کی تمام کمزوریوں کا جواب اور فروگذاشتوں کا قیمتی بدل ہے یہی ایک تعریف ہے۔ جو مردوں میں عورت کا جبروت قائم کراتی ہے۔ ایک پاکدامن عورت رتبہ میں کیسی ہی ذلیل اور حقیر ہو۔ ایک پاکیزہ منش عورت اگرچہ ثروت اور برکت کے اعتبار سے کیسی ہی پست حالت میں ہو۔ مگر اس دولت اور عفت کی بدولت اس خاندانی اور خوبصورت تعلیم یافتہ عورت سے ہزار کیا لاکھ درجہ قابلِ فخر قابلِ عزت قابلِ احترام قابلِ اکرام ہے۔ جو باوجود اسقدر مراتب ظاہری اور فضائلِ زینی کے حرمت اور اعزازِ عصمت سے دور اور محروم ہے۔

منلیسجر کا قول ہے:۔

پارسا عورت کی آواز کیسی شیریں اور دلربا ہوتی ہے وہ اسقدر کم بولتی ہے۔ کہ جب کبھی اُس کی آواز نکلتی ہے تو سب لوگ وجد میں آجاتے ہیں۔

ایک اور مصنف سٹیبنگ کا قول ہے۔

"عبادت و پارسائی سے عورت کی طاقت کی انتہا نہیں۔ اُس کا حسن اور صداقت از خود ایک طاقت ہے۔ مگر جس وقت غم و رنج سے پریشان ہو کر عورت خدا کی طرف جھکتی ہے۔ اُس میں ایک ایسی صداقت آجاتی ہے جس کا مقابلہ دُنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی۔

واشنگٹن آرونگ اپنی کتاب میں عورت کے متعلق لکھتا ہے۔

"جب درخت کھڑا ہوتا ہے۔ انگور کی بیل اس کے سہارے روشنی کا حظ اُٹھاتی اور دھوپ سینکتی ہے۔ جب درخت پر بجلی گرتی ہے۔ تو بھی اُس کے گرد لپٹی رہتی ہے۔ اور آس پاس کے پاش پاش شدہ تنے سمیٹ لیتی ہے۔ اسی طرح عورت عالم آسودگی میں مرد کیساتھ خوشی مناتی ہے۔ اور جب اس پر مصیبت کی بجلی گرتی ہے۔ تو اپنی محبت اور پیار کی نازک بیلیں اس کے گرد لپیٹتی ہے۔ اس کے جھکے ہوئے سر کو اُٹھاتی اور پاش پاش شدہ دل کو ڈھارس دیتی ہے"۔

ملٹن کا قول ہے:۔

"جب میں عورت کی پیاری پیاری شکل دیکھتا ہوں تو وہ مجھے ایسی کامل اور خود شناس معلوم ہوتی ہے کہ وہ جو کچھ کہتی یا کرتی ہے۔ نہایت مناسب عقلمندی اور دور اندیشی پر مبنی اور نیکی کا مجموعہ ہوتا ہے۔ اعلےٰ سے اعلےٰ اُس کے مقابلہ میں ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ ہوشیار سے ہوشیار شخص عورت سے باتیں کرتے وقت اپنا سا منہ

لیکر رہ جاتے ہیں۔ اور سادہ لوح معلوم ہوتے ہیں۔ عقل و رعب اس کے نوکر نظر آتے ہیں۔ غرضیکہ اُس کا دِل عظمت اور شرافت کا گھر ہے۔ اور اس کی نگاہوں سے وہ رُعب ٹپکتا ہے گویا فرشتے اُس کی جلو میں چل رہے ہیں۔"

طامس مور کا قول ہے۔

اے عورت! تو صبح کا ہیرا اور رات کا تارا ہے تو شبنم کا قطرہ ہے جس سے کانٹے کا منہ بھی موتیوں سے بھر جاتا ہے۔ وہ رات تاریک اور وہ دن پھیکا معلوم ہوتا ہے جبکہ تیری آنکھ کے نور سے جسم میں ٹھنڈک نہیں پڑتی خارِ غم دل کے پار ہو جاتا ہے۔ اور زخمِ دل سوائے تیرے شیریں لبوں کے اچھا نہیں ہوتا۔"

شیکسپیر کہتا ہے۔

"عورت کا دِل ایک بہترین چیز ہے۔"

غرضیکہ اس وادیٔ حیات میں عورت سے زیادہ کوئی دلکش شے نہیں۔ اور اس کی خالص محبت کی ندی کا منبع بہشت میں ہے۔

افتخار الرسول بدر

غزل

جہاں کیوں تنگ ہے میری نظر میں
سمائی ہے یہ کیا شوریدہ سر میں

کرینگے جاکے ویرانے میں کیا ہم
جو ویرانی ہو خود اپنے ہی گھر میں

بُری لگتی تو ہے گو تلخیٔ عشق!
مزا بھی ہے مگر دردِ جگر میں

بُجھادی یاس نے وہ گرمیٔ شوق
تپش باقی نہیں دل کے شرر میں

کٹیگی کس طرح یہ عمر بے حس
سماں حسرت کا ہے شام و سحر میں

محمد شریف شرقی

تالاب

ایک جنگل میں ایک نہایت خوبصورت قدرتی تالاب واقع تھا۔ جو چاروں طرف سے خوشنما اور سبز درختوں سے اس طرح گھرا ہوا تھا۔ کہ ان کے سائے سے پانی بھی سبز نظر آتا تھا۔ چشموں کا سرد اور صاف شفاف پانی اس کو ہمیشہ سیراب کرتا رہتا تھا۔ اس وقت اس کے کنارے پر اس قسم کی خاموشی طاری تھی۔ کہ سوئی کے گرنے تک کی آواز بھی سُنائی دے سکتی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کوئی پرندہ اپنے میٹھے اور دل آویز راگ سے اس سنسان خاموشی کو توڑ دیتا تھا۔ یکایک انسان کے پاؤں کی آہٹ نے اس مقام میں چہل پہل پیدا کر دی اور تھوڑی ہی میں ایک نوجوان اور ایک خوبصورت لڑکی درختوں کے جھنڈ سے برآمد ہوئی۔ اور پانی کے کنارے کے قریب آگئی۔

نوجوان نے پوچھا "کیا تم نے اسی تالاب کا ذکر کیا تھا آہا کتنا اچھا مقام اور کیسا سہانا سماں ہے۔ اگر میں اس سبز ہی مائل پانی کا نقشہ پردۂ تصویر پر اُتار لوں تو بڑا ہی لطف ہو" یہ کہہ کر اس نے اپنا بستہ کھولا۔ جس میں سامانِ نقاشی تھا۔ لڑکی ایک گرے ہوئے درخت کے تنے پر بیٹھ گئی۔ اور اس کی نقاشی کے جوہر دیکھنے لگی۔ اس وقت سورج کی شعاعیں اس کے لمبے سیاہ بالوں اور سبز لباس پر گر کر عجب قوس و قزح کا سا منظر پیدا کر رہی تھیں۔ مصوّر اپنے جذبات ضبط نہ کر سکا اور کہہ اٹھا۔ "آج تو تم ایک ایسی حورِ صحرا معلوم ہوتی ہو جو کسی شاعر کے تخیّل نے کسی سنسان وادی میں پیدا کر دی ہو۔ فرق صرف اتنا ہے کہ تم حقیقی ہو۔ اور وہ خیالی تم انسان ہو اور وہ وہم! تم رُوح ہو اور وہ چھلاوا!"

لڑکی نے سنجیدگی سے کہا۔ "رُوح کے بغیر انسان کی زندگی میں کچھ لطف نہیں" پھر اُس نے ایک گہری نظر سے تالاب کی طرف دیکھا۔ اور سرگوشی کی آواز میں زیر لب کہا۔ "شاید وہ بھی اس کو سمجھتا ہو"

مصوّر نے گھبراہٹ سے پوچھا۔ "یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟"

لڑکی نے اپنی نازک اُنگلی سے پانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ "میں اس شخص کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جس نے اس تالاب میں خودکشی کر لی تھی۔ اور لوگ کہتے ہیں کہ جب سے وہ مرا سورج کی روشنی کبھی پانی پر [illegible] دیکھی گئی۔ اس وقت بھی دیکھ لو۔ کہ کرنیں میرے بالوں سے اٹکھیلیاں کر رہی ہیں۔ لیکن پانی تک نہیں پہنچ سکتیں۔"

مصور نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اوہ یہ بیہودہ کہانیاں ہیں۔ لیکن بتاؤ یہ [illegible] کہ وہ اس تھوڑے سے پانی میں کیوں اور کس طرح ڈوب مرا۔"

لڑکی بولی۔ "کیونکہ اس کی محبوبہ نے اس سے بیوفائی کی تھی۔"

مصور۔ "اوہو کتنی عجیب بات ہے۔"

لڑکی نے کہا۔ "اور چونکہ اس شخص نے خودکشی کرلی تھی۔ اس لئے اس کی روح ہمیشہ کے لئے بھٹکتی پھرے گی اور ابدالاباد تک [illegible] رہیگی۔ مجھے ابا جان نے یہ تمام باتیں بتائی ہیں۔"

مصور نے ایک قہقہہ لگایا اور کہنے لگا۔ "تمہارا باپ مذہب کا بہت پابند ہے۔ وہ تم سے ایسی ہی باتیں کہتا ہے۔ لیکن تمہیں کیا پڑی ہے۔ کہ اس کی روح پر بیفائدہ سوچ سوچ کر اپنے خیال کو تھکا رہی ہو۔ میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ اب بھی یہیں کہیں تالاب کے کسی گوشہ میں چھپی ہوئی ہوگی۔"

لڑکی نے تیوڑی چڑھا کر کہا۔ "تم مذہبی باتوں کا تو مذاق نہ اڑایا کرو۔"

وہ پھر ہنسا اور بولا۔ "یہ وقت ایسی خشک گفتگو کا نہیں ہے۔ کوئی ہنسی کھیل۔ کوئی عشق و الفت کی بات کرو۔ ہاں تمہاری سہیلی جو آیا کرتی ہے کیا تم اسے حسین خیال کرتی ہو؟"

لڑکی نے جواب دیا۔ "وہ کل یہاں آئی تھی۔ اس کی شکل و صورت کا تم خود اندازہ کر سکتے ہو۔ لو دیکھو وہی سامنے آرہی ہے۔"

ایک نہایت حسین کشیدہ قامت لڑکی سرخ لباس پہنے خراماں خراماں ان کی طرف آرہی تھی۔ آفتاب کی روشنی اور گرمی نے اس کے جسم میں حرارت پیدا کردی تھی۔ اور اس کے رخسارے تمتما رہے تھے۔ مصور نے اس کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گیا اور نہایت شوق سے اس کے چہرہ کو بار بار تکنے لگا۔ آخر ضبط نہ کرسکا۔ اور کہنے لگا۔ "میرا دل چاہتا ہے۔ کہ تمہاری تصویر اتار لوں"

نووارد لڑکی نے سوال کیا۔ "لیکن میری سہیلی کیا کہیگی۔"

مصور نے جواب دیا۔ "ثریا ایسی باتوں میں کبھی معترض نہیں ہوئی۔"

تصویر کا بنانا قرار پاگیا۔ مصور اسی سرخ پوش لڑکی کے خیال میں اتنا محو ہوگیا۔ کہ تالاب کا قصہ بالکل بھول گیا۔ شروع شروع میں تو ثریا ان دونوں کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھی جب مصور اس لڑکی کے سیاہ بالوں میں خوشنما اور خوشرنگ پھول آویزاں کرتا تھا۔ تو ثریا اس کی محویت پر مسکراتی تھی۔ مصور نے مختلف حالتوں میں اس

دوشیزہ کی تصویر اُتار ہی۔ اس تمام عرصے میں وہ ثریا کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ اب ثریا نے بھی تنگ آکر ان کے پاس بیٹھنا ترک کر دیا۔ وہ کچھ فاصلے پر اسی گرے ہوئے درخت کے تنے کے پاس بیٹھا کرتی۔ گھنٹوں بڑے غور سے تالاب کے پانی کی طرف ٹکٹکی لگائے رہتی۔ اور اس آدمی کے متعلق سوچتی رہتی۔ جو کہ قیامت تک کے لئے اس پانی میں گم ہو گیا تھا۔ اور جسے محبت کی ناکامی نے دغا دی تھی۔

× × × × × × × × ×

× × × × × × × × ×

ایک دن ثریا وہاں سے گذر رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ مصوّر اس سرخ پوش لڑکی کے بوسے لے رہا ہے ثریا گھبرا گئی۔ اُس نے تالاب کے کنارے جا کر آنسو بہائے۔ پھر سسکیاں لیتے ہوئے ذرا اونچی آواز سے بولی "اگر میں بھی ذرا جُرات سے کام لوں تو بیڑا پار ہے" اس کو معلوم ہُوا کہ کوئی اس کے پیچھے کھڑا ہُوا کہہ رہا ہے۔ "یہ کام ایسا بُرا نہیں جتنا تم سمجھتی ہو"

اس نے دفعتہً مڑ کے دیکھا تو اس کے سامنے ایک زرد رو نوجوان کھڑا تھا۔ جس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ ذرا غور سے دیکھا۔ تو ثریا کو اس نوجوان کے کپڑے بھیگے ہُوئے دکھائی دیتے۔

وہ نوجوان کہنے لگا۔ "میں بھی پہلے پہل ڈرتا تھا لیکن اس زندگی سے کیا فائدہ جس زندگی کا پھل مایوسی اور ناکامی ہے۔ پانی کے نیچے کی زندگی اوپر کی دُنیا سے ذرا بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ وہاں خنکی ہے اور خاموشی۔ فریب اور دغا نام کو بھی نہیں۔ نہ وہاں فریبی پیار ہے۔ نہ بناوٹی تبسم۔ ہاں کبھی کبھی تنہائی دق کرتی ہے۔ لیکن تم وہاں آجاؤ تو تنہائی کی آفت بھی تکلیف نہ دے۔"

ثریا نے اس کے وہی الفاظ دُہرائے "خنکی ہے اور خاموشی۔ فریب و دغا نام کو بھی نہیں۔ نہ فریبی پیار نہ بناوٹی تبسّم" پھر اُس نے سوچا۔ کہ تنہائی ضرور ناگوار ہوگی۔ لیکن وہ تنہائی اچھی۔ اور یہ ہجوم بُرا۔ پھر اُس نے نوجوان سے پوچھا۔ "کیا وہاں بہت سردی اور اندھیرا تو نہیں ہوتا؟"

نوجوان نے کہا۔ "اس وقت تم پر جو حالت طاری ہے اس کو میں خوب سمجھتا ہوں۔ کہ مجھ پر گذر چکی ہے۔ لیکن یہ حالت ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ آؤ بہادر بنو۔ اس ناپاک دُنیا میں تمہاری ضرورت نہیں ہے۔"

یہ آخری الفاظ ثریا کے دماغ میں گونجے۔ پھر وہ ایکدم اُٹھی۔ اور اس ہاتھ کو تھام لیا۔ جو نوجوان نے اس کی طرف بڑھا رکھا تھا۔ اور وہ دونوں تالاب میں گم ہو گئے۔

× × × × × ×

سُرخ پوش لڑکی چونک کر کہنے لگی۔ "ایں۔ کیا تم نے کچھ سُنا؟"

مصور بولا "نہیں کیا؟"

لڑکی "یہ چیخ معلوم ہوتا ہے کوئی انسان اضطراب کی حالت میں کراہا ہے"

مصور نے بے پروائی سے اور تصویر سے نظر اٹھائے بغیر کہا "یہ کسی پرندکی آواز ہوگی۔ وہ اپنی رفیقِ حیات کو بلا رہا ہوگا"

لیکن وہ آدمی جو تالاب میں ڈوبا ہوا تھا۔ اب تنہا نہ تھا

محمد فضل حق معتصم

مے قدیم

(۱)

آساں نہ بر رخ تو نظر دوختیم ما — جاے گداختیم و دلے سوختیم ما
روز بحرِ منم بزن اے برق آتشی — تا روشنت شود کہ چہ اندوختیم ما
ہے ہے دلے کہ قیمت او بود سلطنت — بر یک نگہ بدستِ تو بفروختیم ما
شب آمد و ہماں بالم نالہ سر کنیم — گوئی کہ نالہ ہا بشب آموختیم ما

کس مصحفی ز سوز دل ما خبر نشد
دردا کہ سوختیم نہ افروختیم ما

(۲)

زیں پیش بر رُخ تو نظر داشتیم ما — در ہر نظارہ ذوق دگر داشتیم ما
دی شب بیرومِ غیر کہ رفتی و آمدی — پنہاں مکن کہ از تو خبر داشتیم ما
بارے تو خود بگوئے کہ بااین محبت — دور از تو خویش را چہ قدر داشتیم ما
رفتیم و باد ما تو نکردی ہزار حیف — گاہے بخاطر تو گذر داشتیم ما

اکنوں بدیدہ قطرۂ خونی نمے رسد
اے مصحفی چہ شد کہ جگر داشتیم ما

"جج اور جیوری"

(یہ ایک ایکٹ کا ڈراما انگلستان کے شہرۂ آفاق ڈراما نگار سر ولیم گلبرٹ (۱۸۳۶ء - ۱۹۱۱ء) کے زورِ قلم کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔ سر گلبرٹ نے یہ ڈراما حسبِ معمول سر آرتھر سلوان (۱۸۴۲ء - ۱۹۰۰ء) کے ساتھ مل کر لکھا تھا۔ اُس زمانہ میں تمام تھیٹروں میں سر سلوان کے جھنڈے گڑے تھے۔ اور اس لئے سر آرتھر نے اس معمولی تصنیف کی شرکت کو اپنے نام سے منسوب کرنا گوارا نہ کیا۔ اور تمام حسن و قبح کا ذمہ دار سر گلبرٹ کو ٹھیرایا جب خلافِ توقع یہ ڈراما سٹیج سے قبولیتِ عام کا خلعت لیکر اُترا۔ تو خود مصنّفین بھی ششدر رہ گئے۔ سر ولیم گلبرٹ کا شمار انگلستان کے چوٹی کے ادیبوں میں ہے۔ اور اُن کے ڈرامے ندرت، جدتِ تخیّل اور استعارۂ مسلسل کے لحاظ سے اپنا آپ ہی جواب ہیں۔ ۱۹۰۷ء میں ادبی خدمات کے صلے میں انہیں سر کا خطاب ملا۔ قافیہ سے متنفر حضرات شاید یہ سُنکر خوش نہ ہوں۔ کہ سر گلبرٹ نے یہ ڈراما سراسر با قیدِ قافیہ لکھا ہے۔ ان سطور میں اس باکمال کی معجز نگاری کا اُردو میں منہ چڑایا گیا ہے)

نور الٰہی محمد عمر

ارکان ڈراما

فاضل جج	مدعیہ
وکیل مدعیہ	مدعیہ کی سہیلیاں
جیوری کا فائد	اہالیانِ جیوری
سررشتہ دار	چپراسی

سین - دیوانِ عدالت

(بیرسٹر وکیل اہالیان جیوری اور سررشتہ دار بیٹھے نظر آتے ہیں)

(کورس معرف)

سنو! دس کا گھنٹہ بج رہا ہے۔ اور اہل مقدمہ کے دل
دھڑک رہے ہیں۔ تماشائیوں کا قصرِ عدالت میں تانتا بندھا

ہے۔ اور وہ بیم و رجا کی کشمکش کے مزے لے رہے ہیں۔

کیونکہ آج انجمن انتقام العاشقین کا دلچسپ مقدمہ سماعت ہوگا

سررشتہ دار (اہالیان جیوری کو مخاطب کرکے) صاحبان

جیوری پیشتر اس کے کہ کوئی کارروائی شروع ہو میرے

چند الفاظ گوش دل سے سن لیجئے۔ اور عہد کیجئے۔ کہ اس

مقدمہ کا فیصلہ کرنے میں آپ رو و رعایت کو روا نہ رکھیں

گے۔ اور میزان عدل کے دونوں پلڑے برابر رہیں گے۔

حاضرین سے میری التماس ہے۔ کہ وہ نہایت سکون اور

خاموشی سے مقدمہ سنیں۔ میں مانتا ہوں۔ کہ مدعیہ کی دکھ بھری

کہانی انہیں آٹھ آٹھ آنسو رلائیگی۔ اس کے خوبصورت

چہرہ پر جمکر نگاہ ہٹنے کا نام نہ لیگی۔ بیشک انسانیت کا

تقاضا ہے کہ اس شکستہ دل نازنین سے ہر طرح ہمدردی

کی جائے۔ مگر آپ صبر سے کام لینگے میں پھر صاحبان جیوری

سے التماس کرتا ہوں کہ وہ دامن انصاف ہاتھ سے نہ

چھوڑیں۔ اور جب مدعیہ کے دل دردمند کی آہیں اس

قصر کو ہلائیں تو یہ ضرور نہیں کہ آپ اس کی طرف

متوجہ ہوں۔

(مدعا علیہ داخل ہوتا ہے)

مدعا علیہ۔ کیا یہی دیوانی عدالت ہے۔

تمام لوگ۔ ہاں یہی ہے۔ مگر تم کون ہو۔

مدعا علیہ۔ میں مدعا علیہ ہوں۔

(اہالیان جیوری ہم آواز ہوکر اور گھونسے تان کر)

بدمعاش ہمارے فیصلہ سے ڈر۔ جانتا ہے یہ جیوری

ہے۔ جس کا غضبناک ہونا ضروری ہے۔

مدعا علیہ۔ صاحبو یہ عجیب کارروائی ہے۔ پہلے میرا

بیان تو سن لو پھر جو کہنا ہو کہو۔ کیونکہ ابھی تک آپ بدرجہ اد

مقدمہ سے ناآشنا ہیں۔

(اہالیان جیوری کرسیاں چھوڑکر آجاتے ہیں۔ اور مدعا علیہ کو اپنے

حلقہ میں لیتے ہیں)

جیوری کا قاید۔ آہاہاہا یہ سچ ہے کہ تمہارے مقدمہ سے

ہم واقف نہیں۔

مدعا علیہ۔ تو سنئے جب پہلے پہل میں نے اپنی معشوقہ

کو دیکھا تو میرا دل محبت سے معمور ہوگیا۔ میں نے اپنا تمام

مال ومتاع اسکے قدموں پر لا ڈالا۔ اور جیسا ناولوں میں

لکھا ہوتا ہے۔ ویسا عاشق بن گیا۔ دن کی آہیں رات کے

نالے۔ رنگ زرد۔ بدن سرد تمام علامات مرض عشق ظاہر

ہوگئیں لیکن دفور مسرت سے محبت کا جذبہ مردہ ہوجاتا

ہے۔ اور ایک ہی پھول کو لگاتار دیکھنا آنکھوں کو کھٹکتا

ہے۔ لہذا رفتہ رفتہ میرا دل بھر گیا۔ جب اس کی شمع الفت

ٹمٹمائی تو میں نے کسی اور سے لو لگائی۔

جیوری کا قاید۔ جوانی میں مجھے بھی ایسا ہی اتفاق ہوا

اور میرا طریق عمل بدمعاشوں کے ایسا ہوگیا۔ مگر وہ دن

گزر گئے۔ اب تو میں شرافت کی جان اور عزت کا ایمان ہوں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ میری پارسائی مدعا علیہ سے ہمدردی کی روادار نہیں۔

سررشتہ دار۔ سب جھک کر آداب بجالاؤ۔ عالیجناب جج صاحب تشریف لاتے ہیں۔

(جج آکر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

جیوری۔ جج صاحب کا آنا مبارک ہو۔ اُن کی مصدقہ ڈگری قانون کی منزلت رکھے۔ اور اپیل میں کبھی مسترد نہ ہو۔

جج۔ ان محبت بھرے الفاظ کے لئے میرا شکریہ قبول فرمائیے۔ ہاں آج ہمیں ایک نقض معاہدہ کا مقدمہ تجویز کرنا ہے۔ لیکن اگر آپ کا حرج نہ ہو۔ تو پہلے میں آپ کو بتاؤں کہ میں جج کیسے بنا۔

تمام۔ ضرور ضرور۔

جج۔ مہربان دوستو۔ جب میں نے وکالت شروع کی تو میرا ہاضمہ بہت اچھا تھا۔ اور بھوک خوب لگتی تھی۔ لیکن تمام نوآموز بیرسٹروں کی طرح میرے جیب خالی اور دماغ عالی تھا۔ ایک بلا ملفوف لفافہ ایک سادہ ڈائری دو قمیصیں تین چار کالر۔ ایک انگوٹھی جو دُور سے سونے کی معلوم ہوتی تھی۔ میری کل کائنات تھی۔ چھوٹی عدالتوں میں گھوم گھوم کر میرا جوتا بھی ٹوٹ گیا۔ مگر کوئی موکل ہاتھ نہ آیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ جیوری کے سامنے تقریر کرنا میری قسمت میں ہی نہیں لکھا۔ جب خشک روٹی اور سادے پانی سے جی اُکتا گیا۔ تو میں نے ایک بیرسٹر کی بھونڈی لڑکی سے شادی کر لی۔ دولتمند بیرسٹر سے جب میں نے شادی کا خیال ظاہر کیا۔ تو وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ اور یہ جواب دیا۔ کہ اس دُور اندیشی کا اجر تمہیں عدالت سیشن اور ہائیکورٹ میں ملیگا۔ میری لڑکی بہت اچھی ہے۔ ذرا کم سن ہے جب اس کی پشت پر روشنی ہو تو ۴۳ سال سے زیادہ عمر کی معلوم نہیں ہوتی۔ بڈھے بیرسٹر کی پیشینگوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور میرے پاس مقدمات کی بھرمار ہو گئی اور سیشن میں میرا طوطی بولنے لگا۔ تمام چور اُچکے ڈاکو جو میری فیس ادا کر سکتے ہیں۔ میری تقریر کو پروانہ رہائی جانتے تھے۔ اور بے شمار نقب زنوں کو میں نے عدالتوں کے چنگل سے چھڑا کر عزیزوں کے پہلو میں بٹھایا۔ جب میں قانون کی طرح روپیوں میں کھیلنے لگا۔ تو بڈھے بیرسٹر صاحب کی دختر کو دھتا بتایا۔ بیرسٹر بہت گرجا برسا۔ مگر میری شہرت کے قصر کو متزلزل نہ کر سکا۔ اور اب ہم نقض معاہدہ نکاح کے مقدمہ کی سماعت کرتے ہیں۔

(جملہ اہالیان جیوری دوزانو ہو جاتے ہیں۔ اور تماشائیوں کی نظر سے اوجھل)

سررشتہ دار (اہل جیوری کو مخاطب کر کے) آپ خدا کی قسم کھا کر عہد کریں۔ کہ جو سوال امیر غریب، بڑے اور چھوٹے

میں اٹھیگا۔ اس کا تصفیہ آپ دیانتداری سے کرینگے۔

اہلِ جیوری (صرف ہاتھ بلند کر کے) ہم خدا کی قسم کھا کر عہد کرتے ہیں۔ کہ ہم ایسا ہی کرینگے۔

وکیل مدعیہ۔ مدعیہ کو بلاؤ۔

چپراسی۔ چلو۔ کوئی انجلینا۔ انجلینا۔ انجلینا۔ انجلینا حاضر ہے۔

(انجلینا مع اپنی چند سہیلیوں کے داخل ہوتی ہے۔ ہر ایک کے ہاتھ میں کچھ کی ٹہنیاں اور گلاب کے ہار ان کے بازوؤں پر پڑے ہیں)

سہیلی۔ ایک گلِ پژمردہ ایک دلہن مگر نا کتخدا آتی ہے۔ اُس کے آتشیں رُخساروں کے سامنے گلاب ماند ہو رہا ہے۔ اُس کے آفتابی چہرے کے آگے سورج چاند ہو رہا ہے

(جج کی نگاہ ایک سہیلی پر پڑتی ہے۔ اور وہ چپراسی کے ہاتھ اسے ایک پرزہ بھیجتا ہے۔ جسے پڑھکر وہ اُسے بوسہ دیتی ہے اور محرم میں رکھ لیتی ہے)

انجلینا۔ وقت موسم کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ دُھوپ تیز پڑے تو گلاب پر اوس پڑ جاتی ہے۔ زمانہ دُھن کا پکّا، غموں کے سیاہ بادلوں سے مسرت کا سورج نکالتا ہے۔ جس وقت دُھوپ چھاؤں ہم آغوش ہوتے ہیں۔ وہ سب سے خوبصورت سماں ہے۔ میرا بھی وہی نقشہ ہے۔ مجھے غم سے کیا کام۔

(انجلینا گلاب کے ہار سہیلیوں سے لیکر اہلِ جیوری کے گلے میں ڈال دیتی ہے)

جج (جیوری سے) جب سے میں نے انسانوں میں قدم رکھا ہے۔ ایسا خوبصورت چہرہ میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ کیوں ہے نا قابلِ تسخیر۔

جیوری۔ مائی لارڈ۔ صرف ایک لفظ قابلِ تصویر۔

مدعیہ (جھک کر) صاحبو۔ اس احسان کا بار میں کیسے اُتار سکتی ہوں۔

جیوری۔ ہماری ہو جاؤ۔ اور ہمیں سے یہ بوجھ اُٹھواؤ۔

وکیل مدعیہ۔ مائی لارڈ صاحبانِ جیوری۔ جذبات دلی سے پہلو بچا کر میں اس دردناک مقدمہ کو شروع کرتا ہوں کیونکہ یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔ کہ کوئی مرد اس قدر کمینہ ہو سکتا ہے۔ کہ وہ سادہ لوح الھڑ لڑکی کو اس طرح فریب دے۔

تمام۔ خدا اسے غارت کرے۔

(مدعیہ روتی ہوئی وکیل کے گلے میں باہیں ڈال دیتی ہے)

وکیل مدعیہ۔ میری دلکش موکلہ کو دیکھئے۔ جو اس سنگدل کی جفا کا شکار ہوئی ہے۔ اور پھر اس دغاباز کو ملاحظہ کیجئے جو کھڑا مسکرا رہا ہے۔ اور چلو بھر پانی میں ڈوب نہیں مرتا۔ اس نے میری موکلہ سے آنکھ لگائی۔ اور اس دن سے حرام ہے جو اُس کی آنکھ لگی ہو۔ جب محبت کی پینگیں بڑھیں تو وقت گذرتا نظر نہ آیا۔ جب مدت کے بعد میری موکلہ نے شادی

کے لئے اصرار کیا۔ تو اس ناہنجار نے صاف انکار کیا۔ اور فسخ معاہدہ کے علاوہ شکستِ دل کے جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

(مدعیہ رونا شروع کرتی ہے)

پیاری صبر کرو۔ ورنہ میری آنکھیں بھی تیار ہیں۔

(مدعیہ کے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں۔ گویا غش آنے کو ہے)

جج ۔ دیکھنا۔ کہیں گر نہ پڑے بچاری۔

جیوری کا قائد ۔ ذرا میرا سہارا لیلو پیاری۔

(مدعیہ قائد کے سینے سے لگ جاتی ہے)

مدعیہ (قائد سے) اب آپ ذرا ہٹ جائیے۔

قائد ۔ فکر نہ کرو۔ مجھے اپنا باپ جانو۔

جج ۔ اگر ہرج ہو۔ تو میرا سہارا لے لو۔

(مدعیہ جج کے پاس بیٹھ جاتی ہے۔ اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر روتی ہے)

وکیل مدعیہ ۔ ارے کوئی لخلخہ لاؤ۔ کسی حکیم کو بلاؤ۔

جیوری کا قائد (مدعا علیہ کو مخاطب کر کے) ارے بدمعاش یہ تو جج ہے۔ مگر یہ جیوری ہے۔ جس کا غضبناک ہونا ضرور ہے۔

مدعا علیہ ۔ صاحبو۔ ذرا میری بھی تو سنئے۔ اگرچہ میں تسلیم کرتا ہوں۔ کہ میرا دل مستقل نہیں رہا۔ مگر اس میں میرا کیا گناہ ہے۔ جب فطرت رات دن ہمیں یہی سبق سکھاتی ہے دیکھئے نا چاند کبھی ہلال ہوتا ہے کبھی بدر۔ کبھی رات ہوتی ہے کبھی سحر۔ حرفت، ہوا، موسم سب کے سب تغیر پذیر ہیں۔ گویا فطرت کا یہ تقاضا ہے۔ کہ انسانی خواہشات بھی رنگ بدلتی رہیں۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ اُسے بُرا نہ جانو۔ جو آج ایک خاتون کے دل میں راہ کرتا ہے۔ تو کل دوسری کی چاہ کرتا ہے۔ لہذا میرا یہ فعل بھی ثواب ہے۔ اور قانونِ فطرت کا جواب ہے۔ کہ میں آج اس خاتون سے شادی کروں۔ اور کل دوسری کو بیاہوں۔

جج ۔ یہ تجویز معقول ہے۔ اور تمہاری موکلہ کو اس سے انکار نہ ہوگا۔

وکیل ۔ مگر میری یہ گذارش ہے کہ دو عورتوں سے ایک ہی وقت میں شادی کرنا جرم انددواج ثانی کی حد تک پہنچتا ہے (کتاب کھولکر) شاہ جیمز دوم کے عہد میں یہ قانون جاری ہوا۔ کہ ایک ہی وقت دو عورتوں سے شادی کرنا سنگین جرم ہے۔

(کتاب جج کو دیتا ہے جو اُسے پڑھتا ہے)

جیوری ۔ کیا جیّد عالم ہے۔

جج ۔ یہ معمہ ہم سے حل ہونے کا نہیں۔

مدعا علیہ ۔ اگر میں اس خاتون سے شادی نہ کروں۔ تو نقض معاہدۂ نکاح ہوتا ہے۔

مدعیہ ۔ مگر یہ شادی کرے تو ازدواج ثانی کا پھندا گلے میں پڑتا ہے۔

(مدعیہ مدعا علیہ سے بغلگیر ہو کر)

میں تمہیں محبت ہی نہیں کرتی۔ پرستش کرتی ہوں۔ میری محبت اندھی ہے۔ جو اس نقصان کو نہیں دیکھ سکتی۔ جو تمہیں چھوڑ کر مجھے اٹھانا پڑیگا۔ صاحبو۔ جب آپ تاوان کا انداز لگائیں۔ جوایڈون کو ادا کرنا چاہئے۔ تو یہ ضرور مدِنظر رکھیں کہ میں کس قدر محبت اور دلبستگی سے محروم کی گئی ہوں۔

مدعا علیہ (مدعیہ کو جبراً علیحدہ کرکے) میں دھواں دھار تمباکو پیتا ہوں۔ اور بوتل تو کسی وقت میرے ہاتھ سے چھوٹتی ہی نہیں۔ میں عورتوں کو پیٹا بھی کرتا ہوں۔ میرا ہاتھ اس وقت بھی کھجارہا ہے۔ اگر یہ میرے ساتھ شادی کرتی تو اسے دنیا میں جہنم کا مزا یاد آتا۔ اس لئے صاحبو جب آپ تاوان کا اندازہ لگائیں تو میرے اقبالات کو بھی زیرِ نظر رکھیں۔

جج۔ صاحبو غور طلب سوال شراب کا ہے۔ آپ میری ہدایت کے منتظر ہیں؟ تو میری یہ رائے ہے۔ کہ مدعا علیہ کو شراب پلاکر مخمور کیا جائے۔ اور دیکھا جائے۔ کہ وہ اس حالت میں مدعیہ سے کیا سلوک کرتا ہے۔

وکیل۔ میں کمال ادب سے اس تجویز پر اعتراض کرتا ہوں۔

جیوری کا قائد۔ میں کمال ادب سے اس تجویز پر اعتراض کرتا ہوں۔

مدعا علیہ۔ مگر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

جیوری کا قائد۔ نہیں تو ہے۔

جج (کتابوں اور کاغذوں کو پھینک کر) خدا تمہیں قانون کی گرفت میں پھنسائے۔ اور مجھے تم سے نجات دلائے۔ تمہیں کوئی بات بھی پسند نہیں آتی۔ آخر میں تمام دن یہاں نہیں بیٹھ سکتا۔ مجھے جلد جانا ہے۔ وکیلو اور بیرسٹرو۔ اپنے اپنے کاغذ بغل میں دباؤ اور گھروں کی طرف قدم بڑھاؤ۔ میں جھگڑا ہی چکادیتا ہوں اسے خود بیاہ لیتا ہوں۔

(جج اور مدعیہ عدالت کی کرسیوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ سہیلیاں گلاب کے پھولوں کی بارش کرتی ہیں۔ محبت کے دیوتا کی دو تصویریں چھت سے اترتی ہیں۔ اور سرخ روشنی میں سہیلیاں ناچتی ہیں)

پردہ گرتا ہے

نور الہی
محمد عمر

خیابان و گلچیں

قدرت کے لگائے ہوئے باغ میں ایک فرشتہ آتا ہے جس کا نام موت ہے۔ وہ اپنے بڑے تیز اور چمکدار چاقو سے ہرے بھرے پودوں کو کاٹ ڈالتا ہے۔ وہ سرسبز اور میوہ سے لدی ہوئی شاخوں کو دم بھر میں درختوں سے جدا کر کے نہایت بے رحمی سے اپنے ساتھ لیجاتا ہے!

ایک دن فرشتہ نے سوچا" یہ ٹھیک نہیں ہے کہ صرف ہرے پودے یا میوہ دار شاخیں جدا کی جائیں۔ اور ڈالیوں میں، پتیوں کی آڑ پکڑے ہوئے، بہار دکھاتے ہوئے خوشنما پھول چھوڑ دئے جائیں"۔ اُس نے کہا۔ "بیشک یہ پھول ننھے ہیں۔ یہ خوشبودار ہیں۔ اور خوبصورت یہ صحنِ چمن میں صبح سے شام تک آزادی کے گیت گاتے ہیں۔ ہاں، اور یہ کسی کی یاد میں صبح نور کے تڑکے آنسو بہاتے ہیں۔ اچھا، بس، اب تو میں انہیں رونے نہ دونگا اُسی کے پاس لے جاؤنگا۔ جسے پیار کرتے ہیں جس سے محبت کرتے ہیں۔ جس کی فرقت میں روتے ہیں۔ بیقرار ہوتے ہیں۔ ہاں سینہ چاک کرتے ہیں۔ بلکہ جان دے دیتے ہیں۔ اچھا اُسی کے پاس لے جاؤں گا اور انعام وصول کرونگا"۔

اُس نے ناشگفتہ غنچوں کو آنسو بھری نظر سے دیکھا۔ اور اُن کی بند پنکھڑیوں کے بوسے لئے، اُس نے سرسبز پودے کی شاخوں پر ایک پُر تاسف نظر ڈالی، اور مُنہ بند کلیوں کو اپنے چاقو سے کاٹ کر اکٹھا کر لیا۔ اُس نے کہا "رونا کاہے کا، یہ تو مالک کے پاس جا رہے ہیں، مالک؟ ہاں محبوب کے پاس'

فرشتہ نے یکجا کئے ہوئے پودوں، اکٹھا کی ہوئی شاخوں اور جمع کئے ہوئے پھولوں کی طرف دیکھا اُس نے زیرلب خفیف سا مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرے مالک کو ان کی سخت ضرورت ہے۔ یہ تو اُسی کی چیزیں ہیں۔ اور اُسی کے باغ کی پیداوار ہیں" وہ کچھ سوچکر بولا۔ "بے شک، یہ پھول اُس نے کھلونے بنا کر بھیجے تھے۔ جن سے ماں باپ اپنا جی بہلاتے ہیں"۔

اُس نے کہا۔ "یہ پودے، یہ پھول، وہاں نور کے کھیتوں میں بڑھیں گے۔ اور دُودھ کی نہروں میں پرورش پائیں گے۔ میری نگرانی میں پھلیں پھولیں گے۔ اور اِن خوشبودار کلیوں کو بہشت کی پاک و بزرگ روحیں اپنے صاف، شفاف اور اُجلے لباسوں میں پہنیں گی...

ہوں گی۔"

کلیوں کی ماں نے دیکھا اُس کے دل میں محبت کی آگ بھڑکی، دھڑکن اور خدشات نے بڑھا۔ اُس نے کلیجہ میں ٹیس محسوس کی۔ ممتا والی نے اپنے بچوں کو پیار کیا، محبت کی آخری نظر ڈالی اور سینہ پر پتھر رکھ کے فرشتہ کے حوالہ کیا۔ بیتاب دل کو یوں سمجھایا۔ کہ "کمبخت مرا کیوں جاتا ہے۔ عالمِ بالا میں یہی تو ہمیشہ نجات ہونگے۔"

اُس دن باغ میں ایک مسافر آیا تھا۔ سب لوگ کہتے ہیں کہ وہ فرشتہ تھا، یہ بھی کہتے ہیں کہ اُس کا نام موت ہے۔

بعض اُسے بُرا کہتے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ باغ ویران کر گیا۔ کیا سچ مچ؟ ہاں، وہ فرشتہ تھا مگر موت؟ یہ نام تو نہیں، اُس کا نام رحمت ہے۔ وہ اپنے آقا کا وفادار اور فرمانبردار نوکر ہے۔ وہ باغ سے پھول اور پودے لے گیا۔ اُس نے نَنّہ بند کلیاں بھی توڑ لیں۔ اُس نے اُنہیں اپنے مالک کے دائمی فرحت افزا باغ میں نصب کر دیا۔ وہ وہاں ہمیشہ پھولیں گے، اور اُن کی مہک بہشت کے باغوں کی رونق ہوگی۔ اُن کی خوبصورتی کی آرائش میں تا قیامت چار چاند لگاتی رہیگی۔

جلیل احمد قدوائی

معمورۂ دل بستگی

زبرقِ خرمنِ گل بلبلِ بے خانماں گم شد
چناں سیلاب زد شبنم کہ شاخِ آشیاں گم شد

نشانِ مصری جویم ز چشمِ خواب آلودہ
چراغِ دیدۂ یعقوب سوئے کارواں گم شد

زبانِ مدعا، چشمِ تماشا سنج، گشت آخر
شکستم زیرِ لب آواز را، سازِ فغاں گم شد

چہ حاصل از خضر اسکندرِ دنیا گزیدہ را
کہ در ظلماتِ جُست و جوئے حیاتِ جاوداں گم شد

بود موجِ تبسم جنبشِ گہوارۂ نازش
کہ طوفانِ سرشکم در سرابِ خونفشاں گم شد

کشیدم نالہ، بر لب آمد و جذبِ تحیر شد
خوش آں تیرے کہ ناجستہ در آغوشِ کماں گم شد

خجل اسے سعیِ نایابی کہ ہنگامِ وفاجوئی
دریں معمورۂ دلبستگی عمرِ رواں گم شد

تپش زیں نامرادِ باغِ ہستی را چہ می پرسی
خزانِ بے بہار آمد بہارِ بے خزاں گم شد

گرامی نامہ

مجھے اس سے پہلے جناب صغرا ہمایوں مرزا سے کوئی خاص تعارف حاصل نہ تھا۔ آپ کے مضامین اشاعات ادبیہ میں اکثر پڑھے تھے لیکن ذیل کے گرامی نامہ نے نہ صرف تعارف خصوصی ہی کا موقع بخشا بلکہ اعتراف قابلیت بھی اپنی طبیعت میں پاتا ہوں۔

یہ گرامی نامہ شخصی تھا۔ اور اشاعت کے لئے نہیں لکھا گیا تھا۔ تاہم ایک خاتون کے خط کا اسقدر پُر از معلومات ہوتا عام ناظرین ہزار داستان کے لئے بھی افادہ سے خالی نہیں سمجھتا۔

آخر میں مَیں موصوفہ کی خدمت میں شکریہ عرض کرتا ہوں۔ کہ انھوں نے ہتوجہ و کاوش اس پُر از معلومات خط سے مجھے ممنون فرمایا ہے۔

ایڈیٹر

صغرا منزل
ہمایوں نگر
حیدرآباد دکن
یکم جنوری ۱۹۲۳ء

جناب مکرمی و محترمی

. . . . . .

. . . .

. . . .

ہزار داستان کے دسمبر نمبر کے صفحہ ادارت کو پڑھکر اور یہ دیکھ کر کہ کمالات عظیم آباد کے آپ دل سے مداح و ثنا خواں ہیں مجھے مسرت دلی حاصل ہوئی۔ یوں تو صوبہ بہار اور اس کا دارالامارت عظیم آباد اپنی تاریخی روایات کے اعتبار سے تاریخ ہند میں امتیاز خاص رکھتا ہے۔ جہاں گوتما بدھ جیسا لائٹ آف ایشیا نور ایشیا ریفارمر گذرا اسوکا اور چندر گپتا جیسے جلیل المرتبت حکمران پیدا ہوئے۔ ہند میں شہریت و تمدن قدیم کے اعتبار سے بھی تمام عرض و طول ہند میں قدیم دلی ہستنا پور کے بعد دوسرا شہر پاٹلی پوتر عرف پٹنہ عظیم آباد ہے۔ اسلامی دور میں بھی بڑے بڑے بزرگان دین عارف کامل فقہا محدثین ادیب مورخین ریاضی دان و شعرا اس مردم خیز خطہ نے پیدا کئے۔ شعرا میں جہاں آپ نے مرزا عبدالقادر بیدل مرحوم کا

ذکر فرمایا ہے۔ وہاں اُن کے ہم پلہ اور دو نام چھوڑ دیتے۔
یعنی ... مسلم الثبوت اُستاد شیخ غلام علی راسخ مرحوم
جن کو میر تقی میر دہلوی نے خود اپنی زبانِ فیض ترجمان
سے مخبر میر کا لقب عنایت کیا تھا۔ اور حضرت شاہ
اُلفت حسین فریاد علیہ الرحمۃ جو فارسی کے اُستاد
بے بدل اور مورخ و ادیب بے مثل تھے۔ چنانچہ مولانا
سید محمد مرحوم ضمیمہ جواہرِ منتخب میں حضرت فریاد کا تذکرہ
کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں" بالجملہ بعد از مرزا
عبدالقادر بیدل و شیخ غلام علی راسخ ہمچوں حضرت
سید شاہ الفت حسین فریاد از خاک عظیم آباد برخاستہ
جنھوں نے بائیسویں سال اپنی اُستادی کا جھنڈا گاڑا
اور ایسے زمانہ میں جبکہ بہت سے کملائے فن مثل
مرزا احمد خنشا میر ذبیح ملا احمد سلجوقی راجہ پیارے لال
الفتی مسرور میر علی عبرتی وغیرہ وغیرہ موجود تھے۔ اور حضرت
راسخ کا اخیر زمانہ تھا۔ حضرت فریاد کو علاوہ کمالات صوری
و معنوی کے عالیخاندانی کا شرف بھی حاصل تھا چنانچہ
مثنوی دبستانِ اخلاق میں جو ... بوستاں سعدی
۴۲۸ صفحوں کی کتاب ہے۔ سپاس گزاری باریتعالے
مندرجہ ذیل اشعار میں فرمائی ہے۔

دو گوہر ز گنجِ عطائے بزرگ
عطا کرد مارا خدائے بزرگ
یکے گوہرِ پاک ابائے من
دگر جوہرِ طبعِ والائے من
ملاذِ سر سروراں بودہ اند
بگیتی بنام و نشاں بودہ اند
پدر بر پدر جملہ اباتے من
بزرگانِ ارشاد فرمائے من
پدر را نسب از سر آگہی
موسےٰ ابن جعفر شود منتہی
علی ابنِ موسےٰ جدِ ما دریست
کہ روشن دُرِ درجِ پیغمبریست
بسے از بزرگان ابن دودہ اند
کہ کاملتریں اولیا بودہ اند
معظم تریں است محبوب پاک
کہ فیضش بود از سمک تا سماک
بنایم یکے مرشد[۵۱] ما بسوئیست
کہ گنجور گنجینہ معنویست
بدہلی بود شاہ روشن چراغ[۵۲]
دو گیتی ز عطرش معطر دماغ

[۵۱] اشارہ بطرف حضرت قطب الاقطاب۔
جن کا مزار مبارک ہانسی ضلع حصار میں ہے۔

[۵۲] حضرت نصیر الدین اودھی۔

نیائے دگر بوالفرح[۵۱] بودہ است
کہ در خطۂ واسط آسودہ است
وگر آں جلالِ جلالت[۵۲] پناہ
کہ پانی پت اور ابود خوابگاہ!
ولیکن بریں نسبت و اعتبار
نباشد مرا نازشِ و افتخار
نہ زیبد مرا ایں ناز بر جائے خویش
در فخر بر روئے خود باز کرد!
کہ بر جوسے ذلت خود ناز کرد
متاعے گر از خود نداری بدست
زبیگانہ سودا چہ آری بدست

علاوہ ان اشعار آبدار کے ایک قصیدہ میں اپنی عالی نسبی کی جانب اس طرح ارشاد فرمایا ہے۔

مرجعِ شاہاں بودند ملک پناہاں بودند
فیض نگاہاں بودند جملہ نیاگانِ من
لیک ازیں فخر و ناز کرد مرا بے نیاز
ذرۂ سوز و گداز گنجِ فراوانِ من

حضرتِ فریاد کا وطن مالوف عظیم آباد تھا۔ لیکن حضرت کی کل نہا عمر کا زیادہ حصہ مرشد آباد و کلکتہ میں گزرا آخر الذکر مقام میں اقامت کا سبب یہ ہوا۔ کہ منجانب نظامت بنگالہ عہدہ جلیلہ سفارت و نیابت پر ممتاز تھے۔ بنگالہ و بہار کے عمایدین و شرفا حضرت کا اس درجہ احترام و اعزاز کرتے کہتے تھے کہ تقریباً پرستش کی جاتی تھی۔ نواب فخر الملک وزیر السلطان نواب سید امیر علیخاں مرحوم اپنی کتاب امیر نامہ میں حضرت کو ان الفاظ میں یاد کرتے ہیں۔ "حضرت سید شاہ الفت حسین فریاد مدظلہم العالی"۔

نواب بہادر نواب عبداللطیف خاں بہادر سی آئی ای اپنی انگریزی سوانحعمری میں جہاں حضرت کا تذکرہ کیا ہے تو ان الفاظ میں دی موسٹ لرنڈ اینڈ دی موسٹ انفلوئینشل ممبر آف دی محمڈن کمیونٹی آف کلکتہ یعنی اعلیٰ ترین عالم و اعلیٰ ترین با اثر رکن طبقہ مسلمان کلکتہ۔

سلطان العلما نواب سناد الملک دوران تقریظ میں حضرت کے کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت فریاد کی نسبت یوں رطب اللسان ہیں۔ "عمارت دستگاہ سیادت پناہ حضرت شاہ الفت حسین متخلص فریاد کہ خاطر زمانہ مثل او یاد ندارد کہ در عہد خود صاحب جاہ و دستگاہ در دولت بنگالہ راسفیر کبیر و در باران دولت امیر عدیم النظیر از ہر خصال و مرزا یا صاحب فطرت بلند و طبع ارجمند کلام نثر ایشاں نثرہ نثار بودہ و کلام معجز نظام

---

۵۱ حضرتِ بوالفرح واسطی

۵۲ حضرتِ جلال الملک بوعلی قلندر

نظم ایشاں ثریا دثار واقع شاعری در فن شعر باین استعدادات و اتبہ و کسیبہ ہر لفظ و معنیش ظاہر است بلکہ تواں گفت کہ مادر دوران خصوص ملک ہندوستان چنیں روشن بدے نہ زایدہ۔

غرض بہت سے مصنفین و مولفین نے تقریباً انہیں الفاظ میں حضرت کا تذکرہ کیا ہے۔ بہار و بنگالہ میں حضرت کے تلامیذ بے گنتی تھے۔ بعض ان میں سے بذات خود مسلم الثبوت اُستاد ہو گذرے۔ مثلاً شیخ مہدی بخش خواجہ محمد شاہ شہرت حدت داناپوری مولوی اصغر حسن کامل مولوی سید رحیم جان رحیم مولوی معین الدین اذکے مولانا عبدالرؤف وحید مترجم اعظم کونسل قانون سازی گورنر جنرل ہند و ممبر کلکتہ یونیورسٹی۔

حضرت وحید ایک رباعی میں اپنے اُستاد کا یوں کرتے ہیں۔

بر جان سخن ہر آنچہ بیداد آمد
دادش ہمہ از حضرت فریاد آمد
اُستاد سخن بود و تلامیذش را
ہر عقدہ کشودہ شد چو اذ یاد آمد

طبقہ اُمرا میں بھی بہت شاگرد تھے۔ یہاں صرف منجملہ اُن چند کملائے فن کے نام لئے جو اس وقت یاد آ گئے۔ حضرت کے شاگردوں میں جو اس وقت زندہ ہیں

ان میں سے دو نام لائق تذکرہ ہیں۔ ایک تو شمس العلماء نواب سید امداد امام اثر بالقابہ پدر بزرگوار سر سید علی امام صاحب اور دوسرے خان بہادر مولانا حضرت سید علی محمد صاحب شاد ان دونوں سے عزیزداری بھی حضرت سے ہے۔ حضرت شاد ایک قطعہ میں اپنے اوستاد کے متعلق یوں گویا ہیں۔

اخی سید ہمایوں میرزا نام
نگہدار و خدا او را بعزت
ادیب و فاضل و بیرسٹر ایٹ لاء
گلے از گلبن باغ سیادت
ہمایوں یادگار اوستادم
چہ اوستادے کہ او خضر طریقت
جناب حضرت فریاد مغفور
ملک در شکل انساں فی الحقیقت
محقق ہمچو او نایاب در دہر
بہانا در ادب سعدی سریرت
ہزاراں بہ زمن تلمیذ او را!
فدائے شان او یا رب بجنت
کسی اباش او را
ز تربت چوں بر آید در قیامت

علاوہ ہندو مسلمان کے حضرت کے سامنے فرنگی زانوئے

نے بھی زانوئے ادب تہ کیا۔ اور شاگردی کا فخر حاصل کیا۔ وہ نام تو اس وقت یاد آ گئے۔ سر ہنری ٹارلس سابق ریزیڈنٹ مرشد آباد جن کو السنۂ مشرقیہ سے کمال درجہ شوق تھا۔ اور مسٹر جیمس کاکرن سابق مترجم اعظم ہائیکورٹ کلکتہ و مصنف تاریخ چین و جوہر اخلاق وغیرہ

ایک امر یہ بھی قابلِ تذکرہ ہے۔ تمامی عرض و طول ہند سے پہلا اخبار جو مشرقی زبان میں نکلا وہ حضرتِ فریاد ہی کی جودتِ طبع و عالی خیالی و ہمدردیِ قومی کا نتیجہ تھا۔ کہ ۱۸۴۵ء یا اس کے لگ بھگ حضرت اپنے ذاتی صرف اور اپنی ایڈیٹری سے اخبار آئینہ گیتی نما نظم و نثر فارسی میں نکالتے رہے۔ اس کے بعد پھر آپ کے شاگرد مولانا وحید نے حضرت کے مشورہ سے السلطان الاخبار و دوربین یکے بعد دیگرے نکالا جس کے بعد اُردو گائیڈ کا ایک عرصہ دراز تک مولوی کبیرالدین احمد مرحوم کی اڈیٹری سے نکلا۔ بہر حال ہند کا پہلا اخبار آئینہ گیتی نما تھا۔ اس امر کی اولیت کا سہرا حضرت کے سر رہا۔ بحمداللہ کہ زنانہ رسالہ النساء جو دکن سے پہلے پہل نکلا۔ وہ بھی انہیں کے گھر سے نکلا۔ کیونکہ خدا غریقِ رحمت کرے حضرت فریاد علیہ الرحمۃ میرے خسر تھے۔ حضرت کی ولادت باسعادت ۱۲۱۹ھ و رحلت ۱۲۹۶ء بمقام عظیم آباد۔

میں چاہتی ہوں کہ اس سارے مضمون کو ہزار داستان کے ایک ہی نمبر میں نکال لیں۔ چونکہ مضمون ذرا طویل ہو گیا۔ حالانکہ حضرت کے حالات کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے اس لئے حضرت کا بہت تھوڑا کلام بطور نمونہ اس کے ساتھ ارسالِ خدمت کرتی ہوں۔ اگر آپ کو منظور ہے تو میں اکثر جستہ جستہ کلام بلاغت نظام بھیجا کرونگی۔

صغرا ہمایون مرزا

رُباعی

عیب است بزرگ برکشیدن خود را
وز جملۂ خلق برگزیدن خود را
از مردمکِ دیدہ بباید آموخت
دیدن ہمہ کس را و ندیدن خود را

اشاعات جدیدہ

خلافت الٰہیہ :- یہ کتاب حضرت مولوی عبد الماجد صاحب بدایونی مدظلہ کی زیر تالیف مکمل "تاریخ خلافت" کا پہلا حصہ ہے۔ جو شائع ہو چکا ہے۔ اور یہ حصہ عہد خلافت عظمیٰ نبویہ کے دور سعادت کے احوال پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا انداز تالیف سیرت نگاری نہیں بلکہ وہ پہلو نمایاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو سردار دو جہاںؐ کے منصب خلافت سے متعلق کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ غزوات و فتوحات کے بیانات قابل مطالعہ خصوصی ہیں۔

مؤلف موصوف نے تاریخی مقامات تنقید سے سرسری گذر جانے پر اکتفا فرمائی ہے۔ گو معجزات و اخلاق کا ذکر بھی ہے۔ مگر اس میں کوئی اہتمام نہیں کیا گیا۔ کیونکہ غایت تالیف اس کی مقتضی نہ تھی۔ جمعیت مضامین اور ترتیب مطالب میں فاضل مؤلف کی کاوش کا ثبوت ملتا ہے۔ اور اس حسن سعی کے ماجور و مشکور ہونے میں کوئی شک ہی نہیں رہتا۔

عام مسلمانوں کے لئے ایسی کتابوں کا مطالعہ نہ صرف توسیع معلومات ہی کا باعث ہوگا۔ بلکہ موجب فلاح و سعادت اور سبب ثواب بھی ہے۔ کتابت و طباعت گوارا ہے۔ حجم ۲۲۸ صفحات۔ تقطیع ۱۸×۲۲ ۱/۸ قیمت صرف عا۔

قومی دار الاشاعت میرٹھ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اعظم الاخلاق :- اس نام سے ایک مختصر رسالہ جناب سید منظر احسن صاحب نے، اخلاقی مطالب جمع کر کے تالیف فرمایا ہے۔ یہ رسالہ اعلیٰ حضرت حضور نظام خلد اللہ ملکہ و سلطنتہٗ کے شاہزادگان والا تبار کے اسمائے گرامی سے معنون کیا گیا ہے۔ اور غالباً شاہزادگان ممدوح ہی کے لئے مؤلف موصوف نے دوران وظیفہ یابی میں تالیف بھی کیا ہے۔ ترتیب مطالب و عناوین میں مؤلف نے مبادیٔ اخلاق کا احاطہ کر لینے کی کوشش فرمائی۔ اور کافی حد تک کامیاب بھی نظر آتے ہیں بہت ممکن ہے کہ طلباء کے لئے عام طور پر اس کا مطالعہ مفید ثابت ہو۔ حجم ۶۶ صفحات۔ رسالہ مؤلف موصوف سے طلب کیا جا سکتا ہے

گلہائے بہار :- اس نام سے چھوٹی تقطیع کے ۶۵ صفحات کا ایک خوبصورت رسالہ ہمارے عنایت فرما سید عابد علی صاحب عابد نے شائع کیا ہے جن کے مضامین شوخ و شنگ پہلے پہل اوراق ہزار داستان پر باعث زینت ہوئے ہیں اور ہوتے رہینگے۔ کیونکہ ابھی عابد صاحب کے عہد ادبی کا عنفوان ہے نہ کہ خدانخواستہ انحطاط۔ گلہائے بہار یونانی علم الاصنام کے اُن افسانوں کے مجموعہ کا ترجمہ مستزاد ہے جن افسانوں میں تخلیق گلستان کی وہمی توجیہات کا ایک رنگین اور شاعرانہ سرمایہ ہے۔ رسالہ کی دلچسپی میں کوئی شبہ نہیں۔

دار التالیف پرانی انارکلی لاہور سے ۸ر میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

رجائنٹ ایڈیٹر

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام [illegible] پنجند پروپرائٹر کے چھپا اور دار الاشاعت ادب لطیف کے لئے سید افضال علی حسنی پبلشر نے شائع کیا)

چندہ ششماہی چار روپے
چندہ سالانہ

ہزار داستان

ایڈیٹر حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

جلد ۲ | اشاعت ماہِ فروری سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

تصویر — سر ڈاکٹر محمد اقبال مدظلہ

رسالہ ہزار داستان لاہور

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

میں آج فخر، مباہات اور نیاز و عقیدت کے انتہائی احساس سے اس شعر کو اس صفحہ کی زینت بناتا ہوں جو ایک گرامی قدر خریدار ہزار داستان نے مکۂ معظمہ کی خاک پاک سے ارسال فرمایا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ یہ نشانِ سعادت بنکر ہزار داستان کے نئے دور کیلئے باعث یمن و برکت ہوگا

اللہ رے اس کے حسن کی عالم فریبیاں   جس رازداں کو دیکھتے وہ بدگماں رہا

سر ڈاکٹر محمد اقبال مدظلہ العالی کی تصویر کا انتظار ہزار داستان کی چند روزہ تعویق کا باعث ہوا ہے۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ ہزار داستان کی موجودہ اشاعت اس گرانمایہ شبیہ سے مزیّن ہو کر جا رہی ہے۔ یہ تصویر چند اعتبارات سے خاص اہمیت رکھتی ہے۔ جن کا تذکرہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس کو ہندوستان کے نامور مصنّف اور مصوّر سردار امراؤ سنگھ بہادر مجیٹھیہ بالقابہ نے اس عقیدت و محبت سے سرشار ہو کر جو ان کو علامہ موصوف سے ہے کھینچا ہے۔ سر اقبال اس وقت اپنے خلوت گاہ فضل میں آئین سٹائین کے نظریۂ تکوینِ اضافی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ وہ قطعہ جو موصوف کے نتائج افکار میں سے ہے۔ اور جس سے مقابل کا صفحہ مزیّن ہے۔ اسی نظریہ پر غور و خوض کرنے کے بعد معرض ظہور میں آیا۔ میں چوہدری محمد حسین صاحب ایم۔ اے کا ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے پیامِ مشرق کی اشاعت کا پیامی بنکر اس اہم تصنیف کا مژدہ آمد سنایا۔ اور اپنے عالمانہ مضمون میں جو اسی اشاعت میں شائع ہو رہا ہے۔ بہت سے حقائق علمیہ پر روشنی ڈالی۔ قطعہ کا عنوان میں نے علامہ موصوف کی مشہور نظم تسخیر فطرت کے ایک باب پیدائش آدم کے ایک لاجواب شعر سے اخذ کیا ہے۔ جس میں انسان کی تخلیق کا مژدہ اس پیرایہ میں سنایا گیا ہے

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور   خودگرے خود شکنے خودنگرے پیدا شد

چونکہ رسالہ کی ترتیب و تدوین شروع ماہ میں کر دی جاتی ہے۔ اس مرتبہ ایسے مضامین اور افسانوں کی قلت تھی۔ جو رسالہ کی نئی تدبیر کار کو مدنظر رکھتے ہوئے شائع ہو سکتے۔ اس لئے مجھے اپنے ہی ناکارہ تخیّل سے ضرورت سے زیادہ کام لینا پڑا۔ یہ ایک مجبوری ہے۔ اور اسے میں معیوب سمجھتا ہوں۔ امید ہے کہ حضرات اہلِ قلم ہزار داستان کو کم از کم اپنی قلمی اعانت سے محروم نہ رکھیں گے۔ اور رسالہ کو اس تنوع سے مالا مال کرنے کی کوشش کرینگے۔ جو مختلف طبائع کے افکار کا لازمی نتیجہ ہے

رجال ہزار داستان کے عنوان سے ہزار داستان کی حیاتِ ششماہہ پر ایک دلچسپ اور سبق آموز تنقید اسی اشاعت میں شائع ہو رہی ہے۔ میں جناب یوسف عزیز صاحب (ایڈیٹر نقاش بدایوں) کا ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے ہزار داستان کا اس بالغ نظری سے مطالعہ کیا۔ اور ان نتائج سے مجھے اور ناظرینِ ہزار داستان کو محروم نہ رکھا۔ جن پر ایک صحیح مطالعہ کے بعد ہر صاحب الرائے اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق پہنچ جاتا ہے۔ میں اس ستائش اور فمائش کے لئے جو انہوں نے مجھ پر ارزانی فرمائی ہے۔ ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ مگر ساتھ ساتھ یہ بھی عرض کر دینا چاہتا ہوں۔ کہ اگرچہ میں ایڈیٹر کے معروف غیر جانبدارانہ مسلک سے مجبور ہو کر اس تنقید کو رسالہ میں شائع کر رہا ہوں۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ میں ان تمام آرا سے متفق ہوں۔ کہ جو انہوں نے ہزار داستان کے نامور مضامین نگاروں کے اندازِ تحریر کے متعلق ظاہر کی ہیں۔ عدم گنجائش سے اس مرتبہ صرف حصّہ نثر کی تنقید ہی شائع ہو سکی ہے۔

ایڈیٹر

خودی

ز انجم تا به انجم صد جهان بود
خرد هر جا که پر زد آسمان بود
ولیکن چون به خود نگریستم من
کران بیکران در من نهان بود

اقبال

پیغامِ مشرق

اقبال کے تخیل کی نئی فضاؤں میں پرواز

جرمن کے مشہور حکیم و شاعر گوئٹے کی کتاب "مغربی دیوان" کا جواب

اٹھارھویں صدی عیسوی میں جرمنی کی حالت اور گوئٹے

فطرت نے ہر فرد کو ایک ضمیر عطا کیا ہے۔ مگر ایسے منفرد ... اس فرد کو فطرت صدیوں بعد پیدا کرتی ہے۔ جسے ایک ابدی و آفاقی ضمیر کا متحمل و امین بنانا منظور ہوتا ہے۔ یوں کہو کہ فطرت سالہا سال تک اپنی خاص قیمتی جوہر پیدا کرنے والی قوتِ مولدہ کو جمع کرتی اور ذخیرہ کرتی رہتی ہے۔ تاکہ اس کے اس اپنے عمل جمع یا اس کے سابقہ و موجودہ پیدا کردہ قوتی و اعضا کے مسلسل صرف و اضمحال سے اجتماعِ بشری ایک خاص وقت تک پہنچ کر اس حد تک سست و کمزور اور افسردہ و مضمحل ہو جاتا ہے۔ کہ جب تک حیات کے سوز و اضطراب کی ایک نئی رو دوڑائی جائے اس کی اقدامی حرکت کے درجہ سکون تک پہنچ جانے کا خدشہ ہوتا ہے۔ اس لئے حسبِ ضرورت و اہمیت مرسلین ملہمین حکما شعرا۔ ضعف و انحطاطِ زندگی کے ان مخصوص زمانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ (یا پیدا کئے جاتے ہیں) اور بقدرِ حوصلہ و ہمت سمندِ حیات کو اپنی اپنی مہمیز سے سبک خرامی پر آمادہ کرتے ہیں۔

جرمنی کا شہرہ آفاق حکیم و شاعر گوئٹے ۱۷۴۹ء میں جرمنی کے ایک شہر "فرینکفرٹ آن مین" میں پیدا ہوا۔ ذلت و انحطاط کا جو زمانہ جرمنی نے اٹھارھویں صدی عیسوی کے دوسرے نصف اور انیسویں صدی کے آغاز میں دیکھا وہ شاید دنیا کی بدنصیب سے بدنصیب قوم کے پیش نہ آیا ہوگا۔ جن محکومی اور غلامی کی زنجیروں میں اہلِ جرمنی اس زمانہ میں جکڑے گئے جس قعرِ ذلت میں اس عرصہ میں گرے۔ تاریخ کوئی ایسا دوسرا عہد بطورِ شہادت پیش نہیں کر سکتی جس میں یہ لوگ اس سے بڑھ کر صیدِ آفات ہوئے

مصاحب ہوتے ہوں۔ اُن کے فاتحین یعنی فرانسیسیوں کا خیال ان کے متعلق یہ نہیں تھا کہ یہ "انسان" ہیں بلکہ وہ انہیں "غلام" متصوّر کرتے تھے۔ غلامی آج بھی ربعِ مسکون کے سینکڑوں گوشوں میں مخلوقِ خدا کو بندۂ ماسوا بنا رہی ہے۔ تاہم "تہذیب" کی "ترقی" نے لفظِ غلام کے معنی کچھ بدل دیتے ہیں۔ جو مفہوم اس نامبارک لفظ کا اُس زمانہ تک تھا اُس کے مطابق واقعی غلام "انسان" نہ تھے اور جن لوگوں پر اس لفظ کا اطلاق تھا وہ اگر حیوانوں سے رتبہ میں کچھ زیادہ تھے۔ تو صرف اسی قدر کہ ان کی شکلیں اور صورتیں انسانوں کی تھیں۔ گوئٹے کی شہرت سُن کر جب نپولین نے گوئٹے کو اپنی خدمت میں بلایا۔ تو اُسے دیکھتے ہی پہلے درجہ کے حیرت آمیز تعجب کے ساتھ بے اختیار بول اُٹھا کہ "ہیں! یہ تو انسان ہے۔ جرمن نہیں"۔ گویا جرمن ہو کر "انسان" ہونا بہت ہی بعید از قیاس تھا۔ جرمنوں کا انسانیت کے دائرہ سے اخراج کس کوتاہی، کس کمی کس گناہ کی بدولت ہوا؟ دل کہتا ہے کہ وہ کوتاہی ہمت و استقلال کی کوتاہی ہوگی۔ ضمیر کہتا ہے کہ وہ کمی صداقت و ایمان اور خودشناسی و خودداری کی کمی ہوگی۔ رُوح کہتی ہے کہ وہ گناہ عدمِ ایثار و عدمِ ذوقِ شہادت کا گناہ ہوگا۔ مگر اس گئے گذرے اور اس حد تک گئے گذرے زمانہ میں جبکہ ساری کی ساری قوم غلاموں کی قوم تھی نہ کہ انسانوں کی۔ قسمت اپنا کرشمہ دکھلائے بغیر نہ رہی۔ فطرت اپنا معجزہ آشکار کرنے سے باز نہ آئی۔ چند لمحوں کا تفکر۔ چند ساعتوں کا تصوّر کافی ہوگا۔ اُس عظیم الشان ہستی کی کچھ تھوڑی سی حقیقت و عظمت آنکھوں کے سامنے لانے کے لئے جو اگرچہ اسی اسفل و ارذل گروہ کا ایک فرد تھا۔ مگر نپولین اعظم جیسا "انسان" نپولین اعظم جیسا "مرد" اُسے دیکھتے ہی بے ساختہ "انسان" اور "مرد" کہنے پر مجبور ہُوا۔

گوئٹے کن کمالات کا مجسمہ تھا۔ کونسے علوم و فنون کا سرچشمہ تھا۔ فطرت نے اپنی مختلف قوتیں کس حد تک اس فرد میں ودیعت کی تھیں۔ اُس کے ذہنِ رسا کی پرواز حکمت کی کن بلندیوں تک تھی۔ اُس کی کیفیات رُوحانی زندگی کے حقائق و نکات کی عقدہ کشا تھیں۔ اس کے جذبات و افکار تھے۔ یا کسی بالاتر ہستی کے نازل کئے ہوئے الہامات۔ یہ سوال ہیں جن کے جوابات لکھنے کے لئے کتابیں کیا دفتر ہوں تو کافی نہ ہوں۔

ادب۔ شعر۔ فلسفہ۔ دیگر فنونِ لطیفہ کے زمانہ حال کے نقاد اس فیصلہ میں متفق الرائے ہیں کہ گوئٹے کے بعد فطرت نے آج تک گوئٹے سا وسیع النظر، طباع حکیم و سخن طراز پیدا نہیں کیا۔

گوئٹے جوں جوں عمر میں بڑھتا گیا۔ قوم کی مذہبی،

اخلاقی، تمدنی، سیاسی کمزوریاں روز افزوں پیش نظر ہوتی گئیں۔ جب قوم کے زوال و ذلت کے جگر پاش مناظر جنہیں سارے جہاں کا درد بن کر بیٹھ گئے۔ ہم جنسوں اور ہم قوموں کو محکومی و غلامی کی زنجیروں میں بے کس و بے نوا دیکھنے کی تاب لانے سے رہ چکا۔ تو بے تابانہ رازِ حیات کے حریت آموز نغمے الاپنے لگا۔ پھر کیا تھا۔ درماندہ و افسردہ دل تڑپ کی لذت سے آشنا ہو گئے۔ بے حس و حرکت روحیں ذوقِ اضطراب پا کر عرصۂ عمل میں جولانیاں دکھانے پر آمادہ ہو گئیں۔ اور پھر کیا کیا جولانیاں دکھائیں۔ قریباً دو سو سال کے بعد وہ آج اس زمانہ میں ہم نے اپنی آنکھوں سے بھی دیکھیں یا کم از کم ہمارے کانوں نے سنیں۔

فطرت کا یہ طلسم حقیقتاً بڑا محیر العقول ہے۔ قلزمِ حیات حقیقی خشک ہوتے ہوتے جب سراب رہ جانے کو ہوتا ہے۔ اُس کی تہ سے ریگ کے ذرات میں سے یک دفعہ ایک گوہرِ تابندہ نمودار ہوتا ہے۔ اور اپنی حیات آفریں آب و تاب سے سرابِ زندگی کو آناً فاناً پھر سے آبِ حیات کے سمندر میں تبدیل کر جاتا ہے۔ "غلام" "انسان" بن جاتے ہیں۔ زندگی نئی زندگی اختیار کرتی ہے۔

گوئٹے کی سب سے اعلےٰ اور اہم تصنیف جس نے جرمنی کے افراد کو افراد اور قوم کو قوم بنایا۔ اُس کا وہ مشہور و معروف ڈراما ہے۔ جس کا نام "فوسٹ" ہے۔ یہ مبالغہ نہیں حقیقت ہے۔ کہ جرمنی کے لوگ اس کتاب کو الہامی تصور کرتے ہیں۔ عقیدتاً ضرور ایسا مانتے ہیں۔

گوئٹے اور حافظِ شیراز

نپولین کے حملوں اور اُس کی حکومت کے جبر و استبداد سے پامال ہونے پر جب جرمنی کی حالت اسقدر ناگفتہ بہ ہو گئی۔ کہ گوئٹے کے پرسوز و حکمت آموز ترانوں پر کان دھرنا لوگوں کو مشکل ہو گیا۔ اور خود گوئٹے کے لئے ایسی "حکمت" سیدھی اور صاف زبان میں سکھانا آسان نہ رہی تو قدرت نے ایک نرالے طریق سے اپنے فرستادہ کی مدد کی اور جو کام اُس سے اُس حالت میں بھی لینے رہنا مقصود تھا وہ مسلسل لیتی رہی۔ اپنے اصلی و قدرتی مغربی انداز میں لکھنے سے گوئٹے اُکتانے ہی کو تھا کہ ۱۸۱۲ء میں جرمنی کے ایک دوسرے ادیب و شاعر نے دیوانِ حافظ کا ترجمہ جرمن زبان میں شائع کر دیا۔ گوئٹے نے جونہی اسے دیکھا۔ اور پڑھا۔ حافظ کا اندازِ ترنم باوجود اس امر کے کہ اب اس کے ساتھ فارسی زبان کی وہ شیرینی اور سحر طرازی نہ رہی تھی۔ اُس کی طبیعت پر فوراً اثر کر گیا۔ اور اُس نے اسی وقت یہ ارادہ کر لیا کہ وہ خیالات جن کا اظہار اب پرانے انداز میں موثر نہیں رہا۔ حافظ کے تتبع میں جادو کا اثر دکھائیگا۔ جدتِ طرزِ ادا بجائے خود

لگاؤ کو حافظؔ انعمل کی طرف کھینچتی ہے۔ اور جو مقصد فوت ہوتا نظر آتا تھا۔ زندہ تر ہو کر قوم کے مُردہ افراد کو زندہ کرتا رہیگا۔

گوئٹے نے نہ صرف حافظ سے غزل کا انداز ہی لیا بلکہ سینکڑوں لطیف اور نازک معانی وحقائق استفادہ کئے۔ مگر پھر بھی خُذ ما صفا کی حد سے آگے نہ بڑھا مضامین اور ان کی سپرٹ وہی قائم رکھی جو اس کی اپنی تھی۔ ترنّم و سوز حافظ سے لیا۔ اور پھر ایک بار اس ہمدردانہ بیدردی سے قوم کو نئے سرود اور نئے انداز سے تڑپایا۔ کہ حیاتِ حقّہ کے حصول کے لئے اُن میں پہلے سے دُگنی سعی وقوتِ عمل کی آگ بھڑک اُٹھی۔ پانچ چھ برس میں یہ نظموں یا غزلوں کا مجموعہ تیار ہوا۔ "ویسٹ آسٹلشر دیوان" یا "مغربی دیوان" کے نام سے اسے موسوم کیا۔ اور ۱۸۱۹ء میں مکمل و مرتب کر کے شائع کر دیا۔ کتاب کے اس نام میں جو مفہوم مضمر تھا وہ بھی یہی تھا کہ مغرب اس وقت قسمت کے چکروں میں ہے۔ فساد و فتنہ کا گھر ہے۔ بد اخلاقی و بدنظمی میں مبتلا ہے۔ ظلم واستبداد کے تیروں کا نشانہ ہے۔ اور اپنے ہمدرد مشرق کی طرف اپنی غم واندوہ کی داستان اُسی کے اندازِ بیان میں سُنانے کو متوجہ ہوتا ہے

تاریخی اعتبار سے اس زمانہ میں مشرق کا اپنا انحطاط شروع تھا۔ تاہم وہ حالت نہ تھی۔ جو اس کی اب ہے یا جو اس وقت مغرب کی تھی۔

اقبال اور مشرق کی موجودہ حالت

مشرق کی جو حالت اس زمانہ کے بعد ہوئی اسے قلمبند کرنا سوائے اس کے نہیں کہ انہیں الفاظ کا اعادہ کر دیا جائے۔ جو جرمنی یا مغرب کے متعلق اُوپر لکھے جا چکے ہیں۔ طوالتِ مضمون کا ڈر مانع تفصیل ہے۔ ورنہ بنظرِ غائر دیکھا جائے۔ تو بحیثیتِ مجموعی صورتِ حالات بدرجہا بدتر ہوگئی۔ کونسا ملک تھا۔ جو غلامی ومحکومی کی بند وقید سے آزاد رہا۔ کونسا صوبہ تھا۔ جہاں بدامنی نے ہلاکت نہیں ڈھائی۔ کونسا شہر وقصبہ تھا۔ کہ قحط و مصائب کی زد میں نہیں آیا۔ کونسا گھر ہے جہاں غربت و افلاس نے پرورش نہیں پائی۔ پھر ان سب سے بڑھکر خانہ جنگیوں نے جو خانہ بربادیاں کیں۔ اُن کا بیان احاطہ تحریر سے باہر ہے۔ تمام مشرقی اقوام ومِلل آپس کے نفاق اور دشمنی کی لعنتوں میں گرفتار ہوگئیں۔ دوسرے معنوں میں اخلاقی تمدنی سیاسی اعتبار سے افراد کیا اور اقوام کیا سب ننگِ زیست ہو گئے۔ سب افراد اصل انسانی حیثیت سے مسخ ہو چکے۔ گویا "غلام" تھے۔ گو غلام کہلاتے نہ تھے۔

دُنیا میں جنگ عظیم برپا ہوئی۔ سینکڑوں سوئی ہوئی کلیں جاگ اُٹھیں۔ مگر ان اقوام کی رفتار وہی تیلی کے بیل کی رفتار رہی۔ وہی ہنوز آنجائی کا قصّہ ہے

خزاں رسید و کسے آشنائے عیش نہ شد
بہار ہمچو غریباں ازیں دیار گذشت

مگر فطرت جو کرشمے غرب میں دکھا سکتی ہے مشرق میں دکھانے سے قاصر نہیں۔ زندگی کی نگاہوں میں مغرب و مشرق کی کوئی تمیز نہیں۔ مغرب میں گوئٹے سا نغمہ گو اگر مردہ جانوں میں سوز کی لہر دوڑا سکتا ہے تو مشرق میں اقبال سا نباض حیات ہر بیخود و بے جان کو خودی اور زندگی کی لذت سے آشنا کرنے کو تیار ہے۔ اور کر رہا ہے۔

مشرق کی یہ عظیم الشان ہستی جس سے فطرت کو سینکڑوں گنا زیادہ وہ کام لینا ہے۔ جو اس نے گوئٹے سے لیا۔ خدا ہی کے علم میں ہے کہ اپنی انتہائی تکمیل میں کن کارناموں کی مالک ہوگی۔ جو کارنامے یہ ہستی اب تک دکھا چکی ہے۔ حقیقت کے جو نئے اسرار پردۂ مجاز کو اٹھا کر اب تک انسانی آنکھوں کے سامنے لا چکی ہے حکمت کے آفتاب کو افق پر نمودار کر کے مشرق کو جس حد تک صحیح معنوں میں مشرق بنا چکی ہے۔ از خود رفتگاں کو جس قدر باخود و خوددار بنا چکی ہے سوز و گداز کے نغموں سے زندگی کے قلزم میں جو جو ہیجان و طوفان برپا کر چکی ہے۔ اس کی تشریح و تنقید کے لئے نہ ہی یہ جائز محل ہے۔ اور نہ ہم اس داستان کو یہاں چھیڑنا چاہتے ہیں۔

مخاطب اہل نظر اصحاب سے ہے۔ شپرہ چشموں کو ہستی آفتاب کے قائل کرنے کے ہم اہل نہیں۔ جن واقعات نے ہمیں خاص طور پر انگشت بدنداں کر رکھا ہے۔ وہ محض فطرت کے طریق عمل کا مطالعہ ہے۔ اقبال کے درد و سوز کا گوئٹے کے درد و سوز سے مقابلہ نہیں۔ اقبال کے محرم راز حیات ہونے کا گوئٹے کے شناسائے رموز زیست ہونے سے موازنہ نہیں۔ اقبال کے محاسن حکمیہ و شعریہ کا گوئٹے کے کمالات عقلیہ و علمیہ سے توارد نہیں۔ جو بات اس تطابق کو حیرت کے انتہائی درجہ تک لے جانیوالی ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگر فطرت نے ایک بادشاہ کو گوئٹے کو 'انسان' یا 'مرد' کہنے پر مجبور کیا تو آج اقبال نے بھی حکومت کی طرف سے "انسان اور مرد" کا خطاب پایا۔ اور خدا گواہ ہے کہ ہماری آنکھوں میں خطاب "سر" کے دیتے جانے کے اس کے سوا اور کچھ معنی نہیں۔

گوئٹے اور اقبال

وحیِ الٰہی جب بھٹکے ہوئے بندوں کی طرف بواسطہ رسول بھیجی جاتی ہے۔ تو اس کا پہلا مقصد فرد کی اصلی شخصیت کو قائم کرنا ہوتا ہے۔ دوسرا افراد کے مجموعہ یعنی قوم کو اس کے حقیقی نصب العین کا پتہ دینا۔ اور تیسرے اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے زندگی کے آئین و اصول وضع کرنا۔ تمام کامل اور اعلےٰ منصب کے

انسانوں یعنی حضراتِ مرسلین و انبیا نے بھی فرائض ادا
کئے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ دوسرے رتبہ کے افراد یعنی
ملہمین اور حکما و شعرا نے انہیں مقاصد کی تائید تاکسیں
کس حدتک کی ہے۔ ان میں سے جس جس نے اپنا
مطمحِ نظر اسی بہبودیِ بنی نوع کو قرار دیا ہے۔ اور جو
حیاتِ انسانی کو محکم و استوار کرنے میں (نہ کہ اس کو کمزور
و ناتواں کرنے میں) تھوڑا بہت کامیاب ہوا ہے۔ وہ
بیشک قابلِ احترام ہے۔ اور نوع کا محسن۔ لیکن جو اس
معیار پر صحیح نہیں اتر سکتا وہ محض مدعی ہے۔ اور مقصدِ حیات
سے ناآشنا۔

دوسرے رتبہ کے حضرات کے مدارج کو کماحقہٗ
سمجھنے کے لئے یہ لازمی ہوگا کہ پہلے یہ امر ذہن نشین
کر لیا جائے۔ کہ الہام اور حکمت اور شعر کو وحی سے کیا
نسبت ہے۔ اگرچہ یہ مضمون میری استعداد و قابلیت
سے بالاتر ہے۔ تاہم تسلسلِ بیان کی خاطر اتنا عرض کر
دینا کوئی بے محل جرأت نہ ہوگی کہ شعر زندگی کی ایک
تڑپ ہے۔ ایک جذبہ ہے۔ ایک شرر ہے جو زندگی کے
اپنے ہی بہترین و منزہ ترین حاصلِ تعمیر، خدا کے گھر
یعنی انسانی دل سے بہ لباسِ صوت باہر ٹپکتا ہے اور
فضائے بیرونی میں قرار نہیں پکڑتا۔ جبتک کہ دوسرے
دلوں میں جا کر دل نہیں بن جاتا۔ یا پھر عین زندگی نہیں
ہو جاتا۔ بحرِ ہستی کی تمام روانیاں۔ اس کی تمام طغیانیاں
ہستی کے اسی شرر اسی اضطراب سے پیدا ہیں۔ یہ نہ
ہو تو یہ بحر منجمد ہو۔ اور جبتک یہ نہ تھا یہ بحر واقعی منجمد تھا۔
زندگی کا یہ کیفِ اضطراب فطرتاً اپنے عدم سے وجود میں
آنے کے لئے ایک دوسرے سوز کو اختیار کرتا ہے یعنی
صوت کو۔ جسے عرفِ عام میں موسیقی سے تعبیر کیا جاتا
ہے۔ جو چیز شعر و موسیقی میں رشتہ قائم کرتی ہے اسی
کا نام موزونیّت ہے۔ ہر ملک اور ہر قوم کے شعر و موسیقی
نے باعتبارِ زبان و ماحول الگ الگ موزونیّت اختیار
کی ہے۔ موزونیت پر حدود و قواعد کی ٹھوس قیدیں فطرت
کو اپنے کرشمے دکھانے سے روکنے کی بودی تدبیریں
ہیں۔ جن میں مدعیانِ ناقص کامیابی کا کبھی منہ نہیں
دیکھ سکتے۔ حکمت کمالِ علم و کمالِ عمل کے مجموعہ کا نام ہے
دوسرے الفاظ میں ایک جستجوئے صداقت ہے۔ گو
عین صداقت نہیں۔ وحی، شعر و حکمت دونوں پر حاوی
ہے۔ اور دونوں کے کمالات کا مجموعہ۔ وحی میں جو بات
بالخصوص ممیّز ہے۔ وہ اس میں صداقتِ حقّہ کا جوہر ہے
جس میں حیاتِ حقیقی کا تمامتر دار و مدار ہے۔ وحی کا
حامل اس صداقت میں بدرجۂ اتم ایقان و ایمان رکھتا
ہے۔ "لاریب فیہ" وحی کے ہر جملے۔ ہر لفظ۔ ہر حرف
کی شان ہوتی ہے پس جو فرق عینِ صداقت و جستجوئے صداقت

میں ہے۔ وہی فرق مرسل و حکیم میں ہے۔ یہی نورِ صداقت
جس آتشی لباس میں خدا کی طرف سے آراستہ کر کے
عطا کیا جاتا ہے اُسی کا نام شعریت ہے۔ صداقت کاملہ
لاینفک ہے۔ محض شاعر کبھی کامل شاعر نہیں ہوتا۔
بعینہٖ اسی طرح محض حکیم کبھی کامل حکیم نہیں ہوتا۔ شاعر کی
بھی حاملِ وحی سے وہی نسبت ہے جو حکیم کی ہے۔
صرف پہلو دوسرا ہے۔ بغیر محدودِ وحی ہونے کے شاعر
شعریتِ حقہ کا مالک نہیں ہو سکتا۔ بلکہ انہیں الفاظ
میں جستجوئے شعر میں سرگرداں رہتا ہے۔ لہٰذا جو فرق
عینِ شعریت و جستجوئے شعریت میں ہے وہی ایک
حاملِ وحی و شاعر میں ہوگا۔ گویا شعر و حکمت وحی کے دو
ایسے اہم خواص ہیں جو محض شاعر و محض حکیم میں اپنے
کمال کو نہیں پاتے۔ شعر و حکمت بلا تکلف قلبِ انسانی
پر نازل و وارد ہوں۔ مگر اُن کے اندر کی صداقت
انتہائی صداقت کا درجہ نہ رکھتی ہو یا مشتبہ ہو تو اُسے
الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اعلےٰ پایہ کا شاعر اعلیٰ پایہ
کا حکیم عموماً ملہم ہوتا ہے۔

وحی۔ الہام۔ شعر۔ حکمت کی جو تعریفیں لکھی گئی ہیں
ان کے جانے بغیر گوئٹے اور اقبال کا سمجھنا یا ان کے
شعر و سخن کی قدر و منزلت کا اندازہ لگانا محالِ محض ہے۔
دیکھنا یہ ہے کہ کس قدر ملہم یا حکیم یا شاعر دُنیا میں ایسے
ہوئے۔ جو اس معیار پر صحیح اتر سکتے ہیں۔ اور اصل الہام
یا حکمت یا شعریت ان کے حصّہ میں آئی۔ الگ الگ
اِن خواص کے مالک شاید بہت نکل آئیں۔ ہماری
ناقص رائے میں ایسے بہت کم ہونگے جو اِن ہر سہ
کمالات کے مالک ہوں۔ شیکسپیئر۔ ڈانٹے اور
مولانا روم کے سوا اگر کوئی اور دو ہستیاں اس شمار
میں آسکتی ہیں تو وہ اٹھارھویں صدی میں گوئٹے تھا۔
اور آج بیسویں صدی میں اقبال۔

قوم کی ذلّت۔ قوم کے دُکھ۔ قوم کے انحطاط کو دیکھ
کر جو درد گوئٹے کے دل میں اُٹھا۔ اُس سے سوگنا زیادہ
درد آج ایشیائی اقوام کی حالت دیکھ کر اقبال کے دل
میں اُٹھا۔ بنی نوع کو غلامی کی جس پستی سے نکالکر حریت
کی بلندی پر پہنچانا گوئٹے کی قسمت میں تھا۔ اس سے
پست تر پستی سے نکالکر بلند تر بلندی پر بنی نوع کو لیجانا
اقبال کے حصّہ میں ہوا۔ جس مردِ خدا کو تمام دُنیا کے
لٹریچر پر یا کم از کم جرمنی اور ہندوستان کے لٹریچر پر یکجا
تبصرہ کی توفیق ہوگی۔ وہ ان دونوں ہستیوں کے صحیح
جوہروں کو اندازہ کرنے اور اُن پر قطعی رائے دینے کا
مجاز ہوگا۔ کئی اور موضوعوں کی طرح میری طاقت سے
یہ موضوع بھی باہر ہے۔ کہ میں اِس مضمون کے سلسلہ
میں اس پر قلم اُٹھاؤں۔ ہاں اتنا کہنے سے نہیں رُک

سکتا۔ کہ فطرت نے دونوں کو ایک ہی جوہر سے پیدا کیا ہے۔ کمیّت میں تفاوت ہو تو ہو کیفیّت میں فطرت نے دونوں کو ایک ہی سا احساس۔ ایک ہی سا دردِ دل۔ ایک ہی سا سوز و گداز ایک ہی سی فکرِ بلند ایک ہی سی بالغ نظری ایک ہی سا ضمیر جہاں نما عطا کیا ہے دماغی عقلی۔ روحانی موازنوں کو چھوڑ کر میرا خیال ہے کہ دونوں کی روزانہ زندگی کا مطالعہ اس راز کا منکشف ہوگا۔ کہ قوائے باطنی کے یکساں ہونے کی بنا پر دونوں کے عام اخلاق و محاسن دنیوی بھی ایک ہی قسم کے ہونگے۔ خدا کے پیغمبروں کو خدا کے "شاگردوں" پر ہر پہلو سے فوقیت ہے۔ مگر اس پایہ کے شاگردوں پر قدرت بھی اگر ناز کرے تو بجا ہوگا۔ ایسی ہستیوں کا پیدا کرنا اس کی قوتِ اعجاز کے طلسم ہیں۔ پیغمبروں کو براہِ راست وحی عطا کر کے خدا انہیں دماغ سوزی کی زحمت سے بچا لیتا ہے۔ اس کے عوض ان کے دلوں میں قوتِ ارادی شدّت کے ساتھ بھر کر اُن کو اس قابل بنا دیتا ہے۔ کہ دُنیا کے تختے اپنے ہاتھوں اُلٹ دیں۔ حکیم یا شاعر محروم وحی ہونے کے سبب دماغی کاوشوں سے فرصت کم پاتے ہیں۔ قوتِ ارادی از خود کم ہو جاتی ہے اور عملی راہنمائی سے اپنے ہاتھوں دُنیا میں انقلاب پیدا کرنے سے بسا اوقات قاصر رہ جاتے ہیں۔ گویا حکماء و شعراء بہت حد تک فطرتاً میدانِ عمل میں باہر نکلنے سے مجبور ہیں۔ وہ صرف فطرت کے حکمت و شعر پیدا کرنے یعنی زندگی اور اس کا سوز پیدا کرنے کے آلے ہیں جن سے نکل نکل کر زندگی عوام میں سرایت کرتی جاتی ہے۔ حتےٰ کہ عوام میدانِ عمل میں گرم رفتاری پر آپ کو مجبور پاتے ہیں۔

حاصل کلام مغرب کی ذلّت گوئٹے کو گوارا نہوئی اس کی فطرت نے ذلّت کے خلاف بغاوت کی۔ آج مشرق کا انحطاط اقبال کو ناگوار ہوا۔ اُس کی فطرت اس انحطاط کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ گوئٹے نے مغرب کی ذلت کے احساس کو مشرق تک پہنچانا چاہا۔ اور "مغربی دیوان" لکھ کر دل کی بھڑاس نکالی۔ اقبال نے آج مشرق کے انحطاط سے مغرب کو روشناس کرنے پر کمر باندھی ہے۔ بلکہ خود مغرب کو روبہ انحطاط ہونے کی تنبیہ کرنے کی ٹھانی ہے۔ اور "پیامِ مشرق" لکھ کر دل کے بخار نکالنے والا ہے۔ اور مجھ کو بطور اعلان اس جگہ یہ کہنا ہے۔ کہ یہ تمام مضمون "پیامِ مشرق" ہی کے عنقریب شائع ہونے کا پیام ہے۔

اقبال اور حضرتِ حافظِ شیرازؒ

ایک جملہ معترضہ ذہن میں آیا۔ کہے دیتے ہیں۔ کیونکہ گفتنی ہے۔ "اسرارِ خودی" کے پُرانے معترضین جنہوں نے

اس نادر و جدید مجموعۂ حکمت و شعر کی قدر تو کیا کی شعرِ حافظ
کی تنقید پر یہ سوچیے۔ بجھے چراغ پا ہو گئے۔ کیا آج بنا مانگے
کہ گوئٹے کا دیوانِ حافظ کے جواب میں "مغربی دیوان"
لکھنا اور آج گوئٹے کے جواب کے جواب میں اقبال
کا "پیام مشرق" لکھ کر روحِ حافظ کی طرف سے جواب
دینا خود حافظ علیہ الرحمۃ کی کرامت ہے یا اقبال کی طرف
سے حافظ کی خدمت میں اصلی قدردانی کا تحفہ؟ شاید
کرامت کہہ دینا نہایت آسان ہوگا۔ ہم جب جانیں
اگر سخن فہم و نکتہ شناس بن کر اس قدردانی کی اہمیت
کا اندازہ لگائیں۔

پیام مشرق

بڑی مشکل سے ہم شرحِ پیام شوق تک پہنچے ہیں
مگر پہنچنا آسان بھی نہ تھا۔ علامہ اقبال کی تازہ ترین تصنیف
جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے۔ الحمد للہ کہ ترتیب پا چکی ہے
اور اُس کا پہلا حصہ کاتب کے پاس لکھنے کو جا چکا ہے
اندازہ یہ ہے کہ دو مہینہ کے اندر اندر چھپ کر شائع
ہو جائیگی۔

یہ جرأت بڑی بے محل اور قبل از وقت ہوگی اگر
ہم اس مقام پر جب کہ کتاب ابھی زیرِ طبع ہے۔ اُس
کے خواص و محاسن کو زیر بحث لائیں۔ اور اُن نوزائیدہ
افکار کے جواہر ریزوں کو پرکھنے کی نگاہ سے دیکھیں بتصنیف
کے تمام مضامین کو خود مصنف سے پڑھکر اور اس کے
بعد سب کو یکجا پیشِ نظر رکھ کر باوجود میری علمی بے بضاعتی
کے جو شعر اس تصنیف کی ایک غزل کا میری زبان
پر ہر وقت جاری ہے وہ یہ ہے۔ ؎

نگاہ می رسد از نغمۂ دل افروزے
بہ معنیٔ کہ برو جامۂ سخن تنگ است

نغمے اور اُن کی دل افروزیوں کو ایک طرف چھوڑتے
ہوئے وہ معانی جن کو باوجود تنگیٔ جامۂ سخن کے حضرت
اقبال نے پرسحر کلام کے لباس میں آراستہ کیا ہے۔
اُن کا تعلق عموماً زندگی کے بڑے اہم ترین مسائل سے
ہے۔ ناظرین کو کتاب کی خصوصیات و خیالات سے
تھوڑا بہت روشناس کرنے کے لئے اجمالی طور پر اس
کے مضامین کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ کتاب تمام
کی تمام فارسی زبان میں ہے۔ اور نظم میں یہ دیوان چار
مختلف حصوں پر مشتمل ہوگا۔ جن کے الگ الگ مستقل نام
ہونگے حصص کتاب و مضامین کی تقسیم قریباً قریباً
حسبِ ذیل ہے:۔

حصہ اوّل۔ رباعیات۔ زندگی کے مختلف دقیق اور
نازک پہلوؤں پر حکیمانہ نظر ڈالتے ہوئے شاعر نے ہزاروں
تابدار جواہر افکار کو ڈیڑھ سو رباعی کی شکل میں رکھ کر ایک
بزمِ انجم قائم کی ہے۔ بڑے بڑے گہرے مسائل حکمیہ کو

شعر کے طلسم و تاثیر سے عام انسانوں کے افہام و اذہان
کے قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ مسائل مجملاً اس قسم
کے ہیں:۔ حیات جاوید کیا ہے۔ حاصل کس طرح ہو سکتی
ہے۔ فنا و بقا کیا ہیں۔ انسان اور اس کی حقیقت کیا
ہے۔ خدا کی ذات و صفات کے کیا معنی ہیں۔ آرزو کیا
ہے۔ جہاں میں اس کے کیا کیا کرشمے ہیں۔ عشق کیا ہے
عقل کیا ہے۔ انسان ان دونوں سے متوثر کس طرح
ہوتا ہے۔ زوال کیا مصیبت ہے۔ انقلاب کی کیا
حقیقت ہے۔ زندگی مادہ کے لباس میں کیا کیا نیرنگیاں
دکھاتی ہے۔ غرض بیشمار حقائق و معارف ہیں جن پر حصا
اس مقام پر مشکل ہے۔

حصہ دوم قطعات:۔ ڈیڑھ سو کے قریب مختلف
نظمیں ہیں۔ حیات انسانی کے ہزارہا اسرار و غوامض
ان میں بتائے گئے ہیں۔ ہر لفظ میں نغمہ کی بدولت
زندگی کا وہ سوز اور وہ تڑپ ہے کہ صفحۂ قرطاس پر ہر نقش
نقش زندہ نظر آتا ہے۔ مغرب کی تمام موجودہ تہذیب
کی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ عقل و سائنس کی ایجادوں
اور کارناموں کی قلعی کھولی ہے۔ غلبۂ عقل، شکست عشق
نے دنیا کو جس پستی میں گرایا ہے اُس کا نقشہ کھینچکر دکھایا
ہے۔ اخلاق زیست کے زشت و نکو کو بہترین سے
بہترین پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ خدا اور انسان کے
تعلق کی باتیں بتائی ہیں۔ شعر و حکمت۔ علم و عمل کی حقیقتیں
واضح کی ہیں۔ بتایا ہے کہ مشرق و مغرب کے متقدمین
و متاخرین حکما کی عقلوں نے کہاں کہاں تک پرواز کی۔
شعراء نے زندگی کو کیا سمجھا۔ آفرینش عالم اسباب سے
کیا غرض و غایت مقصود ہو سکتی ہے۔ انسان مادہ کو
کس طرح مسخر کرنا جانتا ہے۔ وقت کی کیا حقیقت ہے
مکان و لامکان کے معنی کیا ہیں۔ حکومت۔ غلامی۔ حریت
کیا شعبدے ہیں کس طرح دنیا میں عمل کرتے ہیں۔ سیاست
حاضرہ کس فن کا نام ہے۔ کمزور اقوام اس کی کیوں مسحور
ہیں۔ سرمایہ و محنت کی موجودہ جنگ کیوں ہو رہی ہے اور
کیا کیا نتائج دکھائیگی۔ اس طرح مضامین کا گننا نوبت
دشوار ہے۔ بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اس حصہ کے نہایت
اہم اور چیدہ مضامین کی ایک مختصر فہرست دیدی جائے۔
مسائل حیات و آفرینش پر جو نظمیں ہیں ان کے عنوان
یہ ہیں:۔

عشق۔ دنیائے عمل۔ زندگی۔ حکمت و شعر۔ زندگی و عمل
الملک للہ۔ اگر خواہی حیات اندر خطر زی۔ تہذیب۔
محاورہ مابین خدا و انسان۔ علم و عشق۔ حیات جاوید۔
بہشت۔ تسخیر فطرت (اس بینظیر و جان بلاغت نظم
کے پانچ حصے ہیں۔ (۱) میلاد آدم (۲) انکار ابلیس (۳)
اغوائے آدم (۴) آدم از بہشت بیروں آمدہ میگوید

(۵) صبح قیامت۔ آدم درحضورِ باری۔ اس قصّہ کو دنیا کے
بڑے بڑے الوالعزم انبیا نے بیان کیا ہے اور بڑے
بڑے شعرا نے اس پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ناظرین دیکھینگے
کہ اقبال کے حکمت و سرود اس کی کیا توجیہ کرتے ہیں۔
اور اس قصّہ کے کیا معانی بتاتے ہیں) نوائے وقت
غلامی وغیرہ۔

مغرب۔ اس کی تہذیب اور حکایاتِ مغرب
کے فلسفہ و حکمت کے متعلق حسب ذیل نظمیں ہیں:۔
"شوپن ہارو نٹشا" "ہیگل" "نیٹشہ" "پیام
بدانایانِ فرنگ۔ میخانۂ فرنگ۔ طیارہ۔ خطاب انگلستان
خرابات فرنگ" "جلال و ہیگل" "حکیم فرانسوی و مردِ مزدور"
پیام برگساں" "جلال و گوئٹے" "قسمت نامہ سرمایہ دار
و مزدور۔" پٹوفی (شاعرِ ہنگری) صحبتِ رفتگاں در عالمِ بالا
(ٹالسٹائے۔ کارل مارکس ہیگل۔ مزدک۔ کوہکن) حکیم
آئن سٹائن۔ موسولینی و قیصر ولیم۔ جمعیت اقوام بائرن
وغیرہ۔

حسنِ فطرت و حقائقِ نمودِ حیات پر مفصلہ ذیل نظموں
میں روشنی ڈالی گئی ہے:۔
بوئے گل۔ لالہ۔ شبنم۔ افکارِ انجم۔ فصلِ بہار کشمیر۔
چند متفرق نظمیں بھی ہیں۔ مثلاً لسان العصر اکبر مرحوم۔
غنی کشمیری۔ خطاب بہ مبلغِ اسلام در فرنگستان۔ خطاب
بہ مصطفےٰ کمال۔ خطاب بہ امیر کابل۔ ساقی نامہ (در نشاط
باغِ کشمیر نوشتہ شد)

حصّہ سوم غزلیات۔ غزلیں عموماً مشہور اساتذہ عجم
حافظ۔ سعدی۔ نظیری۔ عرفی۔ غالب وغیرہ کی شہرۂ آفاق
غزلوں کا جواب ہیں۔ مطلب یہ کہ زبان و انداز و سرود دد
ہے۔ مضامین دیکھنے پڑھنے اور سمجھنے ہی سے معلوم ہو سکتے
ہیں۔ کاش یہ تمام اساتذہ آج زندہ ہوتے اور نقد و نظر کے
بعد ہمیں بتاتے کہ ان غزلوں کی کیا قدر و قیمت ہے۔
خالِ ہندو پر سمرقند و بخارا بخشنے والے زلف اسلام کی
ہندی مشاطہ کو سارے کا سارا عجم نذر میں پیش نہ کرتے
تو صبر نہ آتا۔ موت پر سینکڑوں کہنے والے جانگداز مرثیے
کہہ گئے۔ نغمۂ حیات کا سُر بہت تھوڑوں نے چھیڑا یا آج
تک کسی نے نہ چھیڑا۔ مقصد ان تمام غزلوں کا صرف
ایک مطلع میں مضمر ہے۔ اور وہ ہم سُنائے دیتے ہیں ؎

بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم
غزل سرایم و پیغام آشنا گویم

ناظرین ہمارے ساتھ اس بات میں کم از کم اتفاق
کرینگے کہ غزلسراؤں میں سے کسی نے آجتک غزل سرائی
کے پردہ میں آشنا کی پیغام رسانی نہیں کی۔ پیغام رسانی
کے لئے غزل سرائی ذریعہ کیوں اختیار کیا گیا۔ صرف اس
لئے کہ ابتک بعض حلقے غزل کے سوا اور کسی انداز میں

پیغام سننے کو تیار نہیں۔

حصّہ چہارم اگر ہوا تو اس میں چند متفرق نظمیں یا اشعار ہوں گے۔

جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں۔ کتاب ناظرین تک ابھی نہیں پہنچی۔ اس لئے اس کے نصّ و نقد کو زیر بحث لانے سے ہم قاصر ہیں۔ صاحب نظر اصحاب سے التجا صرف اس قدر ہے۔ کہ نظموں اور غزلوں کو پڑھتے وقت اس امر کا خیال رکھیں۔ کہ زبانِ فارسی جس میں شاعر نے مطالب و معانی بیان کئے ہیں بالکل وہی ہے جو اس کتاب سے قبل اور فارسی کی کتابوں میں موجود تھی یا اس میں ادائے اظہارِ خیال کے لئے بعض جگہ الفاظ کو نئے مفہوم دیئے گئے ہیں۔ اور نئی نئی تراکیب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس اضافہ کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ایک ہندی شاعر نے جس نے کبھی فارسی مدرسہ میں نہیں پڑھی یہ جرأت کس طرح کی۔ اور ذوق سلیم کے بل پر اس جرأت میں کس طرح کامیاب ہوا۔ دیکھیں کہ کیا ان میں کوئی ایک ترکیب بھی ایسی ہو سکتی ہے جو جبتک جگر خون ہو کر نہ بہ جاتے وضع ہو سکتی ہو۔ ہم اُردو زبان کو محدود و ناکمل کہتے تھے۔ اقبال کے افکار و مضامین کی فارسی بھی متحمل نہ ہوتی۔ شاید اس کے بعد وہ دن قریب ہوں کہ "دہن پُر از عربی است" کا اعلان ہو جائے۔ اور خدا بالآخر اقبال پر اپنی ہی زبان میں شعر کہنے کی توفیق عطا فرمادے۔

اتنے لمبے مضمون کے مطالعہ کی تکلیف دینے کے بعد ہم ناظرین کے لطفِ طبع کے لئے ان کی خدمت میں "پیام مشرق" کی تین رباعیاں پیش کرتے ہیں۔ اور مضمون کو جناب علّامہ کے ان حیات افروز نغموں پر ختم کرتے ہیں۔

دمادم نقشہائے تازہ ریزد
بیک صورت قرارِ زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است
بخاکِ تو شرارِ زندگی نیست

زجانِ بیقرار آتش کشادم
دلے در سینۂ مشرق نہادم
گلِ اُو شعلہ زار از نالۂ من
چو برق اندر نہادِ اُو فتادم

گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور
کہ جانِ تو زخود نامحرمے ہست
قدم در جستجوئے آدمے زن
خدا ہم در تلاشِ آدمے ہست

محمد حسین

سلطان الہند غریب نواز

در مدح سلطان العارفین وارث الانبیا والمرسلین قطب الاقطاب دوران حجتِ اولیاء زمان امام الشریعت والطریقت مخزنِ معرفت و حقیقت مقتدائے ارباب دین پیشوائے اصحاب یقین صاحب اسرار و مہبطِ انوار عالم علوم ظاہر و باطنی واقف رموز صوری و معنوی کبیر الاتقیا سید الاصفیا معین الاولیا شیخ الشیوخ شیخ الاسلام خواجہ خواجگان سلطان الہند غریب نواز حضرت خواجہ معین الدین حسن ابن غیاث الدین حسن حسنی حسینی چشتی سنجری، ثم الاجمیری رضی اللہ تعالٰی عنہ۔ بہ تقریب عرس مبارک سال حال عرض نمود۔

کیونکر نہ بھریں ہم آپ کا دم سلطان الہند غریب نواز
ہیں آپ ہمارے آپ کے ہم سلطان الہند غریب نواز

پائیں جو تمہارا نقش قدم سلطان الہند غریب نواز
آنکھوں سے لگائیں ہم ہر دم سلطان الہند غریب نواز

ہو جائے نگاہِ لطف و کرم سلطان الہند غریب نواز
سب دُور ہوں میرے درد و الم سلطان الہند غریب نواز

اک دم میں ملاؤ حق سے تم اک دم میں دکھاؤ حق کو تم
حاصل ہے تمہیں وہ قرب اتم سلطان الہند غریب نواز

ہر بات تمہاری ہے اعلیٰ کیا بات تمہاری ہے اعلیٰ
ہو حق کے پیارے حق کی قسم سلطان الہند غریب نواز

ہر دل میں تمہاری عظمت ہے ہر دل میں تمہاری الفت ہے
کیا شان تمہاری ہے اعظم سلطان الہند غریب نواز

کِھلتی نہ رہے کیوں دل کی کلی ہنستا نہ رہے کیوں غنچۂ دل
جب خلق میں تم ہو ابرِ کرم سلطان الہند غریب نواز

ہر چند کہ میں ہوں دُور مگر ہے میری تمنّا آٹھ پہر
مر جاؤں تمہارے زیرِ قدم سلطان الہند غریب نواز

تم دیکھ لو خود ہی بہر خدا کیا حال ہُوا ہے غم سے میرا
آیا ہے لبوں پر اب تو دم سلطان الہند غریب نواز

طالب کی یہی اک حسرت ہے پوری ہو ہر اک جو حسرت ہے
دِل میں نہ رہے اب کوئی بھی غم سلطان الہند غریب نواز

طالب

سکۂ قلب

بمبئی کے مشہور قہوہ خانہ۔۔۔۔ کا دیانی کمرہ برقی روشنی سے جگمگا رہا تھا۔ شب گرد عیاشوں کے قہقہوں کی گونج کمرے کی محدود فضا میں تلاطم پیدا کر رہی تھی۔ چابکدست سبک پا اور بظاہر کیفیت کے لحاظ سے تابع فرمان ملازموں کی برق صفت حرکات قہوہ خانہ کی گرم بازاری اور اس معبد عیش کے دولتمند پجاریوں کی خود فراموشی کا زندہ ثبوت تھی۔

اِس کمرے کے ایک کونے میں عام جھمگٹے سے ذرا پرے ہٹ کر دو نوجوان ایک میز کے آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ دونوں کے سامنے شراب سے بھرے ہوئے ساغر رکھے تھے۔ مگر وہ ان کو پی کر بدمست ہو جانے کی بجائے ان کو دیکھ دیکھ کر ایک اندرونی کیف سے سرشار ہو رہے تھے۔ اس کیف سے جو صرف سامان عیش کا تصوّر ہی پیدا کر سکتا ہے۔ اور جسے ہر عملی عیش پرستی فنا کر دیتی ہے۔ وہ گفتگو میں سرگرم تھے۔ ان کا انداز رازدارانہ تھا مگر کبھی کبھی کسی نہ رُک سکنے والے جذبے سے بے اختیار ہو کر وہ ذرا بلند آواز میں باتیں کرنے لگ جاتے۔

ایک نے آخرکار ایک مایوسی سے بھرے ہوئے لہجہ میں رُک رُک کر کہا۔ "سات سال میں یہ پہلی ناکامی ہے میری شہرت کا دارومدار اب اسی سازش کی تفتیش پر ہے۔ تین مہینے کہنے کو دو لفظ اور عرصہ کے لحاظ سے انسانی زندگی کا ایک بے حقیقت حصّہ ہیں۔ مگر میں سچ کہتا ہوں۔ میرے لئے یہ عرصہ کئی عمروں کی امید و بیم کا ایک منجمد وقفہ بن گیا۔ تم اس سازش کی اہمیت کو نہیں سمجھ سکتے۔ تم میری محرومی کا اندازہ نہیں کر سکتے۔ تم کو ہمارے محکمہ میں کام کرتے ہوئے ابھی صرف چھ مہینے کا عرصہ ہوا ہے۔"

"ممکن ہے کہ یہ چھ مہینے تمہاری زندگی کے سات سال سے زیادہ وقیع ہوں۔" دوسرے نے ایک نمایاں غرور کے انداز سے جواب دیا۔

"ہا ہا ہا تم بھی اندھی تقدیر کے منظور نظر خوش قسمتوں کی طرح اپنی قابلیّت کے متعلق دھوکے میں ہو" پہلے نے ایک حاسدانہ تمسخر سے لبریز لہجہ میں کہا۔ "ممکن ہے تمہاری رائے درست ہو لیکن میرا خیال ہے۔ کہ تم دوسروں کے متعلق رائے قائم کرنے میں اپنے سات سال کے تجربہ سے کام نہیں لیتے۔ سنو تمہاری

اور میری عمر میں کچھ ایسا فرق نہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ تم سات برس سے محکمۂ تفتیش میں کام کر رہے ہو اور میں صرف چھ مہینے سے۔ لیکن تم نے جو کچھ سیکھا اسی محکمہ میں ایک مخصوص، معقول اور عام فہم طریقہ تفتیش کی پابندی تم پر لازم تھی۔ اتفاق سے تم کامیاب بھی ہوگئے مگر میں نے یہ تمام عرصہ فطرت کی کھلی ہوئی کتاب کے مطالعہ کرنے میں صرف کیا۔ میں نے تفتیش جرائم کا ایک نیا نظام خود ترتیب دیا۔ اور جب میں انسانی طبیعت کی نیرنگیوں کا رازدار بن گیا۔ تو میں نے محض روزی کمانے کے لئے نہیں۔ بلکہ خلق خدا کو اپنے تجربوں سے فائدہ پہنچانے کے لئے اس محکمہ کی ملازمت اختیار کرلی۔"

دوسرے نے اپنے متکبرانہ دعوے کے حق میں ایک فلسفیانہ ثبوت دینے کے لئے اپنے ہر ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر تم بھی کوشش کیوں نہیں کرتے میں یہ تو نہیں چاہتا کہ اس کامیابی کا سہرا صرف میرے ہی سر رہے۔ اس سازش کا پتہ چلنا چاہئے خواہ تم ان بدمعاشوں کو ڈھونڈھ نکالو یا میں یا کوئی اور۔ میں یہ کبھی برداشت نہیں کرسکتا۔ کہ ہم سرکار کے خزانے سے تنخواہیں لیتے رہیں اور ایسے خوفناک چور اس خزانے کو تباہ کرتے رہیں۔ ذرا سوچو تو ہر پانچ روپے میں کم از کم ایک جعلی روپیہ۔ تین مہینے سے میں سرگرداں ہو رہا ہوں۔ اگر جعلی سکوں کا یہی اوسط سارے ملک میں ہے۔ تو غور کرو۔ سرکاری خزانے کو کتنا نقصان پہنچ رہا ہے۔ اور بزدل جعلساز کتنے دولتمند ہو رہے ہیں غریبوں کی محنت سے کمائی ہوئی دولت اس طرح رائگاں کھوئی نہیں جاسکتی۔"

"مگر یہ تو کہو تم نے ان جعلسازوں کو تلاش کرنے کے لئے کن تدابیر پر عمل کیا۔ انہیں کہاں کہاں ڈھونڈا کوئی سراغ کوئی نشان کوئی پتہ ملا بھی یا نہیں؟"

"بالکل نہیں۔ میں نے تمام قمار خانوں پر چھاپہ مارا سارے شراب خانوں کو چھان ڈالا۔ مگر سب بے سود ہر مشتبہ شخص کی تلاشی لی۔ مشکوک جگہ کو دیکھا۔ مگر سب بیکار۔"

"کیوں ناظر میں نہ کہتا تھا تم ایک فرسودہ روش پر عمل پیرا ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتے تم نے سراغرساں بنکر چوروں کو تلاش کرنا چاہا۔ یہ تدبیر سرے سے ہی غلط ہے۔ تم کو چوروں کا کھوج نکالنے کے لئے چوروں کی فطرت پیدا کرنی چاہئے۔ سنو ایک عقلمند چور انکشاف جرائم سے محفوظ رہنے کے لئے سراغرسانوں کی فطرت پیدا کرتا ہے۔ ان کے نقطہ نگاہ سے سوچتا

ہے ۔ وہ ہر ایسی جگہ سے کنارہ کرتا ہے جہاں سراغرساں اسے تلاش کرنے کے لئے جا سکتا ہو۔ وہ ہر ایسی ظاہری کیفیت اختیار کرنے سے پرہیز کرتا ہے جس پر شک کی نظر پڑ سکے۔ ایک کامیاب چور وہی ہو سکتا ہے جو ایک کامیاب سراغرساں کی ذہنی قابلیت رکھتا ہو۔ اور اسی وجہ سے ایک کامیاب سراغرساں وہی ہے جو ایک چور کی نفسیات سے واقف ہو۔"

"میں تمہارا مطلب کچھ اچھی طرح نہیں سمجھا۔ چور اگر ایسی جگہ نہ جائیں گے۔ تو اور کہاں جائینگے۔"

"جہاں اگر تم چور ہوتے تو سراغرسانوں سے بچنے کیلئے جاتے۔"

"لیکن میں نے ہمیشہ چوروں کو انہیں جگہوں پر پایا۔ یاد رکھو۔ یہ میری پہلی ناکامیابی ہے۔ اس لئے تم میری تدبیر عمل کے خلاف بہت کچھ نہیں کہہ سکتے۔"

"وہ معمولی چور تھے جو اپنی سستی، کند ذہنی اور جہالت کی کمی کو وحشیانہ حوصلے سے پورا کر کے غافل اور بے بس لوگوں کی محنت کی کمائی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اور پھر اسی وحشیانہ حوصلے سے پورا کر کے غافل اور بے بس لوگوں کی محنت کی کمائی پر ڈاکہ ڈالتے ہیں۔ اور پھر اسی وحشیانہ حوصلے سے مجبور ہو کر اس مفت ہاتھ آئی دولت کو قمارخانوں اور میکدوں میں برباد کر دیتے ہیں۔ مگر وہ شخص جو جعلی سکے بنا کر حکومت کو مقابلہ کی دعوت دیتا ہے۔ جو آج کم از کم تین مہینے سے لاکھوں نہیں تو ہزاروں جعلی روپے ملک کی منڈیوں اور تجارت گاہوں میں بھیج رہا ہے۔ اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کیا وہ نہیں جانتا کہ سرکاری محکمہ تفتیش کے بے شمار سراغرساں اس کا پتہ چلانے کے لئے دن رات سرگرداں ہیں۔ وہ یقیناً اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھنے کے لئے انکی تمام تدابیر سے واقف کر چکا ہے۔"

"تو پھر کیا کرنا چاہیئے۔" ناظر نے اپنے مخاطب کے علم سے مرعوب ہو کر کہا۔

"اس کام کو سات روز کے لئے مجھ پر چھوڑ دو مگر ناظر تم میرے بچپن کے رفیق ہو۔ اگر میں نے اس عیار چور کا پتہ چلا لیا تو تم اس فخر و ناز میں میرے برابر کے شریک ہو گے۔"

ناظر نے اس کا ہاتھ شکریہ اور احسانمندی کے احساس سے دبایا اور کہا "بختیار تم بیشک ایک قابل اعتماد دوست ہو۔"

بختیار نے قہوہ خانہ کے ملازم کو آواز دی۔ اور بل طلب کیا۔ ملازم نے ان بھرے ہوئے گلاسوں کو جن میں سے ایک قطرہ بھی نہ پیا گیا تھا۔ دیکھ کر حیرت سے ان دو عجیب دوستوں کو دیکھا۔ بختیار نے دس روپیہ کا

نوٹ دیا اور ملازم نے چھ روپے لاکر واپس دیتے۔ بختیار نے ان روپوں کو جیب میں ڈالنے کی جگہ میز پر پھیلا دیا اور کہا۔ "ناظر دیکھو ان میں سے دو روپے جعلی ہیں۔"

ناظر نے متعجب ہو کر ایک نظر روپوں پر ڈالی۔ اور پھر بختیار کو ایک ناقابل رشک برتری کے احساس سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے کس طرح معلوم کر لیا۔"

بختیار نے ایک روپے کو دکھاتے ہوئے کہا۔ "ہر شخص جو کھلی ہوئی آنکھوں سے ان چیزوں کو دیکھتا ہے جن سے اسے روزانہ سابقہ پڑتا ہے معلوم کر سکتا ہے سرکاری سکے زیادہ صاف ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہو یہ باریک سی لکیریں اصلی سکوں میں کبھی نہیں ہو سکتیں۔ دوسرے روپوں سے مقابلہ کر لو۔"

ناظر بختیار کی قوتِ مشاہدہ کا قائل ہو گیا اور کہنے لگا۔ "میں تمہاری تفتیش کو زیادہ کامیاب بنانے کے خیال سے بتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ جعلی سکوں پر ایک اور نشان بہت قابلِ غور ہے۔"

'کیا'

بادشاہ کی تصویر کے نیچے یہ دیکھو نقطوں کی ایک قطار کسی سکے پر ایک نقطہ کسی پر دو کسی پر اس سے زیادہ ان دو روپوں ہی پر دیکھ لو۔ ایک پر چار ہیں ایک پر سات۔ ہمارے محکمہ کا خیال ہے کہ وہ بدمعاش جعلساز سو روپیہ بنانے کے بعد ایک نقطہ زیادہ کر دیتا ہے۔"

"ہوں ہوں۔ مگر میری رائے ہے کہ سو کی جگہ اگر ہزار کہا جائے۔ تو زیادہ مناسب ہے۔ اگر ہر پانچ روپے میں ایک روپیہ جعلی ہے تو یقیناً ان سکوں کی تعداد ہزاروں پر جا پہنچی ہوگی۔"

"شاید تمہاری ہی رائے درست ہو۔"

"لو آؤ چلیں ساڑھے نو بجتے ہیں۔ ممکن ہے کہ میں اس معاملے میں آج ہی کچھ کر سکوں۔" بختیار نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر ٹھہرو دفتر میں اور گھر پر کہہ رکھو کہ ٹیلیفون کا خیال رکھیں۔ مجھے شاید تمہاری مدد کی ضرورت پڑے۔"

"بہت بہتر"

اس کے بعد وہ دونوں دوست اٹھے۔ قہوہ خانے کے بیرونی دروازے پر آئے۔ اور مصافحہ کر کے ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

بختیار نے گھر پہنچ کر اپنا سب سے قیمتی اور خوشنما لباس پہنا اور پھر اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا۔ اس کے چہرے سے اطمینان اور سکون ظاہر تھا مگر اس کا دماغ آئینے کی سطح سے بے نیاز اپنا دستور العمل تجویز کر رہا تھا

ٹھیک ساڑھے نو بجے وہ گرانٹ روڈ پر پہنچ گیا یہ بمبئی کا وہی مشہور مقام ہے۔ جو "پلے ہاؤس" کے نام سے مشہور ہے۔ اور جہاں شام کو آفتاب بجائے غروب ہونے

کے طلوع ہوتا ہے۔ جو شور و ہنگامہ دن بھر بمبئی کے مختلف مقامات پر رہتا ہے۔ وہ سرِ شام مجتمع ہو کر اسی محدود علاقے میں سما جاتا ہے۔ پہلے نصف حصّہ شب میں یہ آباد اور پر رونق مثلث انسانوں کا ایک زندہ اور متلاطم سمندر بن جاتا ہے۔ جہاں دن بھر کی محنت سے تھکا ہوا ہر مفلس اور دولتمند مزدور اپنی زندگی کے کم از کم ایک چھوٹے سے حصّے کو خوشی اور عیش میں بسر کرنے کے لئے آمادہ نظر آتا ہے۔

بختیار اس قسمت کے قاتل عقل کے اندھے قمار باز کی طرح جو اپنے مستقبل کی تمام ممکنات کو ایک بازی پر لگا دیتا ہے۔ ایک تھیئٹر کی طرف چلدیا۔ اور سب سے آگے کے درجہ کا ٹکٹ خرید کر تھیئٹر کے اندر داخل ہو گیا۔ تماشا گاہ کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ بختیار اپنے درجہ کے دروازے پر کھڑا ہو کے کسی خالی نشست کو ڈھونڈنے لگا۔ مینجر نے اسے اس تشویش میں دیکھ کر ایک خالی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ جو دوسری قطار کے درمیانی حصّہ میں تھی۔ بختیار مینجر کا شکریہ ادا کر کے اس خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ اور بظاہر تماشہ دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کی نگاہیں تماشائیوں کی قطاروں کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔ وہ کبھی کبھی بیقرار سا ہو کر بعض اشخاص کے چہروں کی طرف دیکھنے لگ جاتا۔ تماشہ کا پہلا باب ختم ہوا۔ لوگ بیرونی تفریحوں سے لطف حاصل کرنے کے لئے تماشاگاہ سے باہر چلے۔ مگر اس نے دیکھا کہ ایک ادھیڑ عمر کا معتبر صورت اور ظاہری کیفیت کے لحاظ سے ایک دولتمند اور فارغ البال شخص جو اس کے قریب کی نشست پر بیٹھا تھا۔ وہیں بیٹھا رہا۔ اس کے ساتھ ایک نوجوان اور حسین عورت تھی۔ جس کی روشن اور بڑی آنکھوں سے علمیت اور دانائی مترشح ہو رہی تھی۔ اس شخص نے تھیئٹر کے قہوہ خانہ کے ایک ملازم کو آواز دی۔ جو آواز سنتے ہی لپکا۔ اور اس کے قریب آ کر حکم کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے چائے لانے کا حکم دیا۔ بختیار بھی چائے کا نام سنکر ایک تھکن سی محسوس کرنے لگا۔ اور اس نے بھی ملازم سے چائے لانے کے لئے کہا۔ چائے آئی۔ اور سب پینے لگے۔ مگر بختیار نے دیکھا۔ کہ اس شخص نے چائے ختم کر کے ملازم سے شراب اور سگرٹ لانے کیلئے کہا۔ بختیار دل ہی دل میں اس شخص کے مذاق طبیعت پر متحیر سا ہوا۔ چائے کے بعد شراب' اس نے پہلے ہی سے شراب کیوں نہ منگائی۔ غالباً یہ اس عورت کی پاس خاطر کی وجہ سے ہو۔ تو یقیناً اس عورت کی خاطرداری کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس کی بیوی تو نہ معلوم ہوتی تھی۔ یہ رکھ رکھاؤ میاں بیوی کے مابین ناممکن تھا۔ بختیار حقیقت میں اپنی طبیعت کے رجحانات تجسس کے ہاتھوں میں بے بس

تھا۔ ورنہ نہ تو وہ شخص نہ وہ عورت اور نہ اس کا کوئی فعل یا حرکت غیر معمولی تھی۔ تماشا پھر شروع ہوا۔ اور پھر وقت مقررہ پر دوسرا باب بھی ختم ہو گیا۔ بختیار نے دیکھا کہ اس شخص نے پھر شراب منگائی۔ مگر اب کے اس نے دو پیالوں کے لئے کہا۔ اور پھر اس نے دیکھا کہ اس دور میں اس عورت نے بھی اس کی شرکت کی۔ یہ بات بختیار کے لئے ضرور تعجب خیز تھی۔ کوئی شریف عورت اس بھری محفل میں یہ بیباک اور حیا سوز حرکت نہ کر سکتی تھی۔ بختیار نے پھر چائے کے لئے کہا۔ ملازم ابکے دو بل بھی لایا جن میں سے ایک اس شخص کا ایک بختیار کا تھا جب ملازم بختیار کو بل دیکر اس شخص کی طرف بڑھا تو اس نے دیکھا کہ اس نے تمام رقم روپوں میں ادا کی۔ ان میں کوئی نوٹ نہ تھا۔ بختیار کو ایک دولتمند شخص کی یہ حرکت بھی کچھ خلافِ معمول نظر آئی۔ اس زمانے میں شاید ہی کوئی مہذب و متمدن شخص چاندی کے سکے جیب میں رکھتا ہو۔ اور وہ بھی اس تعداد میں۔ بختیار نے فوراً ایک دس روپیہ کا نوٹ نکال کر ملازم کو دیا۔ اور باقی کی رقم انہی روپوں میں سے جو اس شخص نے ملازم کو دی تھی لے لی۔ تماشا ختم ہونے پر بختیار دروازے پر کی بھیڑ کے چھٹ جانے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے دیکھا وہ شخص ابھی تک اپنی نشست پر بیٹھا اس عورت سے باتیں کرنے میں مشغول تھا۔ اس نے اسقدر سنجیدہ متین اور مطمئن شخص آجتک نہیں دیکھا تھا۔ بختیار نے اس فرصت کو غنیمت سمجھا۔ اور ان روپوں کو دیکھنے لگا۔ اس کا چہرہ یکلخت روشن ہو گیا۔ اور اس نے ایک عجیب کپکپی اپنے بدن میں محسوس کی۔ یہ تمام کے تمام روپے جعلی تھے۔ کیا یہ ممکن تھا کہ خوش قسمتی کی بے پروا دیوی آج اس پر اس قدر مہربان ہو گئی تھی۔ اور اس کا پہلا تیر ہی نشانہ پر بیٹھا تھا۔ اب اس نے دیکھا کہ وہ شخص اس عورت کے بازو میں بازو دیئے باہر نکلا۔ بختیار ان کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ دونوں موٹر پر سوار ہوئے۔ بختیار نے فوراً ایک کرائے کی موٹر لی۔ اور موٹر کے ڈرائیور سے اگلی موٹر کے پیچھے جانے کے لئے کہا۔ ان کی موٹر ایک شاندار مکان کے دروازے کے سامنے رکی۔ بختیار نے موٹر کو نہ روکا۔ مگر اس کی تیز اور ماہر نگاہوں نے مکان کا پتہ اس کے دل میں نقش کر دیا۔

دوسرے دن بختیار نے اس مکان کے مالک کے متعلق تمام ضروری حالات دریافت کر لئے۔ وہ ایک نامور وکیل تھا۔ جو فوجداری مقدمات میں ایسی مہارت رکھتا تھا کہ آجتک کوئی ملزم جس کی طرف سے اس نے پیروی کی ہو سزایاب نہیں ہوا۔ قتل۔ ڈکیتی۔ چوری۔ جعلسازی۔ مجرمانہ سازش غرض ہر قسم کا فوجداری مجرم

اس کو اپنی آخری پناہ تصور کرتا تھا۔ اس نے یہ بھی دریافت کرلیا کہ پچھلی بڑی جعلسازی کے مقدمہ میں جب سب آلات سکہ سازی تک مجرموں کے قبضہ میں پائے گئے تھے۔ اس نے سوائے ایک مجرم کے باقی کے تمام مجرموں کو صاف بچالیا۔ اگرچہ ان مجرموں کا اس کے بعد پھر کوئی پتہ نہ چلا کہ کیا ہوئے۔ اب بختیار اپنے زعم میں کم از کم تفتیش کی ایک پگڈنڈی پر پڑگیا تھا۔ شاہراہ ممکن ہے کہ دور ہو مگر اس کا مل جانا اب اس کے خیال میں ایک یقینی امر تھا۔

دو دن اور گذر گئے۔ مگر وہ اس عورت کا پتہ دریافت نہ کرسکا مگر چوتھے روز شام کے وقت جب وہ چوپاٹی پر سمندر کے کنارے دوسروں کی نظروں میں محو سیر تھا۔ اس کی نگاہ ایک بنچ پر گر گئی۔ کیا حقیقت میں وہی عورت تھی جو اس دن اس نامور وکیل کے ساتھ تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس کا لباس فاخرہ مگر سادہ تھا۔ وہ اب اتنی نوجوان نظر نہ آتی تھی۔ اگرچہ حسن کے ناقابل فرو گذاشت نشانات اب بھی زمانہ ماضی کے ایک پُربہار چمن کا پتہ دے رہے تھے۔ تاہم اسے کچھ یقین سا ہوگیا کہ یہ عورت وہی ہے۔ اس کا حزن آلود چہرہ اس کی روشن آنکھیں اسکی پیشانی کے بل کسی مغالطہ کو روا نہ رکھ سکتے تھے۔ وہ ذرا پرے ہٹ کر سمندر کی آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی لہروں کو غور سے دیکھنے لگا۔ اردگرد کا نظارہ یقیناً نگاہ سوز تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اس عورت کے سوا اور ہر ایک نظارہ کے لئے بند تھیں وہ کبھی آہستہ آہستہ ٹہلتا کبھی چلتے چلتے رُک جاتا۔ ہر دیکھنے والا یہی خیال کرسکتا تھا کہ وہ کسی بہانہ جو وعدہ خلاف نازنین کے انتظار میں ہے۔ یکلخت اس نے ایک خوبصورت اور شاندار موٹر کار کو اپنے قریب سڑک پر رُکتے ہوئے دیکھا۔ وہ اس وقت بالکل اس کے سامنے تھا۔ دروازہ کھلا اور وہی وکیل اپنے بھاری بھرکم جسم کو سنبھالتے ہوئے اس میں سے نکلکر اور اس بنچ کے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ وہ عورت اسے دیکھتے ہی اُٹھی اور ایک مصنوعی مسکراہٹ سے اسکا استقبال کرکے اس کے ساتھ موٹر کی طرف چلی۔ بختیار نے موٹر کا نمبر دیکھا۔ اور پھر اس کی آنکھیں کسی کرایہ کی موٹر کو تلاش کرنے لگیں مگر اسے کسقدر صدمہ ہوا۔ جب اس کی تیز رو نگاہ اِدھر اُدھر گشت کرکے پھر اسی موٹر پر رُکی۔ جو اس کی آنکھوں کے سامنے مالابار ہل کی بلندیوں کو طے کررہی تھی۔

اس پرو بال شکستہ پرند کی طرح جو دوسرے پرندوں کو فضا میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اور اپنی بے بسی پر قانع ہونے کے سوا اور کچھ نہیں کرسکتا۔ بختیار اس موٹر کی طرف دیکھ رہا تھا آخرکار اس کے مصروف دماغ نے اس تعطل و پشیمانی کو سر کی ایک جنبش اور اپنے سارے بدن کی ایک حرکت سے جھٹک دیا۔ وہ لپکا ہوا چلا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ ادھر سے بھی کوئی راہ وکیل کے گھر تک
پہنچتی ہے یا نہیں۔ کہ ات ایک خالی کرایہ کی موٹر اپنا
سرخ پھریرا اڑاتی ہوئی ملی۔ اس نے اس کے شوفر سے ٹھیر
جانے کے لئے کہا۔ اب بمبئی کی سڑکوں کا ایک نقشہ اس
کے گھٹنوں پر پھیلا ہوا تھا۔ اور وہ بار بار نظر اٹھا کر شوفر کو
ہر موڑ پر کسی خاص طرف مڑ جانے کے لئے ہدایت کر رہا
تھا۔ اس کا چہرہ یکلخت خوشی سے چمک اٹھا جب اس
نے ایک موڑ پر مڑتے ہی وکیل کی بلند اور شاندار عمارت
کا دروازہ اپنی نظروں کے سامنے دیکھا۔ دروازے کے
سامنے وہی موٹر کار کھڑی تھی۔ اس کا دل دھک دھک
کرنے لگا۔ اور اس نے دل ہی دل میں کہا "آج میں اس
عورت کا پتہ لگا لونگا۔"

اس نے موٹر کار کو سامنے کے چوک میں روک کر
ٹھیرنے کے لئے حکم دیا۔ اور خود اس بازار میں گشت
لگانے لگا۔ مگر اس کی نگاہیں موٹر کار سے ایک لمحہ کے لئے
بھی علیحدہ نہ ہوتی تھیں۔ سات بجے آٹھ بجے نو بجے مگر
موٹر کار وہیں کی وہیں کھڑی تھی۔ اب بختیار بہت بے چین
ہوگیا۔ ممکن ہے کہ وہ رات بھر اس مکان سے نہ نکلیں
اور اسے وہیں انتظار کرنا پڑے۔ یا ممکن ہے کہ وہ عورت
بھی یہیں رہتی ہو۔ اور اس وکیل کی بیوی ہی ہو۔ مگر پھر
یہ موٹر دروازے پر کیوں انتظار کرتی۔ یقیناً ایسے بڑے
مکان میں موٹر کار کے لئے کوئی جگہ ہوگی۔ وہ پھر
اسی نتیجہ پر پہنچا کہ یہ موٹر اس عورت کا انتظار کر رہی ہے۔
لیکن کیا اسے آج کھانا کھائے بغیر اسی سڑک کو
ناپتے رہنا پڑیگا۔ ابھی دکانیں بند ہو جائینگی۔ اور بازار
میں اس کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیگا۔ یہاں ٹھیرنے
کے لئے ضرور کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کرنا چاہئے۔ موقع
ایسا اہم تھا۔ کہ وہ بھوک کے اندیشہ اور مناسب اور
نامناسب میں تمیز کرنے کے خیال کو تکمیل مقصد کی راہ
میں حائل ہونے کی اجازت نہ دے سکتا تھا۔ مگر اس
کی مشکل بہت جلد آسان ہوگئی۔ بجلی کی روشنی دو شخصوں
پر پڑی۔ جو موٹر کے قریب کھڑے تھے۔ وہ ایک دکان
کے سائبان کی آڑ میں چھپ گیا۔ اور اس نے اپنی آنکھوں
سے وکیل کو اس عورت سے مصافحہ کرتے ہوئے دیکھا۔
عورت موٹر میں بیٹھ گئی۔ وکیل مکان کے دروازے کے
اندر داخل ہوگیا۔ اور موٹر چلی۔ بختیار اچک کر اپنی موٹر
میں سوار ہوگیا۔ اور موٹر ڈرائیور سے اس موٹر کے پیچھے
پیچھے جانے کے لئے کہا۔ مگر ساتھ ہی یہ ہدایت کر دی۔
کہ دونوں موٹروں میں اتنا فاصلہ رہے کہ تعاقب کا شک
پیدا نہ ہوسکے۔ موٹر پھر اسی راستے سے ہوتی ہوئی اب
شہر کے باہر جا رہی تھی۔ اور بختیار کا دماغ ایک اور مشکل
سے بچنے کے لئے تدبیریں سوچ رہا تھا۔ وہ شہر میں وہ

یا تین یا اس سے بھی زیادہ موٹر کاروں کا ایک ہی طرف کو جانا کسی کے دل میں کوئی شبہ پیدا نہیں کر سکتا مگر شہر سے باہر رات کی تاریکی اور خاموشی میں اس کا اس موٹر کے پیچھے پیچھے جانا کہیں اس عورت کے دل میں شک نہ پیدا کر دے۔ اگر وہ واقعی کوئی مجرم ہے یا اس کا تعلق اس جعلسازی سے ہے۔ تو وہ یقیناً اتنی ہوشیار تو ہو گی کہ اپنی حفاظت کی تدبیر کر سکے۔ اور جب اس کی حفاظت خطرے میں نظر آئے تو اس خطرے کا مقابلہ کر سکے۔ ہوشیار نہ بھی سہی مجرم کا احساس جرم اس کا سب سے بڑا جاسوس ہوتا ہے۔ اور یہی احساس جہاں اس کے ماخوذ ہونے کا باعث ہو جاتا ہے۔ وہیں اس کو ایک کافی دیر تک مامون رکھنے کا موجب بھی ہوتا ہے۔ کیا اگر وہ عورت ابھی سے خبردار ہو گئی تو اس کی ساری محنت پر پانی نہ پھر جائیگا۔" اس نے موٹر ڈرائیور سے موٹر کار کو روکنے کے لئے کہا اور سوچنے لگا۔ "بیشک بہادری ایسے کاموں میں ایک ضروری عنصر ہے۔ لیکن وہ بہادری جو تمام مصلحتوں سے آزاد ہو جائے۔ وحشیانہ دلیری سے زیادہ کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ آج نہ سہی مگر کل تو اس کا پتہ معلوم ہو جائیگا۔ یہ سڑک غیر مشتبہ طور پر بندرہ کو جاتی ہے۔ موٹر کار کا نمبر اس کی نوٹ بک میں محفوظ ہے۔ پھر ایسی کیا جلدی۔" اس نے ڈرائیور سے واپس ہونے کے لئے کہا۔

دوسرے دن وہ صبح ہی نکل کھڑا ہوا۔ موٹر کار ریفرنس کے دفتر میں گیا اور موٹر کے مالک کا نام دریافت کر لیا۔ 'سیٹھ جاکھل بندرہ والا' یہ نام تو اس نے کہیں سنا ہے وہ فوراً اپنے محکمہ کے دفتر میں گیا۔ اور اس یادداشت کی چھان بین کرنے لگا۔ جو پولیس کے نکتہ نگاہ سے ہر غیر معمولی یا مشتبہ شخص کے متعلق رکھی جاتی ہے یکلخت اس کی نگاہ رکی۔ 'جاکھل' اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے اپنے دورۂ خون کو ایک فوری اضطراب کے بعد رکتے ہوئے محسوس کیا۔ کیا یہ کیفیات اسی سیٹھ جاکھل کے متعلق تھیں۔ جس کی موٹر کار کا تعاقب وہ گذشتہ رات کو نہ کر سکا تھا۔

"تین مختلف جعلسازیوں کے متعلق گرفتار ہوا۔ دو دفعہ بچ گیا۔ تیسری مرتبہ سزایاب ہوا۔ مگر ایک خفیف شبہ پر کوئی آلات سکہ سازی اس کے پاس نہ پائے گئے۔ مگر جعلی سکوں کی سب سے بڑی تعداد اس کے قبضے میں تھی۔ بندرے کی قرب و جوار میں ایک کوٹھی میں اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے۔ جو کلکتہ کی رہنے والی ہے۔ پڑھی لکھی اور ظاہرا طور پر بہت مہذب ہے۔ عام ذریعۂ معاش جائداد اور سامان تجارت کی سٹہ بازی ہے۔"

بختیار نے کتاب اٹھا کر محافظ دفتر کے سپرد کر دی۔

اور دفتر سے باہر نکلا۔ اب وہ یقینی طور پر تفتیش کی شاہراہ
پر چل رہا تھا۔

بختیار دفتر سے خوش خوش نکلا مگر گھر میں پہنچ کر جب
اُس کو حالات کے مطالعہ اور مواقع کے موازنہ کا وقت
ملا تو کچھ پریشان سا ہو گیا۔ اور اس پُراسرار عورت کے
گھر تک رسائی کرنا یقیناً ایک مشکل کام تھا پھر
ان دونوں میں سے کسی ایک کو ابتدائی تفتیش کے
لئے انتخاب کرنا اور زیادہ وقت طلب امر ہے۔ وہ تمام
دن بختیار نے مختلف تدابیر کو سوچنے اور انکو پایۂ تکمیل
تک پہنچانے کی فکر میں گذارا۔ آخر کار شام کو وہ بہت
نوٹ جیب میں ڈال کر گھر سے باہر نکلا۔ کوئی دو گھنٹے
وہ مختلف بازاروں میں چکر لگاتا رہا۔ اور اس عرصے
میں اس نے ہر صراف کی دکان میں جا کر ان نوٹوں کا
روپوں سے تبادلہ کر لیا۔ اب اس کے پاس کوئی آٹھ
سو روپے تھے۔ وہ پھر گھر آیا اور ان روپوں کو میز پر پھیلا کر
خوردبین کی مدد سے ان میں سے جعلی سکے تلاش کرنے
لگا۔ کوئی تین گھنٹے کی محنت کے بعد اپنے زعم میں اصلی
اور جعلی سکوں کو الگ کر لیا۔ اسے کسقدر تعجب ہوا۔
جب اُس نے دیکھا کہ جعلی سکوں کی تعداد تین سو کے
قریب تھی۔ تو کیا واقعی یہ بدکار جعلساز اس قدر کامیاب
ہو رہے تھے۔ اسے اپنے فرض منصبی کے احساس سے
ایک ندامت سی ہوئی۔ پھر اس کے چہرے پر سرخی کی
رو دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں سے کسی عزم صمیم کی روشنی
جھلکنے لگی۔

دوسرے دن وہ دفتر کھلتے ہی پولیس کے افسر اعلیٰ
کے کمرے میں تھا۔ اور اس کو اپنی تفتیش کے تمام گذشتہ
مراحل سے آگاہ کر رہا تھا۔ افسر نے بختیار کے احساس
فرض، پختہ کاری، استقلال اور عزم صمیم کی داد دی
اور اس کے آئندہ دستور العمل کی تائید کی پھر وہ اُٹھا
اور اُس نے بختیار کی درخواست کے مطابق ایک
لوہے کی مضبوط تجوری سے وہ آلات جعلسازی جو
گذشتہ مقدمے کے دوران تحقیقات میں برآمد ہوتے تھے
نکالے اور بختیار کے سپرد کر دئے۔ بختیار نے جیب سے
ایک آتشی شیشہ نکالا۔ اور اس کی مدد سے سورج کی
شعاعوں کو ان آلات کے ہر ایک حصے پر منعکس کر کے
خوردبین سے ان کا مطالعہ کرنے لگا۔ وہ نقطے جن کی
طرف ناظر نے اس کو توجہ دلائی تھی۔ اور جو ان جعلی سکوں
کی ایک امتیازی خصوصیت تھے۔ اسے صاف صاف
نظر آنے لگے۔ اور وہ خوشی سے اچھل پڑا۔ اس کے
افسر اعلیٰ نے اس مطابقت کو دیکھ کر اطمینان کا اظہار
کیا۔ اور اسے رخصت کرتے ہوئے کہا "بختیار اس
میں کچھ شک نہیں کہ تم ابھی اس محکمہ میں بہت تھوڑے

مصروف سے کام کر رہے ہو۔ لیکن اگر تم اسی جانفشانی سے
کام کرتے رہے تو تمہاری ترقی کے سوال میں مدّت ملازمت
کا لحاظ نہ رکھا جائیگا۔ جاؤ خدا تمہیں کامیاب کرے
اور حکومت اور مُلک کو تمہاری خدمت سے فائدہ
پہنچے۔ مَیں اس تحقیقات کے نتائج کا بے صبری سے
انتظار کرونگا۔ اور ابھی ناظر کو ایک پولیس کی گارد کے
ساتھ تمہاری امداد کے لیئے متعین کر دُونگا" بختیار
نے شکریہ ادا کیا۔ اور ان آلات کو سنبھال کر پھر گھر
کی راہ لی۔

بختیار نے گھر پہنچکر تبدیل ہیئت ولباس میں
کوئی دو گھنٹے صرف کیئے۔ اب اس کی اپنی آنکھیں بھی
اسے نہ پہچان سکتی تھیں۔ جب اُس نے اپنے آپ کو
آئینے میں دیکھا تو اپنے دماغ کے علم اور آنکھوں کے
مشاہدے کے اختلاف پر ہنسا۔ اب وہ ظاہر بین
کے لئے ایک ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ جس کے چہرے پر
بدمعاشی سیہ کاری اور عیاری کی کرخت علامات تھیں۔
اس کی گھنی ڈاڑھی، ملے ہُوئے اور گنجان ابرو، گوشہ چشم
اور لب دہان کی جھریاں ایک سخت گیر دل، ایک
سخت کوش زندگی پر شاہد تھیں۔ اس کی آنکھوں کی
سرخی اور دہشت کا ختم ایک اعتدال سے ناآشنا فطرت
کی غمازی کر رہا تھا۔ اس کا لباس نیا نہ تھا۔ مگر اس سے
افلاس کی بے بسی بھی ظاہر نہ ہوتی تھی۔ بلکہ سونے کی گھڑی
کی زنجیر اور وہ بھاری انگشتریوں سے کسی قدر تموّل نمایاں
تھا۔ تاہم ہر چیز سے ایک ناملائم طبیعت کی ناداری
مذاق مترشح تھی۔ آلاتِ جعلسازی کو اپنے کوٹ کے
اندرونی جیب میں رکھ کر اور جعلی مہروں کو اس طرح دوسری
جیب میں سنبھال کر وہ گھر سے باہر نکلا۔ اور ایک کرایہ
کی موٹر پر سوار ہو کر بندرہ کی طرف چلدیا۔

اب شام ہو چکی تھی۔ اور بمبئی کے تمام مضافات
سمندر میں دُھلی ہُوئی ہوا کی موجوں سے ایک
لطافتِ مجسم بنے ہوئے تھے۔ ان مضافات کے سرسبز
اور شاداب چمن جو بمبئی کے سے تجارتی شہر کو میسّر نہیں
ہو سکتے۔ ان مضافات کی کھلی فضا جو بمبئی کے سے آباد
اور گنجان شہر کو حاصل نہیں ہو سکتی۔ اکثر دولتمند تاجروں
اور خلوت پسند امیروں کو شام کے وقت اپنی طرف کھینچ
لاتی ہے۔ بلکہ اُن میں سے اکثر نے انہی مضافات کو
اپنی بود و باش کے لئے منتخب کر لیا ہے۔ بندرہ بھی
ان میں سے ایک ہے۔ جہاں آموں کے درختوں کے
دلپسند راستے اور معطّر پھولوں کے دلکش چمنوں میں
بہت سے انگریزی وضع کے بنگلے نظر آتے ہیں۔ شام کے
وقت جب ان بنگلوں کی کھڑکیوں کے آئینہ برقی روشنی
کی پردہ داری کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ تو کسی قدر

سے دیکھنے والے کو سطح آسمان پر چمکنے والے ستاروں کا گمان ہوتا ہے۔ ان ہی بنگلوں میں سے ایک میں وہ خاتون بظاہر اتمول کی شان سے ایک خاموش اور پُراسرار زندگی بسر کر رہی تھی۔ بختیار کو بندرہ شہنگر اس بنگلے کو دریافت کرنے میں کچھ زیادہ وقت نہ ہوئی اور جب شام کا ہنگامہ رات کے سکوت میں تبدیل ہو چکا تو اُس اس بنگلے کے اندر داخل ہو کر ایک معتبر صورت ملازم کے ذریعے اپنے آنے کی اطلاع اندر بھجوائی۔ ملازم نے اندر جانے سے پہلے کسی نمایاں کوشش کے اظہار کے بغیر اس ناخوانده نو وارد کا جائزہ لے لیا۔ مگر بختیار کی باریک بین آنکھ نے اس کے تامل و تکلف میں ایک ایسا تصنع دیکھ لیا۔ جو بجائے خود بہت سے شکوک کا متحمل ہو سکتا تھا۔

ملازم نے واپس آکر بختیار کو ساتھ چلنے کے لئے کہا اور جب بختیار کمرے کے اندر داخل ہو گیا تو اُس نے داخلی دروازہ کو مودبانہ انداز سے بند کر دیا۔ وہ خاتون نہایت آرام و اطمینان سے ایک خوبصورت صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں پر چشمہ تھا۔ اور ہاتھ میں ایک کھلی ہوئی کتاب۔ معلوم ہوتا تھا۔ کہ وہ بختیار کے آنے سے پہلے اس کے مطالعہ میں محو تھی۔ برقی فانوس کی روشنی اس کے گلگوں چہرے پر پڑ رہی تھی جس سے اس کے حسین نقش

معمول سے زیادہ دلفریب نظر آنے لگے۔ اگرچہ کمرہ کی آرائش ایک مذاق مہذب ایک ذوق نمائش کی آئینہ دار تھے۔ تاہم اس سکوت متانت سے جو اس کمرے پر طاری تھا۔ بختیار مرعوب ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

اس پُراسرار خاتون نے ایک احساس برتری سے آنکھ اُٹھائی اور پھر ایک انداز التفات سے بختیار کو ایک قریب کی کرسی پر بیٹھنے کے لئے اشارہ کیا۔ اور پھر شاید خود ہی سلسلہ گفتگو کو شروع کرنے کے لئے پوچھا۔

"آپ کا نام"

بختیار اپنے روش عمل کو اس قدر وضاحت سے ترتیب دے چکا تھا۔ کہ اس کو قریب قریب ہر ممکن سوال کا۔ جواب اسی انداز سے از بر تھا جس سے اس کو اس وقت کام لینا تھا۔

"نام بتلانے سے پہلے میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا میں مسز جاکھل ہی سے باتیں کر رہا ہوں" بختیار نے اپنی ظاہری صورت کی مطابقت کے لئے ایک کرخت مگر متین لہجہ میں پوچھا۔

"ہاں ہاں آپ کہئے۔ آپ کو مجھ سے کیا کام ہے"

اس خاتون نے اس لہجہ اور اس سوال کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے ذرا برافروختگی سے کہا۔

بختیار نے فوراً جواب دیا۔ وہ اس وقت ملازم

لکھوں کو اس کے چہرے پر جمائے ہوئے تھا۔ میں صرف یہ کہنے کے لئے آیا ہوں۔ کہ وہ شخص جو ایک ہی کام کو ہمیشہ محنت کرتے رہیں۔ اگر مل کر کریں تو بہت جلد زیادہ کامیابی سے انجام پاسکتا ہے۔ بلکہ اس کو ذاتی طور پر بھی بہت سہولت ہوتی ہے۔"

خاتون کے زرد چہرے پر سرخی کی ایک رو دوڑ گئی لیکن اس کے بعد فوراً ہی اس کا چہرہ پہلے سے زیادہ زرد ہوگیا۔ بختیار وثوق سے نہ کہہ سکتا تھا۔ کہ اس نے اس کے تمام بدن میں ایک خفیف کپکپی بھی محسوس کی یا نہیں۔ مگر بغیر کسی ظاہری کوشش کے خاتون نے استقامت سے دریافت کیا۔ "آپ کا مطلب"

بختیار نے کمرے کے چاروں طرف دیکھ کر ایک رازدارانہ انداز سے کہا۔ میرا مطلب شاید میرا کام میرے لفظوں سے زیادہ واضح طور پر بیان کرسکیگا۔" پھر وہ اٹھا اور اس نے اپنی جیب سے روپوں کی تھیلی نکالکر اس شفاف تپائی پر جو اس خاتون کے قریب رکھی تھی اُلٹ دی۔

خاتون نے ظاہرداری کی تمام کوششوں کو ضائع ہوتا دیکھ کر ایک دوستانہ مگر متانت سے بھری ہوئی کیفیت اختیار کرلی۔ اُس نے روپوں کو دیکھنا شروع کیا۔ بختیار نے موقع پاتے ہی دوسری جیب سے آلاتِ جعلسازی نکالے اور ان کو دکھاکر کہنے لگا۔ "یہ سیٹھ جاکھل کے آلات کے نمونے کے مطابق بنائے گئے ہیں۔ اور آپ انکو دیکھ کر میری کوششوں کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکینگی۔"

خاتون نے ایک ماہر کی نظر سے ان آلات کو دیکھا۔ پھر اپنا ہاتھ بڑھایا۔ جسے بختیار نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ گویا اس کی طرف سے بختیار کے کمال کا اعتراف تھا۔ پھر وہ اُٹھی اور میز کے قریب جاکر کچھ لکھنے لگی۔ تھوڑی دیر میں اُس نے بختیار کو ایک بند لفافہ دیتے ہوئے کہا۔ " اس معاملے کے متعلق مزید گفتگو آپ ان سے کرسکتے ہیں۔ میں نے اس میں آپکا تعارف کرادیا ہے۔ غالباً اب میں آپ کا نام پوچھ سکتی ہوں"۔ بختیار نے خط لیکر کہا۔ بڑی خوشی سے۔ "میں چالو سیٹھ کے نام سے مشہور ہوں۔ اس عجیب وغریب نام کو سُنکر وہ خاتون کچھ مسکرا سی دی۔ معلوم ہوتا تھا۔ وہ ایک بلند قہقہہ کو روکنے کی کوشش کر رہی ہے۔

بختیار نے گھر آکر اس لفافہ کو ایسی ترکیب سے کھولا کہ اسے پھر بند کرسکے۔ اس کو یقین تھا۔ کہ اس میں اسے ایک ایسا ثبوت مل جائیگا۔ جس کے بعد اسے کسی مزید احتیاط کی ضرورت نہ رہیگی۔ اور مجرموں کو ماخوذ کرسکیگا۔ مگر خط کو کھول کر وہ حیران رہ گیا۔ وہ کسی ایسے خط میں لکھا تھا جسے اس نے آجتک نہ دیکھا تھا۔ ممکن ہے کہ محض ایسی علامتیں ہی ہوں جن کو خاص خاص اشخاص کے

سامنے کوئی نہ جانتا ہو۔ تو میں اس کو کسی ثبوت کے طور پر
پیش نہیں کر سکتا۔ وہ عورت مجھ سے زیادہ ہوشیار نکلی۔
اس کو خاتون کے شکنجہ میں لانے کے لئے کوئی شہادت
نہیں ہے۔" بختیار نے مایوسی کے لہجہ میں دل ہی دل
میں کہا۔ لیکن اس کا کام ابھی ختم نہ ہوا تھا۔ کامیابی کی
امید ابھی باقی تھی۔ دوسرے دن صبح کو وہ اس وکیل کے
مکان پر پہنچا۔ کیونکہ لفافہ پر اسی کا پتہ درج تھا۔ ملازم نے
اس کی اطلاع پہنچائی۔ اور پھر اسے دفتر کے کمرے میں
جانے کے لئے کہا۔ بختیار نے جاتے ہی وہ بند لفافہ
وکیل کے ہاتھوں میں دے دیا۔ وکیل نے خط کھولتے
ہی ایک نظر بختیار پر ڈالی۔ خدا جانے اس کی تیز نگاہوں
میں کیسے شعلے تھے۔ کہ بختیار کی آنکھیں جھک گئیں
وکیل نے خط کو دیکھا۔ اور دیکھتا رہا۔ دونو خاموش تھے۔
پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ اٹھا۔ اور اس نے ایک گہری
آواز میں کہا۔ "آئیے اندر کے کمرے میں چلئے۔ وہیں
باتیں ہونگی۔" بختیار اس کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے
میں چلا گیا۔ وکیل نے ایک اور دروازہ کھولا اور اسے
آنے کے لئے کہا۔ بختیار اندر داخل ہو گیا۔ وکیل نے
دروازہ بند کر کے اسے ایک پُرتکلف کرسی پر بیٹھنے کے
لئے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "آپ تشریف رکھئے۔ آپ
سگرٹ پیتے ہیں یا سگار" اور پھر اس نے میز پر سے

ایک بکس اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں اعلیٰ
قسم کے سگار اور سگرٹ رکھے تھے۔ بختیار نے شکریہ
ادا کر کے ایک سگرٹ لے لیا۔ اور اسے جلا کر پینے
لگا۔" وکیل نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے
کہا تو آپ کو جاکھل سیٹھ کے سانچے کیسے مل گئے۔ ان
کو تو میں سنتا ہوں پولیس بڑی حفاظت سے رکھتی ہے"
بختیار نے فوراً جواب دیا۔ "یہ سانچے میں نے خود تیار
کئے ہیں۔" وکیل نے بختیار کو پہلے سے زیادہ مشتبہ
نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لیکن ان کی نقل کرنے
کے لئے اصل کو آپ نے کیسے دیکھا۔ بختیار اس سوال
کے جواب دینے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے رک رک
کر مگر اپنی ہمت کو جمع کر کے جواب دیا۔ میں نے روپے...
جعلی روپے دیکھ کر..... یہ سانچے بناتے ہیں۔"
"خوب! تو آپ مسٹر جاکھل تک کیسے جا پہنچے۔"
اب کے بختیار نے زیادہ استقلال سے جواب دیا۔
"ایک ہی قسم کا کام کرنے والے دو شخص بہت دیر تک
ایک دوسرے سے پوشیدہ نہیں رہ سکتے۔ اس وقت
بازاروں میں میرے اور آپ کے بنائے ہوئے سکے
قریب قریب برابر کی تعداد میں رائج ہیں۔"
وکیل نے قدرے بلند آواز میں کہا "میرے؟
اس سے آپ کا کیا مطلب ہے۔"

بختیار کو اپنی کامیابی کا یقین ہوگیا۔ "اب مجھ سے چھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر آپ مجھ پر اعتبار کرینگے تو یقیناً یہ کام اس سے بھی بڑے پیمانہ پر ہو سکیگا۔"

وکیل نے یہ سُنکر زیادہ التفات سے جواب دیا "کیا میں آپکے تیار کیے ہوئے سکّے اور سانچے دیکھ سکتا ہوں؟" بختیار نے فوراً جیب میں سے سانچے اور سِکّے نکالکر میز پر رکھ دیئے۔ وکیل نے پہلے تو روپوں کو ایک غائر نظر سے دیکھا اور پھر بہت دیر تک سانچوں کا مطالعہ کرتا رہا۔ اس کے چہرے کے رنگ کے تغیر پیشانی کی شکن اور دانتوں کی کچکچاہٹ سے صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ دل ہی دل میں کسی عجیب گتھی کو سلجھانے کی فکر میں ہے۔ آخرکار اُس نے سر اُٹھایا اور کہا۔ "اب میں آپ کو اپنے سانچے دکھاتا ہوں میرے خیال میں وہ ان سے زیادہ مضبوط ہیں۔" بختیار دل ہی دل میں گھبرایا کہ اگر ان دونوں سانچوں کا مقابلہ کرنا پڑا تو یقیناً اس فن کے متعلق اس کی لاعلمی ظاہر ہوجائیگی۔ مگر پھر یہ سوچکر کہ اس کا منشا تو ثبوت بہم پہنچانے کا ہے کچھ مطمئن سا ہوگیا۔ وکیل نے اپنے میز کی طرف جھککر اس کا دراز کھینچا اور پھر اس میں سے کچھ نکالکر ایک فوری حرکت سے مڑا اور ہاتھ بلند کرکے ایک گہری آواز میں چلّایا۔ "اگر ذرا سی حرکت کی یا آواز نکالی تو تمہاری لاش تڑپتی ہوئی نظر آئیگی۔" وکیل کے ہاتھ میں ایک وزنی پستول تھا۔ جس کی نالی بختیار کے سینے کے مقابل تھی۔ بختیار نے اپنی بےبسی محسوس کرکے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ وکیل نے آہستہ آہستہ بڑھکر اور اپنے بائیں ہاتھ سے بختیار کی مصنوعی ڈاڑھی کو کھینچکر ایک پُرشکوہ آواز میں کہا۔ "ایک عورت کو بیوقوف بنالینا بہت آسان ہے۔ مگر جاکھل سیٹھ کو دھوکا دینا اسقدر آسان نہیں۔ آپ نے شاید محکمۂ سراغرسانی میں بہت دنوں کام نہیں کیا۔ ورنہ آپ کو اپنے دشمن کی طاقت کا اندازہ ہوجاتا۔ میں آپکی ہمت اور فراست کا قائل ہوں۔ اور آپ کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کو مدِّنظر رکھ کر آپکی جراَت کی تعریف کرتا ہوں۔" بختیار کا دماغ جو پہلے ہی سے اس نازک صورت حالات کا اندازہ کرنے سے قاصر تھا۔ یہ انکشاف سُنکر بالکل مختل ہوگیا۔ کیا اِس وکیل اور جاکھل سیٹھ کی شخصیّت ایک ہی ہے۔ اور اس کے محکمہ کو اسکی خبر نہیں۔ وہ غُصّہ ندامت اور بےبسی کے احساس سے دانت پیسنے لگا۔ پھر اس نے ہمّت سے کام لینا چاہا۔ اس نے کہا۔ "اگر آپ نے میری جان لینے کی کوشش کی تو آپ زیادہ دیر تک سزا سے نہیں بچ سکینگے۔" جاکھل نے مسکراتے ہُوئے جواب دیا۔ "نہیں نہیں میں آپ کی جان لینے کا خواہشمند نہیں۔ مگر اس جاں بخشی کی ایک قیمت ہے۔ اگر آپ ہمیشہ کیلئے اپنی زبان بند کرنے کا وعدہ کریں۔ تو آپ یہاں سے اپنی جان سلامت لے جاسکتے ہیں۔" بختیار نے دل ہی دل میں فیصلہ کرکے کہا۔ "میں اپنے فرض کو اپنی جان کی قیمت پر بھی نہیں بیچ سکتا" جاکھل نے ایک بلند قہقہہ لگاکر کہا۔ "معلوم ہوتا ہے آپ بہت دنوں تک فلسفہ اخلاق پڑھتے رہے

ہیں مگر شاید آپ نہیں جانتے کہ زندگی کی کشاکش میں یہ پوئیڈ کتا ہمیں کسی کام نہیں آتیں۔ مگر نہیں میں آپ سے ناانصافی نہیں کرنا چاہتا۔ آپ کو سوچنے کے لئے وقت چاہیئے۔

بختیار اس خوفناک مجرم کی طمانیت قلب پر حیران ہو رہا تھا۔ جاکھل نے بڑھکر میز کے دراز سے ایک رسّی نکالی اور بختیار کو کرسی سے باندھ دیا۔ پھر وہ یہ کہکر کمرے سے باہر چلا گیا۔ "آپ شاید تنہائی میں بہتر سوچ سکیں گے۔"

بختیار کا دماغ اب بڑی سرعت سے کام کر رہا تھا۔ اس کی نظر ٹیلیفون پر جا پڑی۔ جو میز پر رکھا تھا۔ اگرچہ وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ مگر اس کے ہاتھ پاؤں آزاد تھے۔ وہ کرسی سمیت اٹھا اور میز کے قریب آگیا۔ ٹیلیفون کے ذریعے پولیس کے افسر اعلےٰ کو اپنی موجودہ حالت سے آگاہ کرنا ایک لمحہ کا کام تھا۔ اب اس کو اطمینان تھا کہ پانچ منٹ کے اندر اندر پولیس اپنی پوری طاقت سے اسے بچانے اور مجرم کو گرفتار کرنے کے لئے آپہنچیگی۔ مگر اسی وقت دروازہ کھلا۔ جاکھل اسی طرح پستول ہاتھ میں لئے کمرے کے اندر داخل ہوا۔ اور ایک فیصلہ کن لہجہ میں کہنے لگا۔ "تم نے میری رعایت کا ناجائز فایدہ اٹھالیا ہے۔ مگر پولیس کے پہنچنے سے پہلے پہلے میں تمہارا خاتمہ کرسکتا ہوں۔ سُنو اس پستول میں کئی گولیاں ہیں۔ جو تمہاری جان لینے کے بعد مجھے گرفتاری اور بدنامی سے بچا سکتی ہیں۔ جلدی فیصلہ کرو۔ تمہاری زبان بند رہیگی یا میں اسے ہمیشہ کے لئے بند کر دوں۔ تم بہادر ہو اور کبھی جھوٹ نہیں بول سکتے۔ یاد رکھو۔ تمہاری نیکنامی کا میں ذمہ وار ہوں۔"

بختیار نے جاکھل کی آنکھوں میں ایک خونخوار قاتل کے شعلے دیکھے۔ اور اُس کے ہاتھ کی حرکت کا اندازہ کرکے بول اُٹھا۔ "میں خاموش رہونگا۔"

دروازہ فوراً کھلا۔ اور پولیس کا افسرِ اعلےٰ سپاہیوں کیساتھ اندر داخل ہوگیا۔ جاکھل نے بڑی بے تکلفی سے سلام کیا۔ اور ہنستے ہوئے کہا۔ "ہمارے محکمہ کا یہ بہادر سراغرساں بہت عقلمند ہے۔ دوسروں کی تفتیش سے خود فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ جن مجرموں کی تحقیقات میں میں نے تین مہینے صرف کئے ہیں۔ ان کو تین گھنٹوں میں ماخوذ کرکے کامیابی کا سہرا یہ اپنے سر باندھنا چاہتا ہے۔ میں نے خود ہی اسے ٹیلیفون پر پیغام بھیجنے کا موقع دیا تھا۔ یہ لیجئے یہ فہرست ہے ان جعلسازوں کی جو یہاں سے سات میل پر جعلی سکے تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ مگر میرے انعام میں بختیار بھی شریک ہوگا۔" پھر اسنے بختیار کو مخاطب کرکے کہا۔ "میں تمہیں [illegible] دیتا ہوں سب کچھ سچ سچ کہدو۔ تم ایک حد تک کامیاب ہو [illegible] اور تمہاری تفتیش کا طریق قریب قریب ایک ہی تھا۔ [illegible] کروگے۔" پولیس کے افسرِ اعلےٰ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ [illegible] سپرنٹنڈنٹ پولیس ہیں۔" بختیار نے دل ہی دل میں [illegible] "اور وہ عورت؟" اور پھر وہ اپنے محکمہ کی وسعت پر حیران [illegible]

غم نصیب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۲۔ جولائی۔

وہ ہنوز اپنی بیمار سہیلی کے ہاں مقیم ہے، اور بدستور حسن و جمال کی مجسّم دیوی ہے۔ وہی شانِ دلربائی ہے۔ وُہی اعجازِ مسیحائی کہ جدھر کا رُخ کرتی ہے رحمت کا فرشتۂ غیب بن کر دردمندوں کے کان میں راحت کی جاں بخش نوید پھُونک دیتی ہے۔ کل وہ اپنی بہنوں کے ہمراہ سیر کو گئی۔ مجھے پہلے ہی اس کا علم ہو چکا تھا۔ مَیں بھی جا پہنچا اور اُن میں شامل ہو کر سیر و تفریح کا لطف اُٹھاتا رہا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے تک یہی مشغلہ رہا۔ بعد میں ہم نے شہر کا رُخ کیا۔ اثنائے راہ میں ہم کچھ دیر تک اُس چشمے پر ٹھیرے رہے۔ جو یوں تو مدّت سے میری منظورِ نظر سیرگاہ ہے لیکن آجکل اُس کی دلفریبیوں میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

چارلوٹی چشمے کے گرداگرد کی نیچی سی دیوار پر بیٹھ گئی اور ہم اُس کے دائیں بائیں جمع ہو گئے۔ مَیں نے نظر اُٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔ اور مجھے وہ وقت یاد آگیا جب میرا دل اک آوارہ بیکار تھا۔ کہ محبّت کی زرّیں زنجیر سے آزاد کھُلے بندوں فضائے خیال میں گشت لگاتا پھرتا تھا۔ مَیں نے کہا۔

"پیارے چشمے، مدّت ہُوئی ہیں نے تیرے سبزہ پوش کناروں کی فرحت بخش آرامگاہ میں تفریحِ طبع کا لُطف نہیں اُٹھایا۔ مَیں بارہا تیرے پاس سے اس طرح گذر گیا ہوں۔ گویا میری تیری کوئی جان پہچان ہی نہیں۔ یہاں تک کہ مَیں نے ایک مرتبہ بھی تیری طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھا۔" مَیں نے نیچے کی طرف نظر کی تو دیکھتا ہوں کہ چارلوٹی کی چھوٹی بہن جین پانی کا ایک گلاس لئے آرہی ہے۔ پھر میری نگاہیں چارلوٹی پر جا پڑیں اور مَیں نے محسوس کیا۔ کہ یہی وہ پیکرِ اعجاز ہے جس نے آن کی آن میں میری دنیا کی رُت بدل دی۔ اسی عالم میں جین پانی لئے آ پہنچی۔ اس کی بہن میرین نے ہاتھ بڑھا کر اُس سے گلاس لینا چاہا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا۔ بولی "پہلے آپا جان پی لیں" اور اُس وقت اُس کے معصوم چہرے کا دلکش رنگ روپ قابلِ دید تھا۔

اس پیار بھرے لہجہ اور بھولے بھالے انداز نے مجھ پر ایک عملِ تسخیر کا اثر کیا۔ مَیں مسحور ہو گیا۔ اور مَیں نے بچّی کو اُٹھا کر چوم لینے سے دل کی بھڑاس نکال لینا چاہی۔ لیکن

بچّے کا دل ہی کیا ہے۔ وہ اس ناگہانی یورش سے خوفزدہ ہو کر رو پڑی۔ چارلوٹی نے مجھے سمجھایا۔ "ایسا کبھی نہ کرنا چاہیئے۔ بچّے سہم جاتے ہیں۔" مجھ سے کچھ جواب بن نہ پڑا۔ میں گھبرا سا گیا۔ چارلوٹی عین کا ہاتھ تھام کر اُسے سیڑھیوں سے اُتار لے گئی اور بولی: "آؤ جین کیا ہُوا کوئی بات نہیں۔ وہ دیکھو صاف ستھرا پانی پاس ہی بہ رہا ہے۔ ذرا منہ دھو ڈالو۔" میں بُت بنا پاس کھڑا رہا اور ٹکٹکی لگائے انہیں دیکھا کیا۔ ننھی لڑکی ہاتھ بھگو بھگو کر منہ پر ملتی۔ اس بھروسے پر کہ جتنی آلودگیاں میرے چہرے پہ کے بدنما خس و خاشاک سے اُسے لگ گئی تھیں۔ وہ سب اس آبِ زلال سے دُھل کر پاک و صاف ہو جائیں گی۔ اور اگرچہ چارلوٹی بار بار اُس کی دلجمعی کرتی کہ "بس کافی ہے۔ وہ اُس کے کہے پر کان نہ دھرتی اور اپنے مقدور بھر چہرے کو رگڑے جاتی کہ جتنا زیادہ دھوؤں گی۔ اتنا ہی بہتر ہے یقین کرنا میں نے کبھی رسمِ اصطباغ کو بھی اس قدر احترام آمیز خاموشی اور جامد سکون سے نہیں دیکھا۔ اور جب چارلوٹی اس کام کو انجام دیکر واپس آئی۔ تو قریب تھا کہ میں فرطِ ارادت سے اُس کے سامنے جُھک کر زمین بوس ہو جاتا جس طرح مشرق والے اپنے پیر پیغمبروں کی تعظیم بجا لاتے ہیں۔

شام کے وقت میں ایک ایسے شخص سے اس بات کا ذکر کئے بغیر نہ رہ سکا جسے میں نے صاحبِ حسنِ خیال کر رکھا تھا۔ کیونکہ دیکھنے میں سمجھدار ہے لیکن میری ظاہر بین نظروں نے کتنا دھوکا کھایا۔ اُس کے جواب نے تو میری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ کہنے لگا۔ "چارلوٹی سے بڑی غلطی سرزد ہوئی ہمیں بچّوں کو اس طرح گمراہ نہ کرنا چاہیئے۔ یہی غلطی تو سارے فساد کی جڑ ہے۔ اسی کے باعث تو طرح طرح کے وہم اور وسوسے بچّوں کے دلوں میں جاگزیں ہو جاتے ہیں جن سے بچّوں کو محفوظ رکھنا ہمارا فرضِ عین ہے۔" میں اس کے جواب میں کچھ کہنے والا تھا۔ یکایک مجھے خیال آگیا کہ یہی شخص تھا۔ جسے ایک ہفتہ پیشتر بپتسمہ دیا گیا تھا۔ اس لئے میں نے خاموشی مصلحت سمجھی اور کچھ نہ کہا لیکن اپنے عقیدہ کے وثوق میں سرِ مو فرق نہ آنے دیا۔ ہمیں بچّوں سے اُسی طرح پیش آنا چاہیئے۔ جس طرح خُدا ہم سے پیش آتا ہے ـــــ ہم طفلانہ کم فہمیوں اور معصومانہ وہم پرستیوں کے زیرِ اثر ہی خوش ہیں۔

۸۔ جولائی۔

انسان بچّہ نہیں تو کیا ہے! کہ دُھن سوار ہو جائے تو صرف ایک نگاہ کی آرزوئے خام میں مر مٹتا ہے!

تعجب نہیں، تو کیا ہے! چند روز ہوئے چارلوٹی نے ولیم میں قدم رنجہ فرمایا۔ وہ سہیلیوں کے ہمراہ ایک گاڑی میں سوار ہو کر آئی لیکن جب ہم پیادہ پا سیر کر رہے تھے تو اُس وقت مجھے یوں خیال گذرا۔ کہ مَیں نے چارلوٹی کی سیاہ آنکھوں میں . . . . . مَیں بھی کیسا دیوانہ ہوں — مگر بخدا تم خود دیکھتے، اُن آنکھوں کو دیکھتے، تو تمہاری بھی یہی حالت ہوتی — خیر، مَیں مختصراً بیان کئے دیتا ہوں (کیونکہ میری پلکیں نیند کے مارے جھپکی پڑتی ہیں) جس وقت عورتیں رخصت ہو کر گاڑی میں سوار ہوتی ہیں۔ تو مَیں اور ایڈرَن اور ایک اور نوجوان سیلسٹٹ نام گاڑی کے دروازے کے پاس کھڑے تھے۔ وہ دونوں ہنسی ٹھٹھوں میں مشغول تھے لیکن مَیں تھا کہ ایک اندازِ از خود رفتگی میں ٹکٹکی لگائے چارلوٹی کی آنکھوں کو گھور رہا تھا۔ اُس کی وداعی نگاہ باری باری ہر ایک پر پڑی، ایک مَیں ہی حرماں نصیب تھا۔ کہ اس عطائے عام سے بے بہرہ رہا۔ مَیں نقشِ دیوار بنا پاس کھڑا تھا۔ التجائے گدایانہ کی زندہ تصویر! میری نظروں میں وہی وہ جلوہ فرما تھی۔ اور میرے بدن کے روئیں روئیں سے خدا حافظ کی صدا نکل رہی تھی۔ لیکن اُس نے مطلق میری طرف توجہ نہ کی۔ گاڑی بہ جا۔ وہ جا، دیکھتے دیکھتے دُور نکل گئی۔ اور میری آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا گئیں۔

تاہم میری حسرت بار نظریں دیر تک رسمِ مشایعت ادا کرتی رہیں۔ اسی عالمِ بیخودی میں کیا دیکھتا ہوں کہ چارلوٹی کے سر کی ٹوپی کھڑکی سے باہر نظر آ رہی ہے اور معاً اُس کا چہرہ ہماری جانب مڑا ہوا دکھائی دیا۔ خدا جانے وہ اُس وقت کسے دیکھ رہی تھی! آج تک اسی الجھن میں گرفتار ہوں۔ کہ الٰہی اس خوش نصیبی کا سہرا کس کے سر ہے! اور یہی الجھن میرے لئے سرمایۂ تسلّی ہے کسے معلوم ہے کہ اس نگاہِ کرم کا مرکزِ توجہ کون تھا۔ کون نہ تھا! کون کہہ سکتا ہے کہ یہ میرے ہی بھاگ جاگے ہوں! خدا حافظ ولیم۔ تم بھی کہو گے کہ یہ اِک عجب طفلِ ناداں ہے۔

---

۱۰ جلائی

احباب کی محفل گرم ہو اور سلسلۂ گفت و شنید میں کہیں چارلوٹی کا ذکرِ خیر آ جائے تو اُس وقت نہیں معلوم مجھ سے کیا کیا مجنونانہ حرکات سرزد ہو جاتی ہوں گی خصوصاً اُس وقت جب کوئی شخص صاف صاف لفظوں میں مجھ سے اُس کی نسبت استفسارِ رائے کر بیٹھے چارلوٹی کے متعلق رائے زنی کرنا! مجھے اس جملے سے کتنی نفرت ہے! مَیں کہتا ہوں خدا کی خدائی میں وہ کونسی عجیب الخلقت ہستی ہو گی۔ جو اُسے ایک نظر دیکھ لے اور بندۂ بے دام نہ بن جائے، دل و جان سے والہ و شیدا نہ ہو جائے

اُس کی شان میں زبان کھولنا چھوٹا مُنہ بڑی بات ہے پھر راستے نبی کا تو ذکر ہی کیا؟ اسی طرح ایک دن کسی نے مجھ سے پُوچھا" کیوں صاحب آپ اوسین کو کیسا خیال کرتے ہیں؟" مجھے اس سوال پر بڑی ہنسی آئی۔

۱۱- جولائی۔

میڈم م . . . کی حالت بہت خراب وخستہ ہے۔ اور مَیں ہر دم اُس کی شفایابی کے لئے دست بدعا رہتا ہوں۔ کیونکہ چارلوٹی کی ہمدردی میرے رنج وغم کی شریک حال ہے۔ وہ میری خاطر سے گھنٹوں اُس کے پاس بیٹھی اُسے دم دلاسا دیتی رہتی ہے۔ اور آج اُس نے مجھے اُس کے ہاں کا ایک عجیب وغریب واقعہ سُنایا ہے۔ بوڑھا م ایک زر پرست اور تنگدل آدمی ہے۔ اُس نے برسوں سے اپنی بیکس بیوی کا ناک میں دم کر رکھا ہے لیکن اُس نیک بخت کو آفرین کہیئے کہ کیا مجال جو ایک مرتبہ بھی چون وچرا کی نوبت آئی ہو۔ اُس نے شوہر کی اطاعت میں لہو پانی ایک کر دیا۔ اور صبر وشکر سے سب سختیاں جھیلتی رہی۔ آج سے چند روز پیشتر جب طبیب نے ہمت ہار کر علاج کی باگ ڈور خدا پر چھوڑ دی اور اس بات کا اعلان کر دیا کہ مریض کے بحال ہونیکی صورت نظر نہیں آتی۔ تو اُس نے اپنے شوہر کو بُلا بھیجا۔ اور چارلوٹی کی موجودگی میں اُس سے یوں خطاب کیا۔" آپ سے التجا ہے کہ اس کٹھن وقت میں آڑے آئیں اور مجھ گناہگار بندی کی بھول چوک بخش دیں۔ مجھے آپ کے سامنے ایک خاص بات کا اعتراف کرنا ہے۔ جو ممکن ہے میری موت کے بعد کسی قدر تشویش کا باعث ہو۔ خدا گواہ ہے کہ مَیں نے آپ کے گھر بار کا انتظام ہمیشہ دیانتداری اور کفایت شعاری سے کیا ہے۔ اور اس کوشش میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا کہ جتنا کم خرچ ہو سکے اتنا کم کروں۔ لیکن میری خطا معاف ہو تو مَیں عرض کروں۔ کہ مَیں کفایت شعاری کی آڑ میں آپ کو تیس سال متواتر دھوکا دیتی رہی ہوں آپ کو یاد ہوگا کہ جب اللہ رکھے آپ کا بیاہ ہُوا ہے۔ تو آپ نے خانہ داری کے خرچ اخراجات کے لئے تھوڑی سی رقم مجھے دی تھی۔ کہ کبھی ضرورت پڑے۔ تو اس سے کام لوں۔ جب آپ کی کمائی میں اللہ نے برکت دی۔ اور خیر سے گھر کا کاروبار بڑھا تو خرچ کا بڑھنا بھی ایک لازمی امر تھا۔ مَیں نے آپ سے لاکھ کہا سُنا کہ ہفتہ بھر کا زر خرچ جو آپ مجھے دیتے ہیں اُس میں کچھ اضافہ ہونا چاہیئے۔ لیکن آپ نے میری ایک نہ مانی اور مَیں نے بھی تنگ آکر چپ سادھ لی۔ آپ خدا کو حاضر وناظر جان کر کہیئے۔ کہ عین اس وقت

جب ہماری ضرورتوں کا کوئی ٹھکانا نہ تھا آپ مجھ سے کیا کہتے تھے۔ یہی کہ جس طرح بنے ہفتہ بھر میں سات فلورن سے گذارہ کرو۔ میں نے آپ کے ارشاد کو سر آنکھوں پر رکھا اور جو کچھ آپ دیتے رہے شکر بجا لا کر ہاتھوں ہاتھ لیتی رہی لیکن یہ روش کب تک نبھتی؟ آخر روپیہ کے صندوق پر ہاتھ دراز کرنا پڑا۔ وہاں سے بقدرِ ضرورت روپیہ پیسہ نکال نکال کر صرف میں لاتی رہی۔ مجھے یہ خوف تو تھا ہی نہیں کہ کوئی مجھ پر اپنے ہی گھر کی چوری کرنے کا الزام دھریگا۔ اس لئے میں آنکھیں بند کر کے خرچ کرتی رہی۔ یہ سب کچھ ہے لیکن خدا جانتا ہے کہ میں نے کبھی ایک پھوٹی کوڑی بھی اکارت نہیں کی۔ اور میں اس بات کا اقبال کئے بغیر داورِ محشر کے حضور میں اطمینانِ قلب کے ساتھ جا سکتی تھی۔ لیکن مجھے یہ خوف تھا کہ جس نیک بخت بیوی کے سر پر میرے بعد اس گھر کا بار پڑیگا۔ کہیں اُس کے لئے یہ بار وبالِ جان نہ ہو جائے یہ گتھی میرے سلجھائے بغیر سلجھ نہ سکتی تھی۔ کہ اتنے بڑے گھر کا انتظام اتنے سے خرچ میں کیونکر ہوتا رہا آپ تو تا ابد اسی زعم میں مبتلا رہتے کہ آپ جتنا خرچ مجھے دیتے آتے ہیں۔ وہ کافی ہوتا تھا۔ اور وہ بیچاری مفت میں سر کھپاتی۔ کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے! اس ذرا سی رقم کو میں کہاں کہاں اٹھاؤں؟"

پھر ہم دونوں کے درمیان اس ناقابلِ فہم مسئلہ کے متعلق گفتگو چھڑ گئی کہ کس طرح لوگ جان بوجھ کر اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیتے ہیں۔ غور طلب امر ہے کہ سات فلورن وہاں کیا کر سکتے ہیں۔ جہاں اُس سے دوگنی چوگنی رقم بھی شمار قطار میں نہ ہو۔ اب اگر کوئی شخص صرف سات فلورن میں گذارہ کرے۔ تو کسی کو کیونکر شک نہ گذرے۔ کہ خدا نہ بھلائے دال میں ضرور کچھ کالا کالا ہے۔ لیکن میں نے بیسیوں عقل کے اندھے ایسے دیکھے ہیں۔ جو بغیر کسی تعجب کے اس اعتقاد پر آسرا لگائے بیٹھے ہیں۔ کہ ہو نہ ہو۔ ہمارے گھر میں ضرور کوئی طلسمی قوت برروئے کار ہے۔ ضرور کوئی پُر اعجاز چشمہ اُبل رہا ہے ورنہ ہماری کمائی میں اتنی برکت کیوں ہو؟

۱۳- جولائی

نہیں مجھے دھوکا نہیں ہُوا۔ اُس کی سیاہ آنکھوں میں صاف صاف جھلک رہا تھا۔ کہ اُسے مجھ سے ایک گہری دلبستگی ہے۔ اس انکشاف کا رُوح پرور کیف میری رگ رگ میں مسرت کی لہریں دوڑا رہا ہے۔ اور مجھے اپنے دل کے کہنے پر کامل اعتماد ہے جو ایک ہنگامہ پرور خوشی کے جوش میں ناچ ناچ کر سب سے یہ جاں بخش مژدہ سُناتا ہے۔ کہ اُسے مجھ سے محبت ہے!

اُسے مجھ سے محبت ہے! آہ یہ خیال مجھے اپنی ہی نگاہوں میں کسقدر سرفراز کئے دیتا ہے! اور چونکہ تم میری طبیعت کے اداشناس ہو، جو کچھ میرے دل پر گذر رہا ہے اُسے بخوبی سمجھ سکوگے، اس لئے میں تم سے بلا تامل کہتا ہوں کہ میں بیحد خودبین ہو چلا ہوں۔ اس غرور آفرین خیال نے مجھے اپنے آپ کو توقیر کی نگاہوں سے دیکھنا سکھا دیا ہے۔ کیوں نہ ہو۔ آخر میں کس کی نگاہِ لطف کا ہدیۂ مقبول ہوں!

سوچتا ہوں کہ خدایا یہ محض طلسمِ خواب و خیال ہے کہ سچ مچ حقیقت کی جھلک۔ پھر دیکھتا ہوں تو میری نگاہِ فتح کو روئے زمین پر کوئی فردِ بشر ایسا نظر نہیں آتا جس کے سر میں میری رقابت کا خیال تک سما سکے، جس سے زک کھانے کا مجھے خوف ہو۔ لیکن جب وہ گرمجوشی سے اپنے منگیتر کا ذکر کرتی ہے تو مجھ پر اوس سی پڑ جاتی ہے۔ میرا دل اس طرح بیٹھ جاتا ہے جس طرح اس افسردہ خاطر سپاہی کا دل جس سے اُس کا طرۂ امتیاز زبردستی چھین لیا جائے۔ اور اُسے اُس کے حرزِ جان یعنی تلوار سے محروم کر دیا جائے۔

۱۶۔ جولائی

جب کبھی بیٹھے بیٹھے اتفاق سے اُس کی اُنگلی کو چھو لیتا ہوں، یا میز کے نیچے میرے اُس کے پاؤں آپس میں ٹکرا جاتے ہیں۔ تو میرا دل کس طرح بے تحاشا دھڑکنا شروع کر دیتا ہے! میں اس طرح سمٹ کر پیچھے ہٹ جاتا ہوں گویا کوئی دہکتی ہوئی انگیٹھی میرے آگے پڑی ہو لیکن پھر ایک پُراسرار قوت مجھے اُکساتی ہے۔ کہ اس تلخ و ترش تجربہ کا اعادہ کروں۔ اور اُس وقت میرے تمام حواس اک رقصِ سرشار میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اُس کے معصوم اور غافل دل کو خبر تک نہیں ہوتی۔ کہ قرب کا یہ مختصر الحیات لمحہ میرے لئے کسقدر فتنوں سے لبریز ہوتا ہے۔ بعض اوقات جب ہم گفتگو میں مصروف ہوتے ہیں۔ تو وہ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیتی ہے۔ اور سرگرمیِ گفتار میں میرے قریب آجاتی ہے۔ یہانتک کہ میرے ہونٹوں کو اُس کے نفسِ جاں پرور کی گرمی محسوس ہونے لگتی ہے ـــــ اُس وقت کچھ نہ پوچھو میرے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے۔ مجھے یوں معلوم ہوتا ہے گویا مجھ پر بجلی سی گر پڑی ہو۔ اور میں چاہتا ہوں کہ زمین پھٹ جائے تو اُس میں سما جاؤں۔ آہ، ولیم! اُس کی یہ فرشتہ صفت سادہ لوحی میرے لئے ایک عذابِ الیم ہے۔ شرکتِ غیر کا درد انگیز خیال امیدِ کامرانی کا سارا لطف کرکرا کر دیتا ہے۔ رشک کی پھانس دل میں کھٹکتی رہتی ہے۔ . . . . . . مگر نہیں، غلطی ہوئی۔ مجھے اپنے آپ کو سمجھنے میں غلطی ہوئی ـــــ میرا دل ایسا گیا گذرا بھی نہیں۔ کہ ایسے سفلانہ جذبہ سے مغلوب ہو جاتے

وہ کمزور ضرور ہے، بیحد کمزور ——— مگر آہ کمزوری بھی تو ایک عجیب سا عیب ہے!

وہ میری نظروں میں ایک مقدّس ہستی ہے۔ اس کے حضور میں تمام نفسانی خواہشات مُردہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ یہانتک کہ مَیں جب اُس کے قریب ہوتا ہوں تو اپنی حسیات کے اظہار سے بھی عاجز آجاتا ہوں، مجھے یہی محسوس ہوتا ہے کہ میری رُوح میرے جسم کے ہر رگ و ریشہ میں پھڑک رہی ہے .... وہ کبھی کبھی موسیقی کی ترنگ میں آکر اپنا پیانو لے بیٹھتی ہے۔ اور ایسی رسیلی منموہنی سریں نکالتی ہے جو سُنتے ہی ایک نشہ طرب بن کر دل دماغ پر چھا جاتی ہیں ——— نغمہ بالکل سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ لیکن روحانیت کے وجدان انگیز سرُور سے مملو! یہ اُس کا مرغوب راگ ہے، اور جب وہ پہلی ہی تان توڑتی ہے تو نغمہ کا سیلاب آن واحد میں میرے دل سے کلفت کی گرد دھو دیتا ہے۔

مَیں اُن افسانوں کے حرف حرف پر ایمان لاتا ہوں جو زمانۂ قدیم کی جادو طراز موسیقی کی نسبت بیان کئے جاتے ہیں۔ موسیقی میں ضرور جادو کی تاثیر ہے۔ چار لوٹی کا سیدھا سادہ نغمہ مجھے کیسا مبہوت کر دیتا ہے! کبھی کبھی جب مَیں ہجومِ حوادث سے دل برداشتہ ہو کر خودکشی کا تہیّہ کر لیتا ہوں، تو وہ وہی راگ چھیڑ دیتی ہے، اور چشم زدن میں غم و الم کی گھنگھور گھٹائیں جو میرے دل پر چھائی ہوتی ہیں۔ کافور ہو جاتی ہیں۔ اور مجھے پھر وادیٔ حیات میں عشرت کی بہارِ رنگین نظر آنے لگتی ہے۔

۱۸۔ جولائی

محبّت کی عشرت سامانیوں کے بغیر بزمِ کائنات کا نقشہ کیسا متغیّر ہوتا! ایک فانوسِ خیال روشنی کے بغیر کس کام کا ہے۔ روشنی ہی اُس کی رُوح و رواں ہے روشنی ہی سے اُس کی قدر و قیمت ہے۔ فانوس میں بتّی روشن کر دو، تو رنگا رنگ کی درخشاں شکلیں جھلک جھلک کر ایک پرتوِ رنگین پیدا کریں گی۔ اسی طرح اُس دل کو جو جلوہ گاہِ عشق ہو ارد گرد کی دُنیا گوناگوں رنگینیوں سے معمور نظر آتی ہے اور چاہے محبّت ہمیں محض ہرتے پھرتے سایوں کا ایک نظر فریب شعبدہ ہی کیوں نہ دکھائے ہم پھر بھی بیحد مسرور و محظوظ ہوتے ہیں۔ جبکہ ہم بچّوں کے سے پُر انہماک شوق سے اِن صورِ خیالی کی جلوہ آرائیوں کو دیکھتے ہیں اور مسحور ہو جاتے ہیں۔

آج میری طالب دید آنکھیں عیش کامرانی سے محروم رہی ہیں۔ کیونکہ مَیں بدقسمتی سے چند ایسے اصحاب کے نرغہ میں آگیا۔ جن سے گلو خلاصی مشکل تھی۔ مَیں نے پیچھا چھڑانے

کے لئے لاکھ تدبیریں کیں لیکن ایک نہ چلی۔ اب میں کرتا تو کیا کرتا؟ آخر ایک تدبیر سوجھی۔ میں نے اپنے نوکر کو چارلوٹی کے ہاں بھیج دیا۔ کہ کم از کم ایسے شخص کو دیکھ کر ہی آنکھیں سینک لوں جسے اُس کی قربت کا شرف حاصل ہوا ہو۔ اُف کس بیتابی سے میں اُس کی واپسی کا منتظر رہا! کس خوشی سے میں نے اُس کا استقبال کیا! یقین جاننا میں ضرور اُسے اپنے آغوش میں لے کر فرطِ شوق سے چوم لیتا اگر حجاب مانع نہ آتا۔

ایک بیش قیمت پتھر کے متعلق مشہور ہے کہ اگر اسے دھوپ میں رکھ دیا جائے۔ تو وہ سورج کی کرنیں اپنے اندر جذب کر لیتا ہے اور رات کے وقت ایک چراغ کی طرح جگمگاتا ہے۔ جس کی وجہ سے اُسے لعلِ شب چراغ کہتے ہیں۔ اس وقت یہ نوکر بھی میری نظروں میں ایک لعلِ شب چراغ کی مثال تھا۔ اس خیال نے کہ یہ شخص اس وقت اُس کے حضور سے چلا آ رہا ہے اُسے میرے نزدیک اس قدر عزیز کر دیا تھا کہ اگر مجھے گنجِ قارون بھی نعمتِ عظمیٰ بھی دی جاتی تو بھی میں اس سے جدا ہونے کا روادار نہ ہوتا۔ اُس کا وجود میرے لئے کس قدر خوشیوں کا خزینہ دار تھا! دیکھو ولیم خبردار مجھ پر ہنسنا نہیں۔ مجھے بتاؤ کیا وہ چیز جو ہمیں خوش کر دے کبھی دھوکا ہو سکتی ہے؟

۱۹- جولائی

"آج پھر مجھے اُس کا دیدار نصیب ہوگا! صبح سویرے جب میں سو کر اُٹھتا ہوں اور نو طلوع سورج کی متبسم جلوہ پاشیوں کو دیکھتا ہوں۔ تو میں فرطِ مسرت سے پکار اُٹھتا ہوں۔ "آج پھر مجھے اُس کا دیدار نصیب ہوگا!"— اور پھر میرے دل میں کسی اور خواہش کی گنجائش نہیں رہتی۔ سب، سب کچھ اس ایک خیال میں سما جاتا ہے۔

(باقی دارد)

محمد ہادی حسین

تارا

از بابو کشیرود چندر چیٹرجی ——— مترجمہ و مرتبہ حکیم احمد شجاع بی اے

ایک ڈراما

ارکان ڈراما

بیہرداس گنگولی۔ ایک وکیل

ہری داس گنگولی۔ بیہرداس کا بیٹا۔ ایک وکیل

چندر کمار مکرجی۔ ایک وکیل

جگیش چندر چیٹرجی۔ ایک زمیندار

گریش چندر بنیرجی۔ ایک زمیندار

اگھور ناتھ گھٹک۔ ایک برہمن

ہیران بابو۔ عطر فروش

جدو ناتھ مجرہ۔ ایک ڈاکٹر

نرنجن بابو۔ مجسٹریٹ

جگن ناتھ متر۔ اہلکار عدالت

پرسن کمار دت۔ اہلکار عدالت

——— وکیل سرکار

——— سشن جج

رگھوا۔ ملازم

پاربتی دیوی۔ جگیش کی ماں

ساوتری دیوی۔ جگیش کی بہن چندر کمار کی بیوی

یشودا دیوی۔ بیہرداس کی بیوی۔

تارا۔ بیہرداس کی بیٹی

بربھا دیوی۔ ہری داس کی بیوی

———

پہلا باب

پہلا منظر

ہیرداس گنگولی کا مکان

تارا (کتاب کو پٹک کر) مجھے پڑھانے میں کتنی محنت کرتے ہیں۔ اگر اسی طرح مجھے شروع ہی سے کوئی پڑھاتا تو میں بھائی سے زیادہ لائق ہو جاتی۔ مگر چار مہینے کے بعد تو وہ چلے جائینگے۔ ان کے جاتے ہی میری تعلیم کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اور آہ پھر ان کو میں کبھی دیکھ بھی نہ سکونگی۔

(پربھا داخل ہوتی ہے)

پربھا۔ آپا۔ اتنا نہ پڑھا کرو۔ بینائی میں فرق آجائیگا۔

تارا۔ تو بھائی سے صلح ہو گئی کیا۔

پربھا۔ ہماری لڑائی ہی کب ہوئی تھی؟ تمہیں کیسے معلوم ہوا؟

تارا۔ کیسے ہی معلوم ہوا ہو۔ مگر میں جانتی ہوں۔ لڑائی ضرور ہوئی تھی۔

پربھا۔ آخر کیسے معلوم ہوا؟

تارا۔ بھائی کا چہرہ ہی کہے دیتا تھا۔

پربھا۔ ہاں وہ خفا تو ضرور تھے۔ مگر تمہیں معلوم بھی ہے وہ کیا تھی۔

تارا۔ وجہ ہوگی کوئی ایسی ہی سی۔

پربھا۔ تو کیا وہ واقعی خفا تھے۔

تارا۔ خفا ہوتے بھی تو کیا۔ تمہیں خود ہی منا بھی تو لینگے۔

پربھا۔ نہیں منانا تو پھر مجھے ہی پڑیگا۔

تارا۔ واہ کبھی عورتیں بھی منایا کرتی ہیں۔ یہ تو مردوں ہی کا کام ہے۔

پربھا۔ تمہاری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔ تم یہ باتیں کیا جانو؟

تارا۔ تو اس میں رکھا ہی کیا ہے کہ میں نہ جانوں۔

پربھا۔ تو بتاؤ۔ پھر میں کیا کروں؟

تارا۔ بس خفا ہو جاؤ۔ بات تک نہ کرو۔ آپ سے آپ منا لینگے۔

پربھا۔ اور اگر نہ منائیں تو؟

تارا۔ تم خفا ہو کے تو دیکھو۔ جاؤ میری بات کو آزماؤ تو۔

پربھا۔ اچھا میں جاتی ہوں۔ مگر کہیں اور خفا نہ ہو جائیں۔

(جاتی ہے)

(چندر داخل ہوتا ہے)

چندر۔ تارا تم پڑھتی نہیں۔

تارا۔ پڑھکر کیا کرونگی؟

چندر۔ تارا تم یہ آجکل اتنی کھوئی کھوئی سی کیوں رہتی ہو۔

تارا۔ تم جان بوجھ کر کیوں پوچھتے ہو چندر؟

چندر۔ لو میں تمہارے لئے ایک نئی کتاب لایا ہوں بہت دلچسپ ہے۔

تارا (بے پروائی سے) ہوگی۔

چندر۔ تم اب پڑھنا چھوڑ دو اور گھر کے اندر ہی رہا کرو۔

تارا۔ تو کیا چندر تم مجھے اب دیکھنا بھی نہیں چاہتے۔

چندر۔ دیکھنا نہیں چاہتا؟ یا میری آنکھیں اب تمہیں دیکھنے کی تاب نہیں لاسکتیں۔

تارا۔ تو کیا چندر واقعی تم جو کچھ کہتے رہتے ہو سچ ہے۔ کیا سچ مچ تم کو مجھ سے محبت ہے۔

چندر۔ بار بار تم کیوں پوچھتی ہو۔ تارا۔

تارا۔ تو کہہ دو کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں پھر میں تمہیں دق نہ کرونگی۔

چندر۔ اچھا تم ہی کہو تم کیا سمجھتی ہو۔

تارا۔ یہی کہ تم مجھ سے محبت نہیں کرتے۔

چندر۔ تو پھر اب اس کا ذکر ہی کیا۔

تارا۔ مگر چندر میں تمہاری زبان سے سننا چاہتی ہوں اپنی عقل سے نہیں سمجھنا چاہتی۔

چندر۔ اگر اسی کی ضرورت ہے۔ تو سنو کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

تارا۔ اس طرح جیسے ایک پتھر کے دل میں محبت ہو سکتی ہو۔ کیا چندر میں ایسی ہی بدصورت ہوں۔

چندر۔ تم سے زیادہ دلفریب شکل میں نے آجتک نہیں دیکھی۔

تارا۔ تو پھر تم مجھ سے کھنچے کھنچے کیوں رہتے ہو۔

چندر۔ اس لئے نہیں کہ میں تم سے محبت نہیں کرتا بلکہ تمہاری آئندہ زندگی کا خیال مجھے مجبور کر دیتا ہے۔

تارا۔ تو کیا تم نے کبھی مجھ سے شادی کرنے کیلئے کوشش کرنے کا خیال بھی کیا ہے۔

چندر۔ میں کوشش ہی کیا کر سکتا ہوں۔ تمہارے والد کبھی رضامند نہیں ہو سکتے۔

تارا۔ تو پھر بھائی ہی سے کیوں نہیں کہہ دیکھتے۔

چندر۔ تم اپنی بھابی سے کیوں نہیں کہتیں۔

تارا۔ ہاں میں تو کہہ گذرونگی۔ مگر تم چندر کہیں انکار نہ کر دینا۔

چندر۔ میں اور انکار کر دوں۔ کیا تمہیں یہ شبہ ہو سکتا ہے۔

تارا۔ تم اتنے سرد مہر ہو کہ مجھے تمہاری محبت پر اعتبار نہیں آتا۔

چندر۔ ذرا میرے حالات تو دیکھو۔ میں ایم۔ اے ہوں وکیل ہوں۔ مگر تمہارے گھر پر ایک بے تنخواہ اُستاد کی

ی طرح تمہیں پڑھانے کے لئے پڑا ہوں مجھے یقین تھا
کہ تمہارے والد میری امداد کریں گے۔ مگر آج تک انہوں نے
مجھے ایک مقدمہ بھی نہیں دیا۔ اگر ان کو کبھی اس امر کا خیال
آتا کہ وہ مجھے اپنا داماد بنائیں۔ تو وہ کبھی ایسا سلوک
نہ کرتے۔

تارا۔ تو پھر اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟
چندر۔ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ نوکری کے
لئے اخباروں میں اشتہار دوں۔
تارا۔ آؤ وہ ابا آرہے ہیں۔

(جاتے ہیں)

(بیپر داس اور یشودا داخل ہوتے ہیں)

بیپر داس۔ دیکھا صبر کا پھل کیسا شیریں ہے۔ تارا
کے لئے ایسا بر مل گیا۔ اس کو خوش قسمتی نہیں کہو گی تو
اور کیا کہو گی۔
یشودا۔ ہاں جگہ تو اچھی ہے۔ مگر پہلی بیوی سے بچے ہیں۔
بیپر داس۔ تو پھر ایسے لوگ کنوارے کیسے بیٹھے رہیں۔
دس ہزار کی زمینداری اور پھر وکالت سے بھی معقول
آمدنی ہے۔
یشودا۔ ان کی عمر ہو گی کوئی پینتیس برس کی۔
بیپر داس۔ پینتیس نہ پچاس۔ ابھی بارہ سال ہی تو ہوئے
وکالت کا امتحان پاس کیا ہے۔

یشودا۔ مگران کے بچے کتنے ہیں۔
بیپر داس۔ دو بیٹے اور تین بیٹیاں۔
یشودا۔ تو جانے دو۔ یہ جگہ اچھی نہیں۔ چندر میں آخر ایسی
کیا برائی ہے۔ وہ بھی وکیل ہے۔ تمہاری امداد سے بہت
جلد ترقی کرلیگا۔
بیپر داس۔ اس کا نہ گھر نہ در۔ وکالت کو لڑکی اوڑھیگی
یا بچھائیگی۔ ابھی دس برس تک تو بیس روپے ماہوار کمانا
دشوار ہے۔
یشودا۔ بہو کہتی ہے کہ تارا کی مرضی بلکہ خوشی یہی ہے۔
بیپر داس۔ اچھا۔ جب ہی تو میں نے کہا تھا کہ اس کا
اس طرح پڑھنا ٹھیک نہیں۔ بس میں آج ہی چندر کو
نکال باہر کرتا ہوں۔
یشودا۔ نہیں نہیں ایسا نہ کرنا۔ سوشیل کے امتحان میں
اب کوئی چار مہینے ہی تو رہ گئے ہیں۔ پھر وہ خود ہی چلا
جائیگا۔
بیپر داس۔ تو میں تارا کی شادی اسی ہفتہ کے اندر اندر
کردونگا۔ گریش بابو کا گھر ویران ہو رہا ہے۔ ان کے ہاں
کوئی بھی عورت نہیں۔
یشودا۔ شادی سوشیل کے امتحان کے بعد ہوتی تو بہتر
ہوتا۔ اس میں اس کا ہرج ہو جائیگا۔
بیپر داس۔ دیر کی تو بنا بنایا کام بگڑ جائیگا۔

یشودا۔ بگڑ جائے تو بگڑ جائے۔ یہ رشتہ تارا کے قابل تو ہے نہیں۔

بیرداس۔ رنگ سیاہ ہے تو کیا نقش تو اچھے ہیں۔

یشودا۔ مگر اس کے پیٹ کو تو دیکھو کسقدر موٹا ہے۔

بیرداس۔ آدمی بھاری بھرکم ہی معتبر معلوم ہوتا ہے۔

یشودا۔ بہو کہتی تھی کہ تارا کو وہ ایک آنکھ نہیں بھاتے جس دن سے اس نے یہ خبر سُنی ہے۔ رو رو کر بُرا حال کر رکھا ہے۔

بیرداس۔ تو کیا وہ اتنی آزاد ہو گئی ہے۔ . . . . . اچھا . . . تمہی اس ماسٹر کو آج ہی چلتا کرتا ہوں۔

یشودا۔ تم ان سے کچھ نہ کہنا۔ مَیں ہری سے کہونگی وُہ انہیں رُخصت کر دینگے۔

بیرداس۔ مگر وہ آج ہی نکل جائے۔

یشودا۔ اچھا۔ مگر ایک بات یاد رکھو۔ تم دیکھ بھال کر بیٹی کو کوئیں میں دھکیل رہے ہو۔

بیرداس۔ اس کا مکان دیکھو گی تو پھر اسے کنواں نہ کہو گی پُری میں سمندر کے کنارے ایک محل بنا رکھا ہے۔ تارا تو رانی بنیگی رانی۔ تم اسے بھکارن بنانا چاہتی ہو۔ کنوئیں میں مَیں دھکیل رہا ہوں یا تم۔

یشودا۔ تو کیا سکھ صرف روپے ہی سے ملتا ہے۔ چندر کمار تو سچ مچ چندر کمار ہے۔

بیرداس۔ دیکھو اگر تم نے پھر میرے سامنے اس کا نام لیا تو اچھا نہ ہوگا۔

یشودا۔ اچھا جو تمہاری مرضی ہے وہی کرو۔

بیرداس۔ یہ دن بدن عورتوں میں آزادی کیسے آ رہی ہے گھر کا مختار ایک کتّے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اب اگر کام چلیگا تو سختی کرنے سے۔ ہر بات پر اعتراض ہر بات میں حجت۔

(جاتا ہے)

(تارا داخل ہوتی ہے)

تارا۔ میری شادی اس کلموہے بوڑھے کے ساتھ کرتے ہیں۔ مَیں تو سمجھی تھی کہ یہ پاپ ٹل گیا۔ اچھا ان کو سختی کرنے دو۔ مَیں بھی آزادی کی راہ ڈھونڈ نکالونگی۔

(چندر داخل ہوتا ہے)

چندر۔ چندر مجھے بچا لو۔ ورنہ مَیں جان دے دُونگی۔ بابا ایک بال بچوں والے بوڑھے دولتمند سے میری شادی کر رہے ہیں۔ صرف اس لئے کہ وہ جہیز طلب نہیں کرتا ماں کی بھی نہیں سُنتے۔

چندر۔ تو مَیں تمہیں کس طرح بچا سکتا ہوں۔

تارا۔ مجھے ساتھ لیکر کہیں چلے جاؤ۔ وہ تمہیں آج جواب دینے ہی کو ہیں۔

چندر۔ توبہ توبہ! یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے۔

تارا۔ کیوں نہیں ہو سکتا۔

چندر۔ اس سے زیادہ کمینہ پن اور کیا ہو سکتا ہے۔ ان کے اعتبار سے اتنی دغا۔

تارا۔ مگر تم پر انہوں نے اعتبار ہی کب کیا تھا۔ باوا نے تو تمہارا یہاں رہنا کبھی پسند نہیں کیا۔ ہر وقت سوشیل ہمارے سر پر موجود رہتا ہے۔ میں کتنے بہانوں سے اُسے ٹالتی ہوں۔

چندر۔ تو تمہارا ارادہ ہے کہ میں تمہیں بھگا کر جیلخانہ دیکھوں۔

تارا۔ تو پھر ہو گا کیا۔

چندر۔ ہو گا کیا۔ ایک دولتمند زمیندار کی بیوی بن کر تم دو دن میں مجھے بُھلا دو گی۔

تارا۔ (اس کا ہاتھ پکڑ کر) چندر میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ جس طرح ہو سکے مجھے بچاؤ۔

چندر۔ مجھے تو کوئی طریقہ سجھائی نہیں دیتا۔ اب تم اس خیال کو بھلا دو۔ چندر کمار اور اس کی محبت دونوں کو خاک میں ملا دو۔

تارا۔ تو کیا تم مجھے بھلا سکو گے۔

چندر۔ ہاں میرا فرض ہے کہ میں تمہیں بھول جاؤں جاؤ تارا ایک ستی کی طرح اپنے شوہر کی پوجا کرو۔

تارا۔ ایسے شوہر پر پھٹکار۔ میں اس کو کبھی اپنا شوہر نہیں بنا سکتی۔ تم ہی ہو میرے سوامی۔ میرے پتی۔ میں تم کو کبھی نہیں بُھولونگی۔

چندر۔ چپ چپ تارا! ایسے الفاظ زبان سے نہیں نکلنے چاہئیں۔ تم ابھی کم سن ہو۔ جو خیال تمہارے دل میں اتنی جلدی پیدا ہُوا۔ اتنی ہی جلدی جاتا رہیگا بہتر ہے اس کے کہ میں تمہیں بُھول جاؤں تم مجھے بھلا دو گی۔

تارا۔ میں موت کے بعد بھی تمہیں نہیں بُھلا سکتی۔

چندر۔ تو وہ مجھے آج جواب دیدینگے۔ بے عزّتی سے جانے سے بہتر یہی ہے کہ میں خود ہی چلا جاؤں۔

تارا (اس پر گر کر) چندر تم مجھے چھوڑ کر کہاں جاتے ہو۔ مجھے بھی ساتھ لے چلو۔

(باہر سے قدموں کی آواز آتی ہے)

بھائی آرہے ہیں۔ میں جاتی ہوں۔

(جاتی ہے)

(ہری داس داخل ہوتا ہے)

ہری۔ چندر بابو۔ ماں کا خیال ہے کہ . . . کہ . . . کہ۔

چندر۔ کہ اب مجھے یہاں نہ رہنا چاہئے۔

ہری۔ نہیں نہیں۔ یہ تو نہیں۔ مگر تارا کی شادی اب قریب ہے۔

چندر۔ تو میری طرف سے ماں کا شکریہ ادا کر دیجئے۔

اُنہوں نے مجھ پر بہت احسان کیا ہے۔ ہمیشہ اپنے بچوّں کی طرح رکھا۔ (جاتے ہوئے) لیجئے اب زیادہ کہنے کی کچھ ضرورت نہیں۔ میں آج ہی چلا جاؤنگا۔

ہری۔ چندر آدمی تو بہت اچھا تھا۔ مگر باوا اُسی کی نہیں مانتے۔ وہ کبھی نہیں مانینگے۔ (جاتا ہے)

پردہ

دوسرا منظر

جوگیش بابو کا مکان

چندر۔ ساوتری کے ایک نظارہ نے میری زندگی میں کسقدر تغیر پیدا کر دیا ہے۔ تارا کی یاد اس دو برس کے عرصہ میں بھی نہیں مٹ سکی۔ اس کی محبت آہ میں کبھی نہیں بھلا سکتا۔ اس کا حسن مجھ کو آج تک سرشار رکھتا ہے مگر ساوتری کا حسن، ساوتری کا علم بے نظیر ہے۔ وہ صرف عقیدت پیدا کرنے کے لئے بنائی گئی ہے تارا کی محبت پر یقیناً ساوتری کی عظمت غالب آگئی۔

(ساوتری اور پاربتی داخل ہوتی ہے)

(چندر سلام کرتا ہے)

پاربتی۔ آؤ بیٹا (پیار کر کے) کہو خیریت تو ہے۔ کتنی مدت کے بعد تمہیں دیکھا۔ پہلی نظر میں تو تمہیں پہچان بھی نہ سکی۔

چندر۔ مگر چچی! میں نے تو آپ کو پہچان لیا۔ آپ تو بالکل ویسی ہی ہیں۔

پاربتی۔ جوگیش سے معلوم ہُوا کہ تم پوری میں کام کرتے ہو۔ کہو آمدنی کی کیا حالت ہے۔

چندر۔ یہی دو تین سو کا اوسط ہے۔

پاربتی۔ پرماتما کرے تمہاری آمدنی میں بہت سی ترقی ہو۔ کہو شادی وادی کی فکر بھی کی۔

چندر۔ میرے جیسے تن تنہا شخص کے لئے شادی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔

پاربتی۔ تم تن تنہا کیوں ہو۔ کیا تم ہمیں بیگانہ ہی سمجھتے ہو۔

(جوگیش اور اگھور گھٹک داخل ہوتے ہیں)

چندر۔ اگھور بھائی تم کہاں سے آنکلے۔

اگھور۔ جوگیش کے لئے ایک رشتہ لایا ہوں۔ لڑکی کا باپ ایک بڑا زمیندار ہے۔ لڑکی اس کی اکلوتی بیٹی ہے اور ہر وجہ سے قابل تعریف ہے۔ بیس پچیس ہزار کا جہیز بھی ساتھ لائیگی۔

جوگیش۔ روپے کے لئے شادی کرنا غلطی ہے۔ روپیہ اس سے بہت کم قیمت پر مل سکتا ہے۔

اگھور۔ تم تو دیوانے ہو۔ لڑکی تو اچھی ہونی چاہیے۔ لیکن روپیہ پیسہ بھی ساتھ لائے تو کیا کہنا۔

جوگیش۔ لوگ تو یہی کہیں گے کہ گنیش چیٹرجی کا پوتا شادی
کر کے مالدار ہو گیا۔
چندر۔ تو کیا اگر اس کے ماں باپ مالدار نہ ہوتے۔ تو
اس کی شادی نہ ہوتی۔
جوگیش۔ جب وہ مالدار ہیں تو انہیں اس کی شادی کسی
مالدار ہی سے کرنی چاہیئے۔
چندر۔ جب لڑکی والے مالدار آدمیوں کو چھوڑ کر تمہیں پسند
کرتے ہیں تو صاف ظاہر ہے کہ وہ تم کو ان سے بہتر
سمجھتے ہیں۔
پاربتی۔ چندر کہتا تو درست ہے۔ ساوتری بولو تمہاری
کیا رائے ہے۔
ساوتری۔ میں تو لڑکی کو دیکھے بغیر کوئی رائے نہیں دے سکتی۔
پاربتی۔ تو چلو چل کے دیکھ ہی کیوں نہ آئیں۔ ان کا گھر
کچھ دور بھی نہیں۔
چندر۔ چلئے میں آپ کو پہنچا آتا ہوں۔

(ساوتری چندر اور پاربتی جاتے ہیں)

اگھور۔ جوگیش بابو ساوتری کی شادی کی بھی کہیں فکر کی
جوگیش۔ میرے پاس روپیہ ہوتا تو اتنی دیر کیوں ہوتی۔ اب
ساوتری کو ایسی ویسی جگہ بھی تو نہیں دیا جا سکتا۔
اگھور۔ چندر کے متعلق کیا رائے ہے۔
جوگیش۔ ماں کی رائے شاید ان کے حق میں نہ ہو۔
اگھور۔ کیوں اس میں تو روپے پیسے کا بھی خرچ نہیں
جوگیش۔ کہتے تو تم سچ ہو۔ مگر شاید چندر کو ہی اعتراض ہو
اگھور۔ اسے میں سمجھا لونگا۔

(چندر آتا ہے)

چندر۔ ساوتری اور ماں لڑکی کو دیکھ تو آئینگی۔ مگر یہ کیا
ضروری ہے۔ کہ ان کی پسند تمہاری پسند کے مطابق ہو
جوگیش۔ نہیں مجھے ساوتری کی پسند پر پورا اعتبار ہے۔
وہ خود مصوّر ہے۔ اور مصوّر کی آنکھ حسن کو پرکھنے میں
غلطی نہیں کرتی۔
چندر۔ کیا ساوتری کو مصوّری کا بھی شوق ہے۔
جوگیش۔ یہ دیکھو اس البم میں سب کی سب تصویریں
ساوتری کی کھینچی ہوئی ہیں۔
چندر (البم دیکھتے ہوئے) واہ چچی کی تصویر تو خوب ہے
معلوم ہوتا ہے۔ فوٹو پر رنگ کر دیا ہے۔
جوگیش۔ نہیں ماں کو سامنے بٹھا کر کھینچی ہے۔
چندر۔ یہ تو ساوتری کی اپنی تصویر ہے۔ یہ کیسے کھینچی۔
جوگیش۔ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھ کر۔
چندر۔ یہ تو بہت مشکل کام ہے۔ اگر اجازت دو۔ تو
میں اسے تھوڑی دیر کے لئے لے جاؤں۔ ذرا غور سے
دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے بھی مصوّری سے ذوق ہے
جوگیش۔ شوق سے۔

چندر۔ اب میں جانا چاہتا ہوں شام کو کھانے پر آؤنگا۔

(جاتا ہے)

جوگیش۔ حالات تو امید افزا ہیں۔

اگھور۔ کیوں میں نہ کہتا تھا۔

(پاربتی آتی ہے)

پاربتی۔ چندر یہاں آیا تھا کہاں گیا ہے۔

جوگیش۔ کھانے کے وقت آجائیگا۔ مگر یہ تو کہئے۔ اگر ساوتری کی شادی چندر سے کردی جائے تو کیسا؟

پاربتی۔ خاندانوں کے درجے میں جو فرق ہے۔

اگھور۔ نہیں یہ فرق کوئی بڑا فرق نہیں۔ شادی بالکل درست ہے۔

پاربتی۔ مگر چندر تو شادی ہی نہیں کرنا چاہتا۔

جوگیش۔ اگر میں اسے رضامند کرلوں۔

پاربتی۔ تو کیا کہنا ایسا رشتہ قسمت سے ہی ملتا ہے۔

جوگیش۔ مگر ساوتری کی رائے۔

پاربتی۔ میں معلوم کرلونگی۔

جوگیش۔ تو چلئے۔ آپ شام سے پہلے پہلے معلوم کرلیجئے۔ میں بھی ذرا شام کے کھانے کا انتظام کروں۔

(سب جاتے ہیں)

تیسرا منظر

جوگیش کا کمرہ

چندر (ساوتری کی تصویر کو دیکھتے ہوئے) صرف تصویر کو دیکھ دیکھ کر تو جی نہیں بھر سکتا۔ مگر ساوتری کے چہرے کی طرف دیکھا کس سے جائیگا۔ تصویر کو ہی دیکھا کروں کیا؟ مگر اس دل میں تو تارا کی محبت تھی۔ ایک دوسری محبت سے آلودہ دل کو اس دیوی کی خدمت میں کیسے نذر کروں ۔۔۔

(جوگیش داخل ہوتا ہے مگر رک جاتا ہے)

مگر وہ جوگیش جو مہادیو بابو کی بیٹی سے شادی کرنے پر رضامند نہیں ہوتا۔ کیا اپنی بہن کی شادی مجھ جیسے شخص سے کرنے پر رضامند ہوجائیگا۔ اس کا خاندان واقعی مجھ سے بہت بہتر ہے۔ تو پھر اس خیال کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ (تصویر کو الگ ہٹا کر رکھتا ہے)

جوگیش (آتا ہے) چندر تم آگئے۔ معاف کرنا۔ مجھے ذرا دیر ہوگئی۔ کہو کچھ اور بھی سنا۔ آج ہی شام کو میری منگنی کی رسم بھی ادا ہوجائیگی۔

چندر۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ کہو یار خوش تو بہت ہوگے۔

جوگیش۔ میری خوشی کو نہ پوچھو۔ میں خوش ہوچکا۔

(اٹھ کر جانا چاہتے ہیں)

مگر ساوتری کی تصویر کہاں ہے۔

چندر - یہ ہے۔

جوگیش - یہ تم نے اسقدر ٹھنڈی سانس کیوں لی

چندر - تصویر واپس دینے کو جی نہیں چاہتا۔

جوگیش - تو پھر اس تصویر کو اس کی مالک سے مانگ لو۔

چندر - تو کیا وہ مجھے یہ تصویر دے دیگی۔

جوگیش - تصویر ہی تو ہے۔ اسے اس کے دینے میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔

چندر - تصویر تو میں مانگ لوں۔ مگر وہ کیا سمجھیگی؟

جوگیش - تو پھر مت مانگو۔

چندر - تو کیا تم مجھے اجازت دیتے ہو۔ کہ میں یہ تصویر اس سے مانگ لوں۔

جوگیش - فرض کر لو کہ میں تمہیں اجازت دیتا ہوں۔

چندر - جوگیش تم نے مجھے ایک بڑی مصیبت سے بچا لیا ہے۔ میں تم سے سوال کرنے کی جرأت بھی نہ کر سکتا تھا

جوگیش - اب آؤ۔ ذرا دیکھیں ماں کہاں ہے۔

(پاربتی اور ساوتری داخل ہوتی ہیں)

پاربتی - بیٹی آج تمہارے بھائی کی منگنی ہے اور تم اسقدر چپ چاپ پھرتی ہو۔ ابھی وہ لوگ آتے ہونگے۔ ذرا باجے کو ٹھیک کر لو آج بھی نہ گاؤگی۔ تو اور کس دن گاؤگی۔

ساوتری - تو ماں یہ کیوں نہیں کہتیں کہ آپ کا دل گانا سننے کو چاہتا ہے۔

پاربتی - یوں ہی سہی۔ لو کچھ سنا دو۔

ساوتری - [illegible] (گاتی ہے)

(گانے کے بعد ہی چندر داخل ہوتا ہے)

چندر - واہ وا ساوتری تم تو خوب گاتی ہو۔ ایسا گیت تو میں نے پہلے کبھی نہیں سنا۔

(جانا چاہتی ہے)

پاربتی - جاتی کہاں ہو۔ اب ایسی بھی شرم کیا بیٹھو بھی۔

ساوتری - یہ چھپ کر سن کیوں رہے تھے۔

چندر - اگر یہ قصور مجھ سے ہوا ہے تو اب میرے سامنے گائیے اس کی تلافی ہو جائیگی۔

ساوتری (گردن جھکا کر) خوب!

پاربتی - نہیں نہیں میں فیصلہ کئے دیتی ہوں۔ پہلے چندر تم گاؤ بچپن میں تو تم بہت اچھا گاتے تھے۔

چندر - ساوتری کے گانے کے بعد میرا گانا کیا خاک اچھا معلوم ہوگا۔

پاربتی (کچھ سنکر) گاڑی کی آواز آتی ہے دیکھوں کون ہے۔

(جاتی ہے)

ساوتری - (چندر سے) میری تصویر بھی واپس لائے کیا۔

چندر - کیا آپ کو اس کی کچھ ایسی ہی ضرورت ہے اور آج ہی۔

ساوتری - جی ہاں۔

چندر۔ مگر اسے واپس دینے کو تو میرا جی نہیں چاہتا۔
ساوتری۔ وہ تصویر واپس کر دیجئے۔ میں آپ کو ایک اور تصویر دونگی۔
چندر۔ لیکن آپ اپنی تصویر کو کیا کرینگی؟
ساوتری۔ بھائی نے کہہ سُنکر یہ تصویر کھنچوائی تھی۔ ورنہ مجھے اس کی کیا ضرورت تھی۔
چندر۔ تو گویا آپ کو اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ خیر اس وقت میرے پاس رہنے دیجئے۔ پوری جانے سے پہلے واپس کر دونگا۔
ساوتری۔ نہیں نہیں میں نہ مانونگی۔ اُسے آج ہی بلکہ ابھی واپس کر دیجئے۔
چندر۔ میں اسے بہت احتیاط سے رکھونگا۔ ایسی جلدی کیا ہے۔
ساوتری۔ بھلا اس تصویر میں رکھا ہی کیا ہے کہ آپ اتنی ضد کرتے ہیں۔
چندر۔ جب انسان اصل نہ پا سکے۔ تو نقل کو ہی رکھنا چاہتے۔
ساوتری۔ آپ کا مطلب میں نہیں سمجھی۔
چندر۔ کیا واقعی نہیں سمجھیں۔
ساوتری (گردن جھکا لیتی ہے)
چندر۔ تو کہو ساوتری کیا میں اس نقل کو دے کر اصل کو حاصل کرنے کی امید کر سکتا ہوں۔
ساوتری (گھبرا کر) مہمان آگئے ہونگے۔ مجھے جانا چاہئے
(چندر دروازے پر اسے روک لیتا ہے)
چندر۔ جب تک مجھے امید نہ دلاؤگی۔ میں تمہیں نہ جانے دُوں گا۔
ساوتری۔ میں اس کا کیا جواب دے سکتی ہوں۔
چندر۔ جو گیش کو کوئی اعتراض نہیں۔ چچی بھی رضامند ہو جائے گی۔
ساوتری۔ پھر مجھ سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔
چندر۔ اچھا یوں ہی سہی۔ تم ان کا مال ہو۔ مگر تصویر تو تمہاری ملکیت ہے۔ بتاؤ کیا اسے میں اپنے پاس رکھوں
ساوتری۔ پھر تو راستہ چھوڑ دوگے۔
چندر۔ ہاں۔
ساوتری۔ اچھا اسے تم لے لو۔

دُوسرا باب

پہلا منظر

پُوری میں گریش بابو کا مکان

گریش۔ ہماری شادی کو اب دو سال ہو گئے ہیں۔ تارا! مگر اس عرصے میں ایک دن بھی میں نے تمہارے چہرے

پر ہنسی نہیں دیکھی۔
تارا۔ تو کیا عورتوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ ہر وقت ہنستی رہیں۔
گریش۔ ڈاکٹر کی رائے ہے کہ تم کو ہسٹریا کی شکایت ہو گئی ہے۔
تارا۔ ڈاکٹر پاگل ہے۔ میں تو ان دو سالوں میں اس قدر موٹی ہو گئی ہوں کہ سب کپڑے تنگ ہو گئے ہیں۔
گریش۔ شادی سے پہلے تو لڑکی ہی تھیں۔ اور اب
تارا۔ بس بس رہنے دو۔ مجھے تمہارے مذاق سے نفرت ہے۔
گریش۔ تارا مجھے تو تم سے اتنی محبت ہے۔ اور تم مجھے دیکھنا بھی پسند نہیں کرتیں۔
تارا۔ تم ہر وقت یہی کہتے رہتے ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں ہر وقت تمہارے گلے میں باہیں ڈال کر بیٹھی رہوں تم اپنی عمر کی طرف تو دیکھو۔
گریش۔ کیا میں اسقدر بوڑھا ہوں؟
تارا۔ تمہارا لڑکا اب شادی کے قابل ہو گیا ہے۔ وہ ان باتوں کو دیکھیگا تو کیا کہیگا۔
گریش۔ اس کی عمر تو ابھی ۱۳ برس کی ہے۔
تارا۔ یہی عمر تو شادی کی ہے۔ عورتیں تو اس عمر میں مکمل سمجھی جاتی ہیں۔ کیا تم ۱۳ برس کی عمر میں بچے ہی تھے

گریش۔ اتنے دنوں کی بات مجھے یاد کہاں۔
تارا۔ ہاں یاد کیسے رہتی عرصہ بھی تو کوئی تیس برس کا ہو گیا ہوگا۔
گریش۔ تو کیا میری عمر تینتالیس برس کی ہے
تارا۔ شکل تو یہی کہتی ہے۔
گریش۔ میری عمر تو پینتیس سال کی ہے۔ اگر یقین نہیں آتا۔ تو میری جنم پتری دیکھ لو۔
تارا۔ جنم پتری تم نے شادی کے وقت بنوائی ہوگی۔
گریش۔ یہ تو ٹھیک ہے۔ مگر وہ غلط نہیں۔
تارا۔ دیکھو میں نے کیسے سمجھ لیا۔
گریش۔ کیوں نہ سمجھو گی۔ دل میں رہکر دل کا حال تمہیں کیوں معلوم نہ ہو۔
تارا۔ پھر وہی مذاق۔ میں کہتی ہوں مجھ سے ایسا بھونڈا مذاق مت کیا کرو۔ ہاتھی ناچتا ہوا اچھا معلوم نہیں ہوتا۔
گریش۔ تارا تم دن بدن زیادہ گستاخ ہوتی جاتی ہو میرے صبر کی بھی ایک انتہا ہے۔
تارا۔ تو مجھے اپنے گھر بھیجدو۔ (اٹھتی ہے)
گریش۔ نہیں نہیں تارا۔ تم تو واقعی خفا ہو گئیں۔ میں تو یونہی تمہیں چھیڑ رہا تھا۔
تارا۔ میں ایسی چھیڑ نہیں چاہتی۔ مجھے ایسے پیلکی

کچھ منسوست نہیں۔
گریش۔ ڈاکٹر کی رائے ہے کہ تم صبح اور شام کے وقت سمندر کے کنارے سیر کیا کرو۔
تارا۔ تو کیا سیر کے سوا مجھے اور کوئی کام نہیں۔
گریش۔ نہیں تو تم بہت موٹی ہو جاؤ گی۔
تارا۔ پھر کیا ہوگا۔
گریش۔ تمہارا خوبصورت جسم بدشکل ہو جائیگا۔
تارا۔ یہی تو میں چاہتی ہوں۔
گریش۔ حسن عورت کی سب سے قیمتی دولت ہے۔
تارا۔ اس عورت کے لئے جس کا کوئی محبّت کرنے والا ہو۔
گریش۔ تو کیا میں اس قابل نہیں۔
تارا۔ تم اپنی صحت کی فکر کرو۔
گریش۔ پھر۔
(اسکا ہاتھ پکڑ لیتا ہے چوڑی ٹوٹ جاتی ہے)
تارا۔ دیکھا اپنی وحشیانہ حرکت کا نتیجہ۔ میں اب یہاں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رہونگی۔
گریش۔ معاف کرو۔ اب ایسا کبھی نہ ہوگا۔
(اس کے پاؤں پر گرتا ہے)
تارا۔ (اٹھا کر) ہیں ہیں کیا کرتے ہو۔
گریش۔ تو آؤ ذرا سمندر کے کنارے پھر آئیں۔ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائیگی۔

تارا۔ وہ لوگ کیا کہیں گے۔
گریش۔ وہاں اس وقت کون ہوگا۔ یہاں کے لوگوں کو سیر کا شوق ہی نہیں۔
تارا۔ اتنے بنگالی یہاں رہتے ہیں۔
گریش۔ اب مجھے ہی دیکھ لو۔ میں کبھی جاتا ہوں۔ البتہ ایک بنگالی وکیل ہیں وہ ہر روز صبح وشام سیر کرنے آتے ہیں۔ وہ بھی تھوڑے دنوں میں تھک جائیں گے۔ ابھی نئے نئے آئے ہیں۔
تارا۔ وہ کون ہیں؟
گریش۔ چندر کمار مکرجی۔
(تارا گھبراتی ہے)
ہیں گھبراہٹ کیسی۔
تارا۔ یونہی کچھ گھبراہٹ سی ہے۔ شاید ڈاکٹر سچ کہتا تھا کہ کہیں ہسٹریا نہ ہو۔
گریش۔ تو کیا ڈاکٹر کو بلاؤں۔
تارا۔ نہیں ڈاکٹر کیا کریگا۔
گریش۔ نہیں تم سیر ضرور کیا کرو۔ چندر بابو کہتے تھے۔ کہ سمندر کے کنارے سیر کرنے سے ان کی صحت بہت اچھی ہوگئی ہے۔
تارا۔ تو وہ کب سے یہاں ہیں۔
گریش۔ کوئی دو سال ہوتے۔ ہماری شادی کے بعد

ہی غالباً وہ آئے تھے پھر چلے گئے تھے۔ اب شادی
کرنے کے بعد پھر آئے ہیں۔
(تارا گھبرانی ہے)
میں پھر وہی کپکپی۔ تمہاری طبیعت اچھی نہیں۔
تارا۔ تو شاید میں واقعی ہسٹریا میں مبتلا ہو گئی ہوں۔
اچھا اگر ڈاکٹر کہتا ہی ہے تو میں شام کو سیر کرنے جایا
کروں گی۔ مگر میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤنگی۔ مجھے
شرم آئیگی۔
گریش۔ میرے پاس شام کو وقت ہی کہاں ہے۔ شام کے
وقت تو موکل آتے ہیں۔
تارا۔ تو کیا چندر بابو کا کام نہیں چلتا۔ کہ وہ ہر روز سیر کو
چلے جاتے ہیں۔
گریش۔ نہیں نہیں وہ بہت قابل آدمی ہیں۔ تھوڑے
سے عرصے میں اُن کا کام چل نکلا ہے۔
میں پھر وہی کپکپی۔
تارا۔ اچھا اچھا میں شام کو ضرور سیر کرنے جاؤں گی۔
شاید اس سے فائدہ ہو۔
گریش۔ تو اب شام ہی کا وقت ہے۔ اگر جانا ہو تو ابھی
جاؤ کسی ملازمہ کو ساتھ لے جاؤ۔
تارا۔ اچھا۔
(جاتے ہیں)

دوسرا منظر

سمندر کا کنارہ

(چندر کمار سیر کر رہا ہے)
(تارا دوسری طرف سے داخل ہوتی ہے)
چندر۔ اُف۔ کتنی خوبصورت عورت ہے۔
(منہ موڑ کر چلا جاتا ہے)
تارا (آہستہ سے) چندر بابو!
چندر۔ مجھے کس نے بُلایا؟
تارا۔ میں نے۔
چندر۔ کیوں؟
تارا۔ ذرا آنکھ اُٹھا کے تو دیکھو!
چندر۔ کون؟ تارا۔ تم کتنی بدل گئی ہو؟
تارا۔ ہاں میں بہت بدشکل ہو گئی ہوں۔ اسی لئے تو
تُم مجھے پہچان نہیں سکے۔
چندر۔ مگر تم یہاں کہاں؟
تارا۔ میں دو سال سے یہیں ہوں۔
چندر۔ یہیں۔ تو تمہاری شادی کس سے ہوئی۔
تارا۔ گریش بابو سے۔
چندر۔ وہ تو بہت اچھے آدمی ہیں۔ سب وکیلوں میں
ان کی زیادہ آمدنی ہے۔

تارا۔ تو کیا تم مسکرا رہے ہوتے ؟
چندر۔ کیوں نہیں۔
تارا۔ تم کو کچھ افسوس نہیں ہوتا؟
چندر۔ افسوس کیوں ہوتا۔
تارا۔ کیوں ہوتا؟ تمہیں جب مجھ سے زیادہ خوبصورت بیوی مل گئی۔ تو افسوس کیوں ہوتا ؟
چندر۔ ہاں ہے تو ٹھیک۔
تارا۔ اسی لئے تو کسی اور کی طرف نظر نہیں اُٹھتی۔ کہو پھر بھی کہوگے کہ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔
چندر۔ تو تم کو بھی تو مجھ سے کوئی ایسی محبت نہیں بہت خوش وخرم نظر آتی ہو۔
تارا۔ میں مر ہی جاتی تو تم خوش ہوتے۔
چندر۔ نہیں، تم کو خوشحال دیکھ کر میں بھی خوش ہوگیا
تارا۔ تمہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں خوش ہوں۔
چندر۔ تمہاری شکل وصورت سے۔
تارا۔ تمہاری شکل وصورت سے بھی کوئی ایسا غم نظر نہیں آتا۔
چندر۔ تو میں کب کہتا ہوں کہ مجھے کوئی غم ہے۔
تارا۔ تم پہلے سے زیادہ مہذب ہوگئے ہو۔ تم نے واقعی تارا کو بھلا دیا ہے۔
چندر۔ ہاں اور تارا کو بھی مجھے بھلا دینا چاہئے۔

تارا۔ وہ دیکھو سمندر میں ایک لہر اُٹھی ہے۔ اس سے کہو۔ کہ واپس چلی جائے۔
چندر۔ اب میں اس طرف سیر کو کبھی نہ آؤنگا۔
تارا۔ کیوں مجھے اب تم دیکھ بھی نہیں سکتے۔ کیا مجھے دیکھنا بھی گناہ ہے ؟
چندر۔ نہیں تارا۔ تم اب ایک شریف شخص کی بیوی ہو اب تم بچی نہیں۔
تارا۔ اچھا اچھا اب میں بچپن کی باتیں نہیں کرونگی۔ مگر تم سیر کو ضرور آیا کرو۔
چندر۔ میں آؤنگا مگر اس شرط پر کہ تم سیر کو اکیلی نہ نکلا کرو۔ گریش بابو کے ساتھ تم کیوں نہیں آتیں۔
تارا۔ ان کے پاس وقت ہی کہاں ہے۔ وہ تو ہر وقت مقدموں کی فکر میں رہتے ہیں۔
چندر۔ وہ دیکھو کچھ لوگ ادھر آرہے ہیں۔ تم جاؤ۔
تارا۔ اچھا (جاتی ہے)
چندر۔ بڑی مشکل سے میں نے تارا کو بھلا دیا تھا پھر میری زندگی کو جلا کر راکھ کرنے کے لئے اپنے حسن کے شعلے لیکر مجھ پر حملہ آور ہوتی ہے۔ میں اب پوری میں نہ رہونگا۔ تو میں ساوتری کو یہاں بلا ہی کیوں نہ لوں۔ اس کی موجودگی میں میں ہر آفت سے بچ سکتا ہوں۔
(جاتا ہے)

جذباتِ سہا

کھنچ گئی رُوحِ مضطرب غمزۂ کامیاب میں ... کھو گئے لغتہائے دِل آرزوئے خراب میں

تشنہ لبی میں ہے نہاں ایک محیطِ بیکراں ... موجِ مجاز سے گزر، غرق نہ ہو سراب میں

بحرِ سکون تھی نیستی نیند میں تھے قرار تھا ... ہست ہُوئے کہ مٹ گئے آنکھ کھُلی حباب میں

بے خبرِ جہاں سہی عشق کا اہتمام ہے ... تُم بھی جان لو کہ مَیں جاگ رہا ہوں خواب میں

عشرتِ قربِ دوست، اور ضبطِ ہزار آرزو ... چشم بہشت سیر ہے دل ہے مگر عذاب میں

حسرت و یاس کے یہاں دَور کئی گزر گئے ... اُس کی نگاہِ ناز کے ایک ہی انقلاب میں

رنگ نے التفات کے لاکھ فروغ دیدئے ... ابرِ بہار و میکدہ حسن ترا شباب میں

ذوقِ نظر کہ جستجو بس ہے جنوں کو ایک ہُو ... تو ہمہ تن جمال ہے، مُنہ نہ چھپا نقاب میں

پہلوئے عرض ہی نہیں، ہائے نمودِ حسنِ ظن

کاش کہ دیکھ لوں کبھی اُس کو سہاؔ حجاب میں

ایک صبح کی شام

تھی صبح اور ستارے کچھ جھلملا رہے تھے
بیمارِ شام فرقت دُنیا سے جا رہے تھے

تمام رات بے چینی سے گذری۔ ڈاکٹر اطبا تھک تھک کر آخر چلے گئے۔ احباب و اقربا کی بھیڑ بھی رفتہ رفتہ منتشر ہوگئی۔ نوکر چاکر اُونگھ اُونگھ کر سو گئے۔ مگر سلطان احمد کی ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ نہیں جھپکی۔ دو بج گئے۔ تمام عالم پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ فضا نہایت پُرسکون تھی اسی عالم میں اُسنے دیکھا کہ مریضہ کی آنکھ لگ گئی ہے۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر وہ بھی آرام کرسی پر دراز ہوگیا۔ پانچ بجے کے قریب اس کے کان میں دھیمی مگر سُریلی آواز آئی "آپ کہاں ہیں"۔ آواز کو اُس نے پہچان لیا۔ اور نہایت اضطراب کے ساتھ چارپائی کی طرف لپکا۔

چودھویں رات کا چاند اپنی رات بھر کی مسافت طے کرنے کے بعد زرد سا ہوگیا تھا۔ تارے جھلملا رہے تھے اُفق پر طلوعِ سحر کے آثار نمودار تھے۔ عائشہ کے زرد کمزور مگر خوبصورت چہرہ پر چاند کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ اور اگرچہ اس طویل اور شدید مرض کی وجہ سے نہایت ہی لاغر ہوچکی تھی۔ پھر بھی اُس وقت اس کا چہرہ عجیب کیف میں ڈوبا ہوا تھا۔ سلطان احمد نے دیکھا اور فرطِ محبت سے اس کو چوم لیا۔

عائشہ نے نہایت دھیمی آواز میں کہا کہ بلقیس کہاں ہے؟ بلقیس برابر کی چارپائی پر ان تمام حادثاتِ روزگار سے بے خبر پڑی سو رہی تھی۔ سلطان اس کو گود میں اٹھا کر عائشہ کے پاس لے آیا۔

عائشہ۔ اب میرا آخری وقت ہے۔ زندگی کے پانچ برس میں نے ایک ساتھ بسر کئے ہیں۔ دُنیا کے سرد و گرم حالات میں ہم نے ایک دوسرے کا دامن کبھی بھی نہیں چھوڑا۔ مجھ سے جہاں تک بن پڑی میں نے آپ کی خوشی کو اپنی خوشی اور غمی کو اپنی غمی سمجھا۔ آپ نے بھی جہاں تک ہو سکا میری تمام آرزوؤں کو پورا کیا۔ اب میں جاتی ہوں مجھے معلوم نہیں کہ اس زندگی کے بعد کیا ہے۔ اور کیا ہوگا۔ دنیوی تعلقات سے ہمیشہ کے لئے علیحدہ ہو رہی ہوں۔ اب نہ میں آپ کو اور نہ آپ مجھ کو دیکھ سکینگے۔

سلطان ان رقت آمیز باتوں کو سُنکر رو پڑا اور پھر ایک دفعہ اس کو گلے لگا لیا۔ عائشہ کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے تر تھیں۔

عائشہ (بلقیس کو گود میں لیکر) یہ میری ایک ہی لڑکی ہے۔ آہ! میں اس کا چہرہ جی بھر کر نہ دیکھ سکی۔ خدا کا ایسا ہی منظور تھا۔ یہ نامراد ماں کی محبت سے ہمیشہ کے لئے محروم ہے۔ اس کا پیارا پیارا مکھڑا دیکھکر میرا جی بھر آتا ہے کاش! اس کی زندگی بھی میرے ساتھ ہی ختم ہو جاتی...

سلطان (بات کاٹکر) تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔

عائشہ۔ اگر آپ کو مجھ سے سچی محبّت تھی تو میں اپنے لختِ جگر کو آپ کی حفاظت میں چھوڑتی ہوں۔ اور دُنیا سے سکونِ قلب کے ساتھ کوچ کرتی ہوں۔ اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو میری رُوح برسوں بے قرار رہیگی۔ اس کا ایک ایک آنسو میری آنکھوں سے طوفانِ اشک بہائیگا۔ اگر آپ کو فی الواقع مجھ سے محبّت تھی۔ اور اگر میری آئندہ زندگی کی خوشیوں اور آرزوؤں کی آپ کو پروا ہے تو مجھے یقین ہے کہ آپ اس معصوم بچی کو اس کی ماں کی عدم موجودگی میں نہایت حفاظت اور آرام کے ساتھ دیکھینگے۔

یہ کہکر اس نے بلقیس کو آخری مرتبہ جی بھر کر چوما اور ایک دفعہ پھر ہچکیاں لیتے ہوئے سلطان کو اشارا کیا کہ اب اس کو اُٹھا کر اپنی گود میں لے لے۔

سلطان کے دِل میں جذبات کا تلاطم برپا تھا اس کی زبان پر مہرِ سکوت لگی ہوئی تھی مگر آنکھوں سے آنسوؤں کا تار جاری تھا۔ سنبھلکر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ الفاظ ٹوٹ پھوٹ کر آنسوؤں کے دریا میں ڈوب گئے۔ بلقیس کو اُس نے گود میں اُٹھا لیا۔ اور اسکو روتے روتے چومنے لگا۔ لڑکی خواب سے چونک پڑی۔ اور وحشتناک مناظر کو دیکھ کر چلّانے لگی۔

اے نامراد لڑکی تیری زندگی کا چمن بہار آنے سے پیشتر ہی خزاں کی دستبرد سے اُجڑ گیا ہے۔ تیرا معصوم دل جانکاہ رنج و غم سے پاک ہے۔ مگر جب دُنیا کے ناپاک دھندوں میں تجھ کو بھی شریک ہونا پڑیگا تو خدا معلوم تیرا دل کتنی مصیبتوں اور آفتوں کا ہدف بنیگا۔ تیرا سینہ کتنے غموں سے داغدار ہوگا۔ اور تیری ان چمکیلی اور خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کے کتنے دریا بہہ نکلینگے۔

آسمان پر چاندکی روشنی دھیمی پڑگئی ہے۔ ستارے ڈوبتے جاتے ہیں۔ دُنیا کی ہر شے سے اُداسی ٹپک رہی ہے۔ شمع روتے روتے فنا ہو چکی ہے۔ مگر انسان ان تمام کیفیّات سے بے خبر بیہوشی کے عالم میں اِدھر اُدھر کروٹیں بدل رہے ہیں۔ آہ! قدرت کا ذرّہ ذرّہ ان تینوں

کی مصیبت پاداس اور مغموم ہے۔ مگر انسان بے رحم اور سنگدل انسان ان کی سینہ سوز چیخوں کو نہیں سُن سکتا۔ وہ نیند کے نشہ سے مخمور ہے اور ان بے معنی صداؤں کو خلل انداز نہیں ہونے دیتا۔

دُنیا کا یہ رنگ اور ہم کو۔ کچھ ہوش نہیں ہے سوئے ہیں سحر کی سپیدی آسمان کے گوشے گوشے میں پھیل رہی ہے۔ وہ چاند جو ابھی تک شہزادہ تھا۔ اور اپنی پُر سکون ضیا سے دُنیا کو تسکین بخش رہا تھا۔ اب ابر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا معلوم ہوتا ہے۔ ستارے جو اپنی دھیمی اور نرم روشنی سے بزم فلک کو پُر رونق بنائے ہوئے تھے۔ اب سحر کی سپیدی میں گم ہوگئے ہیں۔ آسمان کی تمام رنگا رنگ بزم آرائیاں ختم ہو چکی ہیں۔ اور اب اُداسی اور سنسنی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ دُنیا کی رنگین اور پُر لطف محفلیں بھی ایسی ہی ہیں۔ جب آفتاب لب بام آجاتا ہے۔ تو آن کی آن میں یہ تمام چیزیں دُھندلا سا نقاب پہن لیتی ہیں۔ اور ہمیشہ کے لئے ہماری آنکھ سے پوشیدہ ہو جاتی ہیں۔

عائشہ نے آخری ہچکی لی اور چاند اور تاروں کے ساتھ وہ بھی کسی غیر معلوم دُنیا میں چلی گئی۔ ؎

محفل برخاست ہے پتنگے
رُخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر
تارے کہیں نام کو رہے ہیں!
اُن کی بھی نمود ہے کوئی دم
وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں

اثر صہبائی

محسوساتِ جلیل

جب سے وہ شوخ مائلِ جور و جفا ہُوا
حاصل تھا جو سکون و فراغت کبھی سے مجھے
ڈر ہے یہ آرزو بھی نہ مِل جائے خاک میں
تیری جفا نے ضبط کا خوگر بنا دیا

کُچھ اپنی زندگی کا مجھے آسرا ہُوا
اسے گردشِ زمانہ بتا تو وہ کیا ہُوا
پھر دل کو عرضِ حال کا کچھ حوصلا ہُوا
تیرے ستم سے لطفِ تمنّا سوا ہُوا

بستر پہ یوں جلیلؔ نے کل رات جان دی
سو جائے جس طرح کوئی غم سے تھکا ہُوا

ہندِ قدیم کے ناٹک

ہندو روایات قدیم کے مطابق ڈرامے کی ایجاد برہماجی کی ذات اقدس سے منسوب ہے۔ کہتے ہیں کہ برہماجی نے یہ فنِ لطیف ویدک زمانے کے ایک مرتاض رشی "بھرت منی" کو سکھایا تھا۔ جنہوں نے بعد میں روپک ودیا کو ویدک سنتروں سے اخذ کر کے ڈرامے کی بُنیاد ڈالی۔

صدیوں تک یہ فن رشیوں اور منیوں کی آغوشِ تربیت میں پرورش پاتا رہا۔ اور یہی وجہ ہے کہ زمانہ قدیم کے ہندو ناٹک ایک مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔ عرصہ دراز تک ڈراما مذہبی اصول کی اشاعت اور معاشرتی اصلاحات کی تبلیغ کے لئے ایک کارآمد اور مؤثر ذریعہ بنا رہا۔ اور قدیم ہندوستان کے فلسفی اور مجدد بڑی کامیابی کے ساتھ اس سے وہ کام لیتے رہے جو دوسرے مذاہب میں تمثیلی روایات اور پُرعبرت حکایات سے لیا گیا ہے۔ وہ جذبات لطیف جو انسان کے سینہ میں مضمر ہوا کرتے ہیں۔ اور جن کو علم کی کمی یا اظہار کی بے مائگی کے باعث ہر آدمی مادی کیفیات میں متشکل کرنے سے قاصر ہے۔ اسی فن کی مدد سے آنکھوں کے سامنے آتے۔ شاعر کے تخیل مصوّر کے قلم اور ایکٹر کے ہُنر نے ناٹک کے روپ میں وہ وہ کرشمے دکھائے کہ اسٹیج نے چھوٹی دنیا کا نام پایا۔ یہ سوال کہ آیا ہندو ڈراما، یونانی ڈرامے کی تقلید ہے یا بذاتِ خود ایک ایجاد ایک علیحدہ تبصرہ کا محتاج ہے۔ مگر اس مضمون کی پابندیاں اجازت نہیں دیتیں کہ اس امر پر اسی ضمن میں بحث کی جاتے۔ تاہم یہ کہہ دینا بیجا نہیں کہ ہندوؤں نے اس فن میں وہ وہ اختراعات کی ہیں۔ اور اس صنفِ شاعری کو اس درجۂ کمال تک پہنچایا ہے کہ اس کی اصلیت اور نوعیت کی تحقیق اہلِ ذوق کے لئے کچھ کم دلچسپی نہیں رکھتی۔

ادب قدیم میں اس صنف شاعری کو روپک کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ روپک اپنی مختلف کیفیات اور طریقۂ اظہار کے لحاظ سے دو بڑی اقسام یعنی ناٹیے اور نرتیے پر منقسم ہے۔ مگر حقیقت میں ناٹیے ہی روپک کی وہ شاخ ہے جس پر موجودہ مفہوم کے مطابق ڈرامے کا اطلاق صحیح معنوں میں ہو سکتا ہے۔ ناٹیے کو ہندو مبصروں نے کئی چھوٹی اقسام میں منقسم کر دیا ہے۔

اس تقسیم کا معیار عام طور پر ان کی ہیئت اور طریقۂ اظہار ہے۔ ادبِ قدیم کے مطالعہ سے صاف پتہ چلتا ہے کہ مذہبی، تاریخی اور اخلاقی افسانوں اور عشق و محبت کی داستانوں کی طرزِ تحریر میں ایک نمایاں تمیز روا رکھی گئی ہے۔ رزمیہ ناٹکوں کا اندازِ تحریر بھی جداگانہ ہے اور بشایدِ وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ان مختلف گو کئی لحاظ سے یک رنگ اصناف کی موشگافی کرنے میں ہندوؤں نے اس باریک نظری سے کام لیا ہے جو ٹریجڈی اور کامیڈی کی تحریر میں بھی دوسرے ممالک کے اساتذہ نے ملحوظ نہیں رکھی۔

ڈرامے کی مختلف اصناف کی تقسیم میں ہندوؤں کی دقیقہ رس نگاہ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ اشخاص متعلقہ ناٹک کی تعیین اور ان کے خواص کی تشخیص اس عمدگی اور کامیابی سے کی ہے کہ اس فن کے طلبہ ان کی محنتوں کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ناٹک یعنی ہیرو کی شخصیت کی تعیین ان کے مختلف کیفیات ذہنی کے ماتحت کی گئی ہے۔ جو اجمالی طور پر چار بڑی اقسام میں اور تفصیلی اعتبار سے ایک سو پینتالیس ضمنی شاخوں میں منقسم ہے۔

اسی طرح نائکہ یعنی ہیروان بھی ان امتیازی پابندیوں سے آزاد نہیں رہ سکی۔

مزید براں ان تین اقسام کو نائکہ کے جذبات قلبی کی نوعیت کے لحاظ سے بھی کئی اہم اور مفید تفصیلات سے معین کیا گیا ہے۔ مگر اس سے بھی کہیں زیادہ صرف ہمیں اس جانکاہ محنت کا کرنا پڑتا ہے جو ہندو ماہرینِ فن نے جذباتِ انسانی کی تلاش اور ان کے طریقۂ اظہار میں صرف کی۔

رس حقیقت میں اس کیفیت کا نام ہے جو شخصی جذبے اور مقامی حالات کے متحدہ اثر کا نتیجہ ہوتی ہے اور اس کو ٹھیک اسی انداز میں ظاہر کرنے کے لئے جس میں اس کے مصنف کے ارادے اور موقع کی ضروریات شامل ہیں۔ ہندو بزرگوں نے بہت سی امدادی ہدایات مہیا کی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی خاص رس کے پیدا کرنے کے لئے اول تو کیفیتِ قلبی دوسرے اظہارِ خارجی کی موجودگی لازم ہے۔ اور اسی اصول کو مدِ نظر رکھ کر قدما نے 'بھاؤ' اور 'انو بھاؤ' کی دو مختلف شاخوں کے ماتحت احساس و اظہارِ جذبات کی کثیر التعداد اقسام متعین کی ہیں۔

اس تقسیم کے علاوہ ایک بہت بڑی تفصیلی تشریح ہے۔ ان اشخاص کی اور ان جذبات کی جن کی موجودگی ایک ڈرامے کے لئے ضروری ہوا کرتی ہے۔ مگر اس تشریح کے بیان کے لئے حقیقت

میں ایک ضخیم مضمون کی ضرورت ہے۔ یہ فن ہندی نقطۂ نگاہ سے ایسا اہم اور بسیط ہے کہ اس پر مفصل بحث کرنا قریباً قریباً ناممکن ہے۔ اس مضمون میں بھی چند مختلف اقسام کے نام گنوانے کے سوا اور زیادہ تشریحی بحث نہیں کی گئی۔ مگر یہ ایک قطرہ ہے اس سمندر کا جس کی وسعت لا انتہا ہے۔ اور جس کی اتھاہ گہرائی اس قسم کی مختصر اور کم مایہ تحریروں کے پیمانوں کی زیر بار احسان نہیں ہو سکتی۔ ہم کسی آئندہ فرصت میں اس تحقیق و تدقیق کو بے نقاب کرنے کی کوشش کرینگے۔ جو اس موضوع پر زمانہ قدیم کے ہندوؤں نے کی۔ اور جو اب اخلاف کی بے پروائی اور ناقدری کے ہاتھوں گمنامی کی خاک میں مدفون ہیں۔

ایڈیٹر

صدائے سروش

(گذشتہ سے پیوستہ)

(نمبر ۳)

تو مسلماں ہو تو پھر کون ہے ہمسر تیرا
تیرا قرآں۔ خدا تیرا۔ پیمبر تیرا

صفحۂ دہر سے ظلمت کو مٹایا تو نے
وہ درخشاں تھا زمانے میں مقدّر تیرا

تو خدا کا ہو تو پھر سارا جہاں تیرا ہے
آسماں تیرا۔ زمیں تیری۔ سمندر تیرا

مرغِ بسمل کی طرح کل تو تڑپ جاتا تھا
آج کس واسطے دل ہو گیا پتھّر تیرا

اب ترے دل میں کہاں عشقِ الٰہی کی تپش
مئے عرفاں سے تہی رہتا ہے ساغر تیرا

واقفِ لغزشِ پا تھا نہ کبھی تو پہلے
درِ اغیار پہ جھک جاتا ہے اب سر تیرا

دولتِ حسنِ عمل کا نہیں مشتاق غریب
ذوقِ ایثار سے محروم تونگر تیرا

تجھ سے اپنے بھی ہوئے جاتے ہیں اب بیگانے
کلمہ پڑھتے تھے کبھی دہر میں کافر تیرا

درد بن جا ہمہ تن مثلِ بلالِ حبشیؓ!
بال بیکا نہیں کر سکتا ستمگر تیرا

تو جو روٹھا ہوا محبوب منا لے اپنا
کیوں نہ بگڑا ہوا بن جاتے مقدر تیرا

دیکھ پابندئ آئین سے آزاد نہ ہو
صورتِ نکہتِ گل دہر میں برباد نہ ہو

رفعت

گناہ

ان مظاہر خصوصیات انسانی میں سے گناہ بھی ایک ہے۔ جن کے ہاتھوں میں بے بس اور جن کی دلکش جاذبیت میں جذب ہو جانے کے باوجود انسان اپنی آزادیٔ رائے کو برقرار رکھتا ہے۔ اور اس محکوم و مفتوح کی طرح جو اپنے فاتح پر غالب نہ آسکنے کی حالت مجبوری میں اس کی طاقت کو کوستا ہے۔ اس آزادی رائے کو صرف گناہ کو مذموم و معیوب بتانے میں صرف کر دیتا ہے۔ آہ وہ نہیں جانتا کہ وہ ایسا کرنے سے صرف اپنی کمزوری کی داستان اور گناہ کی مہیب طاقت کے کارنامے سُنا رہا ہے۔

آخر اس اہم انسانی وراثت، اس مقتدر آسمانی حکمت کے خلاف یہ اظہار ناپسندیدگی کیوں؟ اپنی کمزوری کو چھپانے اور دوسروں کی طاقت کو بُرا کہنے کے آخر کیا معنی؟ یہی نا کہ جن لذات سے ایک شخص خود بہرہ اندوز ہو رہا ہے۔ ان سے دوسروں کو محروم کر دے۔ یا جن لذات کے اکتساب کی وہ خود قابلیت نہیں رکھتا۔ ان سے دوسروں کو بھی بے خبر رہنے دے۔ غاصب حکمران اسی طرح رعایا کو فرمانروائی کی ذمہ داریوں سے ڈرا ڈرا کر ان کو ان کے جائز حق سے محروم رکھا کرتے ہیں۔ بہت لوگ اسی طرح دوسروں کو نئے تجربات کی تلخیوں سے خوفزدہ کر کے ان کو ترقی کے مدارج طے نہیں کرنے دیتے

غور سے دیکھا جائے تو اخلاق انسانی کی ارتقائی منازل میں گناہ بھی ایک ضروری اور مفید منزل ہے ہر ارتکاب گناہ کے بعد انسان اپنی قابلیتِ مدافعت کی کمی اور بدی کی زبردست قوت کی زیادتی کو محسوس کرتا ہے۔ اور اسے اپنی حقیقی شخصیت اور اپنی نمائشی تصویر میں تمیز کرنے کا موقع میسر آتا ہے۔

ارتکاب گناہ کے بعد رُوح کو اپنی غیر سودمند اور بیکار، بے پروا اور غیر ذمہ وار زندگی کا احساس ہوتا ہے اور وہ حواس کی متعدی بیماریوں کا علاج کرنے کے لئے جن سے وہ اپنی غیر جسمانی اور غیر فانی خاصیتوں کے باوجود بھی مستون نہیں رہ سکتی۔ اپنی خوابیدہ طاقتوں کو بیدار کرتی ہے۔ گناہ کی یاد بھی جس کو غلطی سے پشیمانی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ایک بڑی اصلاحی قوت ہے۔ کیونکہ اس میں سوا اس کے تمام محاسن تو موجود ہیں۔ مگر تمام معائب مفقود۔ یہی وہ وقت ہے۔ جب انسان خُدا کی ضرورت محسوس کرتا ہے۔ ضرورت بُری بلا ہے گنہگار کے توئی کسی گناہوں کے معاف کر دینے والی، اسے جرائم

کی سوا سے بچانے والی طاقت کی تلاش میں وہ سرگرمیاں دکھاتے ہیں۔ کہ کرخت آواز میں رقت بے مقصد عبادت میں خلوص، سرکش گردن میں خم پیدا ہو جاتا ہے خشک اور کثیف آنکھوں میں آنسو جو حواس کی روحانیت اور روح کی جسمانیت کا مادی اظہار ہیں جھلکتے ہیں استغنائے بد اور پندار معصومیت کی فلک سنرلوں سے ٹوٹی ہوئی وہ سنہری زنجیر جو انسان کو خدا کے ساتھ وابستہ رکھتی ہے۔ ایک ہی کٹھالی میں ڈھل کر زیادہ نازک زیادہ خوبصورت مگر زیادہ پائیدار ہو جاتی ہے۔ سوئی ہوئی رحمت راتوں کی فریادوں سے جاگ اٹھتی ہے۔ گنہگار کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں اپنی ہستی کے معنی دیکھ کر مسرور ہوتی ہے مغرور ہوتی ہے۔ اور فرشتوں کو انسان کی تخلیق کا راز معلوم ہو جاتا ہے

ایڈیٹر

غزل

انسان کی ہستی بھی افکار کی دنیا ہے
اندوہ و حوادث ہیں اندیشۂ عقبیٰ ہے

آنکھوں سے نہاں ہو کر تو چھپ تو نہیں سکتا
دل ہی ہے ترا مسکن دل ہی میں تری جا ہے

مستی کا اثر اب تک باقی ہے دماغوں میں
ساقی ہے نہ میخانہ ساغر ہے نہ مینا ہے

ناکامیٔ الفت میں بیتابیٔ فرقت میں
جینا کوئی جینا ہے مرنا کوئی مرنا ہے

اے گل تری ماہیت ہم خوب سمجھتے ہیں
غنچے کے تبسم کا بگڑا ہوا نقشا ہے

مغموم سے رہتے ہو تم آٹھ پہر واحدؔ
کچھ راز نہیں کھلتا یہ تم کو ہوا کیا ہے

غزل

دل سینے میں مضطر ہے پھر جوش تلاطم سے
طوفان اٹھانے کا آنکھوں کا تہیا ہے

گرداب مصیبت ہے عصیاں کے تلاطم ہیں
اس قلزم ہستی میں طوفان بلا کا ہے

شوخی سے ستمگر نے ناطقؔ سے کہا دیکھو
ہاں خون شہیداں میں کچھ رنگ حنا کا ہے

قزّاق

شلر کے ڈرامہ موسومہ "رابرس" سے ماخوذ — مؤلفہ جناب نورالٰہی و جناب محمد عمر

پہلا باب

تیسرا منظر

(محل کا ایک کمرہ۔ سامانِ آرائش کی کثرت۔ اختر کی نشست کے پہلو پر ایک پرانا کلاک۔ دوپہر کا وقت۔ اختر کچھ سوچ رہا ہے)

اختر۔ کتنا دراز! کسی بڈھے کی زندگی کا رشتہ جانتا ہی نہیں کہ ٹوٹنا کسے کہتے ہیں۔ میرا راستہ کسقدر صاف ہوتا اگر یہ پیرِ زمین گیر خزانے کا سانپ بنکر میرا سدِّ راہ نہ ہوتا۔ کیا میری تمام عمر اِس پُرانی گھڑی کی ٹک ٹک گنتے ہی گذر جائیگی۔ ہو رہو وہ گھڑی نہ آئیگی جس کے لئے مَیں کبھی گھڑی بھر بھی آرام سے نہیں سویا۔ کیا یہ چراغِ سحری کبھی خاموش نہوگا۔ اور میری امیدوں کا آفتاب کبھی جلوہ افروز نہ ہوگا۔ مَیں نہیں چاہتا کہ اُس کا خون اپنی گردن پر لوں لیکن ضرور ہے۔ کہ خون اُس کی رگوں میں نہ دوڑے۔ اور جم جائے۔ مَیں ایک حکیم حاذق کا کام کرونگا۔ اور اُسے دردِ حیات سے نجات دلاؤنگا۔ مَیں بدن کو صدمہ پہنچا کر رُوح کو خارج نہ کرونگا۔ بلکہ رُوح پر ایسی ضرب لگاؤنگا۔ کہ وہ خود گھبرا کر پرواز کر جائے۔ شہاب! (شہاب اندر سے "حاضر جناب" کہتا ہے اور داخل ہوتا ہے)

اختر۔ شہاب! تم مجھے نامہربان آقا تو نہیں خیال کرتے۔

شہاب۔ میرے جسم کا بال بال حضور کا ثناخوان ہے۔

اختر۔ مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔

شہاب۔ فرمائیے مَیں ہمہ تن گوش ہوں۔

اختر۔ میرے باپ نے تمہیں بہت صدمے پہنچائے۔

شہاب۔ سب یاد ہیں۔

اختر۔ بیشک۔ مرد کا خانۂ دل کینہ کا مسکن ہوتا ہے۔ یہ تھیلی لو۔ (تھیلی دیتا ہے) اگر مَیں نواب ہوتا تو اس کا وزن زیادہ ہوتا۔

شہاب۔ خُدا وہ دن جلد لائے۔ کہ تاج حضور کے سر پر چمک رہا ہو۔

اختر۔ لیکن جانتے ہو کہ میرے باپ کی صحت کسقدر اچھی

ہے اور میں چھوٹا بیٹا ہوں۔

شہاب۔ کاش حضور بڑے بیٹے ہوتے۔ اور وہ مسافر جو سفرِ ہستی کی بہت سی منزلیں طے کر چکا ہے۔ جلد منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا۔

اختر۔ اگر میں بڑا بیٹا ہوتا۔ تو دولت میرے قدم لیتی اور سخاوت میرے ہاتھوں کے نثار ہوتی۔ تم سا وفادار شیر دل کے ہاتھوں ایسا ذلیل و خوار۔ اس پر جاگیر کا ضبط ہونا اور جمیلہ کا شادی سے انکار۔ الامان۔ الحفیظ کیسے ناقابلِ برداشت صدمے ہیں۔

شہاب۔ اُس کو جو کرنا تھا۔ کر چکا۔ اب میں وقت کا منتظر ہوں۔

اختر۔ اور جب جمیلہ نے انکار کیا۔ تو بھائی جان نے تمہاری گردن پکڑ کر سیڑھیوں سے نیچے گرا دیا۔

شہاب۔ اس کے عوض میں اُس کے خون سے ہاتھ لال نہ کروں۔ تو میرا نام شہاب نہیں۔

اختر۔ شہاب۔ مانا کہ تو بہادر ہے۔ مگر شیر دل تیری پہنچ سے سراسر باہر ہے۔

شہاب (جوش سے) میں اس کی . . . . (دانت پیس کر رہ جاتا ہے)

اختر۔ (شہاب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر) شہاب! تم سپاہی ہو۔ تمہیں اپنے خون سے اس داغ کو دھونا چاہیئے۔ زر۔ زمین اور زن کا جھگڑا انسانیت کی جان ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان محض حیوان ہے۔ اس لئے دستِ جمیلہ پر قابو پانے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگاؤ۔ اور مشکلات کے پہاڑ کاٹ کر نکل جاؤ۔

شہاب۔ میں عہد کرتا ہوں کہ جبتک جمیلہ کو اپنے عقدِ نکاح میں نہ لاؤنگا۔ داہنے ہاتھ سے کھانا نہ کھاؤنگا۔

اختر۔ جوش میں نہ آؤ۔ یقین رکھو۔ کہ جمیلہ تمہیں ضرور مل جائیگی۔ اور میں تمہاری امداد میں تسمہ لگا نہ رکھونگا۔ شاید تمہیں معلوم نہیں کہ شیر دل عاق کیا گیا ہے۔

شہاب (نزدیک آکر) ناممکن۔ یہ میں نے آج ہی سُنا ہے۔

اختر۔ تحمل کرو۔ اور سُنو۔ گیارہ مہینے ہونے کو آئے۔ کہ شیر دل کو ابّا جان نے حکم دیا تھا۔ کہ وہ ان کو کبھی اپنی شکل نہ دکھائے۔ لیکن اب بڈھا دلگیر ہے۔ اور جمیلہ اس حکم کی تنسیخ کے لئے اس کی دامنگیر ہے۔ خیال ہے کہ وہ جلد چاروں طرف آدمی دوڑائیگا۔ اور اگر وہ مل گیا۔ تو شہاب!! ہمارا سب کیا کرایا اکارت جائیگا۔

شہاب۔ جبتک میں زندہ ہوں۔ ایسا کبھی نہ ہوگا۔

اختر۔ یاد رکھو۔ کہ اگر تم نے اس کے راستے میں روڑا اٹکایا تو وہ مارے قمچیوں کے تمہاری کھال اُدھیڑ دیگا۔ بہتر یہی ہے کہ میں اپنے تمام ارمانوں کی فاتحہ پڑھ ڈالوں

سے تم اپنی جاگیر، عزت اور معشوقہ کی طرف سے ہاتھ دھو ڈالو۔

شہاب۔ بتائیے۔ بتائیے۔ خدارا وہ ترکیب بتائیے۔ جس سے شیردل کی دال نہ گلنے پائے۔ اور یہ آفت اُوپر ہی اُوپر ٹل جائے۔

اختر۔ غور سے سُنو۔ یہ تو تم جانتے ہی ہو۔ کہ تمہاری قسمت کا چکّر دُور کرنے کے لئے مَیں کسقدر کوشش کرتا ہوں۔

شہاب۔ کوئی کہنے کی بات ہے۔

اختر۔ تو ایک سیّاح کا بھروپ بھرو۔ اور بُڈّھے کے پاس جاکر کہو کہ تم سیدھے دکن سے آرہے ہو۔ جہاں ایک معرکہ تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور شیردل نے تمہاری گود میں دم توڑا۔

شہاب۔ مگر باور کون کریگا۔

اختر۔ یہ مجھ پر چھوڑدو۔ لو یہ لفافہ۔ اس میں تمام ہدایتیں درج ہیں۔ اور اس بقچے میں بھیس بدلنے کا سامان ہے۔ (بقچہ و لفافہ دیکر) یہ ایسی دستاویزیں ہیں جنہیں پڑھ کر شکّی سے شکّی مزاج بھی تمہاری بات کو قرآن کی آیت سمجھیگا۔ مگر شطرنج حکمتِ عملی کی یہ آخری چال بازی کا رُخ دیکھ کر چلنا۔

شہاب۔ بہت خوب۔

اختر۔ دیکھو اس طرح ہماری تمام حسرتیں نکل جائینگی۔ جمیلہ شیردل سے مایوس ہوجائیگی۔ بُڈّھا خیال کریگا کہ شیردل اس کے ظلم کی نذر ہُوا۔ یہ خیال اُس کے دماغ میں سمایا تو سمجھ لو کہ وہ دن دُگنا رات چوگنا بیمار ہُوا۔ شاہدِ مرگ اُس سے ہمکنار ہونے کے لئے بیقرار ہے۔ اور اس بوسیدہ گھر کو صرف ایک دھاکے کا انتظار ہے بس پھر کیا ہے (مُسکراتا ہے) جمیلہ تمہاری اور تخت میرا۔

(شہاب آداب بجالاکر چلا جاتا ہے)

اختر (زہر خندہ کرکے) شہاب۔ بیشک خرمن تمہارا ہے۔ مگر جب بیچارہ بیل اپنی پیٹھ پر لادکر گھر تک غلّہ پُہنچاتا ہے۔ تو اُس کے حصّہ میں صرف بھوسہ آتا ہے۔

پردہ

چوتھا منظر

(جمشید جاہ کی خوابگاہ۔ ایک تپائی پر کھانے پینے کا سامان رکھا ہے۔ جمشید جاہ ایک پلنگ پر لیٹا ہے۔ شمع کی نہایت مدھم روشنی میں جمیلہ داخل ہوتی ہے۔ دس بجے رات کا وقت)

جمیلہ۔ سوتا ہے۔ اُس کے سفید بالوں سے کیا نور برس رہا ہے۔ جو اس پر ظلم کرے وہ ابدی روسیاہ ہے۔ سو سو آرام کی نیند سو اور خوش و خرّم بیدار ہو۔ رنج و غم میرے لئے ہے۔ اور مَیں رنج و غم کے لئے۔ ۵

تیری غذا ہے رنج تو میں ہوں غذا سے رنج
پیدا کیا ہے مجھ کو خدا نے برائے رنج

جمشید (عالم خواب میں) بیٹا! بیٹا!! میرا بیٹا!!!

جمیلہ۔ آہ کیا حسرتناک نظارہ ہے۔ بیچارہ خواب میں بیٹے سے ملکر دل کی لگی بجھا رہا ہے۔

جمشید۔ بیٹا۔

جمیلہ۔ چچا جان! اُٹھئے یہ تو خواب ہے۔

جمشید (نیم بیداری کی حالت میں) کیا وہ یہاں نہیں آیا۔ کیا اُس نے اپنے ہاتھوں سے میرا ہاتھ نہیں دبایا۔ بدبخت اختر۔ تجھے اتنا بھی گوارا نہیں کہ میں خواب ہی میں اُس کا چہرہ دیکھ لوں۔

جمیلہ۔ چچا جان۔

جمشید (اُٹھ بیٹھتا ہے) میں کہاں ہوں؟ بیٹی جمیلہ تم ہو؟

جمیلہ۔ کہئے مزاج کیسے ہیں۔ نیند تو خوب آئی۔

جمشید۔ میں خواب میں اپنے بیٹے کو دیکھ رہا تھا۔ کاش یہ عالم کچھ دیر اور رہتا۔ شاید وہ مجھے معاف ہی کر دیتا۔

جمیلہ (غمزدہ ہو کر اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتی ہے اور باوقار انداز سے کہتی ہے) فرشتوں کے دِل گردِ کدورت سے پاک ہوتے ہیں۔ وہ آپ کو معاف کرتا ہے۔

جمشید۔ نہیں بیٹی! تمہارے چہرہ کی زردی تمہارے دِل کی کیفیت بتا رہی ہے۔ تمہاری آنکھوں کی گہرائی مجھے ڈوب مرنے کا کنواں دکھا رہی ہے۔

جمیلہ۔ چچا جان!

جمشید۔ افسوس! میں نے اپنی سر سر حماقت سے تمہارا باغ جوانی پامال کیا۔ تمہاری زندگی اجیرن کی۔ دُنیا میں رہنا جان کا وبال کیا۔

جمیلہ۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب پشیمانی بیکار ہے۔ اگر وہ نہیں تو اُس کا دھیان میرا مونس و غمخوار ہے۔ لیجئے میں کچھ گاتی ہوں۔ اور آپ کا دل بہلاتی ہوں۔

(گاتی ہے)

فسانہ حسرتِ وصل و غمِ جدائی کا
چراغ کشتہ ہوں میں بزمِ آشنائی کا
جہاں میں گرم ہے بازار بے وفائی کا
رواج اب ہے مروّت کی نارِوائی کا
ادائے حقِ محبت کی دے خدا توفیق
مجھے خیال نہیں تیری بے وفائی کا
اگرچہ کچھ نہیں ممکن نہ ہے فریبِ امید
ہنوز حوصلہ ہے قسمت آزمائی کا!

جمشید۔ کیسا اچھا خیال! میرے کسقدر حسبِ حال (تحت اللفظ) ؎
اگرچہ کچھ نہیں ممکن نہ ہے فریب امید۔ ہنوز حوصلہ ہے قسمت آزمائی کا

جمیلہ - ہاں - (گاتی ہے)

عزیز ہے مرے دل کو مرے جگر کا داغ
چراغ ہے یہ مری شام بے نوائی کا

(وحشت)

(دانیال - ایک نوکر - آتا ہے)

دانیال - حضور ایک شخص خواہانِ باریابی ہے۔ اور کہتا ہے کہ کچھ ضروری عرض کرنا ہے۔

جمشید - جمیلہ تُم جانتی ہو۔ کہ مَیں صرف ایک آواز کے لئے گوش برآواز ہوں۔ (ذرا خاموشی) کوئی قسمت کا مارا میری مدد کا طلبگار ہے۔ ہاں۔ آنے دو۔ میرے دروازے پر آیا ہے تو کچھ لے جائے۔ خالی ہاتھ نہ جائے۔

(ایک طرف سے افتخار اور دوسری طرف سے دانیال اور شہاب داخل ہوتے ہیں)

دانیال - یہ شخص کہتا ہے کہ اُسے کوئی وحشتناک خبر حضور کو سُنانا ہے۔

جمشید - ان ضعیف کانوں کے لئے ایک ہی خبر وحشتناک ہو سکتی ہے۔ میاں۔ جو کچھ کہنا ہے کہو۔

شہاب (آواز تبدیل کر کے) خداوندا اگر اس خبر کے سُننے سے حضور کا سینہ چاک ہو جائے تو میری جاں بخشی ہو۔ قصور معاف ہو۔ گو مَیں اس مُلک میں اجنبی ہوں۔ لیکن اتنا جانتا ہوں کہ حضور شیر دل کے والدِ بزرگوار ہیں۔

جمشید (زہرخندہ کر کے) والد! خوب! ایں! اب بھی اُس کا والد۔ مگر تم کیسے جانتے ہو؟

شہاب - حضور کا بیٹا۔ میرا محسن تھا۔

جمیلہ - "تھا" کیا اب نہیں رہا؟ نہیں - نہیں - وہ زندہ ہے۔ تم جانتے ہو؟ بتاؤ۔ وہ کہاں ہے؟

جمشید - تم میرے بیٹے کو جانتے ہو؟

شہاب - جی ہاں۔ خوب جانتا ہوں۔ وہ دہلی سے کہیں چلتے بنے۔ اور مُدت تک اُن کا کوئی پتہ نہ چلا۔ آخر دکن کی ایک مہم میں ملاقات ہوئی۔ اپنی صحرانوردی کی عجیب حسرت بھری کہانی سُناتے تھے۔ کہتے تھے۔ کبھی ایسا وقت بھی آن پڑتا تھا کہ نہ سر پر دستار ہوتی تھی۔ نہ پاؤں میں پیزار۔

جمشید - آہ! میرا توشہ خانہ عجائبات عالم سے بھرپور اور میرا بیٹا معمولی چیتھڑوں سے معذور۔

شہاب - اُن کی ہر بات سے یاس ٹپکتی تھی۔ چہرہ پر حسرت برستی تھی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے۔

جو آرزو تھی چھن گئی اور غم سے حسرت بن گئی
آہ وہ جوانی کا مزا
وہ عشق وہ عہد وفا
کچھ شکوہ اور کچھ شکریہ

اور آہ وہ بزمِ طرب
یاد آتی ہے ایک اک سب
دل کا کنول جو روز و شب
رہتا شگفتہ تھا سو اب
اُس کا یہ ابتر حال ہے۔ اک سبزہ پامال ہے
اِک پھول کملایا ہوا۔ سوکھا ہوا۔ بکھرا ہوا
روندا پڑا ہے خاک پر۔
(نادرؔ کاکوروی)

جمشید۔ میرا نورِ نظر اور اُس پر یہ ستم!
(اختر آنکھ بچا کر شہاب کو آگے بڑھاتا ہے)

شہاب۔ معرکہ آرائی اُس کا کھیل اور گھمسان کے دن میں صفِ اوّل میں نکلنا اُس کا شعار تھا۔ ایک دن لڑائی زور شور سے ہو رہی تھی۔ تلواروں کی چمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں۔ موت کے قاصد گولیوں کے لباس میں آتے اور ہلاکت اور تباہی کے پیغام پہنچاتے تھے۔ میدانِ جنگ میں لہو کی ندیاں بہ رہی تھیں۔ زمین خاکستری لباس اُتار کر ارغوانی جوڑا بدل رہی تھی۔ شیر دل نے کسی پر تلوار کا وار کیا اور کسی کے سینہ سے نیزہ پار کیا۔ ہر شخص حیرت سے اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ملک الموت پناہ مانگتا پھرتا تھا۔

جمیلہ۔ سُنو۔ سُنو۔ میرے خالدِ زماں کا فسانہ سُنو سُنو
میرے رستمِ دوراں کی بہادری کا ترانہ

شہاب۔ مگر شیر دل بڑھتا بڑھتا دشمنوں کے نرغہ میں آگیا۔ اور اس تلاطمِ حیات میں اُس کی زندگی کی ندی بے نام و نشان ہوگئی۔ مگر وہ بہادروں میں نام کر گیا۔

جمیلہ۔ یعنی مر گیا۔

(جمیلہ اور جمشید پر سکتہ کا عالم طاری ہو جاتا ہے۔ ذرا خاموشی
اختر شہاب کی طرف وحشیانہ انداز سے بڑھتا ہے)

اختر۔ خاموش! او اجنبی! اپنی دل آزار زبان تھام کیا تو اباجان کی زندگی کا چراغ اپنی تقریر کی گندی ہوا سے بجھانے آیا ہے۔ اس بہار آفریں چمن میں خزاں کا سکہ چلانے آیا ہے۔

شہاب۔ مجھے خود افسوس ہے مگر ؎
مژدہ اُس کی تباہی کا مری قسمت میں تھا
یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا
(اقبال)

میرے مرحوم دوست کا آخری پیغام حضور کے نام یہ ہے کہ آپ ہی کی بددعا اُسے میدانِ جنگ میں لے گئی۔ یہ کہنے کے بعد اُس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری، جمیلہ کا نام لیا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

جمیلہ (چونک کر) میرا نام؟

جمشید (ماتم کناں) میری بددعا نے اُسے موت کے

گھاٹ اُتارا۔ اور معصوم عالمِ جانی میں جنت کو سدھارا۔

اختر (تلملا اٹھتا ہے) ابّا جان! ؎

خاندان کو تباہ کر ڈالا

جو فکر نہ تھا آہ کر ڈالا

آہ! میرے غریب الوطن بھائی۔ تیری آئی مجھے نہ آئی ؎

سب دُکھ ہوں پہ خالق یہ جدائی نہ دکھائے

داغ اپنا کسی بھائی کو بھائی نہ دکھائے

(انیس)

(اختر آنکھ سے اشارہ کرتا ہے اور شہاب چلا جاتا ہے جمیلہ کھڑی ہو جاتی ہے)

جمشید۔ بیٹی جمیلہ مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ اختر مرو یا جیو میرا بیٹا لاؤ۔

(جمیلہ چلی جاتی ہے)

اختر۔ جناب جان لینا آسان ہے۔ مگر مردے میں جان ڈالنا ناممکن ہے۔ صاحب اگر یوں چھیننا تھا تو بددعا کاہے کو دی تھی۔ اب صبر کیجئے۔ کون ہے جو ساکنانِ عدم کو اس دُنیا کی فضا میں لاسکے۔

جمشید۔ نہیں لاسکتا۔ کوئی نہیں لاسکتا۔ گیا ہمیشہ کے لئے گیا۔ اختر تو ہی بتا جس نے مجھے بہکایا اور اسے بددعا دینے پر اکسایا۔

اختر۔ دیکھو مجھے طیش نہ دلاؤ۔ اگر چندے اور جینے کی تمنا ہے۔ تو اس وقت مُردوں کی طرح خاموش ہو جاؤ۔

جمشید۔ ظلم! ظلم! لا میرا بیٹا لا۔

(جمشید اٹھ کر اختر کا گریبان گیر ہوتا ہے جو اُسے دھکا دے کر پلنگ پر پھینک دیتا ہے۔ اندھیرا زیادہ ہو جاتا ہے)

اختر۔ خُدا کی شان بوسیدہ ہڈیوں کو فولادی بازوؤں سے پنجہ کرنے کا ارمان۔

(اختر چلا جاتا ہے۔ جمیلہ دوسری طرف سے آتی ہے)

جمیلہ۔ یہ کیسا اندھیرا ہاتھ کو ہاتھ سوجھائی نہیں دیتا ہیں کیا ہُوا۔ یا اللہ ہم پر رحم کر۔ (دامن پھیلا کر) ؎

بھلوں کے بعد بُروں پر بھی ہو نگاہِ کرم

کہ تیرے بندوں میں پروردگار ہم بھی ہیں

جمشید۔ بس بیٹی بس (غش آجاتا ہے)

جمیلہ (جُھک کر دیکھتی ہے) ؎

صدمے سہوں کلیجے پہ کس کس کے داغ کے

افسوس پھول جھڑ گئے سب میرے باغ کے

(انیس)

آہ چچا جان بھی چل بسے۔

(جمیلہ جاتی ہے۔ اختر آتا ہے)

اختر۔ چل بسے۔ کیا واقعی چل بسے۔ شاید سو گئے۔ خیر مضائقہ نہیں۔ موت اور نیند تو ہم بہنیں ہیں دونوں

میں صرف نام کا فرق ہے۔ میں تھوڑی دیر کے لئے اُن کے نام تبدیل کر دونگا۔ ابھی نیند آ۔ شوق سے آ۔ میں تیرا منتظر تھا۔ (آنکھیں بند کرکے) اب کون ہے جو قبر منہ پر مجھے بدمعاش کہیگا۔ اور زندہ بچکر جائیگا۔ اختر اب ریاکاری کے گنگا جمنی لباس میں جلوہ گر ہوگا۔ ـــ

نہ رہا شکوۂ محرومیٔ قسمت مجھ کو
لے اُڑی اوج پہ بے پر میری ہمت مجھ کو
بدنصیب سو اور ایسی نیند سو جس سے حشر میں بیدار ہو۔
اب کوئی آواز سوتوں کو جگا سکتی نہیں
سینۂ ویراں میں جانِ رفتہ آسکتی نہیں

ڈراپ

رشحاتِ شاد

بدلی وہ وضع طور سے بے طور ہو گئے
تم تو شباب آتے ہی کچھ اور ہو گئے
دیکھا کئے وہ مست نگاہوں سے بار بار
جب تک شراب آئے کئی دور ہو گئے
آپس کا وہ مذاق وہ ساقی کا ڈھالنا
اب وقت اور اور ہے وہ دور ہو گئے
آئینہ لے کے ہاتھ میں کہتا ہوں کیوں فلک
تو اور ہو گیا کہ ہمیں اور ہو گئے
چارہ ہوا نہ شاد کو آخر کسی طرح
راضی تیری رضا پہ بہر طور ہو گئے

غزل

تلاشِ طور کیوں ہے طور ہوں میں
اُسی کے نور سے معمور ہوں میں
خراب و مست ہے زاہد نے سمجھا
خیالِ یار سے مخمور ہوں میں
مرا پہلو دل و دلبر سے خالی
الٰہی کسقدر مجبور ہوں میں
گدائے بینوا ہوں تیرے در کا
حریفِ قیصر و فغفور ہوں میں
اثر لاؤں کہاں سے شادمانی
سراپا درد ہوں مہجور ہوں میں

اثرِ صہبائی

رجالِ ہزار داستان

سات مہینے گذر چکے ہیں کہ ہزار داستان کے نغمہ ہائے شیوع سے، فضلائے ادبیاتِ اردو، مسرور ہوئی تھی۔ اس وقت جب اس کی اشاعت کا اعلان کیا گیا تھا۔ اور اس اعلان میں جن اہتمامات کا حوالہ تھا۔ اُن سے نگاہیں بیتابی کے ساتھ منتظر تھیں۔ کہ کب ادبی دنیا کے اس منظرِ فائق سے لذت اندوز ہوں۔ کیونکہ ' اپنی میعادِ اشاعت' خصوصیت مقصد' اور زیب و زینت' نقش و رنگ کے لحاظ سے' ہزار داستان سطحِ عصریات سے' کچھ بلند و بالا بنیاد پر قائم ہونے والا تھا۔ ہمارے انتظار کی کشاکش ختم ہوئی۔ اور یہ صحیفۂ ادب' اہلِ ذوق کے پیشِ نظر تھا۔ رسالہ کی دلکشی سرورق سے ظاہر تھی۔ جس پر عجمی محفل طرازیوں کا ایک تخیلی مرقع ثبت تھا۔ اور جو ایسیائی نگاہوں کے لئے بہت ہی قابلِ قدر تھا۔ ایک ورق اُلٹا گیا' تو شاعر اور اُس کا ساقی" والی تصویر سامنے تھی۔ تصویر کے پہلو میں' ناظم نظمیات کی نظم تھی۔ جن کے متعلق پھر عرض کیا جائیگا۔ اُس کے بعد اڈیٹر صاحب کا افتتاحیہ (عرضِ تمنّا) تھا تصویر و نظم سے ناجلانہ اس لئے گزرنا پڑا۔ کہ "عرضِ تمنّا" میں ہزار داستان کا نصب العینِ حیات' پڑھا جائے۔ چنانچہ "ہزار داستان" کے رموز زندگی کا کم از کم میں نے تو بکمال شوق خیر مقدم کیا۔ اور کرتا رہتا ہوں۔ مگر اب اس کی اشاعت کو کئی مہینے گذر چکے ہیں اور دل چاہتا ہے کہ اس کی حیاتِ ششماہہ پر ایک نگاہ تنقید ڈالی جائے۔ ممکن ہے کہ یہ تبصرہ ملحوظات ادبیہ میں کسی اعتبار سے مفید ثابت ہو۔

جن لوگوں نے ہزار داستان کا پہلا نمبر دیکھا ہوگا' وہ حسب ذیل نتائج پر پہنچے ہونگے :-

(۱) "ہزار داستان" پندرہ روزہ' ادبی رسالہ ہوگا اور مصور ہوگا'

(۲) اس کے دامنِ اشاعت میں' ادب لطیف کا گنجینہ ہوگا' جس کو افسانوں' ڈراموں' نظموں' تنقیدی مضامین اور تنقیدی مضامین کی صورت میں پیش کیا جائیگا۔

اظہارات اولین' اور مقاصدِ اشاعت کے لحاظ سے ہزار داستان کو ایک معجزۂ ادب کہنا بیجا نہ ہوگا لیکن دیکھنا یہ ہے کہ گذشتہ چھ مہینے میں ہزار داستان اپنے مقاصدِ اشاعت کو کس حد تک پورا کر سکا ہے ؟ چھ مہینے کی بارہ اشاعتیں اس وقت ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ اور یہ بارہ نمبر ایسے ہیں جن سے ہزار داستان کی اہمیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان میں مضامین نثر (جن میں چند تنقیدیں' ڈرامے' افسانے

وغیرہ مسلسل وغیر مسلسل سب شامل ہیں) کی تعداد (۶۰)
ہے۔ اور نظم کا حصہ (۲۰۵) نظموں، غزلوں وغیرہ پر مشتمل ہے

مجموعی حیثیت سے مضامین کی یہ تعداد دوسرے رسائل کے یکساں مساعی کی برابر ہے۔ اور اسی اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ ہزار داستان کی پندرہ روزہ اشاعت امتیاز سے خالی نہ رہی۔ اب صرف تصویروں کا مطالبہ باقی رہتا ہے۔ کہ حسب وعدہ ہر اشاعت اس سے مزین نہ بنائی گئی لیکن میں اس بارے میں ارباب حل وعقد کو اس لئے معذور سمجھتا ہوں۔ کہ تصویر کا مسئلہ اردو رسائل اور اُردو پریس کے لئے ابھی عام طور پر دقت طلب ہے۔ اور ہزار داستان کا یہ دعویٰ دو اعتبار سے قبل از وقت تھا۔ ایک تو مدت اشاعت کا محدود ہونا۔ دوسرے عام ناقدردانی۔ جس کے نقصانات سے تجارتی نقطہ نظر سے رسالہ کا متاثر ہونا یقینی اور قابل لحاظ امر تھا۔

اُردو میں صحافت تقلیدی اور نقالی کی وساطت سے پہنچی تھی۔ اس لئے اردو رسائل کا معیار اصلی بہت کم قائم رہ سکا ہے۔ اور پچھلے چند برسوں میں تو رسائل کی ادارت کا حال وہ ناگفتہ بہ رہا ہے، جس نے نہ صرف ادارت کو حقیر و ذلیل کیا ہے۔ بلکہ ناقابل اعتماد ہاتھوں میں رہنے کے سبب، خود صحافت اُردو کی رسوائی اور تسفل کی باعث ہوئی ہے۔ اور اُردو رسالوں کے مدیروں کی زیادہ سے زیادہ حیثیت کسی دفتر کے معتمد سے بڑھ کر سمجھنا غلط فہمی میں مبتلا ہونا ہے۔ یوں تو عام طور پر اہل مُلک میں سے جدت اور مصنفانہ اہلیت یا کسی قسم کے اختراع کا مادہ ہی فنا ہو چکا ہے۔ لیکن اس فنائے استعداد کی سب سے نمایاں مثال، اگر دیکھنی ہو تو بیشتر اردو رسالوں کے مدیرین میں بوجہ احسن دیکھی جاسکتی ہے۔ کسقدر حیرت کی بات ہے کہ وہ لوگ جو نہ تو کوئی علمی استعداد بہم پہنچا سکے ہوں۔ اور نہ انشاء پردازی میں کسی اسلوب خاص کے مالک ہوں۔ بیدریغ اعنان ادارت اپنے ہاتھوں میں لیکر غیر ذمہ دارانہ دیدہ دلیری سے رسالہ کے مدیر و رئیس التحریر بن بیٹھتے ہیں۔ ممکن ہے کہ عہد حاضرہ کی جوش پرستی، سیاسی اخبارات کی ادارت کو محض جوش وطنی کی نمائش سے مشروط کرنے پر قانع ہو سکے۔ مگر یہ امر ناقابل فروگذاشت ہے۔ کہ ادبی رسالہ کی ادارت ایک ایسی شخصیت سے متعلق ہونی ضروری ہے۔ جو مخصوص علمی قابلیت، مخصوص ذہن و ذکا، مخصوص ذوق، مخصوص رجحان جدت و اختراع . . . . . .

. . . اور مخصوص طرز انشاء کا مالک ہو! کیونکہ مدیر کی متصف شخصیت ہی وہ مقیاس ہو سکتی ہے جس پر اس ادبی رسالہ کے معیار کو قیاس کیا جاسکتا ہے۔

دِلّی اور لکھنؤ کے موضوعاتِ زبان کے فرسودہ مسئلہ
کو اگر خواہ مخواہ چھیڑا نہ جائے۔ تو اس میں کوئی شک نہیں
کہ "ہزار داستان" کے موجودہ ایڈیٹر کے لئے ایک ادبی
رسالہ کی ادارت' بہت کچھ سزاوار و موزوں ہے۔ اور
حکیم احمد شجاع صاحب بی۔ اے علیگ کی شخصیت پر یہ
اعتماد کرنا کہ یہ ایک ادبی رسالہ کے فرائض ادارت بوجہ احسن
انجام دے سکینگے۔ کوئی تسامح و رعایت نہیں۔ وہ تعلیم یافتہ
ہیں۔ عرصہ تک مُلک کے بہترین رسائل میں مضامین
لکھ چکے ہیں۔ اور ان مضامین میں اپنے اسلوبِ انشاء و
ذوق کا اچھا ثبوت دے چکے ہیں۔ وہ چند افسانوں کے
مصنف ہیں۔ جو بجائے خود ادبیات میں امتیازی حیثیت
کے مستوجب ہیں۔ ڈراما نگاری سے اُن کا دیرینہ ذوق امتیاز
کا پایہ رکھتا ہے۔ اور جن لوگوں نے انکو زیادہ دیکھنے کا موقع
پالیا ہے، وہ بعض اعتبارات سے اُن کی اہلیتوں کو غیر معمولی
سمجھتے ہیں۔ اس لئے جہانتک نفسِ ادارت کا سوال
ہے۔ "ہزار داستان" سے ادبی توقعات کی وابستگی کوئی بھی
فریب خوردگی نہیں لیکن اسی موقع پر مَیں جناب ایڈیٹر
صاحب کو مجملاً اتنا جتا دینا اپنا ناقدانہ فرض سمجھتا ہوں۔
کہ ہزار داستان کے مضامین کے انتخاب و قبول میں اگر
پستی کو دخل نہ بھی سہی پھر بھی اس کے عام مضامین میں
معیاری درجہ قائم نہ ہو سکا جس کے قیام کی طرف امید ہے کہ
بطور خاص توجہ کی جائے گی۔

اعتماد ادارت سے گذرنے کے بعد نفسِ مضامین ہزار داستان
کا موقع آتا ہے۔ اور یہاں بھی سب سے پہلے مسرت کے
ساتھ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ ہزار داستان کا ایڈیٹر محض "مرتب"
ہی نہیں ہے، بلکہ ان بارہ ششماہہ نمبروں میں' علاوہ
"عرضِ تمنا" (افتتاحیہ) کے آٹھ مضامین ایڈیٹر کے بھی
موجود ہیں۔ جن کو "ڈراما" "افسانہ" "تنقید" "تفنن"
کی اصناف میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اور جن میں سے
بعض بے حد مستحق داد و ستائش ہیں۔ اُن کے مضامین میں
"ہیرے کی چوری" اور "نقاب پوش" میں ایک تو
ایک ایکٹ کا ڈراما لکھنے کی جدّت تھی۔ دوسرے
"سراغرسانی" کے فن پر بنیاد تھی۔ جو مشرق و مغرب میں
دلچسپی کے ساتھ دیکھا جاتا ہے۔ "بہارستان کا آسیب"
پُراسرار افسانہ تھا۔ اور "معجزاتِ ادارت" نہایت کامیاب
"طنز" "بینا" ترجمہ کی خوبی و سادگی کے علاوہ اُردو
ادبیات میں معاشری ڈراما کے تعارف کی خصوصیت رکھتا
ہے۔ ہر ایک شے کی خصوصیات و متعلقات کو اگر ملحوظ
رکھا جائے۔ تو غالباً ناظرین کو جناب ایڈیٹر صاحب سے کسی
مزید مطالبہ کا موقع نہ آنے پایا۔ اور غالباً اُن سے وہ شکایت
نہ پیدا ہو سکی جو دوسرے رسائل کے ایڈیٹروں سے اس

ہمارے میں اکثر پیدا ہوتی ہے۔

منشی "پریم چند" صاحب کی افسانہ نگاری اسوقت باعتبارِ شہرت کے مزید تعریف سے مستغنی ہے۔ ان کے پانچ افسانے، ہزار داستان کی گذشتہ اشاعتوں میں نکلے جس میں "فلسفی کی محبت" تنبیہی افسانہ تھا۔ اور دلچسپ ہے "دفینہ" "تعبیری" کہانی تھی۔ مگر سادہ اور "سانپ کی معشوقہ" بے حد دلچسپ لیکن یکسر توہم۔ "فلسفی کی محبت" کے سوا، دو اوّل الذکر افسانے بھی چنداں معیار پر نہیں لکھے گئے تھے۔ البتہ "دعوتِ شیراز" سے بہتر تھے۔

کیونکہ "دعوتِ شیراز" خلا میں خلا۔ کا بھراؤ تھا، اور بس۔ اسی طرح "شکست کی فتح" میں محض عنوان کی رعایت کے سوا کچھ نہ تھا۔ کیا یہ گذارش کر دینا بے موقع ہوگا، کہ شاہیر کو باوصفِ استغنا، اپنی شہرت کی حفاظت کم ازکم اتنی تو ضرور کرنی چاہیئے۔ کہ خود اپنے کمال کا معیار نہ گرنے پائے۔

ہزار داستان کا قابلِ ناز ادبی انکشاف کہنا چاہیئے کہ سیّد محمد شاہ صاحب ایم۔ اے، کو دنیائے ادب میں متعارف کرایا۔ اور اُن کے دو ترجمے، "خندہ تقدیر" اور "گلفروش" نظر سے گذرے۔ "خندہ تقدیر" اس قسم کا ترجمہ ہے۔ جس کے لئے تصنیف سے کہیں زیادہ قابلیت درکار ہوتی ہے۔ اور جس ذوق و طاقت سے سیّد محمد شاہ صاحب نے اس افسانہ میں کام لیا ہے۔ اس کو بہترین ادبی کارنامہ شمار کرنا چاہیئے۔ اور ہمیں انتظار ہے کہ اُن کے مضامین ہمیشہ ہزار داستان میں شائع ہوں۔ اور ان کی ادبی کاوشیں اہلِ ذوق کے لئے زیادہ وسعت کے ساتھ سرمایۂ کیف ہو سکیں۔

جناب سدرشن کے چار افسانے دیکھنے میں آئے۔ جس میں "ترکِ تنقید" قابل الذکر ہے۔ ان کے افسانوں میں سعیِ نتیجہ آفرینی، تو جھلکتی ہے، مگر ادبیت سے بیرنگ ہوتے ہیں۔

"لیلےٰ" (مسلسل) اور "ساون رین کا سپنا" (مسلسل) سیّد امتیاز علی صاحب تاج کے امتیازی مساعیِ ادب میں سے ہیں۔ "لیلےٰ" ترجمہ ہے۔ مگر روانی و بلندیِ انشار اور انتخابی قابلیت کیوجہ سے جناب تاج کو بہت کچھ مستوجب مدح کر دیتا ہے۔ اس سے پہلے بھی اس ناول کے ترجمہ کی دو کوششیں نمودار ہو چکی ہیں۔ لیکن جنابِ تاج کی کاوش، بمراتب فائق ہے۔ اور "ساون رین کا سپنا" بھی برجستگی کی خصوصیت رکھتا ہے البتہ ڈراما کے نام کے اس لفظی ترجمہ سے مجھے باوجود شعریت اختلاف

ہے۔ کیونکہ ان کا ادبی وقار، ایسے لفظی ابتذال کو گوارا نہیں کر سکتا۔ جناب تلّج کا ایک اور ڈراما موسومہ "گلابی ساڑھی" بھی دو یا تین نمبروں میں شائع ہوا تھا۔ اور وہ باعتبارِ انشا خوب تھا۔ کاش ان کے مسلسل ترجمے "ہزار داستان" میں جلد مکمل بھی ہو جاتیں۔ اگرچہ مسلسل مضامین، ماہوار اشاعتوں میں، ہمیشہ منقطع اور بجائے خود غیر مکمل حالت ہی میں رہتے ہیں۔

افسوس ہے کہ میں "جناب پطرس" کی خدمت میں ان کے تفننی مضمون "کُتّے" کے متعلق کوئی ہدیۂ تحسین اس لئے پیش کرنے سے معذور ہوں کہ اس قسم کا تفنن خواہ، فنّی اعتبار سے کتنا ہی مکمل و دلچسپ کیوں نہ ہو۔ مگر مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ادبی سنجیدگی کو ایسے مضامین سے صدمہ پہنچنے کا احتمال ہے۔

جناب میر افضل علی صاحب کا ایک ہی افسانہ "مرزا پھویا" جس کو "مرقعِ سیرۃ" کے فن سے متعلق سمجھنا چاہیئے، دیکھنے میں آیا۔ اس افسانہ میں اُس ادبیت کا تو فقدان ہونا ہی چاہیئے تھا جو ان کے "دورِ ادب" میں پائی جاتی تھی۔ مگر قطع نظر اس کے بحیثیت فن، اُس میں چند امور قابلِ اعتراض رہتے ہیں۔ اوّل تو افسانہ کا یہ نام، اور جس سیرت کی مطابقت میں، یہ افسانہ لکھا گیا ہے، سجاد حیدر صاحب کی ایک نظم سے ماخوذ ہے۔ جو انھوں نے زمانۂ طالب علمی میں طالبعلمانہ حیات کے تفنن میں کسی اپنے معاصر کی حالت کے استقصا میں کہی ہے۔ پھر "مرزا پھویا" باوصف "مرزا پھویا" ہونے کے، گر پڑ کر ہی سہی تکمیل تعلیم بھی کر لیتا ہے۔ ابتدائی ملازمت میں اپنی قابلیت کا ثبوت بھی دیتا ہے۔ اس کی کیا ضرورت ہے کہ ہر وہ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر جو محض جریب کشی کا متحمل نہ ہو سکے "مرزا پھویا" قرار دیدیا جائے۔

رسالہ نقیب (بدایوں) کے صفحات، جناب عظمت اللہ خانصاحب بی۔ اے کے تفننی مضامین کے بہترین آئینہ دار ہیں۔ اور جناب عظمت اللہ خانصاحب کے مضامین باوجود تاثیرِ زعفران زاری، بے حد پر معنی اور کافی معلومات و تنبیہات کے حامل ہوتے ہیں۔ اور یہ کہنا بیجا نہ ہوگا۔ کہ تفننی مضامین میں، تنبیہات و معلومات کا اتنا مواد فراہم کر دینا ایسی خصوصیت ہے، جو موصوف الصدر کے ساتھ ہی مخصوص ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ "ہزار داستان" میں "اٹکّلیس" صرف "اٹکّلیس" رہا۔

مسٹر سوندھے کے ترجمے "وائے حسرت" اور جناب حیدر اجمیری کے "روزا" "شمعدان" اور "مسعود" سے

گذرتے ہوئے جن میں ثانی الذکر کے وہ جملے قابلِ التفات ہیں جن میں بیشتر ادبی رنگ جھلک جاتا ہے۔ جناب تاثیر بی۔اے کے تینوں افسانے "شبیر افضل" "ماسٹا" اور "بہادر جلاد" کامیاب اور مشکور ہیں۔ اور تینوں میں موصوف کے "تہور ذوق" کا عنصر نمایاں ہے

جناب "بلشم" کا افسانہ "انتقام" واقعیت، عبرت اور ایثار کا مرقع ہے۔ اور دلچسپ بھی ہے۔ اب ہم جناب فکری کے ترجمے "ملکہ زبار" جناب حکیم یوسف حسین کے افسانہ "عورت کی دنیا" جناب افتخار الرسول صاحب بدر کے چار افسانوں ڈراموں "شہید محبت" "شہید آرزو" "سرفروش" اور "آشیاں برباد"۔ جناب شیخ فضل حق صاحب منقصم کے چار افسانوں اور ڈراموں "محبت و عصمت" "جنون تحائف" "ساحل بحر" اور "گلابی آنچل"۔ جناب معین کے ایک افسانہ "اقبالِ جرم" جناب امیر الحسن کے "شعلہ مضمر" سے گذرتے ہوئے اور جناب گوپال کرشن صاحب یاس کو اُن کے ترجمے "حقیقی راحت" کی، جناب تماشائی کو "نادعلی" کی، جناب سیّد ابو محمّد صاحب ثاقب کو اُن کے دو افسانوں میں سے "غریب الوطن" کی داد دیتے ہوئے، اور اُن سے مزید دلچسپ مساعی ادب کی درخواست کرتے ہوئے، جناب محمّد ہادی حسین صاحب کو ترجمہ "غم نصیب" پر اُن کی قابلیت انتخاب اور قابلِ ناز کامیابی کی مبارکباد دیتے ہیں۔ اور اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ "لیلےٰ" وغیرہ کے عدم تسلسل سے جنابِ محمد ہادی حسین کے "غم نصیب" نے ہزار داستان کی دلچسپی کو برقرار رکھنے میں کافی مدد دی!

عوام پسندی، ہمہ گیریِ طبع، اور کثرت نگاری، نے خواجہ حسن نظامی صاحب کو دُنیائے ادب میں، پر فروغ و امتیاز حیثیت دے دی ہے۔ اور موصوف کی غیر معمولی جدّت تخیل اور روانیِ بیان کے ہم بھی معترف ہی نہیں بلکہ معتقد ہیں۔ مگر فنونِ ادب میں ایک معیار قائم کرنا اور اُس میں جوہر کمال کا اظہار ہونا ایک غیر متعلق سا سوال ہے۔ غالباً اِسی لئے "محبّت کی پسپائی" کو نہ تو افسانہ سے تعلق رہا، نہ کسی خاص صنفِ ادب سے، البتہ "کفنی" نے بڑی حد تک اس مطالبہ کی تسکین کی۔ مگر وہ بھی باعتبارِ حالات و نتائج اُن کے لکھے ہوئے "غدریات" سے مطلقاً ملتی جلتی تھی۔ اور نفسیاتی اصول سے دیکھا جائے تو "کفنی" کے ہیروئن کے امیال کا یہ تنزّل و تسفل کہ وہ اپنے ہی باغ کی مالن کے فقیر بیٹے کے ساتھ زندگی مدغم کر دینے پر رضامند ہوگئی، واقعیت سے کسقدر بعید معلوم ہوتا ہے۔ اگر محض کفنی کی کرامت کو نظر انداز کر دیا

جاتے۔ جو یکسر وہم ہے۔

ہزار داستان کے تازہ واردانِ ادب میں سے جناب سید عابد علی صاحب عابدؔ کے افسانے قابلِ لحاظ ہیں۔ اور موصوف کے چھ افسانوں میں سے دو افسانے "انحطاطِ شباب" اور "حجابِ زندگی" میری نظر میں بہت وقیع ہیں۔ ان افسانوں میں اُن کی کاوشِ فکر و تخیّل کا اچھا ثبوت ملتا ہے۔ اور یہ توقع ہوتی ہے کہ اگر اُن کی کاوشِ ذہنی اسی طرح کام کرتی رہی تو اپنے موضوعاتِ مخصوصہ میں بہت جلد امتیازی شان پیدا کر لینگے۔ عبارت میں اغلاق و تعقید جملوں میں آورد لفظی ہے اگر احتیاط رہے تو زیادہ باعثِ قبولیّت ہونگے۔

جنابِ نور الٰہی و جنابِ محمد عمر صاحب کی متحدہ کوششیں

ادب کی صنف تمثیل میں عام طور پر نمایاں نظر آئی ہیں لیکن ہزار داستان میں اُن کے دو مضامین مطالعہ میں آئے۔ "خضرِ راہ" اور "حسنِ اتفاق" "خضرِ راہ" ترجمہ تھا۔ اور "حسنِ اتفاق" ذاتی کاوش کا نتیجہ۔ اور یہ دونوں کوششیں مشکور ہوئیں۔ "حسنِ اتفاق" میں علاوہ خوش ذوقی کے جدّت کی بھی بنیاد تھی۔

"حیات بعد الممات" کے مترجم جناب قاضی عبد الودود صاحب اور "اقبال" (تنقیدی مضمون) کے مضمون نگار جنابِ صہبائی کی تحسین پر ہم حصّۂ نثر کا تبصرہ ختم کرتے ہیں۔

عزیز بدایونی

یادداشت

اس مرتبہ رسالہ کی یہ اشاعت قبل از قبل تیار کر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔ لہٰذا صرف وہ مضامین درج کئے جا سکے ہیں، جو فروری کے پہلے ہفتہ میں موصول ہو چکے تھے۔ ہمیں امید ہے کہ صاحبان مضامین اپنے مضامین کی تعویقِ اشاعت پر، ہمیں معذور سمجھیں گے۔ اور خود بھی توجہ فرمائینگے، کہ مضامین مہینے کے پہلے ہفتہ میں روانہ فرما دیا کریں تا کہ ان کے انتظار کو مایوسی نہ ہو۔

تبصرۂ کتب وغیرہ اور معاصرانہ اشتہارات کے اندراج میں بھی یہی امر مانع ہوا۔

جائنٹ ایڈیٹر

(امرت الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیو چند پرنٹر کے چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے سید افضال حسنی پبلشر نے شائع کیا)

٧٨٦

قیمت سالانہ آٹھ روپیہ

قیمت ششماہی چار روپیہ آٹھ آنہ

ہزار داستان

ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

جلد ۲ | اشاعت ماہ مارچ سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۳

فہرست مضامین

اِطّلاع

چونکہ رسائل "ہزار داستان" و "نونہال" کے اجرار کا مقصدِ اوّلین ادبی اور علمی خدمت ہے۔ اور ہمیں منظور نہیں کہ ان کو ذریعہ معاش و تجارت بنایا جائے۔ اور چونکہ اب رسائل کی ترقیِ اشاعت کی وجہ سے اخراجات بشرح فی رسالہ فی سال پہلے کی نسبت کم ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس سب سے پہلے موقع پر ہمیں یہ اعلان کرنے میں مسرّت ہے کہ اس تخفیف اخراجات کو مدّنظر رکھکر ماہِ اپریل ۱۹۲۳ء سے ہر دو رسائل کی قیمت بھی علیٰ قدر نسبت کم کر دی گئی ہے۔ اب ان خریداروں کے لئے جو یکم اپریل ۱۹۲۳ء کے بعد درخواست بھیجینگے ہزار داستان کی قیمت ۶ سالانہ اور نونہال کی قیمت ۵ سالانہ ہوگی۔ ناظرین کرام اس سے اندازہ لگالیں گے۔ کہ اگر وہ ذرا ہمّت کر کے ان رسائل کی ترقی اشاعت کے لئے کوشش کریں۔ تو وہ وقت جلد آجائیگا جب ہم ان رسائل کو موجودہ سے بھی بہتر معیار اور اس سے بھی کم قیمت پر پیش نظر کر سکینگے۔ اس تخفیف قیمت کے باوجود رسائل کی ضخامت کو بڑھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰه

منیجر

پھول سے رازونیاز

کالج سے واپس آکر دیکھا تو میز پر ایک گلدستہ رکھا تھا، آج اس میں تازہ پھول لگائے گئے تھے۔ ایک سُرخ خوشنما گلاب کا پھول جس کی تروتازگی مجھے کسی کے عارضِ گلگوں کی یاد دلاتی تھی۔ سر جھکائے تھا، خاموش تھا، افسردہ تھا، ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ غم سے نڈھال ہوکر اور اپنی مصیبتوں سے تنگ آکر وہ اپنی زندگی، مایوس چند روزہ زندگی ختم کرنا چاہتا ہے۔ اُس کی پنکھڑیاں کانپ رہی تھیں۔ سرخی میں کمی آتی جاتی تھی، گویا ایک مریض ہے، عرصہ کا بیمار اور مُدّت کا پریشان، کہ تپِ غم سے دم توڑ رہا ہے۔ مجھے اُلجھن ہوتی، میرا دل جو، چاہے اسے میری کمزوری کہو، ہر کسی کے غم سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے، سینہ میں آگ بھڑکانے لگا، میں نے ہاتھ بڑھا کر اُس پھول کا سر اُٹھایا۔ اُس کی پریشان پتّیوں پر ہاتھ پھیرا۔ تو ایک قطرۂ آب نیچے گر پڑا۔ اور میز کے سیاہ فرش پر لوٹ کر گلکاری کرنے لگا، اُس ایک قطرہ کے آٹھ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو گئے۔ میں اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہُوا۔ کہ ایک افسردہ دِل سے میں نے تسکین آمیز باتیں کیں۔ اُس نے شدّتِ غم اور فرطِ الم سے آنسو بہائے...... آہ میرے دِل میں ٹھیس لگی، مجھے اُس کے رنج کا اندازہ ہُوا، اپنے کو ملامت کی، آخر میں نے اُسے کیوں رُلایا...... ؟"

میرا قلب مضطرب تھا اور آنکھیں اشکبار، میں نے پھول سے پُوچھا۔ "کیوں اے گلاب کے پھول تو روتا ہے، مگر بتاتا تو، تجھے کیا صدمہ ہے؟" پھول اب بھی گردن جھکائے تھا۔ اُس کے دونوں طرف بڑے بڑے زرد ولایتی پھول تھے، کچھ اُوپر دو یکساں پھول نیچ میں اور دو یکساں داہنے بائیں، چاروں طرف سبز پتّیاں احاطہ کئے ہُوئے تھیں۔ وہ پھول اُن میں اس طرح گھرا ہُوا تھا جیسے چاند کے گرد تارے یا ایک حسین ملکۂ حسن کے گرد اُس کی خواصیں، دیکھتے ہی دیکھتے پھول کی سطح پر۔ اُس خوشنما گلاب کے پھول کی سطح پر جسے میں چاند سے تشبیہ دے چکا ہوں، اُس سُرخ پھول کی سطح پر جسے میں نے ملکۂ حسن کہا ہے۔ اُس دردمند دِل رکھنے والے پھول کی سطح پر جس نے پہلے اشکباری کی تھی۔ اُس کی سطح پر کچھ قطرے اور نظر پڑے، ایک چھوٹا سا قطرہ، ایک ننھّا سا موتی اُس پھول کی پنکھڑیوں کی آڑ سے جھانک رہا تھا، میں نے اُسے دیکھا...... تو وہ بھی نیچے گر پڑا اور میز پوش پر بکھر گیا

اس قطرہ میں سُرخی تھی، ہلکی سی سُرخی، یہ خون کا آنسو تھا۔ اِس میں دل کے ذرا ذرا سے ٹکڑے شامل تھے،

میں نے پھُول سے سوال کیا

کس کے غم میں اے گلِ تر تیرا سینہ چاک ہے
سر جھکائے چپکے چپکے آہ کیوں روتا ہے تو
کس لئے خاموش ہے کیوں ہو گیا افسردہ دِل
تیری ہر ہر پنکھڑی میں کیوں ہے دردِ غم نہاں
پھول، آہ صبح کے توڑے ہوئے پھول بتا، ہاں سچ سچ
بتا، کیوں بہاتا ہے لہو؟"

میں نے اُس سے یہ بھی پوچھا،

میری آنکھوں سے رواں ہیں خون کی کیوں ندیاں
تجھ کو روتا دیکھ کر کیوں دل کی اُلجھن بڑھ گئی
کچھ تو کہہ اے رونے والے میری وحشت کا سبب
آگ بھڑکائی ہے کیوں اس سینۂ صد چاک میں
بتا بتا، ہاں اے میرے دل کو مضطرب کرنیوالے پھُول،
بتا کیوں مجھے مضطر کیا ؟ "

پھر میں نے یہ بھی کہنے کی جُرأت کی،

تیری رعنائی تو ہے تفسیرِ حسنِ یار کی
تیری شادابی ہے شرحِ راحت و آرامِ جاں
برگہائے منتشر پھر کیوں ہیں اوراقِ الم
تیرا تارِ اشک پھر کیوں عشق کی تسبیح ہے
اے پھول تو تو مکمل یار کی تصویر ہے، تجھے رنج و غم سے کیا کام، ہائے کیوں روتا ہے تو ؟ "

گلاب کا پھُول، میرا ہمدم و ہمراز گلاب کا پھول جس سے میں یوں مخاطب تھا، اب بجائے سرخی کے زردی پکڑتا جاتا تھا، اُس کا جسم اب پہلے سے زیادہ مضمحل تھا، گویا ایک حسین چہرہ ہے یا ایک مجسم حسن کی دیوی ہے غمگین و متاثر، جس کی حالتِ زار پوچھ پوچھ کر میں نے اُسے اور غمگین بنا دیا ہے۔ اُس کا رنگ فق ہے، اور اُس کے چہرہ سے اُس کی دلی کیفیات نمایاں ہیں، اُس پھول کی پتیاں پریشان تھیں۔ وہ مرجھا مرجھا کر ایک دوسرے سے علیحدہ ہو رہی تھیں، دو پنکھڑیاں اس طرح مرجھا گئی تھیں اور یوں آپس میں مل گئی تھیں۔ گویا حُسن کی وہی دیوی کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر جذباتِ عشق سے بیچین ہو کر دم توڑ رہی ہے۔ مگر یہ عالمِ نزع میں اور بھی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے ہونٹ ہیں، مرجھائی ہُوئی پنکھڑیاں نہیں، اُن میں سُرخ رنگ ہے جس سے نزاکت نمایاں ہوتی ہے۔ اُن میں سُرخ رنگ ہے جو تپِ عشق سے ہلکا پڑ گیا ہے اور آہ، اس ہلکے رنگ میں اور اس "سادہ آرائش" میں قیامت کوٹ کوٹ کر بھری ہے، اُس کے ہونٹ ہیں، مرجھائی ہُوئی پنکھڑیاں نہیں، جو زبانِ حال سے اپنی کتابِ زندگی کو کسی دردمند "مجنون" کے صفحۂ غم کو آخری دم پڑھنا چاہتے ہیں گویا نہ

ہونٹ، نازک اور متبسم انداز میں میرے سوالات کو سمجھ کر میرے دل پر بجلیاں گرانے کو جواب دینا چاہتے ہیں،

وہ کہتے ہیں

"کون ہے تو اور کیوں یوں چھیڑتا ہے تو مجھے
پوچھ کر، زخموں پہ میرے کیوں چھڑکتا ہے نمک
کیا بتاؤں کون ہوں اور کیا ہے مجھ کو رنج و غم
میری صورت سے ہے ظاہر خانہ بربادی مری
اے میرے مونس و ہمدم، اے میرے رنج میں شریک ہونیوالے
سُن میں سراپا درد ہوں ! "

گویا وہ یہ بھی کہتے ہیں،

"اُس دلِ بسمل کا ہر نالہ ہے برقِ اضطراب
چشمِ دریا بار اپنی آبشارِ عشق ہے !
روتے روتے ہو گیا ہے آہ سینہ شق مرا
دل کے سو ٹکڑے ہیں اور ہر ٹکڑے میں مضمر ہے غم
جب یہ حالت ہے اے میرے غمخوار اور تو بھی میرا ہمنوا ہے،
پھر کیوں نہ پیدا ہو اثر ! "

پھر گویا وہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں،

"میں حسیں ہوں، ہائے لیکن کی نہ میں نے التفات
کیا کہوں اب کس کی یاد آتی ہے مجھ کو بار بار
میں یہاں ہوں مضطرب، بلبل وہاں ہوگی حزیں
ہائے وہ آغازِ اُلفت جس کا یہ انجام ہے"

ہاں تو کیا تجھے بھی ایسا ہی رنج ہے؛ تیرے پہلو میں دل ہے تو آ، مل کے روئیں زار زار ! "

مگر نہیں ..... اب تو وہ کُمہلا رہا ہے، کُمہلا گیا رہا ہے اُس کی پتّیاں اُس کی پنکھڑیاں بیچین ہیں، تھر تھر کانپ رہی ہیں؛ مَیں نے اُسے دیکھا، میرا دل سینہ میں شق ہو رہا تھا، میری آنکھیں خون کے آنسو رو رہی تھیں، مَیں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اُس کی ایک کمہلائی ہُوئی پتّی ضعفِ غم سے آہستہ نیچے آ رہی، مَیں نے دیکھا میرے دل کا ایک ٹکڑا علیحدہ ہو کر آنسوؤں میں شامل ہُوا۔ اور ساتھ ہی ڈھلک پڑا پھر دیکھا ایک اور پتی آہستہ سے اُس پہلی پتی کے پاس آ کر اُس سے گلے ملی، یہ آنسو نہ تھے، یہ پانی یا شبنم کے قطرے نہ تھے، یہ گر کر آٹھ ٹکڑے نہیں ہُوئے، یہ پتّیاں تھیں اُس سُرخ گلاب کی جو میرے جنون کو بڑھانے کے لئے یوں "برگ فشانی" کا تار باندھے ہُوا تھا، مَیں نے پھول سے کچھ کہنا چاہا مگر وہ تو زندگی ختم کر چکا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے سب پتّیاں گر پڑیں، پھول صرف ایک ڈھانچہ تھا، آہ، وہ حُسن کی دیوی لُٹ چکی تھی اُس کا زیور اُتر چکا تھا اُس کی پوشاک بدن سے اُتاری جا چکی تھی۔ اور وہ موت کے مُنہ میں پہنچ چکی تھی، وہ پھول ... مگر مَیں مبہوت تھا، مَیں نے سوچا .... اور .... ؟

جلیل احمد قدوائی

انقلابِ پیرس کا ایک ورق

(ایک سین میں مکمل ڈراما)

اشخاص

مارکوئس ڈی شیٹیلرڈ . . . . طبقۂ امرا کا ایک نوجوان

سبیسٹین . . . . مارکوئس کا وفادار ملازم

کاونٹ لوئی ڈی شیٹیلرڈ . . . . مارکوئس کا چھوٹا بھائی

سینڈ موزال لیبول . . . . لوئی کاونٹ کی معشوقہ

دیگر . . . . فوج کے سپاہی وغیرہ

ہدایات:۔ فابورسینٹ کے ایک اجڑے ہوئے ہوٹل میں مارکوئس ڈی شیٹیلرڈ سفری لباس پہنے بیٹھا ہے۔ سامنے گول میز پر اُس کی ٹوپی اور دستانے رکھے ہیں۔ کرسی کی پشت پر اُس کا سیاہ اوور کوٹ لٹکا ہوا ہے۔

مارکوئس (کچھ سوچ کر) جب باغیوں نے بادشاہ اور ملکہ کو سولی دیدی ہے تو پھر یہاں رہنے سے کیا حاصل۔ جبتک میں اُن کے کام آسکا تب تک پیرس میں رہا مگر اب یوں بیکار پڑا رہنا فضول ہے۔ کیا مجھے . . . . ؟

(سبیسٹین داخل ہوتا ہے)

مارکوئس۔ سناؤ کچھ انتظام ہوا؟

سبیسٹین۔ آقائے ولی نعمت سفر کا سامان تیار ہے گاڑی دروازے پر کھڑی ہے۔ ڈاک کے گھوڑے بھی آگئے ہیں۔ اور پروانہ راہداری بھی مل گیا ہے۔

مارکوئس۔ کہاں ہے؟

(سبیسٹین پروانہ راہداری مارکوئس کے ہاتھ میں دیتا ہے وہ کھولتا ہے۔ اُس میں سے ایک پرچہ نکل کر گر پڑتا ہے)

مارکوئس۔ آہا۔ اُن لوگوں کو میرا پتہ لگ گیا ہے۔ اور وہ نو بجے مجھے گرفتار کرنے کے لئے آئینگے۔ مگر مال خالی ہوگا۔ کیونکہ میں سات بجے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤنگا۔

(دروازہ کھلتا ہے ایک مرد اور عورت داخل ہوتے ہیں)

مارکوئس۔ لوئی تم کہاں؟

کونٹ لوئی (گھبرائی ہوئی آواز میں) بھائی جان! باغی ہمارے

پیچھے پڑے ہوتے ہیں۔ میرا تو کچھ نہیں۔ میں تو خوشی خوشی موت کے مُنہ میں جانے کو تیار ہوں۔ مگر (لیول کی طرف اشارہ کرکے) اسے بچائیے۔ اور کسی ایسی جگہ چھپا یئے۔ کہ اس پر آنچ نہ آئے۔

مارکوئس۔ لوئی تم نہایت خوش قسمت ہو کہ وقت پر پہنچ گئے ہو۔ میں ابھی پیریس کو الوداع کہنے ہی کو تھا۔ جاؤ۔ یہ لو پاسپورٹ، میں بھی تمہارے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ کر آتا ہوں۔

(لوئی اور لیول گاڑی میں بیٹھ کر چلے جاتے ہیں)

مارکوئس (دل میں) خیر اچھا اگر خُدا کو یہی منظور ہے۔ کہ میں یہیں اپنی جان دوں تو یہی سہی۔ مجھے اپنی زندگی کی چنداں پروا نہیں۔ اب بھلا گھوڑے بھی کہاں مل سکتے ہیں اور نو بجتے بجتے تو فیصلہ ہی ہے۔ خیر پیارے وطن رخصت! زندگی اور جوانی رُخصت! دولت اور شہرت رُخصت! تمنائے انتقام رخصت!

الوداع! الوداع!! الوداع!!!

یکایک دروازے پر شور وغل ہوتا ہے۔ مارکوئس کمرے کی تمام شمعیں روشن کرتا ہے۔ اتنے میں دروازے کے کواڑ زور سے کھُلتے ہیں۔ اور مسلح آدمیوں کا ایک بے ترتیب گروہ اندر داخل ہوتا ہے "مارو مارو چھوڑو مت" کے نعرے بلند ہوتے ہیں۔

مارکوئس۔ خبردار اگر کسی نے ایک قدم بھی آگے بڑھایا! ابھی سپاہی مجھے گرفتار کرنے چلے آتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو اُن کے حوالے کر دونگا۔ مگر تم جیسے کمینے مجھے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔

(باہر سے سپاہیوں کا ایک دستہ داخل ہوتا ہے)

کپتان (مارکوئس کی طرف اشارہ کرکے) سپاہیو، پکڑ لو۔ گرفتار کرلو۔ تلوار چھین لو۔

مارکوئس۔ جناب کپتان آپ اتنی عجلت نہ کریں۔ میں اپنے تئیں آپ کے حوالے کئے دیتا ہوں۔ مگر تلوار نہیں دے سکتا۔

کپتان۔ اگر آپ نے کسی پرو نہ کیا تو

مارکوئس (ہنسکر) اوہو! آپ اس قدر بزدل ہیں۔ کیا آپ کو میری بات کا اعتبار نہیں؟

کپتان (سپاہیوں کی طرف مخاطب ہوکر) ذرا ٹھیرو۔

مارکوئس۔ سُنو یہ تلوار تو میں اپنے پاس رکھونگا۔ مگر یہ دوسری تلوار جس سے میں نے اکثر فرانس کے دشمنوں کو زک دی ہے۔ تم کو "تحفۃً" دیتا ہوں۔ غالباً تم کو یاد ہوگا۔ کہ تم پہلے میری رجمنٹ میں لفٹنٹ تھے۔ لو اور اسے اُس شخص کی یادگار رکھو۔ جو کبھی تمہارا کرنیل تھا۔

(کپتان تلوار لے لیتا ہے اور مارکوئس کے ہاتھ پر بوسہ دیتا ہے۔ سپاہی اُسے ننگی تلواروں کے پہرہ میں جج کے سامنے پیش کرتے ہیں)

جج۔ تمہارا نام شیٹیلرڈ ہے؟
مارکوئس۔ میرا نام بین انٹوائن ہے
جج۔ مگر تمہارا خاندانی نام کیا ہے۔
مارکوئس۔ ڈی سیوائے۔
جج۔ پھر تم شیٹیلرڈ کے نام پر کیوں بولتے ہو۔
مارکوئس۔ ایسے بیہودہ سوالات کو رہنے دو۔ مجھے معلوم ہے۔ کہ تم ایسے نادان نہیں ہو کہ ہمارے مقتول بادشاہ کے عہد کو بھول گئے ہو۔ اور تم کو یہ یاد نہ رہا ہو۔ کہ اُمراء کس نام سے پکارے جاتے ہیں۔ جاؤ اور ایسے سوال اُن سے کرو۔ جو ان کا جواب دیں۔ اب میں ایک بات کا بھی جواب نہیں دُونگا۔
جج۔ مگر تمہیں سزا تو ضرور ملیگی۔
مارکوئس۔ میں بڑی خوشی سے تیار ہوں تم ہمارے ساتھ ہر ایک ظلم کر سکتے ہو۔ مگر ہمارے اصولوں کو نہیں بدل سکتے
جج۔ کیا کہا۔
مارکوئس۔ تم ہمارے اصولوں کو ہرگز ہرگز نہیں بدل سکتے۔
جج۔ لو سزا کے لئے تیار ہو جاؤ۔
جلّاد اشارہ پاتے ہی مارکوئس کا سر تن سے جدا کر دیتا ہے
(پردہ گرتا ہے)

افتخار الرسول بدر

غزل

نظرم در چمنے بر گل خنداں افتاد
بہوائش دل سوداز دہ ام شد برباد

چشم شوقم ہمہ وا بود بنظارۂ او
غنچۂ خاطرم از جلوۂ حسنش نہ کشاد

دستِ شوقم بسرش برد دلآویزی او
خواستم ساغرِ وصلش زکفِ خود نہ نہاد

چیدم از شاخ گل و بر زدمش سینۂ خود
خیلے بودم بہوا داری وصلش دلشاد

یادم آمد گہے از بوئے دلآویز کسے
مست بودم زغم و فکر دو عالم آزاد

گلِ خوش رنگ دلم بر دو ندانستم من
ہمہ نیرنگی ایں دانگہِ کون و فساد!

رفت خارے بدلم باگلِ خندانِ چمن
میرسد از دل خوں گشتہ ام اینک فریاد

گل رسیدہ لحزاں درد درونم باقی است
خلشے یابم و ایں نیست ہمہ بے بنیاد

سرِ عشق است بعالم نتواں افشا کرد
دولتِ خاص بہر کس نتواں نکہت داد

قربانی

(۱)

بڑا بازار وزیرآباد - ۳ نومبر ۱۹۱۵ء

پیارے امیر چند

تمہارا خط ملا - پڑھ کر فکر ہوا - یار میری مانو تو اب معاملہ جتنی جلدی ہو سکے طے کر ڈالو۔ یہ بات اب زیادہ دیر تک پوشیدہ نہیں رہیگی۔ آخر عشق اور مشک کہانتک چھپے رہ سکتے ہیں - اور مجھے اندیشہ ہے کہ اگر یہ بات باہر نکل گئی تو تمہاری اور اُس غریب لڑکی دونوں کی بدنامی ہوگی۔ پہلے تم دونوں چھوٹے تھے - اُس وقت کسی نے خیال نہیں کیا - مگر اب وُہ وقت گذر گیا۔ اس وقت تمہاری اپنی ہی نگاہیں راز فاش کر دینے کے لئے کافی ہیں - اس لئے بہتر یہی ہے - کہ تُم براہِ راست سنت رام سے ملو - اور اس کے روبرو تمام حالات بلا کم و کاست کہدو - وہ سمجھدار آدمی ہے کبھی انکار نہ کریگا - مگر اتنا یاد رکھو کہ اُس سے کوئی بات چھپانے کی ضرورت نہیں دیوکی کے متعلق اُسے صاف صاف معلوم ہو جانا چاہئے۔ کہ وہ تم سے بیحد محبت کرتی ہے - اور اُس نے عزم صمم کر رکھا ہے کہ اگر اُس کا بیاہ تم سے نہ ہوا - تو وہ خودکشی کرے گی میرے خیال میں اُسے اس بیاہ پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا صرف ایک بات ہے جس کا مجھے قدرے اندیشہ ہے - اور وہ یہ کہ سنت رام اب کچھ امیر ہو گیا ہے۔ مگر اتنا نہیں کہ تمہیں نفرت و حقارت سے دیکھنے لگے - علاوہ ازیں تمہارے باپ کے احسانات اُس پر ایسے نہیں کہ وہ گردن اُٹھا سکے - بہر حال میرا مشورہ یہی ہے - کہ اُسے ملو - اور اُس سے کھلے الفاظ میں گفتگو کرو۔

تمہاری بھابی اب بالکل تندرست ہے - تمہارا بیاہ دیکھنے کی اُسے بہت خواہش ہے - ممکن ہے آئندہ ماہ میرا تبادلہ گجرات ہو جائے

تمہارا صادق

وزیر چند

(۲)

پشاور چھاؤنی - ۱۰ نومبر ۱۹۱۵ء

میری پیاری دیوکی

مَیں آج یہاں ہوں اور دو چار دن میں یہاں سے بھی چلا جاؤنگا - کہاں جاؤنگا؟ یہ کہنا پیش از وقت ہے مگر اتنا کہہ دینا ضروری ہے - کہ جہاں رہونگا اور جس حالت میں رہونگا - تمہارا خیال دل پر بطور نقش رہیگا - اور انتہائی تاریکی کے لمحوں میں بھی تمہارا تصور روشن تارے کے مانند

میری رہنمائی کرتا رہیگا۔ سوچتا ہوں وہ دن کب آئیگا؟ جب میں تمہیں "اپنی دیوکی" کہہ سکونگا۔ اور دُنیا کی کسی مہذب زبان کو اس پر اعتراض کرنے کا حق نہ ہوگا۔

تمہارے باپ سے مجھے اس جواب کی ہرگز ہرگز توقع نہ تھی۔ کیسے ملنسار آدمی ہیں کسی نے اُن کے چہرے پر کبھی غصّہ کے آثار نہیں دیکھے۔ مگر اُس وقت وہ بیحد جوش میں تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برف کو گرمی آگئی ہو۔ کہنے لگے۔ تم کیا اپنے آپ کو دیوکی کے قابل سمجھتے ہو! دیوکی! تم سے کیا کہوں۔ یہ الفاظ سُن کر میں پانی پانی ہوگیا۔ مجھے اس بیہودگی کی توقع نہ تھی میں سمجھتا تھا۔ اُن سے کہہ دینا ہی کافی ہوگا۔ مگر اُن کا چہرہ گرم تانبے کے مانند سُرخ ہوگیا۔ میں نے جرأت کر کے جواب دیا۔ میں پوری پوری کوشش کروں گا۔ اور مجھے امید کامل ہے۔ کہ اُسے ہر قسم کا آرام بہم پہنچا سکونگا یہ سُنکر اُنہوں نے مُنہ پھیر لیا۔ اور کہا۔ میں امید موہوم کے خیال پر اپنی بیٹی کا مستقبل نثار نہیں کر سکتا۔ میرا منہ بند ہوگیا۔ لاجواب ہوکر میں نے سر جھکا لیا۔ اس وقت مجھے چاروں طرف مایوسی دکھائی دیتی تھی۔ یکایک تاریکی میں بجلی کوندی اور میں نے پھر سر اُوپر اُٹھایا۔ اور کہا۔ "مگر آپ اس کا بھی کچھ خیال کریں گے یا نہیں؟"

یاس امید کی شکل دیکھ رہی تھی۔

اُنہوں نے پوچھا۔ "اُس کا خیال؟ کس کا؟"

میں نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ "دیوکی کا"

آگ پر تیل پڑ گیا۔ اُنہوں نے اس طرح گردن بلند کی۔ جیسے کسی نے ناگ کو چھیڑ دیا ہو۔ اُس وقت اُن کا چہرہ تپا ہُوا تانبا تھا۔ آنکھیں سُرخ شعلے۔ گرج کر بولے "میں اُس سے بھی سمجھ لونگا"

دیوکی! یہ میرے پاس تاش کا آخری پتّہ تھا۔ اس پر مجھے بہت امید تھی۔ مگر تمہارے باپ کے جواب نے اُس پر پتھر مار دیا۔ امید کچلے ہوئے سانپ کی طرح بیٹھ گئی۔ میں نے ہارے ہوئے جواریے کی طرح بے شرمی سے کہا۔ "تو میرے لئے کوئی امید نہیں؟"

اس وقت میری آواز میں یاس کا لہجہ مِلا ہوا تھا۔

اُن کا غصّہ جاتا رہا۔ چہرے کا رنگ بحال ہوگیا۔ مسکرا کر بولے "اگر تم خود کچھ کر کے دکھاؤ۔ تو سب کچھ ہوسکتا ہے"

امید پھر سامنے کھڑی تھی۔ میں نے حوصلہ مندی سے پوچھا۔ "کیا کر کے دکھانا ہوگا؟"

"کچھ کما کے دکھاؤ۔ میں اپنی بیٹی تمہیں کیسے بیاہ دوں جبتک مجھے یقین نہ ہو جائے۔ کہ تم اپنے زورِ بازو سے اپنا اور اُس کا گذارہ کر سکو گے۔ تم نے ایف اے تک تعلیم پائی ہے۔ اس سے ہوتا کیا ہے؟ آج کل کے زمانہ میں تو بی۔ اے اور ایم۔ اے ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں"

میں نے پُر امید لہجہ میں پھر پُوچھا۔ "مجھے کتنی مہلت آپ

میتے ہیں؟"

"دو سال"

مَیں جوش سے تیر کے مانند تن کر کھڑا ہو گیا۔ اور یہ کہتا ہُوا باہر نکل آیا۔ کہ دو سال کے بعد آپ مجھے اس حالت میں نہ دیکھینگے"

دیوکی! اب مَیں یہ دو سال بہترین طور پر استعمال کرونگا اور ایک ایک لمحہ کو روپیہ پیسہ میں تبدیل کرنے کی کوشش کرونگا۔ مجھے کامیابی ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ بھگوان جانے۔ مگر تم سے اتنا کہنا ضروری ہے۔ کہ جب کبھی آرام سے اپنے کمرے میں بیٹھو۔ تو اس بدنصیب کا بھی خیال کر لیا کرو۔ جو تمہاری محبت حاصل کرنے کے لئے وطن سے بے وطن ہو کر دور دراز فاصلوں پر تندہی سے مزدوروں کے مانند محنت کرنے میں مصروف ہے۔

دیوکی! میرا فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ پرماتما سے پرارتھنا کرو کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو۔ اور مَیں تمہیں "اپنی دیوکی" اور تم مجھے "اپنا امیر" سمجھ سکو۔

مجھے خط لکھنے کی ضرورت نہیں۔ مَیں کب کہاں ہونگا۔ اس کے متعلق ہی تمہیں کیا بتاؤں۔ مَیں اس وقت تک خود کچھ نہیں جانتا۔

تمہارا پیارا

امیر چند

(۳)

محلہ پوریاں بٹالہ۔ ۳ جنوری ۱۹۱۶ء

برخوردار سنت رام

بعد برخورداری کے واضح ہو کہ اس جگہ سب خیریت ہے۔ آپ کی خیریت پرماتما سے نیک چاہتا ہوں۔ خط آپ کا ملا حال معلوم ہُوا۔ صورت حال یہ ہے کہ رائیصاحب مرجن مل صاحب بہت زور دے رہے ہیں۔ کہ بیاہ جلد سے جلد ہو جانا چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس اپریل میں اگر بیاہ نہ ہو گیا۔ تو اُنہیں بہت تکلیف ہوگی۔ آپ کو بھی خیال کرنا چاہیئے۔ کہ اُن کے چھوٹے چھوٹے لڑکے ہیں۔ عورت کے بغیر ایک ایک دن گذرنا مشکل ہے۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ بیاہ شادیوں کے معاملہ میں لوگ جھوٹی باتیں بہت مشہور کر دیا کرتے ہیں۔ اس لئے یہ کام جتنی جلدی ہو جائے اُتنا ہی اچھا ہے۔ رائیصاحب کی بہن نے عزیزی دیوکی کی بہت تعریف کی ہے۔ اور یہ گھر بھی بہت عمدہ ہے لڑکی ساری عمر راج کرتی رہیگی۔

جواب فوراً دینا سخت تاکید ہے۔

پرمیشوری داس

(۴)

محلہ قلعہ گجرات۔ ۲۰ جنوری ۱۹۱۶ء

پیارے امیر چند

کئی دن گذر گئے تمہارا کوئی خط نہیں ملا۔ فکر ہو رہا ہے۔ یار ذرا جلدی جلدی اپنی خیریت سے مطلع کرتے رہا کرو۔ اتنی دور بیٹھے ہو۔ چار دن خط نہ آئے تو جان نکل جاتی ہے۔ تمہارے جیسے آدمی کی جو اتنی محنت کر سکتا ہو۔ اسقدر کاہلی تعجب خیز ہے۔ کہ پندرہ پندرہ دن تک چپ سادھے رہتے ہو۔ تمہاری بھابی بھی تمہارے متعلق بہت فکر کرتی ہے۔

دیو کی ہر وقت تمہارے ہی خیال میں محو رہتی ہے۔ ہمارے ہاں اکثر آتی جاتی رہتی ہے۔ اُس کا جسم سوکھ کر کانٹا ہو گیا ہے۔ آنکھوں میں رونق نہیں رہی۔ ہر وقت روتی رہتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے برسوں سے بیمار ہے۔ مگر تمہاری بھابی کہتی ہے کہ تمہارا نام سُنکر اُس کا چہرہ گلاب کی طرح شگفتہ ہو جاتا ہے۔ یار! خوش قسمت ہو۔ آج کل کے زمانہ میں ایسی عورت ملنا آسان نہیں۔ وہ تمہاری پوجا کرتی ہے۔ اثنائے گفتگو میں جب کبھی تمہارا ذکر آ جاتا ہے۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اُس کے مردہ جسم میں جان آ گئی ہے۔ وہ دن رات تمہاری صحت و کامیابی کے لئے دُعائیں کرتی رہتی ہے۔ پرماتما وہ دن جلد لائے۔ جب تمہارے دونوں کے دل کی مراد پوری ہو۔

تمہارے کام کا کیا حال ہے۔ لالہ ہرنام داس کا نام میں نے اکثر سُنا ہے۔ کہتے ہیں بہت ہی نیک طبیعت آدمی ہے۔ اور اُس نے لکڑی کے کام میں لاکھوں روپے پیدا کئے ہیں۔ یار کوشش کر کے اُسے اپنی مٹھی میں کر لو پھر کامیابی یقینی ہے۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے۔ کہ تم کہیں جوش میں نہ آ جاؤ۔ اور اُس سے بگاڑ نہ لو۔ تمہاری طبیعت میں گرمی بہت ہے۔ تمہاری بھابی کی طرف سے آشیرواد۔ اور دیو کی کی طرف سے . . . . . .

تمہارا صادق
وزیر چند

(۵)

محلہ قلعہ گجرات۔ ۲۴ جنوری ۱۹۱۶ء

مکرمی لالہ پرشوری داس صاحب

تسلیم۔ نوازشنامہ جناب کا صادر ہوا۔ شکریہ۔ میں خود چاہتا ہوں کہ یہ کام جلد سے جلد ہو جائے۔ لیکن بعض وقت ایسی رکاوٹیں سامنے آ جاتی ہیں۔ جن کو راستے سے ہٹانا ناممکن ہو جاتا ہے۔ میری بُوا کی جوان لڑکی ساوتری کا کل انتقال ہو گیا ہے۔ جالندھر کے کنیا مہا ودیالہ میں پڑھتی تھی۔ اور نہایت ہی نیک تھی۔ اب ایسی حالت میں یہ مشکل ہے۔ کہ یہ بیاہ جلد ہو سکے۔ تاہم میں کوشش کرونگا۔ آپ اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی طرف دھیان دیں۔ تاکہ دیو کی اُس وقت کچھ گڑبڑ نہ کر دے۔

باقی رہ گیا سوال سگائی کا۔ میرے خیال میں اسکی قطعاً ضرورت نہیں۔ سگائی اور بیاہ ایک ہی ساتھ دے دینگے۔ دیگر خیریت۔

اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تکلف یاد فرمایئے گا۔

تابعدار ہوں۔ آپ کا تابع فرمان

سنت رام

(۶)

پنجاب ہوس بنوں - ۱۷- اپریل ۱۹۱۶ء

مائی ڈیر وزیر چند

کامیابی سامنے دکھائی دے رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے دیوی کی دعاؤں نے آخر اپنی تاثیر دکھائی ——— لالہ ہر نام داس اب بالکل میری مٹھی میں ہیں۔ اُنہیں مجھ پر پورا پورا اعتماد ہو گیا ہے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتے جس میں مجھ سے مشورہ نہ لے لیتے ہوں۔ تم یہ سُنکر خوش ہو گے۔ کہ اب اُنہوں نے میری تنخواہ دوسو روپیہ کر دی ہے۔ اور منافع میں ا/ حصّہ دینے کا اقرار کیا ہے۔ اس ایک آنہ حصّہ کے معنی قریباً چھ ہزار روپیہ سالانہ ہے۔

مگر اس حیرت انگیز کامیابی کا باعث کیا ہے؟

پچھلے دنوں لالہ جی کے ایک پرانے دوست رائے صاحب سرجن مل یہاں آئے ہوئے تھے۔ یہ صاحب بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے ہیں۔ اور بہت امیر ہیں۔ ان کے ساتھ ان کا بھائی بھی تھا۔

شام کا وقت تھا۔ رائے صاحب اور اُن کا چھوٹا بھائی دونوں سیر کے لئے تیار ہوئے۔ لالہ جی نے بہت منع کیا۔ مگر رائے صاحب نے پروا نہ کی۔ اور باہر چلے گئے۔ اُن کا خیال تھا کہ بہت دُور نہیں جائینگے۔ اور جلد لوٹ آئینگے۔ مگر جو قسمت میں لکھا ہو۔ اُسے کون مٹا سکتا ہے۔ رائے صاحب ابھی فصیل سے تھوڑی ہی دُور گئے تھے۔ کہ بندوق چلنے کی آواز سُنائی دی۔ رائے صاحب اور اُن کے بھائی کا خون خشک ہو گیا۔ اتنے میں چند یاغستانی سامنے آکھڑے ہوئے۔ رائے صاحب کا کلیجہ دہل گیا۔ شیر کو سامنے دیکھ کر جو حالت ہرن کی ہوتی ہے وہی حالت رائے صاحب کی ہو گئی۔ چہرے پر پسینہ کے قطرے نمودار ہوئے۔ موت کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ غرور نے گردن جھکا دی۔ منّتیں کرنے لگے۔ لیکن سرحدیوں پر اثر نہ ہوا۔ ایک نے آگے بڑھکر رائے صاحب کے سر پر بندوق کا دستہ مارا۔ رائے صاحب بیہوش ہو گئے۔ جب اُنہیں ہوش آیا تو وہ فصیل کے پاس کھڑے تھے۔ رات نصف کے قریب جا چکی تھی۔ اور اُن کے بھائی کا پتہ نہ تھا۔

دوسرے دن بنوں میں تھلکہ مچ گیا۔ لوگ رائے صاحب کو دیکھنے آتے تھے۔ گویا وہ کسی تارے کی مخلوق ہوں۔ ہمارے مکان پر میلہ لگ گیا۔ مگر رائے صاحب پاگل ہو رہے تھے۔ اُن کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ چہرے پر رنج و غم کے آثار رہ رہ کر کہتے تھے۔ پتہ نہیں بھائی کا کیا حال ہے۔ میں یہ دیکھتا تھا اور دل ہی دل میں کڑھتا تھا۔ آخر شام کے وقت پیغام آیا۔ کہ تین دن کے اندر اندر پچاس ہزار روپیہ

پہنچادو۔ ورنہ اُس کا سر کاٹ کر بھیجدیا جائیگا۔

لالہ صاحب امیر آدمی ہیں۔ وضعداری کے پُورے پابند۔ اُنھوں نے فیصلہ کیا۔ کہ روپیہ بھیجدیا جائے۔ مگر میں نے روک دیا۔ اور بندوق لیکر نکل کھڑا ہُوا۔ سارا شہر کہتا تھا اس کی عقل ماری گئی ہے۔ خود لالہ جی نے بھی کہا۔ تمہاری موت آگئی ہے۔ مگر میں نے سُنا ان سُنا کر دیا۔ اور اس طرح جوش کی حالت میں شہر سے باہر نکلا جس طرح بھرا ہُوا شیر پنجرے کا دروازہ کھُلنے پر شکار پر جھپٹتا ہے۔ چند آدمی میرے ساتھ آئے۔ اُن کا دل میرے لئے محسوس کرتا تھا۔ مگر باہر آکر اُن کے پاؤں میں زنجیر پڑگئی۔ جہان کا خوف جوش ہمدردی پر غالب آگیا تھا۔ جس طرح چاند کی روشنی بدلیوں میں آکر غائب سی ہو جاتی ہے۔ مگر میں جوش انہماک سے دیوانہ وار اُس سڑک پر چل رہا تھا۔ جس پر یہ واردات ہُوئی تھی۔

رات نصف سے زیادہ گذر گئی۔ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔ کوئی اور وقت ہوتا۔ تو میرے لئے ایک بھی قدم چلنا دشوار ہو جاتا۔ مگر اس وقت دل میں جوش تھا۔ سینہ میں گرمی۔ میری رفتار میں دریا کی روانی تھی۔ وزیر چند! میرے اس جوش دلاوری کی تہ میں دیوکی کا خیال کروٹیں لے رہا تھا۔ میں باربار سوچتا تھا۔ کہ اگر کامیاب ہوگیا تو لالہ ہرنام داس کے دل پر میرا خاص اثر ہوگا۔ اخبارات میں میری بہادری پر نوٹ شائع ہونگے۔ اور میری محبت کی کامیابی کا راستہ بہت حد تک صاف ہو جائیگا۔ میں آدمی ہوں فرشتہ نہیں ہوں۔ میں نے محض دوسرے کی خاطر اپنی جان جوکھوں میں ڈال دی ہو۔ یہ غلط ہے۔ میری محبت میری رہنما بن گئی تھی۔ وزیر چند! دُنیا کے عظیم ترین کارناموں میں حُسن و عشق کے جذبوں کو کتنا دخل ہے۔ یہ کون کہہ سکتا ہے؟

میں غیر علاقہ میں پہنچ گیا۔ امید کے ساتھ یاس لپٹی ہُوئی تھی۔ سوچتا تھا۔ اگر پکڑا گیا۔ تو مجھے بچانیوالا کون ہے؟ رائے صاحب تو امیر آدمی ہیں۔ اس پر لالہ ہرنام داس اُن کے دوست۔ اُن کے بھائی کے لئے تو تھیلیاں پہنچ جائنگی مگر میرے لئے کوئی سو روپیہ دینے کو بھی تیار نہ ہوگا۔ امید متزلزل ہو گئی۔ اُس فاصلے کا خیال کر کے جو میرے اور بتوں کے مابین حائل تھا۔ میرے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ جس طرح نادان بچہ بلندی پر سے زمین کی طرف دیکھ کر کانپ جاتا ہے۔ مگر اب خوف بیکار تھا۔ اور میری سلامتی کے لئے مہلک۔ حوصلہ سے آگے بڑھا۔ پیچھے دیکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ یکایک ایک وزیری سامنے آیا۔ میرا جسم کانپنے لگا۔ اُس نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ کر پوچھا۔

"تو کون ہے؟"

میں نے اپنے گرتے ہُوئے حوصلے کو بحال کر کے جواب دیا جو لڑکا کل پکڑا آیا ہے۔ اُس کے متعلق بات چیت

کس لئے آیا ہوں؟"

"تو تم سامنے کا مکان سے چلے جاؤ۔"

وزیری چلا گیا اُس کی روانگی سے میرے جسم میں جان آگئی۔ پچھلے پہر کا وقت تھا۔ چاروں طرف سناٹا چھایا ہُوا تھا۔ گو میرے دل میں طوفان بپا تھا۔ میں نے چند منٹ توقف کیا۔ جس طرح مجرم جرم سے پہلے پس و پیش کرتا ہے اور اس کے بعد آہستہ آہستہ اس مکان کی طرف روانہ ہُوا۔ پر امید بحر یاس میں ڈبکیاں کھا رہی تھی۔ یکا یک میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ امید کو سلامتی کا ساحل مل گیا۔ دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ اور گھر کے تمام آدمی خواب غفلت میں گم تھے۔ میں نہایت ہی احتیاط سے آگے بڑھا۔ سب سو رہے تھے۔ اور ایک طرف کونے میں رائے صاحب کا بھائی چارپائی سے جکڑا ہُوا تھا۔

وزیر چند! میری اُس وقت کی حالت کا اندازہ کرو۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھکر رائے صاحب کے بھائی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اور اُس کے بند کھولنے لگا۔ لیکن آنکھیں اُن سنتریوں کی طرف لگی ہُوئی تھیں۔ اُن کی بیداری اجل کی بیداری تھی۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وقت رُک گیا ہے۔ اور میرے ہاتھوں میں سکت نہیں رہی۔ بارے رائے صاحب کا بھائی آزاد ہُوا۔ اور ہم دونوں آہستہ آہستہ باہر نکلے۔ اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ہُوئے گاؤں سے روانہ ہُوتے۔

اس کے بعد ہم کس طرح دن کو کھیتوں، ویرانوں، کھنڈروں اور غاروں میں چھپ رہتے تھے۔ اور کس طرح رات کو تھوڑا تھوڑا سفر کرتے تھے کس طرح آخر نوٹی پہنچے۔ اور کس طرح لوگوں کو میری کامیابی پر حیرت ہُوئی۔ یہ تمام امور ایسے ہیں جن کے بیان کی ضرورت نہیں۔ جب ملنے کا اتفاق ہوگا۔ اُس وقت بالتفصیل بیان کرونگا۔ قصہ مختصر ہم بخیر پہنچ گئے۔ شہر میں شور مچ گیا۔ لوگ میری طرف حسن عقیدت سے دیکھتے تھے۔ گویا میں اُن کا معبود ہوں۔ اور آپس میں سرگوشیاں کرتے تھے۔ میں یہ دیکھتا تھا۔ اور دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا

دوسرے دن لالہ ہرنام داس نے مجھے اپنے پاس بُلایا اور کہا۔ تمہاری جانبازی سے میں بیحد متاثر ہُوا ہوں اس ماہ سے تمہاری تنخواہ دو سو روپیہ کر دی گئی ہے۔ نیز منافع میں ۱/۲ حصہ تمہارا ہوگا۔"

وزیر چند! میرے دل رنجیدہ پر سرور کا عالم طاری ہو گیا جس طرح گرمی کے دنوں میں آسمان پر اودی گھٹا چھا جاتی ہے ــــ اب مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ گویا دیوکی میرے بہت قریب ہے۔ اور میں اُسے ذرا سا ہاتھ پسار کر پکڑ سکتا ہوں۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو۔ کہ آجکل میں کس قدر مسرور و شاداں ہوں۔ یہ خط دیوکی کو دکھا دینا۔ دیکھکر خوش ہو جائیگی

تمہارا دور افتادہ بھائی

امیر چند

(۷)

پنجاب ہوسٹل بنوں - ۲۴ مئی ۱۹۱۶ء

مائی ڈیر وزیر چند

تمہارا خط ملا' پڑھ کر دل بیٹھ گیا۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ ایسا ہو سکیگا۔ مجھے دیوکی سے یہ امید نہ تھی۔ وہ مجھے چاہتی تھی۔ اُسے مجھ سے بیحد پیار تھا۔ جدا ہونے وقت مَیں نے اُس کے گالوں پر ہمیشہ آنسو بہتے دیکھے ہیں۔ اُس کی باتوں پر مجھے کبھی شبہ نہیں ہوا۔ آخری ملاقات میں اُس نے اپنے پیار کا اظہار ایسے پرزور الفاظ میں کیا تھا۔ کہ مَیں سناٹے میں آگیا۔ اُس نے کہا تھا مَیں تمہاری ہوں تم میرے ہو۔ اور ہم دونوں ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے۔ پرماتما نے ہمیں ایک دوسرے کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔ جو ہمارے راستے میں کھڑا ہو گا مسلا جائیگا۔ میں نے پوچھا کیوں دیوکی! اگر تمہارا باپ تمہارا بیاہ کسی اور شخص سے زبردستی کر دے۔ تو کیا کرو گی۔ وزیر چند! یہ سُنکر دیوکی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں تمتمانے لگیں۔ اُس نے ایک لمحہ کے لئے غور کیا۔ اور غصّہ میں آتی ہوئی ناگن کے مانند سر بلند کر کے جواب دیا۔ اگر ایسی نوبت آگئی۔ تو بیاہ سے پہلے ہی ہون کنڈ میں گر کر جل مروں گی۔ اُس کے یہ الفاظ ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ کسے خیال تھا۔ کہ وہی دیوکی ایک امیر آدمی کے ساتھ چپ چاپ بیاہ کرا لیگی۔ اور اس بدنصیب کا کوئی خیال نہ کریگی۔ جو صرف اس کو' اور اُس کی محبت کو حاصل کرنے کی خاطر اپنے آپ کو موت کے مُنہ میں دھکیلنے سے بھی دریغ نہیں کر رہا۔

لالہ سنت رام پر مجھے بیحد افسوس ہے۔ اُنہوں نے مرد ہو کر اپنی بات کا پاس نہیں کیا۔ مگر اس پر مجھے حیرت نہیں۔ مجھے حیرت دیوکی پر ہے۔ جس نے عورت ہو کر مجھے اس قدر بیوقوف بنائے رکھا۔ اور ثابت کر دیا کہ عورت کا اعتبار کرنا دُنیا میں بدترین قسم کی غلطی کرنا ہے۔ مگر وزیر چند! مجھے ابھی تک شک ہوتا ہے۔ کہ یہ خبر غلط ہے۔ خط تمہارے نام سے ہے۔ تمہارے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔ وہی قلم' وہی کاغذ' وہی سیاہی۔ آنکھیں پہچانتی ہیں۔ مگر دل کہتا ہے۔ نہیں دیوکی یہ نہیں کر سکتی۔ وہ مجھ سے یقیناً محبت کرتی تھی۔ تو اب یہ کیا ہو گیا۔ جب سے خط پڑھا ہے آنکھوں سے برابر آنسو جاری ہیں۔ دماغ میں آگ سی لگ گئی ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے۔ گویا مَیں پاگل ہو جاؤنگا۔

تمہارا بدنصیب دوست

امیر چند

(۸)

محلہ قلعہ گجرات، جون ۱۹۱۶ء

مکرمی لالہ پرمیشوری داس

تسلیم۔ بہت دن ہوئے آپ کا کوئی خط نہیں ملا کیا

وجہ ہے کہ عزیز سرجن لال کے متعلق بھی کوئی خبر موصول نہیں ہوئی۔ فکر ہو رہا ہے۔ کئی خط لکھ چکا ہوں۔ مگر کسی کا جواب نہیں ملا۔ مہربانی کر کے آپ فوراً جواب دیں کہ اُن کا کیا حال ہے۔ اور اُنہیں مل کر تاکیداً کہہ دیں کہ خط لکھنے میں اس قدر سستی نہ کیا کریں۔ میرا دل گھبرا جاتا ہے
دیوکی کا کیا حال ہے؟ غالباً اب وہ پہلے سی وحشی مزاج نہ رہی ہوگی۔ آپ مانیں یا نہ مانیں یہ علیحدہ بات ہے مگر مجھے یہ خیال ہمیشہ بے چین رکھے گا۔ کہ مَیں نے امیر چند سے دغا کی ہے۔ وہ میرے ہی کہنے پر اسقدر فاصلے پر وطن سے دُور چلا گیا۔ دیوکی اُسے چاہتی تھی۔ اور میرا دل کہتا ہے کہ اگر اُس کا بیاہ امیر چند سے ہو جاتا تو یقیناً اُس کی زندگی زیادہ منور، زیادہ شاداں، زیادہ آرام دہ ہو جاتی وہ اس بیاہ پر قطعاً رضامند نہ تھی۔ یہ تو کہو۔ ہماری چال چل گئی۔ ورنہ دیوکی تو بیاہ کے موقعہ پر کچھ کر گذرنے کو تیار تھی۔ جب اُس نے جعلی خط دیکھا۔ تو اُس کی محبت نے اُس سے سرکشی اختیار کر لی۔ اُسے یہ خیال تک نہ تھا۔ کہ امیر چند اس سے بیوفائی کریگا۔ وہ یکایک جوش میں آ گئی۔ اور اس وقت مَیں نے آگے بڑھکر اپنی پگڑی اُس کے پاؤں میں رکھ دی۔ گرم لوہے پر ہتھوڑا کام کر گیا۔ اور دیوکی رائے صاحب سے بیاہ کرنے پر رضامند ہو گئی۔ لیکن پھر بھی مجھے یقین ہے کہ بیاہ اُسی رات نہ ہو جاتا۔ تو دیوکی پھر انکار کر دیتی۔ اُس کے انتقام کے خیال نے ہماری مشکل آسان کر دی۔ ورنہ ہم کسی کو مُنہ دکھلانے کے قابل نہ رہتے پرماتما کا شکر ہے کہ دیوکی کو شبہ نہیں ہوا۔ ورنہ ......

مگر اس کے باوجود کہ اب مجھے اس قسم کی باتیں سوچنا بھی نہیں چاہیئے۔ میرے دماغ میں اکثر ایک خیال کروٹیں لیتا رہتا ہے۔ کہ مَیں نے گناہ کیا ہے اور باپ ہو کر باپ کا فرض پُورا نہیں کیا۔ سُنا ہے۔ امیر چند اقبال وحشمت کی منزلیں طے کر رہا ہے۔ اور اُس نے پردیس میں بہت سا روپیہ کما لیا ہے۔ جب یہ خبریں سُنتا ہوں۔ تو ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کسی نے منہ پر طمانچہ مار دیا ہے۔ خیال آتا ہے۔ جب وہ واپس آئیگا۔ تو کیا کہیگا؟

آپ کا تابع فرمان

سنت رام

(۹)

بٹالہ ۔ ۲ جولائی ۱۹۱۶ء

مائی ڈیئر لالہ ہرنام داس

یہ شادی کر کے مَیں نے عذاب سہیڑ لیا ہے۔ دن رات سوچتا رہتا ہوں۔ کہ کیسی حماقت کر بیٹھا۔ خوبصورتی دیکھ کر ریجھ گیا تھا۔ اب پچتا رہا ہوں۔ وہ خوبصورت ہے۔ اس سے مجھے انکار نہیں۔ وہ حلیم بھی ہے مَیں تسلیم کرتا ہوں۔ سلیقہ شعار بھی ہے۔ گھر کا انتظام اُس نے

سابق کی نسبت بہت عمدہ کر دیا ہے۔ اب گھر میں نوکر لوگ لوٹ نہیں مچا سکتے۔ وہ پیسہ پیسہ کا خیال رکھتی ہے میرے ساتھ اُس کا سلوک نہایت اچھا ہے۔ مجھے دیکھتی ہے۔ تو ادب سے کھڑی ہو جاتی ہے۔ میری ہر ایک خواہش کو اپنے لئے حکم سمجھتی ہے۔ اور اُسے پورا کرنا اپنی زندگی کا مقصد خیال کرتی ہے۔ مجھے اُس نے کبھی شکایت کا موقعہ نہیں دیا۔ رات کو اگر دیر سے گھر آؤں۔ تو جاگتی رہتی ہے۔ اور جبتک میں نہ آجاؤں۔ خواہ ساری ہی کیوں نہ گذر جائے۔ کبھی سونے کا خیال تک نہیں کرتی۔ یہ سب کچھ ہے مگر اُسے مجھ سے محبّت نہیں۔ اُس کی آنکھیں اُس کا چہرہ اُس کے اطوار برملا کہتے ہیں کہ دیوکی کے جسم پر میرا قبضہ ہے۔ مگر دل پر کوئی اور خیال حکومت کرتا ہے۔ اُس کے قریب جاتے ہوئے میرا دل کانپ جاتا ہے۔ میں اُس سے دُور رہنا چاہتا ہوں۔ گویا وہ خوبصورت ناگن ہے۔ اُس کے پاس بیٹھ کر میرے دل پر بوجھ پڑ جاتا ہے۔ اور طبیعت افسردہ ہو جاتی ہے۔ میں بیاہ کر کے تجرد کی زندگی بسر کر رہا ہوں۔ وہ میری عزّت کرتی ہے۔ اور میرے آرام و آسائش کا پُورا پُورا خیال رکھتی ہے۔ مگر بیاہی ہوئی زندگی کے لئے جو چیز آبِ حیات ہے۔ اُس سے ہم دونوں محروم ہیں۔ اُسے مجھ سے بالکل محبت نہیں۔ اُس نے کبھی مجھ سے کوئی چیز نہیں مانگی جو کچھ دیدیتا ہوں لے لیتی ہے۔ جو کچھ خرید لاتا ہوں ہنسکر لے لیتی ہے۔ میں چاہتا ہوں آہ میرے پیارے دوست میں نہیں کیا بتاؤں۔ کسقدر چاہتا ہوں۔ کہ وہ مجھ سے کچھ مانگے۔ مجھ سے لڑے، جھگڑے، مجھے تنگ کرے۔ لیکن وہ نہیں کرتی۔ میں ان باتوں کے لئے ترستا ہوں مجھے سب کچھ میسّر ہے۔ مگر میں پھر بھی بدقسمت ہوں۔ مجھے کچھ بھی میسّر نہیں۔ میں وہ مچھلی ہوں۔ جس کے اُوپر نیچے آگے پیچھے پانی ہو۔ مگر اُسے ایک قطرہ بھی پینے کی اجازت نہ ہو۔ اوہ۔ کیسی خوفناک اور بدترین قسم کی بدنصیبی ہے۔ ایک دن میں نے اُسے محبّت سے پکڑ لیا۔ اور کہا۔ دیوکی! تمہیں کیا رنج ہے۔ مجھ سے کہہ۔ میں اُسے ہر قیمت پر دُور کرنے کی کوشش کرونگا۔

دیوکی نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور چند لمحہ تک خاموش رہی۔ اس کے بعد سہم گئی۔ گویا کبوتری بلّی کے مُنہ میں پھنس گئی ہو۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اور اُس نے بزور اپنے آپ کو میری گرفت سے چھُڑا لیا۔ مجھ پر گھڑوں پانی پھر گیا۔ دیوکی نے آہستہ سے جواب دیا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں۔ مگر لہجہ کہہ رہا تھا کہ یہ غلط ہے۔ مجھے خیال آیا۔ کیا مجھ سا بدنصیب مرد بھی دُنیا میں ہوگا۔ جس کی بیوی بھی اُس کے سامنے اپنا دل نہیں کھولتی۔ پیارے دوست! یہ کیسا عذاب ہے

یہ کیسی آفت ہے۔ یہ کیسا جہنم ہے۔ کاش میں یہ بیاہ
نہ کرتا تو زیادہ آرام سے رہتا۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔
میرے لئے دُعا کرو کہ میری زندگی کی تاریک رات
میں بھی روشنی کا ظہور ہو۔ تمہارا بدنصیب دوست

سرجن لال

(۱۰)

مادھو باغ بمبئی۔ ۴۔ دسمبر ۱۹۱۶ء

مائی ڈیئر وزیر چند

متواتر سات ماہ سے گھوم رہا ہوں۔ ہردوار، رشی کیش
متھرا۔ برندابن۔ بنارس جگن ناتھ سب جگہ ہو آیا ہوں۔
مگر دل کو قرار نہیں رہا۔ طبیعت بدستور پریشان ہے۔
آنکھیں ہر وقت آنسوؤں سے بھری رہتی ہیں۔ میرے
لیکچروں کی ہندوستان میں دھوم مچ گئی ہے۔ جہاں
جاتا ہوں۔ پبلک راستے میں نگاہیں بچھا دیتی ہے۔
اخبارات میری تعریف سے بھرے رہتے ہیں۔ ابھی ایک
ہفتہ کے قریب ہُوا۔ لاہور کے روزانہ اخبار ٹریبون
نے میرے متعلق ایک زبردست لیڈنگ آرٹیکل لکھا
ہے۔ اُسے پڑھ کر تم خوشی سے اچھل پڑو گے۔ مگر مجھے
یہ باتیں بھی خوش نہیں کر سکتیں۔ جیسے بجھے ہوئے چراغ
کو تیل روشن نہیں کرتا۔

۲۷ نومبر کو میں بٹالے گیا۔ دل میں ایک خیال چٹکیاں
لے رہا تھا۔ شاید کہیں اُسے دیکھ سکوں۔ وزیر چند! مجھے
الزام نہ دو۔ مجھے ابھی تک اُس کا خیال ہے۔ اُس کا بیاہ
ہو چکا ہے، وہ پرائی ملکیت بن چکی ہے۔ سوسائٹی اور
اس کے قوانین کی نگاہوں میں میرا اُس سے کوئی تعلق نہیں۔
مگر محبت کی رو سے وہ اب بھی میری ہے۔ میں نے سوچا
اگر اُسے دُور سے دیکھ سکوں۔ تو کیا ہرج ہے۔ میں بٹالے
پہنچا۔ اسٹیشن پر خلقت کا ہجوم تھا۔ لوگ مجھ پر اس طرح ٹوٹتے
تھے۔ جیسے بچے مٹھائی پر۔ میں نے پروفیسر رام مورتی کے
جلوس دیکھے ہیں۔ میں نے پنڈت مالویہ کے پروسیشن دیکھے
ہیں۔ مگر جو رونق میرے خیر مقدم میں تھی ویسی میں نے کبھی
نہیں دیکھی۔ پلیٹ فارم پر سر ہی سر دکھائی دیتے تھے۔
گاڑی اسٹیشن پر پہنچتے ہی لوگوں نے زور سے نعرہ لگایا۔
سوامی سنتوشانند کی جے۔ میرا دل ایک لمحہ کے لئے خوش
ہو گیا۔ مگر یکایک دیوکی کے خیال نے رنجیدہ کر دیا۔
ایک لمحہ پہلے کی خوشی کہاں گئی۔ یہ پتہ نہ لگا۔ جس طرح چاند
پر کالی گھٹا آ جانے سے اس کی کرنیں دکھائی دینا بند
ہو جاتی ہیں۔

گاڑی کھڑی ہوئی میں نے کمنڈل اور کمل سنبھالا اور
نیچے اُترا۔ ہندو سبھا کے اراکین نے میرے قدموں میں
سر رکھ دیا۔ میں نے سب کو آشیرباد دیا۔ اور باہر نکلا۔
جو آدمی پلیٹ فارم پر نہیں جا سکے تھے۔ وہ باہر کھڑے

تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اُنھوں نے نعرہ لگایا۔ سوامی سنتوشانند کی جے۔

یکایک میری نگاہ رائےصاحب سرجن مل پر پڑی۔ مجھے سکتہ سا ہو گیا۔ وہ جوشِ بیتابانہ سے آگے بڑھے۔ اور میرے پیروں سے لپٹ گئے۔ جذبۂ شکرگذاری نے عقیدت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ وزیر چند! مَیں سادھو ہوں۔ میری زبان اور دل میں فرق نہ ہونا چاہیئے۔ اُس وقت میرا خون گرم تیل کے مانند کھول رہا تھا۔ میرا دل اُس سے نفرت کرتا تھا۔ کبھی مَیں نے اُس کے بھائی کو موت کے مُنہ سے کھینچکر نکالا تھا۔ مگر اب موقعہ ملتا تو خود رائےصاحب سرجن مل کو گولی مار دیتا۔ تاہم مَیں نے مُسکرا کر کہا۔ "آہا! رائے صاحب ہیں۔ کہیئے مزاج تو اچھے ہیں؟"

رائےصاحب نے گردن جُھکا کر جواب دیا۔ "آپ کی نظرِ عنایت سے۔ مگر میری آپ سے ایک درخواست ہے"

مَیں نے قدرے حیرت سے پُوچھا۔ "کہیئے! کیا حکم ہے؟"

اس وقت میرے دل میں جذبات کا ہجوم برپا تھا۔ کیا رائےصاحب مجھے اپنے ہاں ٹھیرنے کے لئے نہ کہینگے مگر ساتھ ہی یہ بھی خیال آتا تھا۔ کہ مَیں ہندو سبھا کا مہمان ہوں۔ پتہ نہیں۔ اُنھوں نے کیا انتظام کیا ہے؟ یاس امید کے پہلو میں کھڑی تھی۔

رائےصاحب نے لجاجت سے کہا۔ "آپ میرے ہاں ٹھیریئے گا"

امید یقین بن گئی۔ میرا دل خوشی سے ہچکورے لینے لگا مَیں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "سادھو جہاں ٹھیرے گا کچھ تکلیف ہی دیگا"

"مجھے اس تکلیف ہی کی خواہش ہے۔ آپ منظور فرمالیں۔"

"بہت اچھا"

مَیں موٹر میں سوار ہُوا۔ لڑکے بھجن گا رہے تھے۔ آگے آگے بینڈ بج رہا تھا۔ لوگ مجھ پر پھول برسا رہے تھے۔ میرا جلوس نکلا۔ بازاروں میں مرد تھے چھتوں پر عورتیں ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا مَیں بادشاہ ہوں۔ اور لوگ میری رعایا ہیں۔ کوئی اور وقت ہوتا تو مَیں خوشی سے دیوانہ ہو جاتا۔ مگر اس وقت مجھے مطلقاً خوشی نہ تھی۔ ناکامیِ محبّت کا خیال مجھے پژمردہ کر رہا تھا۔ یہ جلوس میرے لئے مَیّت تھی موٹر ارتھی۔ میرا دل خون کے آنسو بہا رہا تھا۔ بارے جلوس ختم ہُوا اور موٹر رائےصاحب کی کوٹھی پر رُکا۔ میرا دم لبوں تک آ گیا۔ جس طرح تھرڈ کلاس کے مسافر زیادہ آدمی ہونے سے گھبرا جاتے ہیں۔ میری آنکھیں کسی کو تلاش کرنے لگیں۔ مگر وہ نہ دکھائی دی۔ مجھے ایک پُرتکلّف کمرے میں ٹھیرایا گیا۔

شام کا وقت تھا۔ میں بیٹھا ہوا گیتا کا پاٹھ کر رہا تھا۔ اتنے میں کسی کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میرے دل میں ہلچل مچ گئی۔ کیا یہ وہی ہے۔ سوچنے لگا۔ جس آرزو کے لئے کئی ماہ سے تڑپ رہا تھا۔ کیا وہ بر آنیکا وقت آگیا۔ چک اُٹھی۔ میرا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ یکایک سردی کی شام کو چہرے پر پسینے کے قطرے نمودار ہوئے ۔۔۔ یہ دیوکی تھی۔ اُس نے مجھے دیکھا تو ٹھٹک گئی۔ جیسے رات میں چور دیکھ لیا ہو۔ اُس کے چہرے پر سُرخی دوڑ گئی۔ کان تک لال ہو گئے۔ وہ سادھو کے خیال میں آئی تھی۔ مگر لڑکے میں نظر آیا۔ وہ بجلی کی سی تیزی سے مڑی۔ عقیدت نفرت میں بدل گئی۔ یکایک میں نے کہا۔ "دیوکی!"

میری آواز میں محبت اور منت کے عنصر ملے ہوئے تھے۔ وہ دیوکی کے پاؤں کی زنجیر بن گئے۔ وہ جاتے جاتے رُک گئی۔ اور سر جھکا کر کھڑی ہو گئی۔ اُس کی زبان بند تھی مگر جسم کانپ رہا تھا۔ جیسے شدت کا بخار چڑھ رہا ہو۔ میں اُس کے مُنہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اور اپنے گذرے ہوئے دنوں کو یاد کر رہا تھا۔

کچھ دیر تک دیوکی اُس طرح کھڑی رہی مگر یکایک چونک اُٹھی۔ گویا مٹی کے بُت میں جان آگئی ہو۔ میں نے کہا۔ "دیوکی! میں نے سادھو کا لباس پہن لیا ہے۔ مگر میرا دل اب تک وہی ہے۔ میں تم سے ایک شکوہ کرنا چاہتا ہوں کیا تمہارے پاس سننے کے لئے وقت ہے۔"

دیوکی کے چہرے پر ڈوبتے ہوئے سورج کی سُرخی چھا گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے دل میں غصہ کی آگ جل رہی ہے۔ چہرہ کی سُرخی اس آگ کے شعلے تھے۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔ "کہو کیا کہتے ہو؟"

میری خاموشی میری شکایت ہے تم جواب دو۔"

دیوکی سے اب ضبط نہ ہو سکا۔ اُس نے کڑک کر جواب دیا۔ "کاہے کا جواب دوں۔"

"اپنی اس حرکت کا" میرا اشارہ اس کے بیاہ کی طرف تھا۔

"تم اپنے آپ کو اس سوال کا حقدار سمجھتے ہو؟"

"کامل طور پر"

دیوکی نے اپنی جیب سے ایک پرانا خط نکالکر میرے سامنے رکھ دیا۔ اور کہا۔ "اسے دیکھ کر بھی"

میں نے تعجب سے خط پڑھا۔ میری حیرت کا ٹھکانا نہ تھا۔ وزیر چند! یہ خط ہنوں کے کسی ٹیک چند کی طرف سے گجرات کے کسی جمناداس کے نام تھا۔ میں ان دونوں سے ناواقف ہوں۔ مگر خط کا مضمون میرے ہی متعلق تھا اس میں لکھا تھا کہ گجرات کا ایک نوجوان امیر چند یہاں آیا ہوا تھا۔ اُسے ہم نے (ٹیک چند سے مراد ہے) اپنی لڑکی سے بیاہ کے لئے پسند کیا ہے۔ امیر چند نے اوّل اوّل انکار کیا۔ مگر اب روپے کے لالچ سے مان گیا ہے۔

یہ خط پڑھ کر میری جان نکل گئی۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ دیوکی نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا "اب بھی کیا اپنا وہی سوال دُھراتے ہو؟"

مَیں نے اپنے گرتے ہوئے حوصلے کو استوار کرتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں مَیں اب بھی اپنے آپ کو وہی سوال دوہرانے کا مستحق سمجھتا ہوں۔"

دیوکی نے حیرت سے کہا۔ "اور یہ خط؟"

"معلوم ہوتا ہے تمہارے باپ کا دھوکا ہے۔"

دیوکی کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اس کا عضو عضو کانپ رہا تھا۔ اُس نے پُوچھا۔ "تو تمہارا بیاہ نہیں ہُوا؟"

"بالکل نہیں"

"اور اب سادھو کیوں ہُوئے ہو؟"

"اور کیا کرتا؟"

دیوکی کھڑی تھی۔ یہ سُنکر بیٹھ گئی۔ اور دونوں ہاتھوں سے مُنہ چھپا کر رونے لگی۔ اب مجھ پر اور اُس پر اصل حقیقت کا انکشاف ہُوا۔ دونوں کے رنج وغم کی تھاہ نہ تھی۔

رات کو میرا لیکچر ہُوا۔ مَیں نے کلیجہ نکال کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ اور بیاہ کی بُرائیوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ مَیں سات ماہ سے لیکچر دے رہا ہوں۔ مگر اُس رات کے لیکچر میں جادو تھا۔ حاضرین کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اور عورتیں تو زار زار رو رہی تھیں۔ مگر اس لیکچر کا سب سے زیادہ اثر رائے صاحب اور دیوکی پر ہُوا۔ دونوں کے چہرے کا رنگ اُڑا ہُوا تھا۔ دوسرے دن معلوم ہُوا کہ دیوکی نے ساڑی پر تیل چھڑک کر کپڑوں کو آگ لگالی ہے۔ مجھ پر پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ جی چاہتا تھا۔ کہ اُس کے ساتھ ہی جل مروں۔ مگر پھر یہ خیال روکتا تھا۔ کہ اس سے دیوکی بدنام ہو جائیگی۔ لوگ سرگوشیاں کریں گے۔ اُس نے بیاہ کر کے بھی محبّت کی آن کو نبھایا۔ کیا مَیں اُس کی موت کے بعد اُس کی مٹی خراب کرونگا۔

وزیر چند! اب دُنیا تیرہ و تار ہو گئی ہے۔ پہلے سوچتا تھا۔ کہ دیوکی میری نہیں۔ نہ سہی۔ مگر زندہ تو ہے۔ پر اب یہ بات بھی نہیں رہی۔ اب زندہ رہ کر کیا کرونگا۔ یہ میرا آخری خط ہے۔ کل کے اخبار میں میری موت کی خبر پڑھو تو حیران نہ ہونا۔ دیوکی میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ مَیں اُسے زیادہ پریشان نہیں کرنا چاہتا۔

تمہارا چند گھڑی کا مہمان

امیر چند

(۱۱)

مادھو باغ بمبئی۔ ۵ دسمبر ۱۹۱۶ء

مائی ڈیر لالہ ہرنام داس

مَیں آج ہی یہاں پُہنچا ہوں۔ اور آتے ہی یہ خبر سُنی ہے۔ کہ سوامی سنتوشانند بھی مر گئے ہیں۔ اُنہوں نے زہر

کھالیا ہے۔ جب سے میں نے اُن کی اور دیوی کی گفتگو چھپ کر سُنی تھی۔ تبھی سے میں حیران ہو رہا تھا۔ کہ اب کیا ہوگا۔ یہ موت اس ناٹک کا آخری ڈراپ ہے۔

دیوی کی حیرت انگیز، اداسی اور خاموشی کا راز اب معلوم ہوا ہے۔ اور میری نگاہوں میں اُس کی عزت کئی گنا زیادہ ہو گئی ہے۔ وہ امیر چند سے محبت کرتی تھی۔ اُس کا دل اُسے چاہتا تھا۔ مگر اس کے باوجود اُس نے میری دلدہی کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور اپنی محبت کو اندر ہی اندر دبا رکھا۔ مگر جب اُس پر باپ کی کمینہ حرکت کا راز کھلا۔ تو اُس نے خودکشی کر لی۔

کاش سنت رام سوچتا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کاش اُسے خیال آتا کہ دنیا میں دولت ہی سب کچھ نہیں۔ تو یہ رنجدہ اموات واقع نہ ہوتیں۔ اور ہماری قوم ان دو قیمتی زندگیوں سے اس طرح محروم نہ ہوتی۔

تمہارا بدنصیب دوست

سرجن مل



آخری لمحہ

اب میرے جانے کا وقت ہے۔ امّاں اب میں جاتا ہوں

جب رات کی گہری تاریکی میں تم اپنے بچے کے لئے چارپائی پر بازو پھیلاؤ گی تو کہونگا ’’بچہ وہاں نہیں ہے۔ امّاں اب میں جاتا ہوں‘‘۔

میں ہوا کا لطیف جھونکا بن کر تمہارے بدن سے مس کرتا ہوا جاؤنگا۔ اُس تالاب میں جہاں تم نہاؤ گی میں چھوٹی چھوٹی لہریں بن کر تم کو بار بار چومونگا۔

طوفانی رات میں جب مینہ کی بوندیں پتوں پر زور سے پڑتی ہوں۔ تم اپنے بستر پر میری سرگوشیاں سُنو گی اور میری ہستی بجلی کے ساتھ کھلے ہوئے دریچے کے راستے تمہارے کمرے میں چمک جائیگی۔

اگر تم اپنے بچے کے خیالات میں محو بہت رات تک جاگتی رہوگی۔ تو میں ستاروں کے ساتھ ملکر یہ گیت گاؤنگا۔

’’سوجا پیاری امّاں سوجا‘‘

چاند کی بے ترتیب کرنوں کے ساتھ ملکر میں تمہارے بستر میں آکر تمہارے سینے سے لپٹ جاؤنگا اور تم سو رہی ہوگی۔

میں خواب بن کر تمہاری نیم وا آنکھوں کے راستے تمہاری نیند کی گہرائیوں میں اُتر جاؤنگا۔ اور جب تم بیدار

ہوکر حیرت کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھوگی تو میں چمکتے ہوتے جگنو کی طرح تاریکی میں اُڑ جاؤنگا۔

جب "پوجا" کے تیوہار پر اردگرد کے بچّے گھر کے آس پاس کھیلیں گے تو بانسری کی کوک میں نبدیل ہوکر تمام دن تیرے دل کو تڑپاتا رہونگا۔

خالہ جان "پوجا" کے تحائف لیکر آئیگی۔ تو پوچھیگی "بہن! بھلا بچّہ کہاں ہے؟ امّاں! پھر تم نہایت آہستگی کے ساتھ کہوگی "وہ میری آنکھوں کے تل میں بیٹھا ہے، وہ میرے جسم اور میری روح میں ہے"

ٹیگور — مترجمہ از (دی کریسنٹ مون) — اثر صہبائی

بادل اور موج

امّاں! آسمان کے رہنے والے فرشتے مجھ سے کہتے ہیں۔ جاگنے کے وقت سے دن کے ختم ہونے تک ہم سب صبح کی سنہری روشنی اور نقرئی چاند سے کھیلتے ہیں میں اُن سے دریافت کرتا ہوں۔ "میں تم تک کس طرح پہنچوں"۔ وہ کہتے ہیں کہ اس دُنیا کے کنارے آجاؤ۔ اپنے ہاتھ آسمان کی جانب بلند کرلو۔ ہم تم کو بادلوں میں اُٹھا لینگے۔ میں کہتا ہوں۔ میری ماں گھر میں میرا انتظار کر رہی ہوگی۔ میں اُس کو اکیلا چھوڑ کر کیسے آسکتا ہوں۔ . . .

وہ ہنستے ہیں اور گم ہو جاتے ہیں۔

لیکن امّاں! میں اس سے اچھّا کھیل جانتا ہوں۔ "میں بادل بن جاؤنگا۔ اور تم چاند" میں تم کو اپنے دونوں ہاتھوں سے چھپالونگا۔ اور ہمارے مکان کی چھت آسمان کا کام دیگی۔

موجوں میں رہنے والی پریاں مجھ سے کہتی ہیں۔ ہم دن رات پیارے پیارے گیت گاتی ہیں"۔ میں دریافت کرتا ہوں۔ کہ میں تمہارے گروہ میں کس طرح شامل ہوسکتا ہوں؟ وہ کہتی ہیں کہ ساحلِ سمندر تک آجاؤ اپنی آنکھیں بند کرکے کھڑے ہوجاؤ۔ ہم تم کو اُوپر اُٹھا لینگے . . . . . . میں کہتا ہوں میری پیاری امّاں شام کو میرا انتظار کریگی۔ میں اُس کو اکیلا چھوڑ کر کیسے آسکتا ہوں . . . . . وہ ہنستی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔

لیکن امّاں! میں اُن سے بہتر کھیل جانتا ہوں۔ میں موجیں بن جاؤنگا اور تم ساحل!

میں تمہاری گود میں آکر ہنسونگا اور کوئی بھی معلوم نہ کرسکیگا کہ ہم کہاں ہیں۔

(دی کریسنٹ مون۔ ترجمہ ٹیگور) افتخار الرسول بدر

حسینۂ مصر

ایک سائنسدان نے جو علوم مصریہ کا مشہور ماہر تھا اپنے رفیق انگریز رئیس سے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ وادی بیبان الملوک میں ایک ایسی قبر ملیگی۔ جسے آجتک کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔"

نوجوان انگریز رئیس نے جواب دیا۔ "خدا آپ کی مدد کرے۔ اس میں بہتوں کو دھوکا ہوتا ہے۔ کیونکہ ان خزانوں کے شکاری ہمیشہ پہلے ہی مال اُڑا لے جاتے ہیں۔"

سائنسدان "یہ ایسی قبر ہوگی۔ جسے مصریوں یا یونانیوں یا رومیوں یا عربوں نے ابھی تک نہیں تاراج کیا۔ اور ہمارے سامنے اس کے تمام خفیہ خزانے بجنسہ موجود ہونگے۔"

انگریز رئیس "اور اس پر تم ایک زبردست کتاب لکھو گے جو تمہیں شامپولین، روزلینی، ولکنسن، لیپسیوس اور بلزونی کا ہم پایہ بنا دیگی؟"

سائنسدان "میں اس کتاب کو حضور ہی کے نام نامی سے معنون کرونگا۔ کیونکہ بغیر حضور کی بندہ نوازی کے میں آثار قدیمہ کو دیکھ کر اپنے اصول کی جانچ نہ کرسکتا۔ اور اس قدیم مُلک کے عجائبات پر غور کئے بغیر اپنے چھوٹے سے جرمن گاؤں میں گمنام و نشان مرگیا ہوتا۔"

یہ سائنسدان ایک جرمن ڈاکٹر تھا۔ جو اس نوجوان رئیس کی رفاقت کر رہا تھا۔ اس کا نام ڈاکٹر مفیس تھا۔ اور رئیس کا نام لارڈ ایوانڈیل تھا۔ یہ گفتگو دریائے نیل کے قریب وادی بیبان الملوک دہانہ پر ہوئی تھی۔ لارڈ ایوانڈیل ایک عربی النسل گھوڑی پر سوار تھے۔ اور ان کا رفیق خچر پر تھا۔

جس جہاز پر یہ لوگ آئے تھے۔ وہ لکسر کے سامنے دریا کے دوسرے کنارے پر لنگر انداز تھا۔ اور اس کے بادبان لپیٹ لئے گئے تھے۔ اسی جہاز پر ان سب کا قیام بھی رہتا تھا۔ کئی دن تک تو یہ لوگ ثیبہ (مصر کا قدیم نام) کے حیرت انگیز کھنڈرات دیکھتے رہے۔ جو ایک عظیم الشان شہر کے آثار تھے۔ اس کے بعد اُنہوں نے دریا کو عبور کیا۔ اور اُس خُشک سرزمین کی طرف رُخ کیا جس میں دریا کے اس پار والے عظیم الشان محلوں کے قدیم باشندے اپنی اپنی قبروں میں آرام کر رہے تھے۔ کچھ لوگ تو رئیس موصوف اور ڈاکٹر کے ساتھ ہو لئے اور باقیماندہ جہاز کے سایہ میں اطمینان کے ساتھ سگرٹ نوشی کرتے رہے۔

لارڈ ایوانڈیل اُن نوجوان انگریزوں میں سے تھے۔ جن کا طرز معاشرت بظاہر بالکل بے داغ تھا۔ یہ اعلیٰ انگریزی

طبقہ کی معاشرت کی نہایت ہی عمدہ مثال تھے۔ ان میں وہ خودداری بھی تھی۔ جو ایک بہت بڑی موروثی جائداد کے مالک ہونے اور روسائے انگلستان کی فہرست میں نام ہونے سے پیدا ہوتی ہے۔ وجاہت ظاہری میں مشکل کوئی اُن کا کوئی ہم پلہ ہوگا۔ اور پیشانی اور چہرے کے خطوط افسانوں کے حسن کی یاد دلاتے تھے۔ ابروؤں اور رخساروں کا صاف رنگ مصنوعی معلوم ہوتا تھا۔ جس پر کاسمیٹک لگا ہوا تھا۔ ان کے بال نہایت خوبصورت اور گھونگر والے تھے۔ حجام یا خدمتگار کے ہاتھ لگانے کی ضرورت نہ تھی۔

تاہم ان کی نیلگوں نگاہوں کے استقلال اور لبوں کی خوددارانہ جنبش اُن اثرات کو زائل کر دیتی تھی۔ جو بظاہر اُن کی نسوانی ساخت سے لوگوں پر پڑتا تھا۔ یہ انجمن جہازرانی کے ممبر تھے۔ اور وقتاً فوقتاً اپنے ہلکے جہاز پک پریوں ہی سفر کرلیا کرتے تھے۔ جہاز میں آسائش کا تمام سامان موجود ہوتا تھا۔ اور چند منتخب جہازران اس پر مامور تھے۔ پچھلے سال اُنہوں نے مصر کا سفر کیا اور انکا جہاز اسکندریہ میں ان کا منتظر تھا۔ ایک سائنسدان، ایک ڈاکٹر، ایک طبیعاتی، ایک نقشہ کش اور ایک مصور بھی ان کے ساتھ تھا۔ تاکہ یہ سفر فائدہ سے خالی نہ رہے۔ یہ خود بھی اچھا خاصہ علم رکھتے تھے۔ اور اپنے عروج کی وجہ سے کیمبرج کی اعلےٰ تعلیم کو نہیں بھولتے تھے۔ اس وقت یہ نہایت ہی فیشن ایبل لباس پہنے ہوئے تھے۔ جو انگریزوں کا خاصہ ہے۔ کیونکہ صحرا کی خاک اور ساحل سمندر کی ریگ یا شہر کے محلات میں انگریز اپنے لباس کا یکساں خیال رکھتے ہیں۔

اس وقت ان کے کپڑے خاصکر سفید تھے۔ کیونکہ دھوپ سخت پڑ رہی تھی۔ ان کے سر پر ایک نہایت خوبصورت انگریزی ٹوپی تھی۔ جس پر سبز مخمل کی پگڑی لپٹی ہوئی تھی۔ رفیق ماہر مصریات باوجود گرمی کے ایک سائنس دان کی طرح سیاہ لباس پہنے ہوئے تھا۔ اور اس کے داہنے پائنچے پر قلم صاف کرنے کا نشان بہت ہی صاف صاف نظر آتا تھا۔ اس کا کالر بے تکے پن سے اس کے اُبھرے ہوئے نرخرے پر بندھا ہوا تھا۔ اور تمام وضع قطع سے خالص سائنٹیفک لاپرواہی نمایاں تھی۔ اور وجاہت ظاہری کا تو پتہ ہی نہ تھا۔ چند سرخی مائل بال اُس کے بڑے بڑے کانوں کے پیچھے اُڑ رہے تھے۔ اس کا چاند کھلا ہوا تھا۔ اور ناک لمبی تھی۔ اس کی ساخت سارس کی طرح سے تھی۔ اور چونکہ قدیم مصر میں سارس نہایت ہی مقدس سمجھا جاتا تھا۔ اس لئے مصری کتبوں کے پڑھنے والے کے لئے یہ تشبیہ بہت ہی مناسب ہے۔

رئیس اور ڈاکٹر یہ گفتگو کرتے ہوئے وادی میان الملوک کے اُن ٹیلوں کی طرف جا رہے تھے جن میں قدیم مصر کے شاہی خاندانوں کے مدفن تھے۔ کہ اتنے میں ایک شخص ایک

مقبرہ کے تاریک دروازہ سے نکلتا ہُوا نظر آیا۔ اور انہیں سلام کیا۔ یہ ایک یونانی سوداگر تھا۔ جو مصر کی قدیم چیزوں کی تجارت کیا کرتا تھا۔ اور جب کوئی قدیم چیز نہیں ملتی تھی تو نئی بنا لیا کرتا تھا۔ اس کی وضع قطع میں کوئی بات ایسی نہ تھی جس سے اس پر مسافروں کو ستانے والے ڈاکو کا گمان ہو سکے۔ یہ ایک سرخ ٹوپی پہنے تھا۔ اور اس کی حجامت تازی بنی ہُوئی تھی۔ اس کا گندمی چہرا سیاہ ابرو خونخوار آنکھیں اور بڑی بڑی مونچھیں یہ سب باتیں ڈاکوؤں کے مشابہ تھیں لیکن محض ایک سفلہ پن کی مسکراہٹ ان تمام باتوں کو پوشیدہ کئے ہوئے تھی۔ اس یونانی نے جہاں کو بغور دیکھا تھا اور اس بات کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ اسکے مالک سے کچھ اینٹھنا چاہیئے۔ اس لئے وہ وقت کا منتظر بیٹھا ہُوا تھا۔ اور مقابر کی تمام اراضی کو اپنی جاگیر سمجھے ہوئے تھا۔ اور جو شخص اس میں مخل ہوتا تھا۔ اُسے نکال باہر کرتا تھا۔ یونانی تاجروں کی نظری ہوشیاری کیساتھ اُس نے پہلی ہی نظر میں لارڈ ایوانڈیل کی دولت کا اندازہ کر لیا تھا۔

اس نے اس معزز انگریز کو اُن مقابر کی سیر کرنے کا خیال ترک کر دیا۔ جو سینکڑوں بار کھودی جا چکی تھیں اُس نے خیال کیا کہ اس وقت اس کا موقعہ نہیں ہے۔ کہ ایسے مقامات میں اُلجھا جائے۔ جہاں سے کچھ بھی نہ حاصل ہو اور جہاں وہ خود ہی مُدتوں پہلے صفائی کر چکا ہو۔ اور بڑی بڑی قیمتیں حاصل کر چکا ہو۔ آرگراپولوس نے (یہ اس یونانی کا نام تھا) اس وادی میں چکّر لگاتے ہوئے ایک ایسے مقام کا راستہ دریافت کیا تھا۔ جہاں آج تک کوئی اور نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس راز کو اُس نے دو برس تک مقابر کے لوٹنے والوں سے محفوظ رکھا۔ اور اب وہ لارڈ ایوانڈیل کے پاس آیا۔ اور ایک قسم کی مرکب زبان میں کہا۔

"کیا حضور کچھ تحقیقات کا ارادہ رکھتے ہیں اگر ایسا ہے تو میں سو فلاحین مہیا کر سکتا ہوں۔ جو اپنے ناخن سے زمین کی تہ تک کھود سکتے ہیں۔ ہم آپ کے سامنے قربانگاہ یا قبر یا مورت نکالکر رکھ سکتے ہیں۔"

رئیس یہ سُنکر بالکل خاموش رہا۔ اور اُس کا رفیق مشکوک نگاہوں سے دیکھکر مسکرانے لگا۔ آرگراپولوس فوراً سمجھ گیا۔ کہ وہ احمقوں کیساتھ معاملت نہیں کر رہا ہے اور اُسے یقین ہو گیا۔ کہ اب سب سے بہتر یہ ہوگا۔ کہ اپنی عظیم الشان تحقیقات کو ان لوگوں کے ہاتھ معقول رقم پر بیچ لے۔ چنانچہ وہ یہی سوچ سوچ کر خیالی پلاؤ پکانے لگا۔ اور اپنی آمدنی اور اپنی لڑکی کی شادی کے منصوبے باندھنے لگا۔

اور اپنے سلسلہ تقریر کو یونانی عربی اطالوی اور انگریزی

الفاظ کی مرکب زبان میں جلدی جلدی کہنے لگا۔" اب میں سمجھ گیا کہ آپ محض معمولی سیاح نہیں ہیں۔ جو محض سیر کے شوق میں یہاں آتے ہیں۔ بلکہ صاحبانِ علم و فضل ہیں میں آپ کو ایک ایسا مقام بتا سکتا ہوں۔ جہاں ایک ایسی قبر ہے جو آج تک کسی کو نہیں ملی ہے۔ میرے سوا اسے کوئی نہیں جانتا کیونکہ میں اسے بطور ایک خزانہ کے محفوظ رکھتا ہوں اور صرف اسی کو بتاؤنگا جو اس راز کے معلوم کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔"

رئیس نے جواب دیا" جو نہیں معقول رقم دے۔"

سچ تو یہ ہے کہ حضور کا خیال ٹھیک ہے۔ مجھے اس کی بہت بڑی توقع ہے کہ آپ کی اس تحقیقات کی معقول قیمت حاصل کروں۔ یہاں تو ہر شخص اپنی چھوٹی سی حرفت پر بسر اوقات کرتا ہے۔ میری بسر اوقات یوں ہوتی ہے کہ فراعنہ کی قبروں کو کھود کر باہر کے آدمیوں کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں یہ قبریں اب بہت کم ہوتی جاتی ہیں۔ اور یقیناً یہ دنیا بھر کے متلاشیوں کے لئے کافی نہیں ہو سکتیں۔ اب تو اس چیز کی بہت مانگ ہے اور تھوڑے دنوں سے دستیاب ہی نہیں ہوتی۔"

ڈاکٹر۔" یہ تو بالکل ٹھیک ہے۔ ممی بنانے والوں کی دوکانوں کو بند ہوئے صدیاں گذر گئیں۔ اور اس ملک کے زندہ لوگوں نے مردوں کے خاموش مقامات کو مدتوں سے چھوڑ دیا ہے۔"

یونانی نے اس مقرر کو بغور دیکھا۔ لیکن رئیس سے اپنی گفتگو جاری رکھی۔

" کیا ایک ایسی قبر کی قیمت جسے دفن کے بعد سے آج تک کسی آدم زاد نے ہاتھ نہیں لگایا۔ پندرہ ہزار روپیہ زیادہ ہے؟ ایسی چیز کے لئے اس رقم کی کوئی حقیقت نہیں شاید اس قبر میں زر و جواہر بکثرت ہیں۔ اور ہیرے اور موتی کے طوق زمرد کی بجلیاں اور دیوتاؤں کی تصاویر جواہرات کی ڈھلی ہوئی مل جائیں۔"

رفیق۔" او فریبی تو تو ایسے جواہرات کا نام لیتا ہے جو تجھے اچھی طرح معلوم ہے۔ کہ اب مصری مقابر میں ملتے ہی نہیں۔"

جب ارگراپولوس نے دیکھا کہ اُس کی عیارانہ لفاظیاں ان لوگوں پر مطلق اثر نہیں کرتیں۔ تو اس نے اپنی تقریر یہیں پر منقطع کر دی۔ اور لارڈ ایوانڈیل کی طرف مڑ کر صاف صاف اصل مطلب کی بات کہنے لگا۔

" بہت اچھا حضور کیا میری بتائی ہوئی قیمت پر معاملہ طے ہوگا؟"

نوجوان رئیس نے کہا۔" اچھا چلو اگر تمہارے قول کے بموجب یہ قبر کبھی کھولی نہیں گئی ہے۔ تو میں پندرہ ہزار روپیہ دونگا۔ اور اگر کسی نے اس پر ذرا سا بھی کوئی حربہ چلایا

ہے تو ایک حبہ نہ دوں گا۔"

ہوشمند رمفیس نے اتنا اور اضافہ کر دیا۔" اور یہ شرط بھی ہونی چاہیئے۔ کہ اگر ہم چاہیں تو قبر میں جو کچھ ملے سب لیجا سکتے ہیں۔"

یونانی نے مطمئن لہجہ میں جواب دیا۔" مجھے منظور ہے بیعانہ دیجئے۔"

لارڈ ایوانڈیل (اپنے دوست سے) میرے اچھے رمفیس تمہارا خواب صحیح ہونا معلوم ہوتا ہے۔ یہ مسخرہ اپنی تحقیقات پر یقین کامل رکھتا ہے۔"

عالم دوست نے کہا۔" خدا کرے یہ سچ کہتا ہو۔ اور ہمیں کامیابی ہو۔ یونانی تو اس غضب کے جھوٹے ہوتے ہیں۔ کہ ان کا جھوٹ ضرب المثل ہو گیا ہے۔"

رمفیس۔" اس میں تو کوئی شک نہیں کہ یہ شخص یونانی ہے۔ لیکن کم از کم اس وقت تو یہ سچ بول رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ اس کی عمر بھر میں پہلا اتفاق ہو۔"

چنانچہ یہ کھنڈرات کا راہنما عالم اور رمفیس کے آگے آگے اکڑتا ہوا چلا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں سب لوگ اُس تنگ درہ پر پہنچ گئے۔ جہاں سے وادیِ بیابان الملوک کا راستہ تھا معلوم ہوتا تھا کہ یہ راستہ قدرتی درہ نہیں ہے۔ بلکہ انسانی ہاتھوں نے کاٹ کر بنایا ہے۔

بظاہر خلوت کا دیوتا اس شہر خموشاں کو لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا۔ شکستہ قبروں کے ٹکڑے ادھر اُدھر نظر آرہے تھے۔ اور آخر میں پہنچکر وادی ذرا چوڑی ہو گئی تھی اور سنسان منظر پیش کرتی تھی۔ دونوں طرف پہاڑی ٹیلے نظر آتے تھے۔ جنہیں بیرحم سورج کی حدت نے پرشکن اور خاکستری بنا دیا تھا۔ ان ٹیلوں کے بازوؤں پر جا بجا بڑے بڑے سیاہ دہانے تھے۔ جن کے چاروں طرف پتھر کے ٹکڑے شکستہ اور بدنظمی کی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ یہ مربع سوراخ تھے۔ جو چھوٹے چھوٹے ستونوں پر رُکے ہوئے تھے۔ اور ان ستونوں پر نشانیاں اور کتبے اور بادشاہوں' دیوتاؤں اور دیویوں کے نام لکھے ہوئے تھے۔ یہی مصر کے قدیم بادشاہوں کی قبریں تھیں۔ اور آخر کار ایسا معلوم ہوا کہ ان لوگوں کی منزل مقصود قریب پہنچ گئی۔ کیونکہ آرگراپولوس نے ایک بہت بڑے پتھر کی طرف اشارہ کیا اور کامیابی کے لہجہ میں کہا۔

" وہ یہ ہے"

اُس نے دستک دی اور چاروں طرف سے بسولیاں ہتھوڑے اور دیگر ضروری اوزار لئے ہوئے فلاحین پہنچ گئے یونانی نے ان میں سے چند مضبوط آدمیوں کی طرف اشارہ کیا جنہوں نے چٹان کے ایک بہت بڑے ٹکڑے کو ہٹانا شروع کیا۔ یہ ٹکڑا ہٹ گیا۔ اور دو اور ٹکڑے بھی ہٹا دئے گئے۔ جس کے بعد ایک قبر کا دروازہ نظر آیا۔ جو چٹان کو کھوکھلا کر کے بنایا گیا تھا۔ اس کے بازوؤں پر ستون تھے۔ اور دروازہ

تصویردار حروف سے منقش تھا۔ اینٹ اور پتھر کی ایک دیوار کے پیچھے انہیں ایک پتھر کی چوکھٹ نظر آئی۔ اسی پر وہ دروازہ تھا۔ جو زمین دوز قبر کو گیا تھا۔ جرمنی عالم نے دروازہ کی مہر کو سالم پایا اور چیخ اٹھا۔

"اب مجھے واقعی یقین ہو گیا کہ ہم کامیاب ہو گئے"

لارڈ ایوانڈیل۔ "ہمیں قبل از وقت آپے سے باہر نہ ہو جانا چاہیے۔ بلزونی نے ایکبار بہت سخت غلطی کی تھی۔ اس نے ایک بغیر کھولی ہوئی قبر دریافت کی تھی۔ جو دوسرے رُخ سے کھولی جا چکی تھی۔"

رفیس۔ "لیکن یہاں پہاڑی کا سلسلہ اس قدر بڑا ہے۔ کہ اس قسم کے آدمی ایسے اوزاروں کے ساتھ کسی دوسرے رُخ سے نہیں کھول سکتے۔"

اب ان آدمیوں نے اُس بڑے پتھر پر حملہ کیا جو آگے کے راستہ کو چھپائے ہوئے تھا۔ کھودائی کے ساتھ بکثرت چھوٹی چھوٹی تصویر نکلتی آتی تھیں۔ یہ تصویریں فوت شدہ کے احباب نے رکھی تھیں جس طرح ہم لوگ پھول چڑھاتے ہیں۔

دروازہ کھل گیا۔ پینتیس صدیوں کے بعد یہ پہلی دفعہ کھلا تھا۔ اور پہاڑ کے اس نئے کھودے ہوئے دہانے سے جو ہوا نکلی۔ وہ مرد بیمار کی ٹھنڈی سانس سے مشابہ تھی۔ اس دھندلکے میں کچھ اور تصویر دار حروف نظر آئے۔ مشعلیں روشن کر دی گئیں۔ اور یہ سب کے سب آگے بڑھے۔ اس راستہ کے اختتام پر ایک اور سربمہر سنگین دروازہ تھا۔ گرمی غضب کی تھی۔ اور ارگراپلوس نے تازہ پانی بھرے ہوئے اسفنج منگا بھیجے۔ اور انہیں کو ناک میں لگا کر سب لوگ سانس لینے لگے۔ اب دوسرا دروازہ نیچے تھا۔ اور ایک زینہ نظر آیا۔ جو بالکل نشیب کو چلا گیا تھا۔

زینے کی تہ میں پہنچکر ڈاکٹر کا دم پھولگیا۔ اور اُس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "اُف جسقدر ہم آگے بڑھتے ہیں۔ اُسی قدر گرمی بڑھتی جاتی ہے۔ یقیناً اب ہم اس مردود کی آرامگاہ کے قریب ہیں۔"

اس کے بعد ایک اور راستہ ملا۔ اور پھر یہ لوگ ایک خندق کے قریب پہنچکر رُک گئے۔ ایک مشعل نیچی کی گئی۔ جس سے سوراخ یک چشم دیوزاد کی آنکھ کی طرح چمک اُٹھا۔

لارڈ ایوانڈیل۔ "اس زمانے کے لوگ بھی مرے ہوئے مصریوں کے برابر ہوشیار نہیں ہیں۔ یہ پیچ در پیچ راستے اور کوٹھڑیاں خندقیں اور دروازے یقیناً ڈاکوؤں اور محققوں کے سارے جوش و خروش کو ٹھنڈا کر دینے والے ہیں۔"

ڈاکٹر جو خود محقق تھا۔ اور اچھی طرح جانتا تھا۔ فوراً بول اُٹھا۔ "تاہم وہ اس کا امتیاز بمشکل کر سکتے تھے۔ کہ ڈاکو تلاش زر کو آتے ہیں اور سائنس دانوں کو صداقت کی تلاش ہوتی ہے اب یہ دونوں چیزیں تمام دُنیا میں سب سے زیادہ قیمتی ہیں۔"

ارگراپولوس۔ "گرہ دار رسی لاؤ۔ ہم اس خندق میں اُتریں گے۔"

ایک شخص نے رسّی پکڑی اور یونانی دیوار پر ضربیں لگاتا ہوا نیچے اُترا۔

ایوانڈیل اور رفیس استعجاب اور تشویش کے جوش میں اس خندق پر جھک پڑے۔ اس کا سخت اندیشہ تھا کہ سر کے بل نیچے نہ جا پڑیں۔ اور یونانی کی تلاش کو نہایت دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

جب ارگراپولوس اُوپر آیا تو اُس کے چہرہ پر سخت غصّہ کے آثار تھے۔ اور وہ اپنے ہونٹوں کو چبا رہا تھا۔

"یہاں تو کسی راستہ کا ذرا بھی پتہ نہیں چلتا حالانکہ یہ کھوہ کی طرح یہیں پر ختم نہ ہوا ہوگا۔"

رفیس۔ ممکن ہے کہ جس مصری نے اس قبر کے بنانے کا حکم دیا ہو۔ اُس کی موت کسی دوسرے مُلک میں ہوئی ہو۔"

ہاں اگر ایسا ہوا تو کیا یہاں کام ختم نہ کر دیا گیا ہوگا۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے۔ اور یقیناً اکثر ایسا ہی دریافت بھی ہوا ہے۔"

لارڈ ایوانڈیل۔ ہمیں امید ہے کہ ہماری مسلسل تلاش کا کوئی پُراسرار نتیجہ نکلیگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو کیا ہم اس پہاڑ کے کسی دوسرے رُخ سے ایک وار پار راستہ نہیں بنا سکتے؟"

ارگراپولوس۔ "یہ قدیم مصری اپنے مردوں کو دفناتے وقت اس قدر چالاکی کرتے تھے۔ کہ آج وہ اپنے بعد کی آنے والی نسلوں کو منہ چڑھاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔"

یہ کہنے کے بعد وہ خندق کے اُوپر والے حصّہ کو مزید غور سے دیکھنے لگا۔ اور یکا یک اُس کے ذہن میں ایک اور بات آئی۔ اور وہ اُلٹے پاؤں لوٹا۔ اُسے کھنڈرات اور مقابر کی تلاش کا پُرانا تجربہ تھا۔ اور یہ تجربہ اس وقت کام آیا اور اُسے اسی قسم کی ایک اور رُکاوٹ یاد آگئی۔ علاوہ بریں پنڈ ہزار روپیہ نقد حاصل کرنے کی خواہش نے اُس کی عقل کو بہت تیز کر دیا۔ اُس نے بسولی اُٹھائی۔ اور دیوار پر ضرب لگائی۔ آخرکار دیوار کی آواز سے پتہ چلا کہ یہ کھوکھلی ہے۔ وہ کامیابی کے جوش میں چیخ اُٹھا۔ اور اُس کی آنکھیں چمکنے لگیں دونوں آدمی جو باہر سے دیکھ رہے تھے تالیاں بجانے لگے۔

"یہ دیوار گرا دو۔"

اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی۔ اور ایک راستہ کھول لیا گیا جس سے ایک آدمی اُس کھوہ میں گذر سکتا تھا۔ جو پہاڑ کے اندرونی حصّہ کو گیا تھا۔ اور جس کے اختتام پر ایک مستطیل مربع کمرہ بنا ہوا تھا۔ جس پر تصاویر بنی ہوئی ہیں اس کمرے سے ایک اور کمرے کا راستہ تھا۔ جو ذرا اُوپر تھا۔ اور اس میں دو ستون تھے جن پر ایسے ہی نقوش کندہ تھے اس کمرہ کے بعد پھر اور کوئی راستہ نہیں نظر آیا۔ تمام امیدوں کا خاتمہ ہوگیا! اور یہ سب مجبور ہوئے۔ کہ اسی طرح واپس آئیں۔ کیونکہ اس مقام پر ہوا کا مطلق گذر نہ تھا۔ اور گرمی غضب کی تھی۔

ڈاکٹر مفیس نے کہا۔ "بہر نوع یہ بھول بھلیاں محض مذاق کے لئے نہ بنائی گئی ہوگی۔ یقیناً کوئی اور راستہ ہوگا۔ جو منزلِ مقصود کو پہنچائیگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ فوت شدہ مرد یا عورت کو اس امر کا اندیشہ ہوگا۔ کہ اس کی قبر پر حملہ کیا جائیگا۔ اور اسی لئے کسی مقام پر قبر کے اندر جانے کا ایک راستہ ہوگا جو پتھر سے ڈھکا ہوا ہوگا"۔

لارڈ ایوانڈیل۔ "میرے عزیز ڈاکٹر مجھے یقین ہے۔ کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہمیں بار بار تلاش کرتے رہنا چاہیئے"

اُنھوں نے ہر گوشہ اور ہر پتھر کو ٹھونکا۔ آخر کار ایک ستون کے پاس کھوکھلے پن کی آواز آئی۔ اور جب صدیوں کی پڑی ہوئی مٹی ہٹائی گئی۔ تو ایک مستطیل پتھر صاف صاف نظر آیا۔

اب لارڈ ایوانڈیل نے کہا۔ "مجھے کچھ ندامت ہے۔ کہ اس بیچارے خوابِ فنا کے سونے والے کو چھیڑنے کے لئے اسقدر تدابیر اختیار کیں"۔

پتھر اٹھا لیا گیا اور ایک زینہ نظر آیا جو ایک کمرے کو گیا تھا۔ جس میں چھوٹے چھوٹے گوشے تھے۔ اور ان میں پتھر پیتل اور لکڑی کی بنی ہوئی تصاویر رکھی ہوئی تھیں۔ آگے بڑھتے وقت لارڈ ایوانڈیل نے ایک عجیب بات محسوس کی۔ موجودہ زندگی اور اُس کے اغراض و مقاصد موصوف کے حواس ظاہری اور تخیل میں فنا ہوگئے۔ وہ برطانیہ عظمیٰ کو بھول گئے۔ اور یہ بھی یاد نہیں رہا۔ کہ اُن کا نام وہاں کے اعیان و اشراف کی فہرست میں ہے۔ اور وہ باالقاب رؤساء کے طبقہ سے ہیں۔ لنکا شائر میں اپنا وطن لنڈن کے مغربی حلقہ میں اپنا مکان اور اپنا جہاز اور اپنی انگریزی معاشرت کے تمام لوازمات فراموش ہوگئے۔ ایک غیر محسوس ہاتھ نے گھڑی کی سُوئی پھیر دی۔ اور قرنوں کا زمانہ سامنے آگیا۔ صدیاں خاموشی کے ساتھ رات کے سناٹے اور خلوت کے اوقات کی طرح گذرنے لگیں۔ تاریخ اپنی قدیم حالت میں موجود ہوگئی۔ موسےٰ جی اُٹھے۔ فرعون حکومت کرنے لگا۔ اور لارڈ ایوانڈیل نے محسوس کیا۔ کہ مصر کے شاہی خاندان کے حضور میں وہ مصری شرفا کی طرح مونعل لباس اور درباری کپڑے نہیں پہنے ہوتے ہیں۔ روحانی خوف و ہراس کی حالت بھی ان پر طاری ہوگئی۔ کیونکہ اُنہوں نے اُس نیم مقدس شاہی لاش کے خوابگاہ کو چھیڑا تھا۔ جس کی دستبرد کرنے والوں سے حفاظت کرنے میں اتنی احتیاطیں کی گئی تھیں۔

اس وقت یہ کوشش اور اس کی کامیابی اُن کی نظروں میں گناہ اور قابلِ سرزنش معلوم ہونے لگی۔ اور اُنہوں نے کہا۔ " اگر اس میں کوئی فرعون ہوگا۔ تو وہ اپنی آرامگاہ سے اُٹھیگا اور اپنے عصائے شاہی سے مجھے ماریگا۔ ایک لحظہ کے لئے اُس کی خواہش ہوئی۔ کہ یہ سنگین پردے پھر سے ڈال دئے جائیں۔ اور اس تمدن قدیم کی لاش کو یونہی محفوظ رہنے دیا جائے۔ لیکن ڈاکٹر دوسرے خیالات میں محو تھا۔ اور اپنے

محققانہ جوش وخروش میں باآواز بلند کہنے لگا۔

"حضور پتھر کی قبر تو بالکل سالم ہے۔"

اس جملہ سے رئیس کے تخیل میں پھر حقیقی زندگی کے واقعات عود کر آئے۔ اور اس کے تصور نے جو صدیوں کے واقعات یکجا کئے تھے۔ وہ دفعتہً بجلی کی طرح کوند کر دماغ سے نکل گئے۔ اور اس نے جواب دیا۔

"میرے عزیز ڈاکٹر کیا سچ مچ سالم ہے؟"

ڈاکٹر نے عالمانہ مسرت کے جوش میں کہا۔ "بیشمار دولت عجیب وغریب حسن اتفاق، لاثانی خزانہ"

ڈاکٹر کے اس جوش کو دیکھ کر ارگراپولس کو افسوس ہوا۔ اور یہ اس کی عمر بھر میں سب سے پہلا اتفاق تھا کہ اسے یہ احساس پیدا ہوا۔ اب اسے خیال پیدا ہوا کہ اسے بہت زیادہ رقم مانگنی چاہیے تھی۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ میں بڑا بیوقوف ہوں۔ اور نوجوان رئیس نے بڑا مال مارا۔ اور آئندہ کے لئے مزید احتیاط کی کئی تدابیر اس کے ذہن میں آئیں۔

آنکھوں کی مسرت میں اضافہ کرنے کی غرض سے فلاحین نے اب اپنی تمام مشعلیں روشن کرلیں۔ قبر کی آرامگاہ کے راستہ پر جو کمرے اور دروازے تھے۔ ان میں ایک عجیب اور شاندار منظر تھا۔ لارڈ ایوانڈیل اور رفیس باوجودیکہ مصر قدیم کے مراسم دفن کی عظمت سے کچھ پہلے ہی سے آشنا تھے

تاہم اس نظارہ کو دیکھ کر حیرت زدہ ہوگئے۔

اسقدر روشن ہونے پر اس زریں حجرہ نے سب سے پہلی بار اپنی دیوار کے چمکتے ہوئے نقش ونگار پیش کئے۔ سرخ نیلے۔ سبز اور سفید رنگ سنہری وارنش کی ہوئی زمین میں چمک رہے تھے۔ اور تصویر دار حروف اور نقشے ابھی کے بنے ہوئے نظر آتے تھے۔

وسط میں سنگین قبر تھی۔ جو سنگ اسود کے ایک بڑے ٹکڑے کو اندر سے خالی کر کے بنائی گئی تھی۔ اور اس کے اوپر اسی پتھر سے گول کیا ہوا ڈھکنا تھا۔ ستونوں کے چاروں گوشوں پر پتھر کی تصاویر برکندہ تھیں۔ اور اس خوبصورتی سے چسپاں کی گئی تھیں جس طرح انگوٹھی پر نگ لگا ہوتا ہے۔

قبر کے گوشوں پر چار پتھر کے برتن تھے۔ جو بالکل ڈھکے ہوئے تھے۔ ان چاروں برتنوں میں ممی کے بعض اندرونی حصے تھے۔ اور قبر کے سرہانے اساریہ کا ایک مجسمہ تھا جو اس فنا کے آرام کرنے والے کی حفاظت کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔

رئیس نے کہا۔ "قبر کھولو لیکن اوزار نہایت احتیاط سے استعمال کرو۔ کیونکہ میں چاہتا ہوں۔ کہ اس قبر کو مسلم عجائب خانہ انگلستان کے لئے لے جاؤں۔"

آخر کار جب قبر کھلی گئی۔ تو رفیس کو یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا۔ کہ یہ ممی کی ہوئی لاش عورت کی ہے۔ کیونکہ اسکے ڈاڑھی

نہ تھی۔ اور کفن کی لپیٹ سے بھی یہی معلوم ہوتا تھا۔ یونانی نے بھی تعجب کا اظہار کیا۔ اُس کے طول طویل تجربہ میں یہ پہلا اتفاق تھا۔ کیونکہ وادی بیبان الملوک قدیم مصریوں کا شاہی قبرستان تھا جس میں صرف بادشاہوں کی قبریں تھیں۔ اور شہزادیوں کا قبرستان پہاڑ کی ایک دوسری وادی میں ہے۔ علاوہ بریں شاہزادیوں کی قبریں بالکل سادی ہوتی ہیں۔ اور عموماً اُن میں صرف ایک یا دو کمرے ہوتے ہیں۔ عورتیں موت میں بھی مردوں سے کم رُتبہ سمجھی جاتی تھیں۔ اس قسم کی اکثر قبریں پہلے جب کھودی گئیں تو ان میں بگڑی ہوئی ممی اور بہت ہی کم مصالحہ لگی ہوئی ملیں

ڈاکٹر مفیس۔ "اس سے میرے تمام خیالات اور نظریات منتشر ہو گئے۔ اور مصری رسوم تجہیز و تکفین کا وہ مستقل اور بندھا ہوا انتظام ٹوٹ گیا جس کی ہزاروں برس تک نہایت سختی سے پابندی ہوتی رہی ہمیں اس زمانہ کے کسی غیر معلوم دستور یا واقعہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس کا تاریخ میں پتہ نہیں ہے۔ اگر یہ قدیم کتبے قابلِ اعتبار سمجھے جائیں تو ایک عورت تختِ فراعنہ پر بٹھائی گئی تھی اور اُس نے حکومت کی تھی۔ اس کا نام طھوسر تھا۔ کیا اس عورت نے تخت اور قبر پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا؟"

لارڈ ایوانڈیل۔ یہ مسائل تمہارے سوا کوئی حل نہیں کر سکتا۔ ہم اس پراسرار حیرت انگیز صندوق کو اپنے جہاز پر لے چلیں گے۔ اور وہاں تم اطمینان کے ساتھ غور کرنا۔ چنانچہ فلاحین نے کوشش کر کے اس سنگین صندوق کو جہاز پر پہنچا دیا۔

ارگراپولس نے صندوق کے پاس وہ تمام چیزیں رکھ دیں جو اس کے چاروں طرف ملی تھیں۔ اور ادب کے ساتھ جہاز کے دروازہ پر کھڑا ہو گیا۔ لارڈ ایوانڈیل سمجھ گیا اور اُس کی رقم ادا کر دی۔

صندوق جہاز کے وسط میں رکھا گیا۔ اس کے رنگ اسقدر چمک رہے تھے۔ کہ ابھی کل کے رنگے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے اندر ممی شدہ لاش ڈھلی ہوئی تھی۔ قدیم سرزمین مصر کی تاریخ میں کوئی مردہ اپنی قبر میں اس سے زیادہ خوبصورتی کے ساتھ نہیں رکھا گیا۔ ممی کے صندوق میں سر اور بازو بنے ہوئے تھے۔ اور شوخ رنگ منقش تختہ کے نیچے ایک نوجوان اور خوبصورت جسم نظر آرہا تھا۔ کفن کی سنہری نقاب میں لمبی لمبی مصری آنکھیں بنی ہوئی تھیں۔ جن کے سیاہ حلقے سنگ اسود کے بنے ہوئے تھے۔ نازک نتھنوں کی ناک، گول رخسار اور بھرے ہوئے لب جن پر ابھی تک ایک غیر قابل بیان مسکراہٹ موجود تھی۔ یہ تمام باتیں مصریوں کی خیالی تصویر کا نمونہ تھیں۔ اور بہت سی دیگر مخصوص تفصیلات جو مصنوعی نہیں ہو سکتی تھیں۔ ایک انسان کی شکل صاف صاف

نمایاں کرتی تھیں۔ نقاب کے دونوں طرف بکثرت خوشنما بالوں کے حلقے نہایت ہی احتیاط کے ساتھ گندھے ہوئے لٹک رہے تھے۔

حلقوم کے گرد ایک جواہرات اور سونے کا سینہ بند حلقہ کئے ہوئے تھا۔ جو کئی تاروں کے ساتھ نیچے کو گیا تھا۔ اور اُبھرے ہوئے سینہ کی شکل سونے کے دو تودوں کی طرح نظر آتی تھی۔ سینہ کی بندشوں پر کئی تصویر دار حروف لکھے ہوئے تھے۔ جن میں سب سے ممتاز حرف طاء تھا۔ جو غیر فانی کی ایک پراسرار علامت ہے۔ ایک لمبی بندش جس پر حروف نقش تھے۔ سینہ سے پیر تک بندھی ہوئی تھی۔ اس میں غالباً فن تجہیز و تکفین کے طریقے یا اس مردہ حسینہ کے کچھ اوصاف لکھے ہوئے تھے۔ رفیس بعد کو ان سب کا ترجمہ کرنا چاہتا تھا۔

تمام کتبے اور نقوش اپنی صورت یا طرز اور سطور یا رنگ کے لحاظ سے ایک ماہر مصریات کی تربیت یافتہ نگاہوں میں مصری فنون کے سب سے زیادہ خوش مذاق زمانہ کے معلوم ہوتے تھے۔

اب رئیس اور محقق نے ملکہ لاش کو صندوق سے نکالا۔ جہاز کی دیوار سے لگا کر کھڑا کیا۔ ممی کیا ہوا۔ اور سنہرا کفن پہنے ہوئے۔ بیجان جسم مدتوں تک پہاڑ کے قلب میں جواہرات کے بستر پہ آرام کرنے کے بعد اب سیدھا سیدھا کھڑا کیا گیا تھا اور ایسا معلوم ہوتا کہ ایک واہمہ نے انسانی جسم اختیار کر لیا ہے۔ اور اب پھر سے زندگی کی وضع میں نمایاں ہو رہا ہے۔ اس تن بیجان کی رُوح کا خیال ہوگا۔ کہ اس کا جسم ہمیشہ یوں ہی آرام کرتا رہیگا۔ اور اگر اُسے یہ معلوم ہو سکے کہ اس آرامگاہ کی حفاظت کیلئے اُس نے جسقدر تدابیر اختیار کی تھیں۔ وہ سب بے سود ہو گئیں۔ تو اُسے بیحد قلق ہو۔

ممی پر غائر نظر ڈال کر رفیس نے کہا" ایک مردہ کے لئے یہ کسقدر خوبصورت لباس ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ایک نوجوان عورت ہے۔ جسے ممی بنانیوالوں نے معطر کفن میں مصالح لگا کر لپیٹا ہے۔ جو مرور ایام کے ساتھ زرد ہو گیا ہے۔ مصریوں کو دیکھتے ہوئے ہم یقیناً وحشی ہیں۔ اور وحشیانہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ کیونکہ ہم میں موت کی مخصوص اور اعلیٰ عظمت اور خوبصورتی کا کوئی لطیف احساس نہیں ہے۔ ان باریک احتیاطوں اور بیحد غایت حفاظتوں اور ان تمام خفیف بے سود کارروائیوں سے جن پر کسی کی نظر پڑنے والی نہیں تھی۔ کسقدر محبت کسقدر افسوس اور کسقدر لگاوٹ کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ اس امر کی کوشش تھی کہ محبوبہ کے جسم کو فنا سے کامل یا قطعی طور پر بربادی سے بچایا جاتے۔ اور بہر طور جسم کو اُسی صورت پر قائم رکھا جاتے تاکہ قیامت کے دن جب رُوح جسم میں داخل ہونا چاہیے

تو اسے ہر چیز مسلم ملے۔"

لارڈ ایوانڈیل۔ غالباً ہمارا تمدن محض ایک زوال ہے۔ اس لیئے کہ ہم چند حال کی ایجادات پر تو مہمل طریقہ پر فخر کر رہے ہیں۔ اور مصر کی قدیم سرزمین کی مٹی ہوئی عظمت کا کبھی خیال بھی نہیں کرتے۔ ہمارے پاس اسٹیم ہے لیکن اس کی اُن خیالات کے مقابلہ میں کوئی وقعت نہیں جنہوں نے اہرام تعمیر کیئے۔ اور ان پہاڑوں کو کھوکھلا کیا۔ اور پہاڑی کے پتھر کو کاٹ کر مجسمے اور یادگاریں تیار کیں اور اس علم کو جانا کہ نازک انسانی جسم بے جان کو وقت کے تباہ کن ہاتھوں سے کیونکر محفوظ رکھا جائے۔ ان لوگوں میں بقائے دوام کا احساس تھا۔ اور یہ احساس ان کی معاشرت اور اُن کے فنون سے عیاں ہے۔"

رفیبس۔ "مصری تو حیرت انگیز صناع اور واعظ تھے لیکن ہم اُن کے خفیہ خزانوں کو تو ذکر ہی رہ جاتے ہیں۔ آئیے اِس نوجوان حسینہ کو جسقدر احتیاط سے ممکن ہو عریاں کریں۔"

لارڈ ایوانڈیل۔ افسوس اے غریب خاتون! آج بُری نگاہیں اُن چیزوں کو دیکھیں گی۔ جنہیں غالباً محبت کی نگاہوں نے بھی نہ دیکھا ہو۔ سائنس کی آڑ میں ہم اسی قدر وحشی ہیں جسقدر ایرانی یا کمبی۔"

ڈاکٹر نے جسم کی بندشیں ہٹا دیں۔ اور یہ آخری پردہ ہٹ جانے پر ایک نوجوان حسینہ باعصمت عریانی کے ساتھ نظر آئی۔ اور باوجودیکہ کتنی صدیاں گذر چکی تھیں۔ تاہم اُس کے خط و خال کا ابھار اور اُس کے عالی خاندان ہونے کے علامات صاف صاف ظاہر ہو رہے تھے۔ اس کی وضع اور ظاہری ادا زہرہ کی طرح تھی جو مصریوں میں بہت ہی شاذ ہے۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ ممی بنانیوالوں کے اُستاد کا یہ منشا تھا کہ اس تن بیجان کی ادا سے مردنی کی سختی اور مغموم صورت کا اظہار نہ ہونے پاتے۔

دونوں دیکھنے والوں نے نعرہ تحسین بلند کیا۔ کسی یونانی یا رومی مجسمہ نے آجتک اس قدر نظر فریب اور حسین صورت نہیں پیش کی۔ خیالی مصری حسن کی مخصوص خصوصیات سے اس حسین جسم کے خط و خال میں وہ نزاکت پیدا ہو گئی تھی۔ جو قدیم سنگ مرمر کی مورتوں میں نہیں پائی جاتی۔ خوشنما ہاتھ اور پاؤں چمکتے ہوئے ناخن نوک دار خوبصورت جوبن کولے اور ران کا ابھار اور لمبی ٹانگیں جن سے گذرے ہوئے رقاصوں اور مغنیوں کی یاد تازہ ہوتی تھی۔ یہ تمام باتیں نہایت ہی نوجوان حسینہ کی خصوصیات تھیں جن میں ایک حسین عورت کے سارے کمال موجود تھے۔ عموماً ممی کئے ہوئے اجسام چونکہ تیزاب وغیرہ سے تر کئے جاتے ہیں اس لئے آبنوس کی تصویروں کے مشابہ ہوتے ہیں۔ یہ تنا تو نہیں ہوتے لیکن زندگی کی تمام شکل و صورت غائب ہو جاتی ہے۔ یہ خاک تو نہیں ہوتے لیکن ایک ایسی صورت

اختیار کر لیتے ہیں۔ جو خوفناک اور نفرت انگیز ہوتی ہے لیکن یہاں چونکہ نہایت احتیاط اور خرچ سے کام لیا گیا تھا۔ اس لئے زندگی اور گوشت پوست کی بہت کچھ شباہت باقی تھی۔ گوشت کا متماتا ہوا عنبری رنگ جو جارجین تصاویر میں اسقدر خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ زندگی میں اس نوجوان مصری حسینہ کا رنگ ہوگا۔ سر سوتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ لیکن یہ نیند تیس سو برس کی تھی۔ اس کا جسم اعلےٰ درجہ کے زر و جواہر سے قریب ڈھکا ہوا تھا۔

ایک ایسے شاندار آدم زاد کے روبرو کھڑے ہونے سے جو اس زمانہ میں زندہ رہا ہو۔ جس وقت کہ تاریخی واقعات پردہ خفا میں ہیں۔ ایک عجیب احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک خوبصورت مخلوق ہے۔ جو یقیناً حضرت موسےٰ کی ہمعصر رہی ہوگی۔ اور اب تک نوجوانی کی شان برقرار رکھے ہوئے ہے۔ خیال کیجئے۔ کہ آپ ایسے خوبصورت ہاتھ کو چھو رہے ہیں۔ جسے غالباً فرعون نے بوسہ دیا ہوگا۔ اور ایسے بال جو سلطنتوں سے زیادہ دیرپا اور پتھر کے مجسموں سے زیادہ پائدار ہوں۔

اس حسینہ کی عریاں صورت کے سامنے جس نے مدتیں گذریں کہ اس سے حکومت کی ہوگی۔ نوجوان رئیس کو وہ خواہش پیدا ہوئی جو کسی ایسی خوبصورت تصویر یا مجسمہ کے سامنے پیدا ہوتی ہے۔ جو اپنی حسن و ادا میں شہرہ آفاق ہو۔ اُس نے خیال کیا۔ کہ اگر وہ اُس قدیم زمانہ میں زندہ ہوتا تو اس پر عاشق ہو گیا ہوتا۔ اور اس کا یہ روحانی خیال بظاہر خلا تک پہنچکر اس کی روح سے باتیں کرنے لگا۔

رفیس جو اس سے کم شاعرانہ خیالات رکھتا تھا۔ تمام جواہرات کا معائنہ کرنے لگا۔ ایونڈیل کا منشا نہ تھا کہ یہ اُتار لئے جائیں۔ ایک مردہ عورت کے زیور اُتارنا گویا اُسے دوسری بار مارنا ہے۔

یکایک ڈاکٹر کی نظر اس مردہ عورت کے بغل میں ایک لپٹے ہوئے کتبہ پر پڑی۔ اس نے کہا "حضور! اگر پولس ہمارے نزدیک بہترین آدمی ہے۔ یہ سب سے پہلا اتفاق ہے۔ کہ کسی شخص کو کوئی ایسی مصری تحریر ملی ہو جس میں محض مصری مذہبی اصول کے علاوہ کچھ اور لکھا ہو۔ میں اُسے پڑھونگا۔ اور اسے مرحوم حسینہ تیرا راز مجھے معلوم ہوجائیگا۔ علاوہ بریں اس کام سے میری عزت بڑھ جائیگی اور میں شامپولین کا ہم پلہ ہو جاؤنگا اور لیپسیس تو حسد سے مرجائیگا۔

یہ لوگ یورپ واپس آئے اور ممی لنکن شائر میں لارڈ ایونڈیل کے پارک میں رکھ دی گئی۔ رئیس اکثر صندوق کو دیکھتا تھا۔ اور خواب میں یہی باتیں دکھائی دیتی تھیں۔ جس سے اُس کی آتش شوق بڑھتی جاتی تھی۔ بہت طویل مطالعہ کے بعد رفیس نے کتبہ کو پڑھا۔ جو حسب ذیل تھا۔

باب اوّل

دردِ پنہاں

اونچی اونچی دروازے والے شہر قدیم تھیبہ کا مصری نام) پر سورج کے شعاعوں سحر انگیز اثر سے خواب کی حالت طاری تھی۔ ٹھیک دوپہر کا وقت تھا۔ زرد آسمان سے ایک سفید روشنی پیدا ہوتی تھی۔ اور زمین پر پڑتی تھی۔ جو گرمی کے مارے بیہوش ہوئی جاتی تھی۔ سورج تپتی ہوئی دھات کی طرح تپ رہا تھا عمارتوں کے نیچے سایہ بالکل کم تھا۔ اور محض ایک چھوٹی سی نیلگوں لکیر معلوم ہوتی تھی۔ ڈھالو پشتوں کے مکانات پزاوہ کی اینٹ کی طرح گرمی سے تپ رہے تھے۔ تمام دروازے بند تھے۔ اور کوئی سر کھڑکیوں کے باہر نہیں نظر آتا تھا خالی سڑکوں کے ختم پر اور چھتوں کے اوپر سے ستونوں کے واضح نقاط نظر آ رہے تھے۔ محلوں۔ معبدگاہوں اور میناروں کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ جن کے اوپر کا حصّہ اکثر مصری چہرہ کی طرح کا تھا۔ اور اکثر کنول کے پھول کی طرح۔ وقتاً فوقتاً ایک باغ کی دیوار کے اوپر کھجور کا درخت نظر آتا تھا۔ جو اپنے ماہی نما جسم کے ساتھ اپنی پتلیوں سے پنکھا جھل رہا تھا جا بجا نحاسی قوم کے سیاہ یا شاہی رنگ کے غلام دریائے نیل کا پانی لینے کی غرض سے دھوپ کی شدت کا مقابلہ کر رہے تھے۔

آج باوجود اس گرمی کے تھیبہ کے سب لوگ نہیں سو رہے تھے۔ ایک عظیم الشان قصر کی دیواروں سے نغمہ و سرود کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔ دیوار کی طویل جسامت میں اُلجھ کر یہ نغمہ و سرود غیر معمولی طور پر خوشگوار ہو رہا تھا۔ یہ کوئی نیم غمگین مسرت، پاکشیدگی اور تکان کا نغمہ تھا۔ جس سے جسم کے کسل اور جذبات کی ماندگی کا اظہار ہوتا تھا۔ قصر کی دیوار کے نیچے غلام اپنے کام لینے والوں کی مار کو بھول کر اس نغمہ کو سُن رہے تھے۔ جس میں خواہشوں کی کھوئی سرزمینیں کبھی نہ پورے ہونے والے خواب، شکستہ تعلقات عشق و محبت اور قسمت کی غیر قابل شکن رکاوٹیں اور اسی طرح کی دوسری دل دکھانے والی باتیں تھیں۔

قصر کے اندرونی کمرہ میں دیوار کے قریب ایک عجیب ساخت کی مسہری یا کوچ تھا۔ جس پر بیل کی تصویر بنی تھی۔ کمرے کے وسط میں ایک قیمتی لکڑی کی میز تھی۔ جس پر سنگار کی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ اس میز کے قریب ایک صوفہ پر ایک نہایت ہی حسین لڑکی بیخودی اور غم کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے خط و خال میں بلا کی نزاکت تھی۔ اور اُس کا حسن خالص مصری حسن تھا۔ حتّٰی کہ اکثر مصوّر دیویوں کی تصاویر بناتے وقت اُس کی صورت کو ذہن میں رکھتے تھے۔ جواہرات کی چمک سے اُس کا رنگ اور زیادہ نکھر آیا تھا۔ اور اُس کی بڑی بڑی سرگیں آنکھیں نور کی شعاعوں کو جگمگا رہی تھیں۔ بھری ہوئی پلکیں اور گنجان ابرو جھوٹے سے

چہرہ میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھے۔ لبوں پر ایک قدرتی مسکراہٹ تھی۔ جس میں اُس کے شفاف دانت موتیوں کی طرح جھلک رہے تھے۔ آنکھ کان، ناک اور رخسا کا صاف نقشہ اُس کے حسن اور دلفریبی میں چار چاند لگا رہا تھا۔ اس کا لباس نہایت ہی پُر تکلف تھا۔ اور بیش قیمت جواہرات اور زیور سر سے پاؤں تک لدے ہوئے تھے۔ اس کا نام طھوسر تھا۔ اور اس کے قریب ایک نوجوان جوگن بااوب جھکی ہوئی بیٹھی تھی۔ اور ایک نو تار کا ستار بجا رہی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور سازوالی تھی۔ اور ایک تیسری لڑکی ڈھول پر تال بتا رہی تھی۔

ستار بجانے والی ایک دردانگیز نغمہ الاپ رہی تھی اور دوسری مغنیات لطیف ترین سر کے ساتھ اس کا ساتھ دے رہی تھیں۔ الفاظ سے مبہم امید پنہاں درد غیر معلوم محبت اور قسمت اور دیوتاؤں کے مظالم پر مجبورانہ افسوس کا اظہار ہوتا تھا۔ طھوسر اپنے کوچ پر کہنی ٹیکے ہوئے گانے والیوں کا راگ ہمہ تن گوش ہو کر سُن رہی تھی۔ اور کبھی کبھی ایک سرد آہ نکلجاتی تھی۔ یا آنکھیں ڈبڈبا آتی تھیں۔ اور اپنا زیریں لب چبانے لگتی تھی۔

یکایک اُس نے دستک دے کر اُنہیں خاموش کیا اور گھبرائی ہوئی آواز میں بولی "ساتو" تیرا نغمہ تیز خوشبو کی طرح محزون کئے دیتا ہے۔ اور دل میں درد پیدا کر رہا ہے"۔

مغنیہ نے جواب دیا۔ "حضور عالیہ، شاعر اور نغمہ سنج سب کچھ جانتے ہیں۔ دیوتا اُنہیں بہت سی پوشیدہ باتیں بتا دیتے ہیں۔ لیکن اگر میرا راگ رنجیدہ کر رہا ہے۔ تو میں اسے بدل دونگی۔ اور کوئی ایسا راگ چھیڑوں گی۔ جس میں اس سے زیادہ نغمہ ہائے مسرت ہوں"۔ یہ کہہ کر ساتو نے مسرت بھرے جوش کے ساتھ تاروں کو چھیڑا۔ اور ایک ایسا گیت گایا۔ جس میں شراب کی دلفریبی، خوشبو کی دلکشی، اور رقص کا خمار سما گیا تھا۔

اس پر طھوسر کی دوسری سہیلیاں ناچنے لگیں۔ اور نغمہ کے اوتار چڑھاؤ پر پیر اُٹھنے لگے۔ لیکن ساتو کے راگ سے طھوسر کا غم بڑھتا ہی گیا۔ اور وہ اپنی رفیقہ کے سینہ سے چمٹ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

"آہ میری پیاری نوفزی میں بہت ہی غمگین اور بدقسمت ہوں"۔ (باقی آئندہ)

(م۔ص)

تاثراتِ کرشن

(۱)

سر پہ کلاہ کج دھرے، زلفِ دراز خم بخم — آہوئے چشم ہے غضب، ترکِ نگاہ ہے ستم
چاند سے منہ پہ خال دو، ایک ذقن پہ رخ پہ ایک — اس سے خرابیِ عرب، اس سے تباہیِ عجم
عشوہ وہ ظلم دوست ہے، قتل کرے جو بے چھری — ناز وہ دشمنِ وفا، رحم کی جس کو ہے قسم!
دل جو بڑا رفیق تھا، وہ تو ہے دستِ غیر میں — اب رہی اپنی زندگی، وہ کہیں آرزو سے کم
یاس پہ یاس، ہر گھڑی چوٹ پہ چوٹ رات دن — درد پہ درد، دُکھ پہ دُکھ، رنج پہ رنج، غم پہ غم
نالۂ آتشیں، دمِ آہ، چشمِ تر، و غبارِ دل — آتش و آب و خاک و باد ایک جگہ ہوئے بہم
نرگسِ پرخمارِ یار کرتی ہے کام زہر کا — بادۂ خوشگوار میں گھول دیا کسی نے سم
وقت عزیز جا چکا، آئے پلٹ کے اب محال — جتنے زمانے طے کئے، طے ہوئی منزلِ عدم

طولِ کلام بے محل شادؔ اگرچہ عیب ہے
لکھنے کچھ اور حالِ دل حیف کہ رک گیا قلم

(۲)

عشوۂ جاں گداز کیوں، غمزۂ سحر ساز کیوں؟ — سب تو ہیں تیرے مبتلا اس پہ یہ ترکتاز کیوں؟
قامتِ فتنہ خیز کو خواہشِ حشر کس لئے؟ — بازیِ نو کی فکر میں نرگسِ نیم باز کیوں؟
دل کے اجاڑنے کی فکر خود مجھے مدتوں سے تھی — اس پہ مرا عدو ہوا نالۂ جاں گداز کیوں؟
ہم سے اگر ہوا نہ ضبط، کیا کریں پھر بشر ہیں ہم — ہم پہ اگر نہ تھا وثوق، ہم سے بیانِ راز کیوں؟

شادؔ سخن کی جان ہے بادہ و نغمہ و سرود
آپ تو شعر کہتے ہیں آپ کو احتراز کیوں؟

شادؔ عظیم آبادی

تارا

مُصنّفہ بابو کشیرود چندر چٹرجی ——— مترجمہ و نشلہ حکیم احمد شجاع بی اے

دُوسرا باب

تیسرا منظر

چندر بابو کا کمرہ
رات کے گیارہ بجے

(چندر ایک کتاب پڑھ رہا ہے)

چندر۔ کسی طرح بھی کتاب میں جی نہیں لگتا۔ تارا دو سال میں کسقدر خوبصورت ہوگئی ہے۔ اس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ روشن ہیں۔ اب تو ان میں بجلیاں کوندتی ہیں اور اس کا شباب۔ اف میں کیا سوچ رہا ہوں۔

(خیال بدلنا چاہتا ہے) ساوتری اس وقت اپنے گھر میں آرام سے سو رہی ہوگی۔ نہیں نہیں مجھے یاد کر رہی ہوگی۔

(تارا ایک چادر میں لپٹی ہُوئی داخل ہوتی ہے)

کون ؟

(تارا چادر پھینک دیتی ہے)

تارا۔ میں۔

چندر۔ تارا۔ اس وقت۔ تم کیوں آئی ہو۔ گریش بابو کہاں ہیں۔

تارا۔ وہ ایک مقدمے کے لئے کٹک گئے ہیں۔ وہ یہاں نہیں ہیں مت ڈرو۔

چندر۔ مگر تم اس وقت یہاں کیوں آئی ہو۔

تارا۔ یونہی۔ اکیلے پڑی پڑی گھبرا گئی تھی۔ لاکھ کوشش کی نیند نہیں آئی۔ میں نے کہا تمہیں سے دو باتیں کر آؤں

چندر۔ یہ بہت ہی بیجا حرکت ہے۔ جاؤ اپنے گھر میں آرام کرو۔

تارا۔ یہ بیجا حرکت تو اب ہو ہی گئی۔ اب جانے سے کیا فائدہ ہوگا۔

چندر۔ نہیں تمہیں جانا پڑیگا۔

تارا۔ میرے سوامی! میرے پتی! مجھے اپنے گھر سے اس

طرح مت نکالو۔ میرا گھر یہی ہے۔

چندر۔ تارا تمہاری شادی ہو چکی ہے۔ تم اب ایک دوسرے شخص کی بیوی ہو۔ سمجھو تو تم کیا کہہ رہی ہو

تارا۔ میں ایک مجبور عورت تھی۔ میری شادی کر دی گئی۔ مگر تم نے ایک آزاد مرد ہو کر کیوں شادی کر لی۔ اس کا جواب دو۔ مجھ سے محبت کرنے کے بعد تم کو ایک دوسری عورت سے محبت کرنے کا کیا حق تھا۔

چندر۔ جب میں نے شادی کی اس وقت تمہاری شادی ہو چکی تھی۔ میں تم کو بھول گیا تھا۔

تارا۔ جھوٹ ہے۔ انسان صرف ایک دفعہ محبت کر سکتا ہے۔ پہلی محبت کو کوئی شخص نہیں بھلا سکتا۔ کہو سچ سچ کہو کیا تم مجھے بھلا سکتے ہو۔ چندر بولو۔ چپ کیوں ہو۔ یہی حالت جو تمہاری ہوتی رہی میری بھی ہے۔ صرف تم جھوٹ بول سکتے ہو۔ میں جھوٹ بولنا نہیں چاہتی۔

چندر۔ تارا تم نے سچ کہا۔ میں تمہیں آج تک نہیں بھلا سکا اور شاید کبھی نہ بھلا سکوں۔ لیکن تم عورت ہو ابھی بہت کم سن ہو۔ میں مرد ہوں۔ مجھے آئندہ کا خیال کرنا ضروری ہے۔ دیکھو انسان کا دل بہت کمزور ہے۔ اگر ایک دفعہ پاؤں پھسل گیا تو میں کہاں جا کر گرونگا۔ کچھ اس کا بھی اندازہ ہے۔

تارا۔ میں اب بدعصمت ہوں۔ تم اب بدکار ہو تم میرے شوہر ہو جس کو میں نے اپنی محبت کے لئے خود منتخب کیا اب میں ایک بیگانے مرد کے ساتھ زندگی بسر کر کے زندہ جہنم میں رہتی ہوں۔ اگر تم مجھے مل جاؤ تو میں نیک اور پارسا بن جاؤنگی۔ گناہ سے بچ جاؤنگی۔

چندر۔ میرے سوامی مجھے بچالو۔ مجھے ایک بیسوا کی زندگی سے آزاد کر دو۔

چندر۔ لیکن تارا تم نے سوچا بھی۔ میری بیوی کا کیا حشر ہوگا۔

تارا۔ مجھے اس کی کچھ پروا نہیں۔ تم پر اس کا حق مجھ سے زیادہ نہیں۔ میں ہوں تمہاری پہلی تمہاری اصلی بیوی۔ دیکھو اگر تم نے مجھ سے محبت نہ کی تو میں دیوانی ہو جاؤنگی۔

چندر۔ تو تمہیں بچانے کے لئے تم چاہتی ہو۔ کہ میں دیوانہ بن جاؤں۔

تارا۔ پتھر کبھی دیوانہ نہیں ہو سکتا۔ تم پتھر کے بت ہو۔

چندر۔ تارا میں پتھر نہیں۔ بے حس نہیں۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ جاؤ اپنے گھر جاؤ۔

تارا۔ نہیں چندر۔

چندر (درشتی سے) جاؤ تارا۔

تارا (آنکھوں پر ہاتھ رکھ کے) اُف تم کس قدر بیرحم ہو۔

چندر۔ میں بیرحم نہیں ہوں۔ ایک دن آئیگا جب تم

جان لوگی۔ کہ مَیں نے تم پر کس قدر رحم کیا ہے۔

تارا۔ مجھے ایسے رحم کی ضرورت نہیں۔

چندر۔ اگر تمہیں میرے رحم کی ضرورت نہیں۔ تو خدارا مجھ پر رحم کرو۔ اور گھر چلی جاؤ۔

تارا۔ مَیں ہرگز نہیں جاؤنگی۔ ہاں اگر تم چاہتے ہو تو مجھے زبردستی نکال دو۔

چندر۔ زبردستی نکال دو۔ ایسا تو مجھ سے کبھی نہ ہوگا۔ لو تم ٹھیرو۔ مَیں جاتا ہوں۔ (باہر جانے کی کوشش کرتا ہے)

تارا۔ تم مجھ سے چھپ کر کہاں جا سکتے ہو۔

چندر۔ تم مجھے دیوانہ بنا دوگی۔

تارا۔ چندر اسقدر بے اعتنائی نہ کرو۔ مَیں تمہیں سچے دل سے چاہتی ہوں۔ میری محبت لازوال ہے۔

چندر۔ اگر تمہارے خیال میں اسی کا نام محبت ہے۔ تو تم محبت کی توہین کرتی ہو۔ جاؤ اپنے گھر جاؤ۔

تارا۔ مَیں اپنی مرضی سے کبھی نہیں جاؤنگی۔

چندر کمار۔ اچھا تم یہاں بیٹھو۔ مَیں ابھی آتا ہوں۔

(جاتا ہے)

تارا۔ تم ان بہانوں سے جان نہ چھڑا سکو گے۔ اچھا مَیں دیکھونگی۔ یہ بے اعتنائی کب تک رہتی ہے۔

(جاتی ہے)

(چندر داخل ہوتا ہے)

چندر کمار۔ ساوتری تم کہاں ہو۔ جلدی آؤ۔ اور اپنے شوہر کو تباہی سے بچاؤ۔ مَیں بے بس ہو رہا ہوں۔ مَیں جہنم کے کنارے پر کھڑا ہوں۔ اگر ایک قدم آگے پڑ گیا۔ تو آہ کیا ہوگا........

تیسرا باب

پہلا منظر

(چندر کمار اور ساوتری چندر کمار کے مکان میں)

چندر۔ ساوتری میرا ضمیر مجھے تمہارے قریب بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا۔ مجھ پر گناہ کا تاریک سایہ پڑ چکا ہے

ساوتری۔ تم گناہگار کیوں ہونے لگے تم تو گناہ کے پنجے سے بچ کر نکل آئے ہو۔

چندر کمار۔ صرف میرا جسم۔ مگر اس دل کو کیا کروں تارا کی یاد میرے دل پر غم کی سیاہ گھٹا کی طرح چھائی ہوئی ہے

ساوتری۔ یہ تو کوئی گناہ نہیں ہے۔

چندر کمار۔ کیوں نہیں۔ اگر تم آج نہ آتیں ——

ساوتری۔ اب اس ذکر کو جانے دو۔ آخر تم انسان ہی تو ہو۔

چندر۔ لیکن ساوتری تم بھی تو انسان ہو۔ فرض کرو کہ تم سے کوئی شخص ایسی محبت کرے جیسی تارا کو مجھ سے

ہے۔ تو کیا تم اس کو اپنے دل میں جگہ دو گی۔

ساوتری۔ عورتوں کے دل اور دماغ کی ترکیب ہی مختلف ہے۔ جب مجھے تم سے کوئی شکایت نہیں تو تم اپنے آپ کو مجرم کیوں سمجھتے ہو۔

چندر۔ اسی لئے کہ میں تمہارے جیسی بیوی کا شوہر ہوں۔

ساوتری۔ تم نیکی کا سورج ہو۔ اور گناہ کا سایہ تمہارے قریب نہیں آسکتا۔

ساوتری۔ نہیں نہیں تم ہی ہو میرے دیوتا۔ میں تو صرف تمہاری پجارن ہوں۔

چندر۔ ساوتری۔ میرے دماغ کو اس نجاست سے تم ہی پاک کر سکتی ہو۔

ساوتری۔ اس بات کا خیال ہی چھوڑ دو۔ لو میں تمہیں ایک نیا گیت سناتی ہوں۔

گیت

پرم پتا کرپال جگ پرمیشور جگ دیال
دکھ سنکٹ میں تیرا سہارا
بپتا کی رین میں تو دھرو تارا
پرم پتا کرپال جگ پرمیشور جگ دیال
سنفر دھرتی آکاش تم ہی سے
نر آتشں کی آس تم ہی سے
پرم پتا کرپال جگ پرمیشور جگ دیال

چندر۔ آہ ساوتری۔ تم نے مجھ کو گناہ سے بچالیا ہے لیکن صرف مجھے بچانا ہی کافی نہیں۔ جس طرح بنے تارا کو بھی بچاؤ۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر تم اس سے چھو بھی جاؤ گی تو وہ پاک ہو جائیگی۔

ساوتری۔ میں تارا کو کیسے بچا سکتی ہوں۔ اس کو تو میری شکل سے بھی نفرت ہوگی۔

چندر۔ ساوتری۔ کسی طرح اُسے اپنے شوہر سے محبّت کرنا سکھاؤ۔ اسی طرح کی محبت جیسی تم مجھ سے کرتی ہو۔

ساوتری۔ مگر میں اس سے مل کہاں سکتی ہوں۔

چندر۔ کیا تم خیال کرتی ہو کہ اگر میں نے ایک دفعہ اس کی آرزوؤں کو ٹھکرا دیا۔ تو پھر وہ کبھی مجھ سے ملنے کی خواہش نہیں کریگی۔ اگر گریش بابو کلکتہ سے ابھی تک واپس نہیں آئے۔ تو تارا ضرور آج رات کو پھر یہاں آئیگی۔ تم اس وقت اسے سمجھا سکتی ہو۔

ساوتری۔ اگر تم اجازت دو۔ تو میں اس کے گھر ہی کیوں نہ چلی جاؤں۔

چندر۔ ہاں یہ اچھّا ہوگا۔ کل ضرور اس کے ہاں جاؤ۔ یہ نیکی کا کام ہے۔ اور تم نیک کام کرنے کے لئے ہی پیدا کی گئی ہو۔ آؤ کھانے کو دیر ہوئی جاتی ہے۔ تم بہت تھک گئی ہوگی۔

(جاتے ہیں)

دوسرا منظر

(گریش بابو کا مکان)

(تارا صوفے پر بیٹھی پڑھ رہی ہے۔ ساوتری داخل ہوتی ہے)

تارا۔ تم کون ہو۔

ساوتری۔ میرا نام ساوتری ہے۔

تارا۔ ساوتری کون۔

ساوتری۔ میں چندر بابو کی بیوی ہوں۔

تارا۔ آپ کیسے تشریف لائیں۔

ساوتری۔ میں آپ سے بھیک مانگنے آئی ہوں۔

تارا۔ میں بھیک کیا دے سکتی ہوں۔

ساوتری۔ شوہر۔

تارا۔ (مسکراتے ہوتے) بھلا میں انکار کرسکتی ہوں۔ دیدیا۔

ساوتری۔ تو کیا اب تم ان سے کوئی تعلق نہ رکھوگی۔

تارا۔ بالکل نہیں۔ یہ تعلق تو سراسر میری مرضی کے خلاف ہے۔

ساوتری۔ تم کیا کہتی ہو۔ تمہاری مرضی کے خلاف ہے

تارا۔ تم گریش بابو کا ذکر کررہی ہو نا۔ وہ تمہاری نذر ہیں اور بالکل مفت۔

ساوتری۔ آہ۔ میں تم سے اپنا شوہر بھیک مانگتی ہوں

تارا۔ تمہاری چیز کو بھیک میں دینے کا مجھے کیا اختیار ہے

ساوتری۔ تارا تم اس کو مجھ سے چھین لینے کی کوشش کررہی ہو۔

تارا۔ تم غلط کہہ رہی ہو میں اسے چھین لینے کی کوشش کر رہی ہوں یا تم نے اس کو مجھ سے چھینا ہے۔

ساوتری۔ میں نے تم سے چھین سکھا ہے۔ تمہاری اس کے ساتھ شادی نہیں ہوئی؟

تارا۔ شادی؟ تمہارے فضول رواج کے مطابق نہ ہو مگر میرے لئے یہی شادی ہے۔ میں اس کی تھی اور وہ میرا تھا۔

ساوتری۔ تم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہو۔ چندر نے مجھ سے شادی سے پہلے سب کچھ کہہ دیا تھا۔

تارا۔ تو اُس نے تم سے جو کچھ کہا جھوٹ کہا۔

ساوتری۔ چندر جھوٹا سہی لیکن تم تو گریش بابو کی بیوی ہو

تارا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں ان کی بیوی ہوں۔ لیکن بہت جلد یہ رشتہ منقطع ہو جائیگا۔

ساوتری۔ لیکن تم دو سال سے ان کے گھر میں رہتی ہو ان کی کمائی کھاتی ہو۔

تارا۔ اگر تم میری جگہ پر ہوتیں تو کیا کرتیں۔

ساوتری۔ میں ان سے کبھی شادی نہ کرتی۔

تارا۔ کیا یہ بھی ممکن ہے۔ ایک کمزور عورت مردوں کی مرضی کا مقابلہ کیسے کرسکتی ہے۔ یہ اختیاری بات نہ تھی۔

ساوتری۔ لیکن موت تو ایک اختیاری امر ہے۔

تارا۔ تو کیا تم مر جائیں۔

ساوتری۔ بیشک۔

تارا۔ شاید تیرا دل اتنا مضبوط نہیں۔

ساوتری۔ تو پھر اپنے خاوند کے ساتھ صبر اور شکر کے ساتھ دن گذار دو۔ اور میرے خاوند کو چرانے کی کوشش نہ کرو

تارا۔ اگر چوری کا اندیشہ ہو تو پولیس میں اطلاع دیدو۔

ساوتری۔ تمہارے سینے کے اندر ایک دل ہے وہی ایشور کا گھر ہے، میری پولیس ہے۔ میں اسے اطلاع دینے آئی ہوں۔

تارا۔ تم جیسی پاک عورتوں کے دل میں شاید ایشور رہتا ہو۔ میں نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا۔

ساوتری۔ تو کیا تم ایشور کی ہستی سے بھی منکر ہو۔

تارا۔ ہاں میں سب سے منکر ہوں۔

ساوتری۔ تو پھر تم کسی کو مانتی بھی ہو۔

تارا۔ صرف چندر کو۔ میرے دل کے مندر میں صرف چندر رہتا ہے۔ اور میں اسی کو پوجتی ہوں۔

ساوتری۔ بہن اپنی بہتری کے لئے چندر کی بہتری کے لئے اسکے خیال کو چھوڑ دو۔

تارا۔ اس کے چھوڑنے میں میری بہتری ہے یا تباہی؟

ساوتری اگر میں نے اسے چھوڑ دیا۔ تو میری زندگی حرام ہو جائیگی۔ اگر میں تم سے کہوں کہ چندر کو میرے لئے چھوڑ دو۔ تو کیا تم مان لوگی؟

ساوتری۔ اگر اس میں چندر کی بہتری ہو۔ تو میں ضرور اسے چھوڑ دونگی۔ تمہیں دعوےٰ ہے کہ تم چندر سے محبت کرتی ہو۔ کیا تمہاری محبت گوارا کر سکتی ہے کہ وہ مصیبت میں گرفتار ہو جائے۔

تارا۔ کیسی مصیبت۔

ساوتری۔ تو معلوم ہوتا ہے تم نے اس کے نتیجہ پر غور نہیں کیا۔ ذرا سوچو تو۔ اگر کسی کو اس کا علم ہو جائے۔

تارا۔ علم کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر سنو۔ ساوتری اگر تم نے کسی سے کہا۔

ساوتری۔ تو کیا ہوگا۔

تارا۔ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گی۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم پوری سے چلی جاؤ۔

ساوتری۔ مجھے موت سے کوئی ڈر نہیں۔

تارا۔ مگر میں اپنے چندر کے ساتھ تمہیں رہنے کی اجازت کبھی نہ دونگی۔ اگر تم اپنی جان کی دشمن نہیں۔ تو کلکتہ چلی جاؤ۔

ساوتری۔ میری جان لیکر تم جہنم کے عذاب سے نہ بچ سکوگی۔

تارا۔ کیا تم میرے گھر میں میری توہین کرنا چاہتی ہو۔

ساوتری۔ اگر میں نے کوئی ناگوار بات کہہ دی ہو تو معاف کرو۔

تارا۔ مَیں معاف کرنا نہیں جانتی۔ جاؤ۔

ساوتری۔ تارا۔ بھکاری کو بھیک دِئے بغیر نکال دینا گناہ ہے۔

تارا۔ مَیں گناہ سے نہیں ڈرتی۔

ساوتری (تارا کے پاؤں پر گر کر) تارا میری بہن۔ مجھے مایوس نہ پھیرو۔ تم اس سرزمین کی بیٹی ہو۔ جس میں سیتا۔ ساوتری پدمنی جیسی دیویاں پیدا ہوئیں۔ تم اس مُلک کی عورت ہو جس میں عورتیں چتا میں جل کر خاک ہو جاتی تھیں۔ جہاں شوہر اپنی بیویوں کے ایشور ہیں۔ جس میں عورت کا سب سے بڑا زیور اس کی عصمت ہے۔ تمہارا شوہر دولت میں۔ عزّت میں۔ نیکی میں ایک دیوتا ہے۔ اس کی عزّت کرو۔ اس سے محبّت کرو۔ اس کی پوجا کرو۔

تارا۔ اگر گریش بابو تمہیں اتنے پسند ہیں تو ان کو تم لیلو اور چندر مجھے دے دو۔

ساوتری۔ تارا شرم کرو۔ تم کیا کہہ رہی ہو۔

تارا۔ عوض معاوضہ تو زمانے کا رواج ہے۔ بی پنڈتانی اگر تم اسقدر پرہیزگار ہو تو جاؤ کسی مندر میں ایشور کی پوجا کرو محبت کر کے تم کیا کرو گی۔ چندر تمہارے کام کی چیز نہیں

ساوتری۔ تم محبّت کو کیا جانو۔ تم صرف اپنے آپ سے محبّت کرتی ہو۔

تارا۔ تم نے میری توہین کی۔ جاؤ جاؤ۔ ورنہ مَیں تمہیں اپنے گھر سے نکال دُونگی۔

ساوتری۔ نہیں نہیں تارا مَیں بھیک لئے بغیر نہیں جا سکتی

تارا۔ خیر۔ مَیں تو جا سکتی ہوں۔ ہاں چندر سے کہدینا مَیں رات کو دس بجے آؤنگی۔ گریش بابو کٹک سے واپس نہیں آئے

(تارا جاتی ہے)

ساوتری (مایوس ہو کر) ہری! یہ میرے دل سے تارا کے حق میں بددُعا کیوں نکل رہی ہے۔ ایشور۔ اس بددُعا کو نہ سُن۔ اس کو عقل دے۔ اس کے دل میں اپنے شوہر کی محبت دے۔

(جاتی ہے)

تیسرا منظر

(چندر کمار کے گھر کا ایک کمرہ)

(چندر کمار اور ساوتری بیٹھے ہیں)

ساوتری۔ اب دس بجنے کو ہیں۔ تارا نے اسی وقت آنے کو کہا تھا۔ میری موجودگی میں اس کا یہاں آنا کچھ اچھا معلوم نہ ہوگا۔ میرا یہاں سے چلا جانا ہی مناسب ہے۔

چندر۔ نہیں نہیں وہ اب نہیں آئیگی۔ یونہی تمہیں دق کرنے کے لئے کہتی ہوگی۔ تمہاری موجودگی میں وہ یہاں آنے کی جرات کیسے کر سکتی ہے۔

ساوتری۔ وہ ضرور آئیگی۔ اگر اور کسی غرض سے نہیں۔ تو صرف مجھے نیچا دکھانے کے لئے آئیگی۔

چندر۔ تو اگر وہ یہاں آئی تو اُسے خود نیچا دیکھنا پڑیگا۔

ساوتری۔ نہیں نہیں، چندر تمہیں یہ حق حاصل نہیں کہ جو تمہارے گھر آئے تم اُس کی توہین کرو۔ خصوصاً تارا کی۔ وہ تو تم سے محبت کرتی ہے۔

چندر۔ کیا اُسے تم محبت کہتی ہو۔

ساوتری۔ کیوں نہیں۔ محبت کے تمام مفہوم یہی ہیں۔

چندر۔ پھر تم اپنی حیثیت کو کیا کہوگی۔

ساوتری۔ تارا تو میری محبت کو محبت ہی نہیں سمجھتی۔

چندر۔ اچھا اگر وہ آہی جائے تو تم اس کمرے میں بیٹھ کر ہماری گفتگو ضرور سننا۔

ساوتری۔ توبہ توبہ یہ بھی کہیں ہو سکتا ہے۔ اگر تم اجازت دو تو میں رگھوا اور کامنی کو ساتھ لیکر ذرا سمندر کے کنارے سیر کرا آؤں۔ آج چاندنی رات ہے۔

چندر۔ نہیں نہیں یہ وقت سیر کے لئے اچھا نہیں اس وقت سمندر کے کنارے سانپوں کی کثرت ہوتی ہے۔

ساوتری۔ اچھا تو پھر باورچی خانے میں جاکر بیٹھتی ہوں۔

چندر۔ مجھے اس طرح تارا کے پنجے میں چھوڑکر جانے کا تمہیں حوصلہ ہے۔

ساوتری۔ اس میں حوصلہ کی کیا ضرورت ہے۔

چندر۔ اگر میں مجبور ہوگیا تو۔

ساوتری۔ یہ ناممکن ہے۔

چندر۔ کیوں۔

ساوتری۔ میں یہ نہیں جانتی۔ مگر میں جانتی ہوں کہ یہ ناممکن ہے۔

چندر۔ تو کیا تم مجھ پر اتنا اعتبار کرتی ہو۔

ساوتری۔ اس میں اعتبار یا بے اعتباری کا کیا سوال ہے۔

چندر (آواز سنکر) وہ دیکھو کوئی دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے تارا کے سوا اس وقت کون آسکتا ہے۔ تم سچ کہتی تھیں۔

ساوتری۔ تو میں جاتی ہوں۔

چندر۔ ٹھیرو ٹھیرو میں دروازہ نہیں کھولونگا۔ تو خود ہی واپس ہو جائیگی۔

ساوتری۔ نہیں نہیں۔ تم جاؤ۔ دروازہ کھولو۔ اس کو سیدھی راہ پر لانے کا یہی طریقہ ہے۔ ایسے معاملات میں آنکھ مچولی نہیں کھیلی جاتی۔ اگر اسے تم سے ملنے کا زیادہ موقع ملا تو اس کا خیالِ خام جاتا رہے گا۔

(جاتی ہے)

(چندر کمار دروازہ کھولتا ہے اور تارا داخل ہوتی ہے)

چندر۔ تم پھر آگئیں تارا؟

تارا۔ کیا ساوتری نے تمہیں میرے آنے کی اطلاع نہیں دی؟

چندر۔ ہاں ہاں اُس نے کہا تھا۔ مگر میں اس بات پر یقین کیسے کرسکتا تھا۔

تارا۔ ہاں یہ تو کہو تم نے ساوتری کو کیوں بُلا لیا۔

چندر۔ تو کیا مجھے اپنی بیوی کو بُلانا بھی نہ چاہیئے تھا۔

تارا۔ بیشک۔ مگر تمہاری بیوی مَیں ہوں۔ میری موجودگی میں تم کسی دوسری عورت کو بیوی نہیں بنا سکتے۔ اس سے کہدو کہ وہ چلی جائے۔

چندر۔ تم ہی اس سے کیوں نہیں کہہ دیتیں۔

تارا۔ مَیں کہہ چکی ہوں وہ نہیں مانتی۔ مگر چندر یاد رکھنا۔ اس کا انجام اچھا نہ ہوگا۔

چندر۔ کیوں اس کا انجام اچھا کیوں نہ ہوگا۔

تارا۔ اگر وہ یہاں سے نہ گئی تو مَیں اسے مار ڈالونگی۔

چندر۔ اس کا قصور۔

تارا۔ مَیں قصور وصور نہیں جانتی۔ اگر تم نے اسے نہ بھیجا تو مَیں تمہیں بھی مار ڈالونگی۔

چندر۔ بہت بہتر۔ اگر تمہاری یہی خواہش ہے تو مار ڈالو

تارا۔ تم شاید میری بات کو سچ نہیں سمجھتے۔

چندر۔ کیوں نہیں۔

تارا۔ ساوتری کہاں ہے اسے یہیں کیوں نہیں بُلا لیتے۔

چندر۔ اس کو یہاں بُلانے سے کیا حاصل۔

تارا۔ مَیں اس سے صلح کر لونگی۔

چندر۔ لیکن تم تو ابھی ابھی اسکی جان لینے کو کہہ رہی تھیں۔

تارا۔ تو کیا تمہیں میری باتوں پر یقین آگیا تھا۔ وہ ہے کہاں۔ وہ برابر کے کمرے میں ہماری باتیں سُن رہی ہوگی؟

چندر۔ کیا تم اسے ایسا سمجھتی ہو۔

تارا۔ نہیں نہیں وہ ضرور سُن رہی ہوگی مَیں جاتی ہوں (جاتی ہے)

چندر۔ کیا مصیبت ہے!

(تارا واپس آتی ہے)

تارا۔ ساوتری تو وہاں نہیں ہے۔

چندر۔ وہ باورچی خانہ میں ہے۔

تارا۔ کیا وہ کھانا بھی خود ہی پکاتی ہے۔ تمہارے ہاں باورچی نہیں۔

چندر۔ وہ نہ پکائے تو پھر اور کون پکائے مَیں گریش بابو کی طرح بڑا آدمی تو نہیں۔

تارا پھر اسی کا نام لیا۔ تم باز نہیں آؤ گے چندر۔

چندر۔ رات زیادہ ہو گئی ہے تم اب گھر جاؤ تارا۔

تارا۔ ہاں رات زیادہ ہو گئی ہے۔ اب مَیں گھر جا کر کیا کرونگی یہیں سو رہونگی۔

چندر۔ بڑی خوشی سے، جاؤ ساوتری کے کمرے میں سو رہو۔

تارا۔ مگر پھر صبح تم ساوتری کو زندہ نہ پاؤ گے۔

چندر۔ خیر دیکھا جائیگا۔

تارا۔ تو مَیں اسے بُلائے لیتی ہوں۔

(جاتی ہے)

چندر۔ آج تو مجھ پر تارا کا کچھ اثر نہ ہوا۔ ساوتری نے سچ کہا تھا۔ اس کی موجودگی میں میں کبھی بگڑ نہیں سکتا۔

(تارا اور ساوتری ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے داخل ہوتی ہیں)

چندر (خوش ہوکر) دیکھو تارا اب تم دونوں کیسی اچھی معلوم ہوتی ہو۔ واقعی تم کو دو بہنوں کی طرح رہنا چاہئے

تارا۔ بیشک تم سچ کہتے ہو چندر۔ کل ساوتری! کھانا میرے ہاں کھانا۔

ساوتری۔ بہت اچھا۔ مگر میں باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتی۔

تارا۔ نہیں نہیں میں تمہارے لئے خود پکاؤنگی۔

ساوتری۔ تمہیں تکلیف ہوگی۔

تارا۔ تکلیف کیسی ہاں ساوتری مجھے معاف کر دینا۔ کل میری زبان سے الفاظ ہی ایسے نکل گئے تھے۔ اب میں جاتی ہوں۔ تمہارے سونے کا وقت ہوگا۔

(جاتی ہے)

چندر۔ دیکھا ساوتری تمہاری ایک دن کی صحبت نے اس کو کیا سے کیا کر دیا۔

ساوتری۔ پرماتما کرے تمہارا خیال درست ہو۔

چندر۔ آؤ۔ اب چلیں۔ مجھے تو نیند آرہی ہے۔

پردہ

چوتھا منظر

(گریش بابو کا مکان)

(گریش بابو اور تارا بیٹھے ہیں)

تارا۔ کل چندر بابو کی بیوی آئی تھی۔ بہت شریف عورت ہے۔ میں نے اسے آج کھانے پر بلایا ہے۔

گریش۔ بہت اچھا کیا۔

تارا۔ مگر باورچی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہیں کھاتی۔

گریش۔ پھر کیا انتظام کرنا چاہئے۔ تم تو کھانا پکانا نہیں جانتیں۔

تارا۔ مجھے کھانا پکانے کی کیا مصیبت پڑی ہے۔ باورچی کو پکانے دو۔ میں کہہ دونگی میں نے پکایا ہے۔ وہ دیکھنے تو آئیگی نہیں۔

گریش۔ نہیں نہیں ایسا نہ کرنا چاہئے۔ کسی کے عقیدے کی ذلت کرنا بہت برا ہے۔

تارا۔ تو پھر تم خود پکالو۔ میں تو کھانا پکانا نہیں جانتی۔ تم ہمیشہ اپنے کھانا پکانے کی تعریف کیا کرتے ہو۔

گریش۔ تو کیا تم سمجھتی ہو کہ میں جھوٹ بولتا ہوں۔ لو میں لباس تبدیل کرلوں۔ آج میں خود ہی کھانا پکاؤنگا۔

(جاتا ہے)

تارا۔ یہ بھی اچھا ہوا۔ میں خود ہی چاہتی تھی۔

(ساوتری داخل ہوتی ہے)

ساوتری۔ میں جلدی ہی چلی آئی۔ انھوں نے کہا۔ کہ تمہیں کھانا پکانے میں تکلیف ہوگی۔ میں خود تمہارے ساتھ مل کر کھانا پکاؤنگی۔

تارا۔ نہیں اتنی تکلیف کی کیا ضرورت ہے۔ تمہارے لئے گریش بابو خود کھانا پکا رہے ہیں۔

ساوتری۔ گریش بابو خود پکا رہے ہیں؟ توبہ توبہ ایسا کہیں ہوسکتا ہے۔ جاؤ ان کو بلالو۔ میں خود پکاؤنگی۔

تارا۔ نہیں نہیں ان کو کھانا پکانے کا بہت شوق ہے اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

ساوتری۔ دیکھو تو تارا گریش بابو تم سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ تمہاری تکلیف کے خیال سے خود اتنے بڑے آدمی ہوکر کھانا پکا رہے ہیں۔ تم کو ان سے اتنی ہی محبت کرنی چاہیے۔

تارا۔ ساوتری اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ میں اب ان سے محبت کرونگی۔

ساوتری۔ شاباش تم سے یہی امید ہے۔ اچھا اب ان کو بلالو۔ یہ مناسب نہیں۔

تارا۔ تو جاؤ۔ پہلے ہاتھ منہ دھو لو پھر باورچی خانے میں چلیں گے۔

ساوتری۔ اچھا۔

(جاتی ہے)

تارا۔ یہ اور اچھا ہوا۔

(جاتی ہے)

پردہ

پانچواں منظر

(چندر کمار کے مکان میں دفتر کا کمرہ)

(چندر کمار مقدمات کی مثلیں دیکھ رہا ہے)

چندر۔ یہ آجکل کے جج بھی عجیب فیصلے لکھتے ہیں لیکن اگر وہ ایسے فیصلے نہ لکھیں۔ تو وکیلوں کا گذارہ کیسے ہو۔

(ساوتری گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے)

ساوتری کیوں خیر تو ہے۔

ساوتری۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ کھانا کھاتے ہی میری طبیعت خراب ہوگئی۔ اب تک سینہ میں سخت جلن ہے اُوہ پھر چکر آیا۔ میں کھڑی نہیں ہوسکتی۔

(صوفے پر لیٹ جاتی ہے)

چندر۔ غضب ہوگیا۔ تارا نے ضرور تمہیں زہر کھلا دیا ہے۔ میں ڈاکٹر کو بلاتا ہوں۔

(بھاگتا ہوا جاتا ہے)

ساوتری۔ نہیں نہیں۔ ڈاکٹر کو مت بلاؤ۔ تارا سزا سے نہ بچ سکیگی۔ اس میں تمہاری بدنامی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ میں مرجاؤں۔ تم کہہ دینا مجھے ہیضہ ہوگیا تھا۔

چندر۔ تارا کو ضرور سے ملنی چاہیئے۔ میں جاتا ہوں۔

ساوتری۔ مت جاؤ۔ مت جاؤ۔ تمہیں میری قسم مت جاؤ۔

چندر۔ تم علاج کے بغیر مر جاؤ۔ اور میں کھڑے کھڑے دیکھا کروں۔

(پھر جانا چاہتا ہے)

ساوتری۔ ٹھیرو۔ ٹھیرو۔ اگر ڈاکٹر پوچھے تو کہہ دینا کہ میں نے تم سے ناراض ہو کر خود زہر کھا لیا ہے۔ خبردار تارا کا نام نہ لینا۔

(چندر جاتا ہے)

ساوتری۔ ہری! میری موت کے بعد میرے شوہر کو برائیوں سے محفوظ رکھنا۔ میں اس کے سوا اور کچھ نہیں چاہتی

(بیہوش ہو کر مر جاتی ہے)

پردہ

چوتھا باب

پہلا منظر

(چندر کمار کا مکان)

(چندر کمار گیتا پڑھ رہا ہے۔ گریش بابو داخل ہوتا ہے)

گریش۔ مجھے معاف کیجیئے گا چندر بابو۔ میں اتنا نادم اور شرمسار تھا۔ کہ آنے کی جرأت نہ کر سکا۔ کتنا افسوس ہے کہ آپ کی بیوی ہمارے ہاں کھانا کھا کر ہیضہ میں مبتلا ہو گئی۔ ان کی موت کا بار ہمارے سر پر ہے۔

چندر۔ نہیں نہیں۔ آپ کا اس میں کیا قصور ہے۔ ایشور کی یہی مرضی تھی۔

گریش۔ مگر میرے دل سے یہ افسوس کبھی نہیں مٹ سکتا

چندر۔ نہیں آپ افسوس نہ کیجیئے۔ یہ تو تقدیر کے کھیل ہیں۔

گریش۔ میری بیوی کے دل پر تو اسقدر صدمہ پہنچا ہے کہ وہ بیمار ہو گئی ہے۔ آپ کے ہاں افسوس کے لئے بھی نہیں آ سکی۔

چندر۔ آپ ان کو سمجھا دیجیئے۔ اس میں ان کا یا کسی کا کیا قصور ہے۔ اب افسوس کرنے سے کیا حل جائیگا۔

گریش۔ میں تو اسی گاڑی سے کٹک جا رہا ہوں۔ آپ ذرا میرے گھر کا خیال رکھیئیگا۔

چندر۔ ضرور آپ بیفکر رہیئے۔

گریش۔ چندر بابو اب مجھے اجازت دیجیئے۔ گاڑی کا وقت ہو گیا ہے۔ افسوس کہ میں آپ کے پاس زیادہ دیر ٹھیر کر آپ کی دلجوئی بھی نہیں کر سکتا۔

(جاتا ہے)

چندر۔ گریش بابو سے شوہر کی قدر نہیں کرتی۔ تارا کی فطرت کسقدر ذلیل ہے۔ کیا وہ اب بدی کے گہرے سے

گہرے غار میں گر کر بھی یہ سنبھلیگی۔ پرماتما اس کو تو ہی بچا۔

(تارا داخل ہوتی ہے)

تارا۔ یہ کیا ہو گیا چندر۔

چندر۔ دور ہو جا مردار! پاپن! چڑیل! میرے سامنے آتے ہوئے تجھے شرم نہیں آتی۔ کس دل سے تو نے اس دیوی کو زہر دے کر ہلاک کر ڈالا۔

تارا۔ تمہیں معلوم ہی ہو گیا ہے تو اب چھپانے سے کیا فائدہ۔

چندر۔ ایسے گناہ کو کیا تم چھپا بھی سکتے ہو۔ جاؤ۔ اس دیوی کو دعا دو جس نے تم کو پھانسی سے بچالیا۔

تارا۔ میرا تم کیا بگاڑ سکتے ہو۔ گریش بابو نے کھانا پکایا تھا اور ساوتری باورچیخانہ میں خود موجود تھے۔ ساوتری مجھے کیوں بچاتی۔

چندر۔ اس لئے کہ وہ دیوی تھی۔ اور اپنی پاک خصلت نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ تم چڑیل ہو۔ اور اپنی خباثت سے ابتک باز نہیں آتیں۔

تارا۔ چندر میں نے جو کچھ کیا ہے تمہیں حاصل کرنے کے لئے کیا ہے۔ تم مجھے برا بھلا مت کہو۔

چندر۔ تم اس سے زیادہ سزا کی مستحق ہو۔ اب تم یہ الزام مجھی پر لگاتی ہو۔

تارا۔ تم ہی ہو اس ساری آفت کا سبب۔ مجھے برا کہنے سے کیا فائدہ۔

چندر۔ جاؤ تم سے بات کر کے بھی گنہگار بن رہا ہوں۔

(جاتا ہے)

تارا۔ یہ غصہ بہت دن تک نہیں رہیگا۔ ساوتری کا صدمہ دور ہو لینے دو۔ پھر تم میرے ہی ہو جاؤ گے۔ جیسے میں تمہارے قدموں میں ذلیل ہونے کے لئے آتی ہوں بہت جلد تم میرے قدموں میں پڑے ہو گے میں جانتی ہوں تم کو مجھ سے ابتک محبت ہے۔

(ساوتری کی روح نظر آتی ہے)

تارا۔ آہ۔ آہ۔ آہ۔ یہ کیا تم کون ساوتری۔

(ساوتری کی روح اشارہ کرتی ہے)

تارا۔ میں نے ... تو ... تمہیں زہر نہیں دیا۔

(ساوتری کی روح پھر اس کی طرف اشارہ کرتی ہے)

نہیں۔ نہیں ....

(بیہوش ہو کر گر جاتی ہے)

دوسرا منظر

تارا کی خوابگاہ

(تارا لیٹی ہوئی ہے۔ مگر بہت بے چین ہے)

تارا۔ لوگ دیوانگی سے کیوں ڈرتے ہیں۔ اگر میں پاگل ہو جاؤں۔ تو اس مصیبت سے بچ سکتی ہوں۔ میں تو سمجھتی تھی کہ ساوتری کی موت نے مجھے اس کے پنجے سے چھڑا دیا

ہے۔ مگر یہ تو اب دن رات میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔

(ساوتری کی روح پھر نظر آتی ہے اور وہی اشارے کرتی ہے)

آہ آہ پھر وہی ......

(بیہوش ہو کر گر جاتی ہے)

(خادمہ آواز سنکر گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے اور اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے دیتی ہے)

تارا (ہوش میں آکر) میں مر رہی ہوں جلدی کسی کو بلاؤ

خادمہ۔ ڈاکٹر کو۔

تارا۔ نہیں اب یہ روگ ڈاکٹر کے بس کا نہیں۔ چندر بابو کو بلاؤ۔ وہ جو سامنے رہتے ہیں۔ انسے کہو گریش بابو کی بیوی مر رہی ہے۔ جلدی آئیں۔

(خادمہ جاتی ہے)

آج اگر گریش بابو یہاں ہوتے تو مجھے اتنی تکلیف نہ ہوتی۔ یہ انہی کو ستانے کی سزا ہے یا ساوتری کو زہر کھلانے کی۔

(پھر ساوتری کی روح نظر آتی ہے)

آہ ساوتری ساوتری مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے کئے پر پشیمان ہوں۔ بہت زیادہ پشیمان ہوں۔

(روتی ہے)

(چندر کمار داخل ہوتا ہے)

چندر۔ کیوں تارا تم نے مجھے کیوں بُلایا۔ بیماری کا بہانہ کر کے مجھے اپنے گھر میں بُلانے کی جرأت تم کو کیسے ہوئی۔

تارا۔ یہ بہانہ نہیں۔ میں سچ مچ مر رہی ہوں۔ بتاؤ چندر کیا مرنے کے بعد بھی انسان کو سزا ملتی ہے۔ کیا یہ جہنم کوئی چیز ہے۔

چندر۔ ہے کیوں نہیں گنہگاروں کے لئے جہنم کے سوا اور کوئی ٹھکانا نہیں۔

تارا۔ تو جہنم میں کیسی تکلیف ہوتی ہے۔

چندر۔ اس تکلیف سے ہزاروں درجہ زیادہ۔

تارا۔ اف۔ جب میں اس تکلیف کو برداشت نہیں کر سکتی۔ تو جہنم کے عذاب کو کیسے برداشت کر سکونگی۔

چندر۔ تم اپنے گناہوں سے پشیمان ہو کر توبہ کرو۔ تمہاری دُنیا اور عاقبت دونوں سدھر جائینگی۔

تارا۔ تو کیا میں کسی طرح اس عذاب سے نجات پا سکتی ہوں۔ چندر بتاؤ۔ بتاؤ۔ میں اس گناہ کا کفارہ کس طرح ادا کروں۔

چندر۔ اِن بُرے خیالوں کو دل سے نکال کر اپنے سوامی کی بھگتی کرو۔

تارا۔ اور تمہیں۔

چندر۔ مجھے اپنا بیٹا سمجھو۔

تارا (جلدی سے چندر کے مُنہ پر ہاتھ رکھ کر) بس بس یہ الفاظ مُنہ سے نہ نکالو۔

چندر۔ تو میں جاتا ہوں۔ اب تم مجھے نہ دیکھ سکوگی۔

(جاتا ہے)

تارا۔ آہ میں جانتی ہوں، میں تمہیں حاصل نہیں کر سکتی مگر تمہاری امید کو چھوڑ دوں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ مگر جہنم کا عذاب! کچھ پروا نہیں میں سب کچھ برداشت کر لونگی۔

(پھر ساوتری کی رُوح نظر آتی ہے)

آہ آہ چھوڑ دونگی۔ چھوڑ دونگی۔ میں چندر کو اپنا بنانے کی امید چھوڑ دونگی۔ مجھے نہ ستاؤ۔ ہاں بتاؤ بتاؤ کہ میں چندر کو کس طرح اپنا بیٹا سمجھ سکتی ہوں۔

(رُوح اشارہ کرتی ہے)

ہیں تم نہیں جاتیں۔ تم تو میرے قریب آرہی ہو۔۔۔

آہ ۔۔۔ (بیہوش ہوجاتی ہو)

(چندر داخل ہوتا ہے اور پانی کے چھینٹے دیتا ہے)

تارا (ہوش میں آکر) چندر میں کوشش کر رہی ہوں۔ مگر دل نہیں مانتا۔ ہاں مجھے تم خود ہی سکھا دو کہ میں کس طرح اس خیال کو دل سے نکال دوں۔۔۔۔

چندر۔ میں تمہیں ماں کہہ کے پکارتا ہوں۔ جواب دو ماں!

تارا ۔۔۔۔۔۔ آہ میری زبان سے لفظ نہیں نکلتے۔ میں نہیں کہہ سکتی۔

چندر۔ ماں۔

تارا۔ بے ۔۔۔ بے ۔۔۔

چندر۔ ماں

ماں۔ بیٹا ۔۔۔

(بیہوش ہوجاتی ہے)

(چندر اس کے پاؤں کو چھو کر سلام کرتا ہے)

پردہ

تیسرا منظر

گریش بابو کا مکان

(گریش بابو بیٹھے ہیں۔ تارا گریش بابو کے ناریل کے حقّہ پر چلم رکھ کر اُسے پھونکتی ہوئی آتی ہے۔ اور حقّہ کو گریش بابو کے ہاتھ میں دیکر ان کے پاؤں دبانے میں مصروف ہوجاتی ہے۔ ملازم آتا ہے)

ملازم۔ چندر بابو آپ سے ملنے کے لئے آئے ہیں۔

گریش بابو۔ (خوش اور حیران ہوکر) چندر بابو! (تارا سے) کوئی تین سال کے بعد پھر آتے ہیں۔ نہ معلوم بیچارے کا کیا حال ہوگا۔

(جاتا ہے)

(تارا کرسی پر ہاتھ رکھ کر سر جھکا لیتی ہے)

(ساوتری داخل ہوتی ہے)

ساوتری۔ تارا۔

تارا۔ (گھبرا کر دیکھتے ہوئے) کون۔ ساوتری۔ میرے دل میں تو اب چندر کا نام سنکر بھی خیال نہیں آیا۔ پھر پھر تم کیوں آئی ہو۔ کیا اب بھی تم کو اطمینان نہیں ہوا

ساوتری (ڈھکیل) نہیں مانا۔ تم اب دیوی ہوئیں۔ تمہاری اشیرباد لینے کے لئے آئی ہوں۔ میں مری نہیں زندہ ہوں

تارا۔ ساوتری تم زندہ ہو۔ آہ

(بغلگیر ہو جاتی ہیں)

پردہ

تصویر جذبات

گناہ گار رہوں پھر بھی گناہ گار نہیں
مئے خودی کا نشہ مجھ کو زینہار نہیں

سلوک راہ کو درکار جذب روح بھی ہے
خشوع نفس کا تنہا یہاں گزار نہیں

قدم قدم پہ یہاں دام نفس پنہاں ہیں
نہ چل یہ راہ کہ زاہد تو ہوشیار نہیں

یہ کس کا جذب محبت ہے اس طرح ساری
کہ کوئی ذرہ نہیں ہے جو بے قرار نہیں

قدم ہے غیر کا جنبک کہ درمیاں سالک
فنائے عشق کا واللہ اعتبار نہیں

رگوں سے کھنچ کے گلے مل رہی ہے روح انکی
طبیب وصل ہے یہ رنگ احتراز نہیں

یہ کہدو شیخ سے کیوں مدعی عصمت ہے
وہ آدمی ہی نہیں جو گناہ گار نہیں

شریک ہوش بھی ہے مے گساری میں
حرام کرکے پیوں مے وہ مے گسار نہیں

قیامت آگئی آغاز کار ہی سے ہمیں
ہمارے دل پہ کوئی داغ انتظار نہیں

یہ جلوہ گاہ حقیقت ہے کھائے نہ فریب
یہ دل ہے حضرت موسے کوئی شرار نہیں

ہوں قید میں بھی میں تقلید رسم سے آزاد
غلام ہوں، پہ غلامی سے شرمسار نہیں

آزاد سبحانی

تعرف الاشیاء باضدادہا

یوں تو عنوانِ بالا' ایک عام حقیقت ہے جسے تنازع للبقا کی ایک خاص حالت کی تفسیر ہوتی ہے۔ مگر اس کی سب سے زیادہ روشن صداقت جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔ وہ "مسئلہ ترقیِ اُردو" ہے۔ جن غفلتوں اور جن مخالفتوں سے زبان اُردو کو سابقہ ہُوا' کم از کم ہندوستان کی کسی دوسری زبان کو ایسے مواقع پیش نہیں آئے۔ اور اگر اس میں بقاء و ارتقا کے طبعی عناصر موجود نہ ہوتے تو یقیناً اُردو سے صفحہ ہند معرّا ہو گیا ہوتا لیکن اُس کی عظمت اور وسعت بیحد مخالفتوں اور بے انتہا غفلتوں کے باوجود' باقی رہنے ہی میں مضمر ہے۔ زبان' افہام و تفہیم کا ذریعہ ہونے کے سبب سے' انسانی ترقی کا فطری واسطہ ہے' مگر چونکہ ہماری قوم خود ترقی کے احساس سے محروم تھی۔ اس لئے اس ناگزیر ذریعہ ترقی سے بھی بے اعتنا رہی۔ لیکن اس احساس کے ساتھ اب زبان کی طرف بھی میلان ہُوا ہے۔ اور اب اس میلان کے مظاہر بھی نمایاں ہوتے جاتے ہیں۔

ملک میں' ترقیِ اُردو کا مسئلہ چھڑ گیا ہے لیکن "انجمن ترقیِ اُردو" اور "دار المصنّفین" کے محدود' مگر منتظم و قابل احترام دوائر عمل کے سوا' شاید ہی کوئی ایسی انجمن یا جماعت ہو جو محض اس خدمت کی بجا آوری میں مصروف ہو' اور اپنی خدمات کا کوئی نتیجہ عمل پیش کر سکے لکھنؤ میں' دائرۂ ادبیہ بھی اسی مقصد سے قائم ہے۔ اور ہمیں ذاتی طور پر علم ہے۔ کہ دائرہ ادبیہ کے ارباب کار' کافی سرگرمیِ مساعی سے کام لے رہے ہیں لیکن اُس کی کس مپرس حالت نے' ابھی تک نمودِ عام کا موقع نہیں دیا۔

پنجاب یونیورسٹی کی اردو نوازیوں نے سارے ملک پنجاب میں' اُردو کو نہ صرف شاہ راہ ارتقاء پر لگا دیا ہے بلکہ اپنی بیحد دلچسپی کا اظہار کر کے' دوسری معاصر یونیورسٹیوں کے لئے قابلِ توجہ ترغیب و قبول کی مثالیں پیش کی ہیں۔ مگر عرصہ تک کسی یونیورسٹی نے' پنجاب یونیورسٹی سے یہ ضروری اور ناگزیر سبق نہ پڑھا۔ تا آنکہ اُردو کی وسیع اہمیت نے خود ان کو مجبور نہ کر دیا چنانچہ عرصہ کے بعد بنگال یونیورسٹی نے اس میدان میں ایک قدم بڑھایا۔ اور پھر بمبئی یونیورسٹی میں اس تحریک پر غور و خوض کی نوبت آئی۔

لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ اُس صوبہ میں کیا ہُوا ؟ جو اُردو کا مولد و مہد ہے اور جس صوبہ میں اُردو بلا شرکتِ غیرے اپنے وجودِ فرید سے چھائی ہُوئی ہے۔ اور جہاں کے لوگ ملکیت اُردو کے سب سے بڑے مدعی ہیں۔ تو اس سوال کا جواب نہایت افسوسناک اور ندامت انگیز ہو گا۔ اس شدتِ تشنگی

کی تسکین دار المصنفین یا دائرۃ ادبیہ کے حوالوں سے نہیں ہو سکتی۔ اس کے جوابدہ وہ جماعت ہے جو سارے صوبہ کے امورِ تعلیم کی ذمہ دار ہے۔ اور جواب صاف ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی نے بوصف اس کے کہ اس پر ہر نوع اُردو کی حفاظت و بقاء اور کفالت و ترقی کی صحیح اور واجبی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اور باوجود اس کے کہ ملک کے دوسروں صوبوں نے اردو کے جائز احترام میں اچھی اچھی مثالیں پیش کیں، لیکن الہ آباد یونیورسٹی حیرت انگیز بے اعتنا روش پر قائم رہی۔

علیگڑھ کے مرکزِ تعلیم (مسلم یونیورسٹی) میں (جو اردو ہی جہاں) میں قائم ہے۔ جہاں اُردو پیدا ہوئی ہے۔ اور جس کے بانیٔ اعظم کو لوگ علاوہ محبِ قوم ہونے کے امام زبانِ اُردو بھی باور کرتے ہیں۔ اور جس کے بانیٔ اعظم کے پوتے (سید راس مسعود) نے حیدر آباد میں اُردو کی یونیورسٹی قائم ہوتے وقت تاسیسی مجاہدات کئے ہیں) ہمیں نہیں معلوم کیا ہو رہا ہے؟

بارے اس خبر کا ہم نے دل سے خیر مقدم کیا ہے کہ الہ آباد یونیورسٹی میں ایک انجمن "انجمن اُردو" کے نام سے قائم ہوئی ہے۔ اُس کے مستقل صدر، سر کلاڈ ڈیلا فوس بالقابہ وائس چانسلر الہ آباد یونیورسٹی ہیں۔ اور دوسرے ارکانِ عمل، صوبہ کے بہترین تعلیم یافتہ اصحاب ہیں۔

اس انجمن کا افتتاحیہ جلسہ زیرِ صدارت آنریبل مسٹر جسٹس محمد رفیق، ۲۷ جنوری ۱۹۲۳ء کو لکچر تھیٹر الہ آباد یونیورسٹی میں، نہایت جوش و عظمت کے ساتھ منعقد ہوا۔ اور جس میں شہیر علم و فضل مسٹر عبد اللہ یوسف علی نے افتتاحیہ تقریر کی۔ جو زبانِ اُردو کی ایک مختصر تاریخ اور اسباب تنزل اور توجیہات ترقی پر مشتمل تھی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس انجمن کا انعقاد یونیورسٹی الہ آباد میں بہر کیف مبارک اور توقعات آفرین ہے۔ اور ہم اربابِ انجمن کی مساعی کو اس حد تک بھی مشکور ہی سمجھتے ہیں۔ ہمیں اعتماد بھی ہے کہ ارکانِ انجمن اپنے امکانیات کو ترقیٔ اُردو میں صرف فرمائیں گے۔ اور تالیف و تراجم اور نشر و اشاعت کا کام بوجہ احسن انجام دینگے۔ مگر کاش کہ اس انجمن کی تحریکات داخلِ یونیورسٹی میں کوئی نتیجہ آفرینی کریں اور خود یونیورسٹی کو اُردو کی تعلیم دیں۔ ورنہ یوں تو تقریباً ہندوستان کے ہر کالج میں اس قسم کی ضمنی انجمنیں قائم ہیں۔

احمد مجددی

ندائے قلب

ستم ست گر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو ز غنچہ کم نہ دمیدۂ در دل کشا بہ چمن درآ

تو ہی وُہ انسان ہے جس کی خود خالق کو تلاش ہے تو ہی وہ مخلوق ہے جس پر آفرینش کو ناز ہے۔ تو ہی وُہ خاکی مینا ہے جس میں روزِ ازل کی کھینچی ہُوئی مئے دو آتشہ روپوش ہے۔ تو ہی وہ ہستی ہے۔ جس کے ہر ذرّہ میں ہزاروں عالم کو خاکستر بنا دینے کی قوت مخفی ہے۔ تو ہی وہ جوہر ہے۔ جس کے ہر ارتعاشِ خفی پر لاکھوں ثوابت و سیارے نثار ہونے کو تیار ہیں۔ کائنات تیری ملکیّت ہے۔ سلطنت تیرے لئے ہے۔ اور لذّاتِ عالم کا تو ہی مستحق وارث ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ تیرا نوحۂ غم اشکہائے حسرت کے خونی قطروں سے رنگین ہے۔ اور یاس و نامرادی نے تجھ ہی کو اپنے لئے مخصوص کر لیا ہے؟

کیا تیرے گذشتہ واقعات حوصلہ شکن ہیں؟ تیری زندگی کا ہر لمحہ گمنامی کی سیاہ چادر سے لپٹا ہُوا ہے۔ تیری ماضی کی تابوت پر زرّین مرقعوں کے ناشگفتہ پھولوں کی پژمردہ پنکھڑیوں کے سوا ایک بھی تازہ و شگفتہ پھول نہیں؟ کیا تو محسوس کرتا ہے کہ تیرے گرد و پیش لذّت و مسرت کی دیویاں اور رنگ و بو کی پتلیاں اٹکھیلیاں کرتی ہیں۔ لیکن تو اِن کی روح نوازیوں سے محروم ہے؟ لیکن کیا تجھے اس کا بھی کبھی احساس ہوتا ہے۔ کہ خود تیرے مرکزِ دل میں ایسی قوتیں پنہاں ہیں جو صحیح طریقِ عمل پا کر گلہائے رُوح نواز اور اثمار حیات بخش میں صورت پذیر ہو سکتی ہیں؟

خاموش التجائیں اور ناگفتہ مدعائیں حیات جاوید کی سرگوشیاں ہیں۔ جو روحوں کو ہمت و عمل کی تعلیم دیتی ہیں ہر حوصلہ مندی کے ساتھ اس کی بار آوری کی روشن تصویر بھی بازوئے اُمید پر پرتو فگن رہتی ہے۔ اگر تیرا دماغ پراگندہ ہے۔ اگر مخالف تاثرات سے تیرے دماغ میں شکوک و اوہام پیدا ہوتے ہیں۔ خود اعتقادی' اور استقلال بالکل مفقود ہیں۔ تو یاد رکھ کہ حادثات زمانہ تجھے اپنا شکار بنا لینگے۔ تو زندگی کے بحرِ تلاطم خیز میں اُس طوفان زدہ کشتیبان کی طرح غلطاں رہیگا۔ جو تمام لوازمات جہازرانی کھو چکا ہے۔ اور بحر بیکراں کی سطح پر آشوب پر وحشتناک لہروں کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے۔ آ۔ میں تجھے ایک ایسا جادۂ عمل بتاؤں کہ تیری ناتواں کشتی امید اور

مسرت کی فرحناک ساحل تک پہنچ جائے اور وادی انبساط
کی فضاء لالہ زار میں تیری کامیابی کا پرچم لہرانے لگے۔

اپنے تخیلات کو تمام ہستی کے مرکز فکر پر مجتمع کر۔
خارجی شور و فساد۔ رسمی ہنگامہ آرائی اور تمام ماسوا سے
منقطع ہو کر اپنی روح کو حیات جاوید کے جوہر جان نواز
میں مستغرق کر۔ اور کامل غور اور توجہ سے قلب کی ندائے
صداقت پر کان دے۔ جو اہتزازات خفی سے تیرے
دماغ میں ان رموز حیات کو منفوذ کریگی۔ جن سے افراد
اور اقوام کو طاقت مسرت۔ کامیابی اور کل وہ نعمتیں ملتی
ہیں جن کی انسان تمنا کر سکتا ہے۔

کیا دنیا تیرے ہی لئے نہیں پیدا کی گئی ہے؟
قدرت اور صنعت کے حسن کرشمہ ساز سے محظوظ ہونے
لذات زندگی سے مسرور ہونے۔ اور ان بے پایاں
خزانوں پر قبضہ کرنے کے لئے جو زمین کی پشت پر لدے
ہوئے ہیں یا سمندر کے سینے میں مستور ہیں۔ تو ہی نہیں
پیدا ہوا ہے؟ دنیا تیری جائداد ہے۔ قانون قدرت
کے مطابق تو ہی اس کا جائز مالک ہے۔

صفحۂ عالم کی کسی چیز سے خوف مت کھا۔ تاریکی
کی موہوم صورتوں سے مت ڈر۔ کسی مقام پر قرار نہ لے
گردش پیہم ہی کا نام حیات ہے۔ دائمی حرکت
اور ابدی عمل سے اپنی حیات جاوید کا ثبوت پیش کر۔
دنیا کی کوئی زندہ روح اس قابل نہیں کہ تو اپنا سر نیاز
اس کے آگے خم کرے۔

عالم حیات کی کوئی روح نہ تجھ سے بڑی ہے اور
نہ تجھے مضرت پہنچا سکتی ہے۔ جس طرح آفتاب کی
ضوفشانیوں کے ساتھ فضاء آسمان کی تاریک خطیں
یکایک معدوم ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح تیری خودشناسی
پر بھی تمام مخالفتوں کی ظلمت مآبی فنا ہو جائے گی۔ تیرا
دل جس چیز کا متمنی ہے۔ وہ لاریب تیری ہی ہے۔
سحر طراز لہجہ میں اپنے مدعا کو بیان کر۔ اپنے ہاتھوں کو
تحکمانہ انداز سے بڑھا۔ اور اس چیز پر قابض ہو۔ جو
یقینی تیری ہی ہے۔ سحر آمیز کلام کر۔ دلبرانہ اٹھ۔ اور
اپنے دستور العمل کو پورا کر۔ مخالفت تاثرات کی
کچھ بھی پروا نہ کر۔

تو جو کچھ ہونا چاہتا ہے ہو جا۔ اور اپنی
جائداد پر قبضہ کرنے کے لئے کسی غیر کی
اجازت کا خواستگار ہو کر "اسرار خودی" پر
داغ مت لگا۔

محمد امیر الحسن

نوائے وارفتگی

وہ دل کہ جس پہ ناز تھا مجھے کبھی شباب میں　　کیا اُسی نے مبتلا کچھ اس طرح عذاب میں
کہ پھر نہ مل سکا سکوں

نہ دن کو راحت و خوشی نہ شب کو لطفِ خواب ہے　　یہ جانِ ناتواں ہے اور وفورِ اضطراب ہے
نہ پُوچھ سوزشِ دروں

گذر رہی ہے زندگی عجب غم و ملال میں　　بتاؤں کیا کہ محو ہوں مَیں آہ کس خیال میں
کہوں تو ہائے کیا کہوں

نہ قلب میں شگفتگی، نہ ذوقِ سیرِ باغ ہے　　نہ حسرتِ بہار ہے نہ عیش کا دماغ ہے
ہُوا ہے کیا مجھے جنوں

گھری ہے جانِ مضمحل ہجومِ رنج و یاس میں　　بتائے تو کوئی مجھے اگر مَیں ہوں حواس میں
تو پھر یہ بیخودی ہے کیوں

نہ جی ٹھکانے ہے مرا نہ جسم و جاں کا ہوش ہے　　نہ دل میں ولولے رہے نہ ولولوں میں جوش ہے
عجیب کشمکش میں ہوں

شریکِ غم ہو کون اب مری شبِ دراز میں　　دلِ غریب مٹ چکا تری رہِ نیاز میں
ہے رنجِ بیکسی فزوں

طبیعت آج خود بخود مری بہت اداس ہے　　عجیب کچھ خلش سی ہے عجیب کچھ ہراس ہے
کیا ہے مجھ پہ کیا فسوں

بتاؤں کیا کہ کیا ہے حال فرطِ اشتیاق میں　　بنی ہے جانِ زار پر ترے غمِ فراق میں
ہے حالِ دل بہت زبوں

گلہ نہ غیر کا مجھے، نہ شکوۂ حبیب ہے
کسی کو کیا جو وقفِ غم یہ جانِ غم نصیب ہے
عبث ہے کوئی سرنگوں

ہے محویِ شکستہ دل عجیب خلفشار میں
نہ دل میں تابِ ضبط ہے نہ چشم دجلہ بار میں
رواں ہے ایک موجِ خوں

مرے لئے اگر یہی غم جگر گداز ہے
یہی مزاجِ عاشقی دوائے سوز و ساز ہے
تو پھر میں کس طرح جیوں

محوی صدیقی

تاثرات

ہر ایک پھول ہے گلشن میں محوِ راز و نیاز
بڑے غضب کے ہیں ابکی بہار کے انداز

ہوس پرست نگہ سے نہ دیکھ تو یہ کر
یہ حسن رازِ حقیقت ہے اے اسیرِ مجاز

کہاں ہوں میں یہی دُنیا ہے کیا مرے مالک
جدھر سُنو اُدھر آتی ہے دُکھ بھری آواز

خوشی سمجھتے ہیں سب جس کو غم کی ہے تمہید
طلسم خانۂ دُنیا کا ہے یہ ادنےٰ راز

کہاں سے جذبۂ کامل کا ہو ورود اس میں
کہ قلب میں ہی نہیں جب وہ ذوقِ سوز و گداز

ادھر بھی دیکھ لے اے زاہدِ حقیقت بیں!
کہ ذرّہ ذرّہ ہے اس میکدہ کا محوِ نماز

اُتر گئی مرے سینہ میں بن کے نشترِ غم
وہ ان کی دلکش و شیریں مہین سی آواز

یہ کب سمجھتے ہیں شارق مجاز کے بندے
کہ ابتدائے محبت ہے انتہائے نماز

قطعہ

نسیمِ صبح کے یہ ہلکے ہلکے سرد سے جھونکے
جو اک مستانہ پن سے گلشنِ عالم میں چلتے ہیں

کسے معلوم ہے شارق یہی تیرِ ستم بن کر
مریضِ غم کے دل پر کیسے کیسے ظلم کرتے ہیں

(شارق)

لبِ جُو

ایک پُر اثر گفتگو

مَیں اور مصطفےٰ دونوں، ہمہ تن خلوص و نیاز بنے ہُوئے کچھ اس طرح محوِ گفتگو نظر آتے تھے جیسے کوئی برابر کے دو دوست حالانکہ مَیں ابھی نوجوان تھا۔ اور مصطفےٰ کی عمر ستّر سے بھی کچھ زیادہ۔

گرمیوں کا زمانہ تھا۔ اور دوپہر کا وقت، مگر جلالی پہلو کی بجائے جمالی رُخ اس وقت زیادہ نمایاں تھا۔ ہم دونوں ایک سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھے ہُوئے تھے۔ اُس کی شاخوں نے دور تک پھیل کر زمین پر دھوپ چھاؤں کا ایک دلکش فرش بچھا دیا تھا۔ ہر طرف سبزہ کا لہلہانا دِلوں میں عجب لہر پیدا کر رہا تھا۔ کبھی کبھی ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا اس طرف آجاتا تو دماغ کو ایک خاص تازگی محسوس ہوتی تھی قریب ہی ایک چشمہ بھی پھوٹ نکلا تھا۔ جو اپنے دلپذیر انداز سے اُبل اُبل کر ہمارے پیروں میں لوٹتا ہُوا بہا چلا جاتا تھا۔

یہ نظارہ کچھ ایسا دلکش اور نظر فریب تھا۔ کہ میرے تخیّل نے مجھے کہیں سے کہیں پہنچا دیا۔ دماغ نے اپنی تخلّیات کا عکس دل پر ڈالا۔ اور جب دل بھی اُن تصوّرات کا بار نہ اُٹھا سکا۔ تو زبان پر دلی جذبات آ گئے۔ یعنی مَیں عالم خیال سے دُنیائے افعال میں آیا اور اس طرح گویا ہُوا۔

"اس وقت میری ایک آرزو ہے۔ وہ یہ کہ جس وارفتگی و مستانہ انداز سے یہ چشمہ اپنی روانی میں مصروف ہے ہمیں بھی اس پُر فضا اور مسرت افزا مقام پر اپنے ذوقِ سخن اور شوقِ کلام کو روانی میں لانا چاہیے۔ آپ اپنی کوئی پھڑکتی ہوئی غزل سُنا کر لُطف اندوز فرمائیے۔"

مصطفےٰ اس وقت پیکرِ تصویر بنا ہُوا تھا۔ اور ٹکٹکی لگائے پانی کو دیکھ رہا تھا، تھوڑی دیر تو وہ اسی طرح مبہوت بیٹھا رہا۔ مگر پھر یکایک اپنی خود فراموشی سے چونکا اور ایک آہِ سرد بھر کر یوں مہرِ سکوت توڑی۔

"دیکھو اس چشمہ کو ذرا بھی کسی کی روک ٹوک کا خوف نہیں، یہ سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں برس اسی شد و مد کے ساتھ جاری رہیگا۔ مگر میری زندگی کس قدر قابلِ رحم ہے مَیں یہاں اس پُر فضا مقام پر آج کس بیکسی اور بے بسی میں پڑا ہوں۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میری آنکھوں نے مچل مچل کر میرے خیالات کو منتشر کر دیا ہے، ادھر دل ہے کہ پہلو سے نکلا جاتا ہے۔ اور میرے جذبات کو بھڑکا رہا

ہے، ادھر میرے کانوں میں وہی آوازیں گونج رہی ہیں، جو میں اپنے بچپن میں سنا کرتا تھا غرض عجیب کشمکش کا سامنا ہے۔

"یہ ہر لمحہ زندگی کے ساتھ اپنی منزل مقصود سے قریب ہوتے جاتے ہیں مگر کون اس پر غور کرتا ہوگا۔ کہ عمر نے ہمارے پاس کیا باقی چھوڑا۔ اور ہم سے کیا چھین لیا۔

یہ ہری بھری ٹہنیوں پر ننھی ننھی چڑیوں کا ادھر سے اُدھر پھدکنا یہ کالی کوئل کا درخت کی شاخ پر بیٹھ کر کوکنا گو آج ان کے اختیار میں ہے۔ مگر کل ان سے یہ نغمے چھن جائینگے۔ اور یہ خاموشی کا راگ الاپا کرینگی۔

"تم نے کبھی اس ننھی مخلوق کو قدرت کی مرضی کے خلاف عمل کرتے نہ دیکھا ہوگا۔ ان کی جوانی خوشی اور مسرت کے نغموں میں بسر ہوتی ہے، ہماری حیاتِ چند روزہ قانون کے زبردست شکنجوں میں جکڑی ہوئی ہے۔

ہمیں گو اصلی اور سچی خوشی میسر نہ آئے۔ مگر ہم کبھی کبھی اپنے گذشتہ زمانہ کو یاد کر کے تھوڑی دیر کے لئے اپنا چہرہ بشاش بنا لیتے ہیں، یہ عارضی و مصنوعی خوشی کیا ہے، انسان کی زندگی کا ایک مضحکہ انگیز پہلو،

"اس دُنیائے بے ثبات میں اگر کوئی ایسا انسان جو اپنے ایک عزیز کو پیوند زمین کرنے کے بعد اس کا ماتم کرتا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ گھر بھر کا غم اسی شکستہ دل کو کھانا پڑے۔ تو بھی یہی کہونگا کہ وہ حقیقت میں نہایت خوش نصیب ہے۔

"میرے دوست! میرے ایامِ طفلی گذر گئے۔ جوانی کا افسوس بھی بے سود ہے۔ کہ وہ بھی اب ہاتھ آنیوالی نہیں۔

اب جبکہ میری زندگی اپنا آخری دور پورا کر رہی ہے میں کسی کو اپنا سچا ہمدرد نہیں پاتا۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو میرے ساتھ خلوص سے پیش آتے ہیں۔ مگر حقیقی معنوں میں محبت کرنے والا مجھے آجتک کوئی نہ ملا۔ وہ سخت غلطی پر ہے اور مجھے بھی دھوکے میں ڈالنا چاہتا ہے۔ جو یہ کہے کہ تم ان سرسبز و شاداب مرغزاروں میں رہا کرو۔ اور دُنیا کے بکھیڑوں سے یکسوئی حاصل کر کے بیفکری کے گیت گاؤ۔"

مصطفٰے کی اس مؤثر تقریر نے میرے دل پر وہی اثر کیا جو پانی کا ایک چشمہ کسی سخت چٹان کے ساتھ کرتا ہے میری طبیعت اس وقت گوناگوں کیفیات کا ایک آئینہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے جواب میں میں نے صرف اتنا کہا۔

"آپ اپنے مرنے والے بچوں کے عوض مجھے اپنا بچہ سمجھیں تو کیا ہرج ہے۔"

مصطفٰے نے آہستہ سے میرا ہاتھ دبایا اور کہا "افسوس اب یہ نہیں ہو سکتا۔"

شام ہوا چاہتی تھی، ہم دونوں بادلِ ناخواستہ چشمے کے کنارے سے اُٹھے اور مکان کا رُخ کیا۔

(ورڈسورتھ) مرزا مظفر حسین

نقد التنقید

سال نو کے نوادر میں سے ایک وہ مضمون بھی ہے۔ جو حضرتِ ڈرامی نے جنوری ۲۳ء کے ہزار داستان میں تنقید کے عنوان سے شائع کرایا ہے۔ محض عنوان کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ غالباً اس مضمون کا موضوع بحث فنِ تنقید ہے۔ لیکن چند سطور کے مطالعہ کے بعد اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے۔ مگر قیامت یہ ہے کہ پورے دو کالم پڑھنے کے بعد بھی یہ پتہ نہیں چلتا کہ آخر جناب ڈرامی کس چیز پر تنقید کر رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ گویا مضمونِ زیرِ بحث کسی مسلسل مضمون کا ایک ٹکڑا ہے جس کی سابقہ اقساط ناظرینِ ہزار داستان کے ملاحظہ سے گذر چکی ہیں۔ کیونکہ ان دونوں کالموں میں جس شے کے لئے "ضمیر" متعدد مرتبہ استعمال کی گئی ہے۔ اس کا اسم کہیں نہیں ملتا۔ شاید جناب ڈرامی نے "اضمار قبل الذکر" کی صنعت صرف فرمائی ہے۔ تیسرے کالم پر پہنچکر یہ حال کھلتا ہے کہ ہمارے لائق مضمون نگار کا آماجگاہ مولنا آزاد کا ڈرامہ "اکبر" ہے جو حال ہی میں نہایت آب و تاب اور غایت اہتمام کیساتھ شائع ہوا ہے۔ بہر حال ہمیں جناب ڈرامی کے مضمون کی "سبے سوپائی" سے چنداں بحث نہیں۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ وہ بحیثیت ایک ناقد کے اپنے فرض سے کہاں تک عہدہ برا ہوئے ہیں۔

ہمارے فاضل مضمون نگار کے اکثر اعتراضات فی نفسہ اسقدر سطحی ہیں۔ کہ مذاق سلیم کے نزدیک وہ اس قابل بھی نہیں کہ اُن کی طرف التفات کی جائے۔ اور ان کا جواب دینا درحقیقت اپنے اور ناظرین کے وقت کا خون کرنے کے علاوہ اُن صفحات کا برباد کرنا ہے جو لطائف ادبیہ کے لئے مخصوص ہونا چاہئیں۔ لہٰذا ہم صرف انہیں اعتراضات کے اُٹھانے کی کوشش کریں گے۔ جو بظاہر کسی قدر جاندار معلوم ہوتے ہیں۔

ہمارے ڈرامی صاحب اس پر بہت ناراض ہوئے ہیں۔ کہ سرورق پر مولانا آزاد کو (ڈرامی صاحب کی راستے کے بغیر) رشک شیکسپیر و ملٹن کیوں ظاہر کیا گیا۔ اسلئے کہ ڈرامی صاحب کے بقول مولانا آزاد کو شیکسپیر اور ملٹن سے کوئی وجہ مشابہت نہیں۔ لیکن ہم اپنے فاضل ناقد سے پوچھتے ہیں کہ اگر محبوب کو "آہو" اور "غزال" سے تشبیہ دی جاتی ہے تو اس کے یہ معنی کیونکر ہو گئے۔ کہ محبوب کے دو سینگ بھی ہیں۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں پر چلتا اور گھاس

بھی چھپا ہے۔ کاش ڈرامی صاحب یہ اعتراض کرنے سے پیشتر کسی واقفکار سے مشورہ کر لیتے۔ اور انہیں معلوم ہو جاتا کہ تشبیہ کے لئے نام ہونا ہی ضروری نہیں ؎

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے اے خدا
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

کیا یہ کچھ کم وجہ شبہ ہے کہ جس طرح انگریزی میں شیکسپیر کو اس کے کارنامہ لٹریچر نے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اسی طرح ہندوستان کے سب سے زبردست انشاء پرداز کو بھی اس کے ادبی کارناموں نے بقائے دوام کی سند عطا کر دی ہے۔ اگر ملٹن کی نظموں کے گیت ہمیشہ گائے جائینگے تو مولانا آزاد کا انقلاب نظم بھی قیامت تک اردو میں یادگار رہیگا۔ جس کے نتائج رات دن قومی اور ملکی مسدسوں اور ترانوں کی شکل میں رونما ہو رہے ہیں۔ ضمناً ہمارے ڈرامی صاحب نے یہ خیال بھی ظاہر فرمایا ہے۔ کہ "مولانا آزاد کو فلسفہ الٰہیات میں کوئی تبحر نہیں" حالانکہ مولانا آزاد کی مجذوبیت کا سب سے بڑا سبب فلسفہ الٰہیات کا استغراق ہی تھا۔ اور تقریباً تمام عمر ہندی پارسی۔ یونانی اور عربی کے فلسفہ الٰہیات میں منہمک رہے چنانچہ ہمیں ذاتی طور پر علم ہے۔ کہ اسی بحث پر مولانا کے تصنیف کردہ تقریباً سو رسالے عربی اور فارسی میں ان کے ورثا کے پاس اس وقت تک موجود ہیں۔ اور جس کا جی چاہے وہ بچشم خود دیکھ سکتا ہے۔

آگے چلکر ڈرامی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ "سرورق سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ڈراما صرف حضرت آزاد ہی کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یہ تاجرانہ حکمت عملی آغا صاحب کے شایان شان نہیں" اس اعتراض کی حقیقت سوء ظن سے زیادہ نہیں۔ کاش ڈرامی صاحب تھوڑی سی تکلیف گوارا فرما کر دیباچہ کا ملاحظہ کر لیتے۔ جس میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بتلا دیا گیا ہے۔ کہ اس عمارت کی ساری منزلیں مولانا آزاد کی تعمیر کی ہوئی نہیں۔

مولانا شبلی علیہ الرحمہ کی سیرۃ نبوی تمام نہ ہونے پائی تھی کہ وہ خود رحلت فرما گئے۔ اور ان کے بعد انکے جانشینوں نے اس کو مکمل کر کے دُنیا کے روبرو پیش کیا۔ ملک کے بہت سے ادبی رسالوں اور اخباروں نے اسپر زبردست تنقیدیں اور گرانمایہ ریویو لکھے۔ مگر یہ اعتراض کسی نے نہ کیا۔ کہ سرورق پر مصنف کی حیثیت سے صرف شبلیؒ ہی کا نام کیوں ظاہر کیا گیا ہے۔ واقعی جناب ڈرامی کی یہ ذہانت اور نکتہ آفرینی قابل داد ہے۔

ہمارے ڈرامی صاحب نے اپنے معرکتہ الآرا اور سب سے زیادہ مہتم بالشان اعتراض کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

"آغا صاحب دیباچہ میں رقمطراز ہیں "اردو میں ڈرامہ لکھنا آج کچھ بڑی بات نہیں۔ جس نے چند انگریزی اردو کی

کتابیں پڑھی ہوں۔ کچھ ناول دیکھے ہوں۔ تھیٹر کی زیارت سے مشرف ہوتا ہو۔ کہیں دل دیا ہو کہیں لیا ہو۔ اچھا خاصہ ڈرامائسٹ بن سکتا ہے۔ قطع نظر اس بات کے کہ ڈراما نگار کی جو تعریف آغا صاحب نے وضع فرمائی ہے۔ وہ ازبس سوفیانہ ہے۔ یہ مولانا آزاد کی ذاتِ والاصفات پر ایک بے ادبانہ حملہ تصوّر ہو سکتا ہے۔"

ہم ناظرین ہزار داستان سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ آغا صاحب کا دیباچۂ زیر بحث ایک مرتبہ ضرور ملاحظہ فرمائیں تاکہ سیاق عبارت سے ڈرامی صاحب کے اس مغالطہ انگیز اعتراض کی حقیقت کھل جائے۔ دراصل آغا صاحب کا منشا یہ ہے کہ باستثناء خاص جو الشاذ کالمعدوم کے حکم میں ہیں۔ آجکل جبکہ ڈرامے حشرات الارض کی طرح پیدا ہو گئے ہیں اور بد مذاقی کے ہاتھوں ڈراما نویسی کا معیار اس درجہ پست ہو گیا ہے۔ جیسا کہ آغا صاحب نے اپنے مندرجہ صدر الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ تو ایسی حالت میں کون سمجھیگا کہ ایک ڈرامہ لکھ کر جو فی نفسہ تمام اصنافِ ادبیات میں مشکل ترین صنف ہے۔ آزاد نے کوئی بڑا معرکہ سر کیا۔ لیکن واقعی صد ہزار آفرین ہے اُس شخص پر جس نے دوحۂ سخن میں یہ نئی قلم لگائی۔

ہمارے ڈرامی صاحب کو یہ بات بھی نہایت ناگوار ہے کہ آغا صاحب نے ڈراما نویسی کا تاج اولیّت مولانا آزاد کے سر پر کیوں رکھا۔ حالانکہ امانت اپنی اندر سبھا کو اُن سے پہلے پیش کر چکا ہے۔ ڈرامی صاحب کے الفاظ میں علم ڈراما سے مس رکھنے والے جانتے ہیں۔ کہ امانت کی اندر سبھا کو ایک ڈرامہ سے جو حقیقی معنوں میں ڈرامہ کہلانیکا مستحق ہو سکتا ہے۔ کوئی نسبت ہی نہیں۔ اس موقعہ پر خود مولانا آزاد کے ایک خط کا اقتباس مکتوباتِ آزاد سے ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے جو خالی از لطف نہیں۔

"ہندوستان کے دانا عہدِ قدیم میں کبھی بغرض تفریح اور کبھی بغرض اصلاح بعض رسومِ ملکی کے بعض معاملات کو بطور نقل کے اس کے کل سامان کے ساتھ محفلوں میں اس طرح ادا کرتے تھے۔ کہ دیکھنے والوں کو نقل سے اصل کا مزا آجاتا تھا۔ شعرا اور انشا پرداز اس میں زورِ طبع کی داد دیتے تھے۔ اور ذہین وطباع لوگ اُسے وجودِ عمل میں لاکر دکھلاتے تھے اور اُسے ناٹک کہتے تھے۔ لیکن وہ فقط اندر سبھا یا راس دھاریوں کا سوانگ نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ کبھی عظیم الشان بادشاہوں کے معرکے اس میں بیان ہوتے تھے۔ کبھی نیک و بد رسموں کی خوبیاں اور برائیاں دکھا کر لوگوں کے دلوں میں برائی سے نفرت اور بھلائی پر رغبت پیدا کی جاتی تھی۔"

اسی اعتراض کے ضمن میں حضرت ڈرامی نے ایک ایسی لطیف توجیہ پیش کی ہے۔ کہ اہل ذوق جتنی مرتبہ اس کو پڑھیں گے۔ ایک نیا لطف آئیگا۔ ارشاد ہوتا ہے کہ مولانا

آزاد کے عہد میں احسن اور طالب اچھے خاصے ڈرامہ نگار موجود تھے پھر کس طرح مولانا مرحوم اردو کے پہلے ڈراما نویس قرار دئے جاسکتے ہیں۔ مجھ میں نہیں آتا کہ ہمعصر ہونا تقدیم و تاخیر کے مراتب کے لئے کیونکر مانع ہے اور اس میں کونسا استحالہ لازم آتا ہے۔ احسن اور طالب نے اگر مولانا آزاد کے ہم عہد ہونے کے باوجود اس میدان میں قدم رکھا تو اس میں عدم امکان کا کونسا پہلو ہے۔

پہلی جھلک

کے متعلق ہمارے ڈرامی صاحب کو یہ اعتراض ہے کہ نظر قلی کی تقریر بہت طویل ہوگئی ہے۔ اور اس نے ڈراما کو ملیامیٹ کر دیا۔ جواباً اسی قدر کہہ دینا کافی ہے کہ ہر ڈراما اس مقصد کے لئے نہیں لکھا جاتا کہ اُسے اسٹیج پر دکھلایا جائے۔ جناب نورالٰہی اور محمد عمر صاحب جو فن ڈرامہ کا خاصہ مذاق رکھتے ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں جرمنی کے شہرۂ آفاق ڈرامہ نگار "شلر" کے ایک ڈرامہ کا ترجمہ "قزاق" کے نام سے شائع کرایا ہے۔ جس میں تیس تیس پینتیس پینتیس سطر کی طویل تقریریں موجود ہیں۔ چنانچہ وہ خود دیباچہ میں رقمطراز ہیں۔ "واضح رہے کہ یہ کتاب اکٹنگ اڈیشن نہیں ہے اس لئے لمبی لمبی تقریریں اور گانیکا فقدان لطف مطالعہ کے لئے روا رکھا گیا ہے۔

اسی جھلک کے متعلق جناب ڈرامی صاحب کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ "مجلس مشاورت کے ساتھ ہی ہیمو کی شکست کی اطلاع اور ہیمو کا گرفتار ہو کر پیش ہونا ایک ہی سین میں پیش کئے گئے ہیں۔ اور یہ تواتر واقعات مذاق ڈراما کے نقیض ہے" غور کیجئے میدان کارزار سے قرارگاہ شاہی تک ڈاک لگی ہوئی ہے۔ رزمگاہ سے دم دم کی خبریں بادشاہ کو بھیجی جارہی ہیں۔ قاصد پر قاصد پہنچ رہے ہیں۔ پس جس امر پر ڈرامی صاحب کو اعتراض ہے۔ فی الحقیقت وہ بالکل مطابق واقعہ ہے۔ اور مطابق واقعہ ہونا ہی اس امر کی کافی دلیل ہے کہ وہ مذاق ڈراما کے نقیض نہیں۔

دوسری جھلک

کے متعلق ہمارے ڈرامی صاحب کا خیال ہے کہ وہ پہلی جھلک سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ جن لوگوں کو ڈرامے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ خواہ سٹیج پر خواہ کتابی صورت میں وہ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں خصوصیت کے ساتھ ڈراما کا یہ اصول ہے کہ اصل قصہ کے دوران میں جستہ جستہ کامک سین بھی دکھلائے جاتے ہیں۔ اور دراصل اس میں ایک بڑی مصلحت اور خوبی ہے۔ وہ یہ کہ پہلے پہلے ایک ہی قسم کے واقعات دیکھتے دیکھتے طبیعت اکتا جاتی ہے کیونکہ انسان فطرتاً ہمیشہ یکساں حالت سے خوش نہیں رہ سکتا حضرت موسیٰ کے ساتھی من و سلویٰ کھاتے کھاتے اسقدر اکتائے کہ آخر ان کے جی لہسن اور پیاز پر للچائے۔

اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اگر ہر دو سین میں ایک ہی قصّہ کا تسلسل باقی نہیں اور متانت کے بعد ظرافت کی چاشنی بھی دیدی گئی ہے۔ تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بلکہ جو چیز ہمارے ڈرامی صاحب کو قبیح نظر آ رہی ہے۔ دراصل وہی حسن ہے۔

تیسری جھلک

ڈرامی صاحب کا یہ فرمانا کہ "اس سین میں جہانگیر شراب کو مُنہ لگاتا ہے اور بس اس تھوڑے سے کام کے لئے ایک سین کا سین وقف کر دینا بہت غیر ضروری ہے" فنِ ڈراما سے ان کی غایت ناواقفیت کی زبردست دلیل ہے۔ غور کیجئے۔ کہ جہانگیر نے آج تک کبھی شراب نہیں پی ہے۔ وہ اُسے شرعاً ممنوع اور عرفاً مذموم خیال کرتا ہے۔ اور اس لئے اُسے شراب سے صرف کراہت ہی نہیں بلکہ نفرت ہے۔ مگر مصاحب چاہتا ہے کہ کسی طرح شہزادہ کا "کفر" توڑے اور شراب پر لگائے۔ اس مقصد کے لئے سینکڑوں جتن کر رہا ہے۔ نئے نئے انداز سے شراب کی خوبیاں اور اوصاف بیان کرتا ہے۔ اصول طبیہ سے اس کے فوائد دکھلاتا ہے۔ تمثیلات سے جائز ٹھیراتا ہے۔ اور بالآخر جہانگیر کے انتہائے احتراز کے باوجود اُسے ایک جام پلا کر ہی چھوڑتا ہے۔ یہ ہے اصل واقعہ جس کی بابت ڈرامی صاحب رقمطراز ہیں۔ کہ جہانگیر شراب کو منہ لگاتا ہے اور بس" مذاق سلیم پر پوشیدہ نہیں کہ مصاحب نے جو کام کیا ہے وہ کوئی معمولی بات نہیں۔ لاریب وہ ایک زبردست معرکہ ہے۔ اور صرف ایک ہی سین میں ان تمام واقعات کا ادا ہو جانا مصنّف کے کمال انشاپردازی کی بیّن دلیل ہے۔

چوتھی جھلک

کے نیچے کاتب کی غلطی اور سوءِ اتّفاق سے لفظ "پہلا سین" بھی درج ہو گیا ہے۔ ڈرامی صاحب کو اس پر بھی سخت اعتراض ہے۔ اور اسے طرح طرح کے لچر معنی پہنا کر اپنی دانست میں خوب ہی تنقید و تحقیق کی داد دی ہے لیکن تھوڑی سی دقتِ نظر سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ کہ جب ساری کتاب میں لفظ "سین" کہیں آیا ہی نہیں تو اس مقام پر بجز سہو القلم کے اور کیا معنی ہو سکتے ہیں۔

جناب ناصر نذیر صاحب فراق دہلوی کے متعلق ہمیں خود اعتراف ہے کہ وہ اُردو کے ڈراما نویس نہیں اور خود آغا صاحب نے بھی اپنے دیباچہ میں مختصراً مگر جامع الفاظ کے ذریعہ اس امر کا اظہار کر دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جہاں مولانا آزاد کا قلم رُک گیا اس کو آگے بڑھانا ہندوستان کے بڑے سے بڑے انشاپرداز کا بھی دم خم نہیں اور جو کوئی بھی اس میں جوڑ لگاتا پیوند صاف نظر آتا۔ تاہم آغا صاحب نے اس ڈراما کو فراق صاحب سے مکمل کرانے میں ضرور دانشمندی سے کام لیا ہے کیونکہ موخر الذکر تاریخی فسانہ نگاری میں ید طولےٰ رکھتے ہیں لہذا یہ ڈرامہ بھی ایک تاریخی واقعہ پر مبنی ہے۔ اب ناظرین آزاد کے

چاروں ہیشل تہ مناظرات لطف اندوز ہونے کے بعد ایک لاجواب تاریخی افسانہ سے بھی محظوظ ہو سکینگے۔
ڈرامی صاحب کا سب سے آخری مگر سب سے نرالا اعتراض یہ ہے۔ کہ "آغا صاحب کا اس ڈرامہ کو شائع کرنا مولانا آزاد کو بدنام کرنا ہے" کاش ہمارے فاضل نقاد نے اپنے اس دعوے پر کوئی مسکت دلیل بھی پیش کی ہوتی۔
شاید کچھ ایسے لوگ بھی ہوں جو ڈرامی صاحب کی اس گمراہ کن تحریر سے غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔ ورنہ جس میں ذراسی بھی عقل ہے۔ وہ جانتا ہے کہ آغا صاحب نے یہ ڈرامہ شائع کر کے مولانا آزاد کو اور چار چاند لگا دیئے۔ اور دنیا نے دیکھ لیا کہ آزاد ادب لطیف کی اس نازک اور دشوار صنف پر بھی قدرت رکھتے ہیں۔ بلکہ اردو میں اس صنف سخن کی ایجاد کا فخر بھی انہیں کو حاصل ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار

عندلیب شادانی

حشرِ جذبات

وہ امیدیں اُس کی بربادی کا ساماں ہوگئیں
چار دن بھی جو دلِ عاشق میں مہماں ہوگئیں

مخلصی پائیں گے کیا وابستگانِ زلفِ یار
یہ بلاکش ہستیاں مانوس زنداں ہوگئیں

لیجلی پردوں کی کثرت بے حجابی کی طرف
غفلتیں مجھ کو سبق آموزِ عرفاں ہوگئیں

"یہ کسی نے رُوح پھونکی یا دیا درسِ فنا"
آج کلیاں باغ میں جتنی تھیں خنداں ہوگئیں

مختصر یہ ہے ہمارے دل کی بربادی کا حال
جمع تھیں کچھ آرزوئیں وہ پریشاں ہوگئیں

کیا کلیجہ بھی لہو ہو جائیگا دل کی طرح
چند بوندیں پھر سرِ مژگاں نمایاں ہوگئیں

وہ ہوا، وہ رات کا منظر وہ اُن کی برہمی!
رُخ پہ سَو سَو بار، وہ زُلفیں پریشاں ہوگئیں

مثلِ غالب جوشِ گریہ کار ہا ثاقب اگر
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہوگئیں

ثاقب

بہاریہ

چلی بادِ صبا، غنچے کھلے صحنِ گلستاں میں!
ترانوں کے نہ کیوں چرچے ہوں مرغانِ سحرخواں میں

جمایا رنگ اپنا ہر طرف بادِ بہاری نے
ملاحت دے رہی ہے لطف روئے صبحِ خنداں میں

مٹے اندوہ و غم ان جانفزا جھونکوں کے چلنے سے
نگہ میں نور اور تسکین ہے قلبِ پریشاں میں

کہیں سبزہ، کہیں پانی، کہیں پھولوں کے تختے ہیں
مناظر دلکشا ہیں کسقدر کوہ و بیاباں میں

حسیں پھولوں کے پیراہن میں قبروں سے نکل آئے
یہ پھونکا صور فصلِ گل نے کیا شہرِ خموشاں میں

نکل اے گوشۂ مسجد میں اُس کو ڈھونڈنے والے
چمن کی ہر کلی ڈوبی ہوئی ہے نورِ یزداں میں

فلک پر ہو گئی دیوانگی ابرِ بہاری کو
الٰہی کیا فسوں کاری ہے اس زلفِ پریشاں میں

چھٹا جاتا ہے دامن ہاتھ سے صبر و تحمل کا!
قیامت کی ہے شوخی اس نگاہِ فتنہ ساماں میں

کہاں وہ ذوقِ جامِ لعل لبہائے شکر خا کا
یہ مانا ہم نے سُرخی خوب ہے لعلِ بدخشاں میں

چہِ بابل کی شہرت ہو گئی ہے دو اسیروں سے
ہزاروں قید ہیں لیکن ترے چاہِ زنخداں میں

یہ کس چشمِ جنوں پرور نے دل کو ناز سے تاکا
کشاکش ہو گئی پیدا مرے دست و گریباں میں

دلِ دیدار جُو بیخود ہوا جاتا ہے اے ساقی!
غضب کی دلفریبی ہے جمالِ ماہِ تاباں میں

بہا دے خُم کے خُم تیری نگاہِ مست کے صدقے
لگا دے آگ مے سے خرمنِ اندوہ و حرماں میں

شبِ مہتاب میں ہر قطرۂ دریا ہے نورانی
ہیں انجم جلوہ گر آئینۂ موجِ خراماں میں

جمالِ مہ، سرودِ مطرب و بزمِ احبّا ہے
جنوں آکر نہ کیوں جھانکے مرے چاکِ گریباں میں

ترے انکار پہ بیجا نہیں اصرار ساقی کا
لگا لے اے اثرؔ اک اور غوطہ بحرِ عصیاں میں

اثرؔ صہبائی

غزل

جا میکدے میں دیدۂ رُخ مے فروش کر | مل جائے کچھ شراب تو اس کو بھی نوش کر
حسرت کہ اک جہانِ مصائب ہے کچھ بھی ہے | جو کچھ ملا ہے اس کو اُٹھا بار دوش کر
کیا حد سے بڑھ گئیں ترے رندوں کی شوخیاں | زاہد سے کہہ رہے ہیں ہمیں خرقہ پوش کر
کچھ ہوش ہے تو حال کی حالت پہ رکھ نظر | فردا کا فکر اور نہ پروائے دوش کر

فاخر سکوں پذیر ہے پھر کشتیِ حیات
ہر قطرۂ سرشک کو طوفاں بدوش کر

رباعیاتِ عرش

کچھ کام فقیری نہ امیری آئی | کرنے کو اجل ہی دستگیری آئی
اندھیر رہا رہی جوانی جب تک | اب مجبور ہوا جو صبحِ پیری آئی

غافل یہ نشاطِ زندگانی کب تک | ہنگامۂ کیفِ نوجوانی کب تک
اس شورشِ بیجا کی کوئی حد بھی ہے | آخر کب تک یہ لن ترانی کب تک

نیرنگیِ قدرت کے تماشے دیکھے | کیا کیا تری صنعت کے تماشے دیکھے
اک شکل کی لاکھوں میں نہیں دو شکلیں | کثرت میں بھی وحدت کے تماشے دیکھے

محدود زمانہ کا زمانہ ہے عرش | جینا نہیں مرنے کا بہانہ ہے عرش
پاؤں میں پڑی ہے زندگی کی زنجیر | دنیا یہ نہیں قید خانہ ہے عرش

عرش

کوہ کندن و کاہ برآوردن

رسالہ صلائے عام (دہلی) کے جنوری نمبر میں اس عنوان سے ایک مضمون شائع ہوا ہے۔ جس کے راقم جناب بشیر الدین صاحب دہلوی ہیں۔ اس مضمون میں موصوف الذکر نے اُن دو مضمونوں کے متعلق اظہار خیال کیا ہے جو انجمن ترقی اردو کے سہ ماہی رسالے "اردو" (بابت اکتوبر) میں شائع ہوئے ہیں۔ جن میں پہلا مضمون "تنقید شعر العجم" کے عنوان سے جناب مولوی حافظ محمود خان صاحب شیرانی پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور کے خامہ حقیقت نگار سے نکلا ہے۔ اور دوسرا بعنوان "کلام غالب کی شرحیں" سید ہاشمی صاحب رکن دارالترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی کی زبانِ قلم کا رہین منت ہے۔

دوسرے مواقع کو نظر انداز کر کے علمی معاملہ میں یاد رکھنا چاہیئے کہ پردہ داری سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں اور اگر جناب بشیر الدین صاحب اس موقع پر پردہ داری کو پردہ دری پر ترجیح دیتے ہیں تو ہندوستان کی (موجودہ) علمی دنیا اس کو گوارا نہ کریگی۔

تنقید شعر العجم پر ایک اجمالی نظر

قارئین کرام میں سے بہت کم لوگوں نے اس تنقید کو پڑھا ہوگا اس لئے میں اس کی ضرورت و اہمیت جتانے کے لئے اس کا ایک مختصر نمونہ پیش کرتا ہوں۔ جس سے تنقید کی ضرورت روشن ہو جائیگی۔

ایک جگہ مولانا شبلیؒ نے لکھا ہے؛

"لیکن خاندان سامانیہ نے شاعری سے اصلی کام لئے۔ چنانچہ رودکی کو کلیلہ و دمنہ کی نظم کی خدمت دی۔ اور اس کے صلہ میں چالیس ہزار درہم عطا کئے۔ عنصری ایک قصیدہ میں کہتا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش عطا گرفت بنظم کلیلہ در کشور

شعر العجم صفحہ ۲۹، ۳۰ و لہ نصر بن احمد سامانی نے رودکی کو حکم دیا کہ اس کو فارسی میں نظم کر دے ص ۲۶"

ان دو بیانوں پر مولانا شیرانی صاحب نے اس طرح تنقیدی نظر ڈالی ہے:

"اس عبارت میں مولانا کو دو مغالطے پیش آئے ہیں۔! شعر بالا پر ہمارے تذکرہ نگاروں نے عجیب عجیب اصلاحیں دی ہیں۔ مفتاح التواریخ میں صاحب ہفت اقلیم کی سند پر یوں لکھا ہے ؎

چہل ہزار درم رودکی ز مہتر خویش عطا گرفت بنظم کلیلہ و دمنہ

مرآت الخیال میں مطلع بنا لیا گیا ہے ؎

چہل ہزار درہم رودکی ز مہتر خویش عطا گرفت[51] نظم آوری بکشور خویش

لیکن قصاید عنصری دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل شعر یوں تھا ؎

چہل ہزار درہم رودکی ز مہتر خویش بیافتہ است بتوزیع[52] انیں دو آں در

[51] صفحہ ۲۱ طبع بمبئی آقا محمد شیرازی۔ [52] قسمت کردن بر جمع بجائے دلیتہ پراگندہ کردن۔

شگفتش آمد وشادی فزود وگنج زیش گفت فخر بگفت این شعر خود اندر[51]

یہ فیصلہ کرنا کوئی مشکل امر نہیں ہے کہ ان میں قصائد عنصری والا مصرع بپاختہ است بتوزیع الخ صحیح ہے یا مولانا کا مصرع جس میں کلیلہ کا ذکر آتا ہے۔

ارزقی نے جو ابوالفوارس طغانشاہ بن الپ ارسلان محمد بن جغری بیگ داود سلجوقی کا مداح ہے۔ اتفاقیہ اس واقعہ کا ذکر ایک قصیدہ میں کیا ہے۔ عنصری کا شعر بالا اس کے ذہن میں ہے اور وہ لکھتا ہے ؎

حدیث میر خراسان و قصہ توزیع بگفت رودکی از بہر فخر در اشعار
بدانچہ دادہ بداو را ہزار دینارے بنا دجونہم کردہ از صغار و کبار

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح عنصری کے ہاں اسی طرح ارزقی کے ہاں کلیلہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ دونوں شاعر توزیع لکھ رہے ہیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ انعام کلیلہ کے صلہ میں نہیں ملا۔ بلکہ مختلف موقعوں پر۔ اگر مزید شہادت کی ضرورت ہے تو خود رودکی کا شعر جو غالباً اس قصہ کا بانی مبانی ہے نقل کیا جا سکتا ہے۔ وہو ہذا ؎

بداد میر خراسانش چل ہزار درم وزو فزونی یک پنج میر ماکان بود[52]

یہاں دیکھا جاتا ہے کہ رودکی خود بھی کلیلہ کے قصہ کی تائید نہیں کرتا۔

کلیلہ کی نظم کے سلسلہ میں فردوسی ابوالفضل بلعمی المتوفی ۳۲۶ھ وزیر امیر نصر المتوفی ۳۳۱ھ کا نام پیش کرتا ہے میں فردوسی کے اشعار بجنسہ نقل کر دیتا ہوں ؎

کلیلہ بتازی شد از پہلوی بدین سان کہ اکنون ہمی بشنوی
بتازی ہمی بود تا گاہ نصر بدانگہ کہ شد در جہاں شاہ نصر
گرانمایہ بوالفضل دستور اوے کہ اندر سخن بود گنجور اوے
بفرمود تا پارسی و دری ! بگفتند و کوتاہ شد داوری
ازین پس بدو سیم ورائے آمدش بدو بر خرد رہنمائے آمدش
ہمیں خواستی آشکار و نہاں کزو یادگارے بود در جہاں
گزارندہ را پیش بنشاندند ہمہ نامہ بر رودکی خواندند
بپیوست گویا پراگندہ را بسفت این چنین در آگندہ را
ہر آنکو سخن داند آرایش است چو ابلہ بود جائے بخشایش است
حدیث پراگندہ پیرا گند چو پیوستہ شد مغز جاں آگند

اس طرح آل سامان کی علمی فتوحات کے زرین کارناموں میں سے جس پر مولانا ان کے اس قدر مداح معلوم ہوتے ہیں ایک کارنامہ بالکل نکل گیا یعنی کلیلہ کی نظم امیر نصر کی فرمائش سے نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کے روشن خیال وزیر ابوالفضل بلعمی کے حکم سے وہ ابن المقفع کے عربی ترجمہ سے فارسی نثر کے قالب میں آئی۔ اور اسی کے ارشاد سے رودکی نے اسے نظم کا جامہ پہنایا۔

ناظرین نے ملاحظہ فرمایا تحقیق و تنقیح سے معاملہ نے کیا صورت اختیار کر لی ہے۔ آگے چلکر رودکی کے نمونہ کلام میں مولانا شبلی مرحوم نے آٹھ سے زیادہ جگہ دو دو چار چار شعر رودکی کی غزلوں اور قصائد کے نقل کئے ہیں لیکن مولانا شیرانی صاحب نے دلائل و شواہد

[51] دیوان عنصری صفحہ ۲۶ بمبئی ۱۳۲۰ھ طبع آقا محمد اردکانی۔ [52] شعر العجم صفحہ ۳۶ ۱۹۰۹ء

کے ساتھ ان تمام اشعار کو قطران تبریزی کا کلام بتایا ہے مثلاً ایک جگہ رودکی کے قصیدہ کی مثال میں مولانا شبلی نے یہ اشعار لکھے ہیں ؎

از بنفشہ مرزہا گسترده دیباہا چین — وز شگوفہ شاخہا بربستہ دُر شاہوار

با ہوائے اوست گفتی ہرچہ گفتی در نسیم — بر زمین اوست گفتی ہرچہ در عالم بہا الخ

اس پر شیرانی صاحب نے لکھا ہے۔

مولانا شبلی مرحوم نے یہ ابیات قطران کے اُس قصیدے سے لئے ہیں جو ابو منصور وہسودان کی مدح میں ہے جیسا کہ اسی قصیدہ کے ایک شعر سے ظاہر ہے ؎

افتخار دہر ابو منصور وہسودان کہ ہست — بندگانش را امیران صد ہزاران افتخار

ابو منصور وہسودان جو ابو نصر مملان[1] کا جانشین معلوم ہوتا ہے آذربائیجان کا بادشاہ تھا۔ ناصر خسرو علوی بلخی جب ۴۳۸ھ میں تبریز پہنچا تو آذربائیجان کا بادشاہ یہی ابو منصور تھا۔ جس کا پورا نام سفر نامہ میں یوں دیا گیا ہے۔

الامیر اجل سیف الدولہ و شرف الملتہ ابو منصور وہسودان بن محمد مولا امیر المومنین" (سفر نامہ ناصر خسرو مولفہ مولانا حالی مرحوم)

[1] ابو منصور وہسودان اور ابو نصر مملان دونوں قطران تبریزی کے ممدوح ہیں۔ جن میں اول الذکر پہلا اور آخر الذکر دوسرا بادشاہ تھا۔ اور اسی ترتیب سے قطران نے ان کی مداحی کی، اول الذکر کی تعریف میں قطران کے اکثر وہ قصاید بھی ہیں جنہیں شبلی مرحوم نے رودکی کے تصنیف سمجھکر رودکی کے نمونہ کلام میں درج کیا ہے۔

دو صفحوں پر تاریخی و تحقیقی روشنی ڈالنے کے بعد مولانا شیرانی صاحب فرماتے ہیں۔ "یہ "دیوان رودکی" رودکی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتا۔ اگرچہ بعض قطعات رودکی کے بھی اس میں شامل ہیں، اس کا نام اگر دیوان قطران تبریزی ہوتا تو موزوں ہوتا۔ کیونکہ دیوان کے تمام قصاید قطران کے قلم سے نکلے ہیں۔ الخ

مَیں نے صرف دو جگہ سے مضمون کا خلاصہ کیا جس سے تنقید کی صورت بہت کچھ مسخ ہوگئی ہے۔ جن حضرات کو دلچسپی ہو۔ رسالہ "اردو" بابت اکتوبر و جنوری کا مطالعہ کریں۔ اور انصاف فرمائیں کہ ادب اُردو کو اس تنقید کی کس حد تک ضرورت تھی۔

ماہرین فن جانتے ہیں کہ کسی ہزار دو ہزار صفحات کی تاریخی کتاب کا مرتب کرنا بہت آسان ہے لیکن اسی کتاب پر چار پانچ سو صفحوں کی تنقید لکھنا ذرا کارے دارد۔ لیکن بشیر الدین صاحب لکھتے ہیں کہ :-

" (شیرانی صاحب) نے بڑی محنت و عرقریزی سے ایڑی چوٹی کا زور لگا کر چند غلطیاں شبلی صاحب کی اگر گرفت کیں تو کیا کمال کیا؟ کمال تو جب تھا کہ کوئی کتاب شعر العجم سے بہتر تو کیا لکھتے خیر اس کے برابر ہی لکھ کر میدان میں آتے۔"

تنقید کا دامن بھی دامن ترقی سے وابستہ ہے۔ اور جوں جوں زمانہ ترقی کریگا۔ اس کے تمام شعبے منتہائے مقصود کی

معراج کی طرف بڑھیں گے۔ تنقید بھی اسی طرح وسعت و ترقی کی طرف مائل ہوگی۔ اور جس طرح ترقی کبھی مٹنے کی نہیں اسی طرح تنقید بھی کبھی فنا نہیں ہوگی۔ کیونکہ منازل تحقیق ابھی ختم نہیں ہوئیں۔ اور کون جانتا ہے کہ کل اس تحقیق میں کتنا عروج پیدا ہو جائیگا۔

آگے چلکر بشیر الدین صاحب نے مولوی حبیب الرحمن خاں شروانی (جو شبلی صاحب کے گہرے اور عزیز دوست ہیں) کی وہ چند سطریں نقل کی ہیں۔ جن میں شروانی صاحب نے مولوی شبلی صاحب کے اخلاق و عادات کے متعلق اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ اور پھر بشیر الدین صاحب نے شیرانی صاحب اور شروانی صاحب کے آرار کا موازنہ کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ شیرانی اور شروانی کی تجنیس خطی بھی موجود ہے۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ۔ ۔ ۔ ۔ دونوں کی نگاہ تنقید میں کتنا فرق ہے وغیرہ وغیرہ۔

شیرانی اور شروانی کی تجنیس خطی کی تحقیق ممکن ہے کہ کولمبس کی تحقیق سے کم نہ ہو۔ مگر افسوس ہے کہ انہوں نے یہاں ایسا مغالطہ پیدا کیا ہے۔ کوئی پوچھے کہ آپ نے شیرانی صاحب اور شروانی صاحب کی آرار کا تو موازنہ کیا لیکن جن امور کے متعلق یہ رائیں لکھی گئی ہیں۔ ان میں بھی کوئی تطابق پیدا کیا؟

شیرانی صاحب نے اپنی تنقید میں صرف شعر العجم کے تاریخی اغلاط پر ایک انتقادی نظر ڈالی ہے۔ نہ ان کے عادات و خصائل پر! اس کے برخلاف شروانی صاحب نے مولانا شبلی مرحوم کے خصوصیات مزاج کے متعلق اظہار رائے کیا ہے۔ نہ ان کی تاریخدانی کی بابت۔

ایک ادیب تصنیف پر تنقید کر رہا ہے اور دوسرا مصنف پر تقریظ لکھتا ہے۔ دونوں کا مقابلہ کس قدر غلط بحث ہوگا۔

پھر ارشاد فرماتے ہیں۔

"موشگافی اور اعتراض ان سب کا مختصر اور جامع مانع جواب یہ ہے۔ کہ من صنّف استُهدِف"

اگر واقعی اعتراضات کا یہی جواب کسی مجلس تحقیق میں کافی ہو سکتا ہے۔ تو

"بیا کہ ما سپر انداختیم اگر جنگ است!"

فرہاد

ملہ یہ یاد رہے کہ شروانی صاحب اور شبلی صاحب کی ملاقات اور دوستی کا سبب وہ تنقید تھی جو شروانی صاحب نے المامون پر لکھی تھی۔ اگر آج مرحوم زندہ ہوتے تو کیا تنقید شعر العجم شیرانی صاحب اور ان کی دوستی کا باعث نہ بن جاتی مگر موت تو شیرانی صاحب کو بشیر الدین صاحب کی زبان قلم سے گالیاں دلوانا چاہتی تھی۔

تبصرہ اشاعتِ جدیدہ

چندن:۔ "چندن" جناب سُدرشن کے پندرہ مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے جو حال میں شائع ہوا ہے۔ جنابِ سدرشن کی ادبی دلچسپیاں اور مساعی افسانہ نگاری' پنجاب کے حلقہ ادبیات میں قابلِ ذکر و مستحسن ہیں۔ اُن کے افسانوں کے خاکوں میں بنگالی افسانہ نویسی کا عنصر غالب ہے اور سادہ وصاف مگر اخلاقی ادب کے ضمن میں وہ اُردو زبان میں ایک سنجیدہ اضافہ کر رہے ہیں۔ ہمیں توقع ہے کہ "چندن" بھی عام طور پر نظرِ قبول سے پڑھا جائیگا۔ اہتمام طباعت و تصحیح کے لحاظ سے بھی "چندن" کا نسخہ نہایت گوارا ہے۔ تقطیع مختصر صفحے ۲۴۲ قیمت عہ۔ "رام کُٹیا" بک ڈپو گوالمنڈی۔ لاہور سے منگائی جاسکتی ہے۔

تلاشِ راز:۔ یہ مختصر افسانہ جنابِ نیاز فتحپوری کے قلمِ لطافت نگار کے رشحاتِ تازہ میں سے ہے۔ افسانہ کی دلچسپی میں کوئی شبہ نہیں۔ لیکن انگریزی معاصر' ماڈرن ریویو بابت ماہ مارچ کا یہ نوٹ' کہ "یہ رینالڈ کے افسانہ "ماسٹر ٹماتھیز بک" سے ماخوذ ہے۔ اور مستعار نگار نے افسوس ہے کہ ماخذ کا حوالہ نہیں دیا" چنداں قابلِ لحاظ' اور جدید انکشاف نہیں ہے۔ پھر ماڈرن ریویو کے ایڈیٹر کو یہ کیا معلوم ہے۔ کہ جناب نیاز کی قبولیت اُن کے اندازِ تحریر پر منحصر ہے' نہ کہ خیالات' افسانوں کے خاکوں اور ماخذوں کی اہمیت پر۔

کتاب مذکور چھ آنے میں' اُردو بک ڈپو مرادآباد سے حاصل ہوسکتی ہے۔

سیاحتِ ہوا:۔ اُردو میں علمی ناولوں کی کمی ہی نہیں بلکہ فقدان ہے۔ اہلِ مغرب ہر فن و علم کو' ادبی اصناف میں ادا کر کے عوام میں علمی و فنی ذوق پیدا کرنے کی کامیاب مساعی کرتے ہیں۔ اور ایک ادیب کا کمال بھی یہی ہے۔ کہ وہ اپنی لطافتِ ادا و بیان سے ٹھوس موضوعات میں مذاقِ عامہ کے لئے دلچسپی کا سرمایہ پیدا کردے یا معمولی اور عام امور کو اس اسلوب سے پیش کردے کہ سہل ممتنع کہلائے۔ "سیاحتِ ہوا" ایک اسی قسم کے فرانسیسی ناول کا دلچسپ ترجمہ ہے۔ جسکا موضوع تذکرۂ ہوائی جہاز کی اختراع اور اُس کی خارجی "میکانیک" ہے۔ یہ ناول "دائرۂ ادبیہ" (لکھنؤ) کی مساعیِ ادب کا تازہ ترین اظہار' اور جناب سید محمود اعظم صاحب فہمی کی کاوشوں کا بعنوانی ترجمانی' ایک اچھا ثبوت ہے۔ مترجم موصوف نے بیشتر مقامات پر ضروری تحشیہ سے' ادارت کا بھی فرض بوجہ احسن انجام دیا ہے حجم کتاب ۲۱۶ صفحات' قیمت ایک روپیہ" دائرۂ ادبیہ" محمود نگر لکھنؤ سے' مل سکتی ہے۔

فارسی آموز:۔ باعتبار ترتیبِ اسباق و مواد' اپنے قسم کی پہلی کتاب ہے جو فارسی آموزی کے مقصد خاص کو پیش نظر رکھ کر ہمارے محترم دوست جنابِ میر حسین علی صاحب نے بکمال کاوش تالیف فرمائی ہے۔ اس میں موجودہ مروجہ فارسی کا جسقدر اہتمام کیا گیا ہے' کسی ہندوستانی کی تالیف میں یہ بات نظر نہیں آتی۔

اسباق' ترجمہ ضروری مشقوں کا نہج فرہنگ۔ نقول فرامین شاہی اور نقولِ مراسلات سرکاری وغیرہ کے مجموعہ کا زیرِ مطالعہ آجانا متوقع کرتا ہے کہ ہندی طلبہ۔ اور ہندی اساتذہ کے لئے یہ کتاب ازبس مفید ثابت ہوگی۔ اس جدید فارسی آموزی کا حقیقی راز میر صاحب موصوف الصدر کے دس سالہ قیام بلاد ایران اور آپ کے مخصوص ذوق زبان و ادب میں مضمر ہے حجم ۲۴۴ صفحات' طباعت و کتابت گوارا۔ قیمت عہ۔ میر امجد علی صاحب ٹمپل روڈ۔ پارک لین۔ لاہور سے حاصل ہوسکتی ہے۔

علیگڈھ میگزین:۔ اس رسالہ پر ہزارداستان کی کسی گذشتہ اشاعت میں تبصرہ ہوچکا ہے لیکن جنوری اور فروری کی منضم اشاعتیں' ایک رسالہ کی صورت میں نہایت آب و تاب کے ساتھ وصول ہوئیں۔ اور ساتھ ہی تبصرۂ مکرر کا تقاضا بھی۔ یوں تو جیسے رسالہ

کی ادارت کا جدید دور شروع ہوا ہے۔ رسالہ میں ترقی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ مگر اس دو مہینے کے وقفہ کے بعد جو اشاعت پیش نظر ہے وہ بہترین ترقی اور خواجہ منظور حسین صاحب کی سنجیدہ کوششوں کی آئینہ دار ہے مضامین اور اہتمام طباعت وغیرہ کے لحاظ سے موجودہ اشاعت بہتر سے بہتر معاصر رسالوں سے کسی طرح کم نہیں ہمیں توقع ہے کہ علیگڑھ میگزین اسی معیار پر روبہ ترقی رہے گا۔ کیونکہ ایک یونیورسٹی کے طلبا کے رسالہ کو علم و ادب کے ماحول میں نشو و نما کا ایسا ہی نمونہ پیش کرنا بھی چاہئے جیسا کہ اس کا ماحول ہے۔ قیمت سالانہ صہ ۔ دفتر علیگڑھ میگزین مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے طلب فرمایئے۔

جامعہ:۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اپنے شعبہ تصنیف و تالیف کے زیر اہتمام و نگرانی جامعہ نامی ماہوار رسالہ طلبائے جامعہ کی علمی و ادبی دلچسپی کے لئے جاری کیا ہے جس کی پہلی اشاعت پیش نظر ہے۔ مضامین نہایت سنجیدہ ہیں۔ اور تمام معیار علم و ادب کا متوقع بناتے ہیں۔ مولوی اقبال احمد سہیل ایم۔ اے۔ مولوی ضیا علی صاحب وحشت اور مولانا تمنا عمادی کا کلام۔ بجائے خود کسی رسالے کے کئی نمبروں کے محاسن ادبی کی برابر ہے۔ ترتیب و اخذ مضامین سے جناب نور الرحمن صاحب، مدیر رسالہ کے ذوق اور کاوش کا ثبوت ملتا ہے۔ بالعموم مدارس کے رسالے تلون ذوق اور خلط مباحث کے لئے مثال ہوتے ہیں۔ "جامعہ" کو اس بارے میں بہت محتاط ہونا چاہئے۔ کیونکہ یہ رسالہ باوصف اس کے کہ طلبا کے لئے ہے۔ اس پر شعبہ تصنیف و تالیف کی باوقار نگرانی کو بڑا ذمہ دار ہونا ضروری ہے۔ نیز یہ کہ "جامعہ" کے طلباء کے ذوقیات اور عام مدارس کے ذوقیات میں بیّن امتیاز بھی رہنا چاہئے۔ کیونکہ ان طلبا کی حیات علمی تمام دوسرے ذوقیات کی قربانی سے شروع ہوتی ہے۔ اسلئے انکا رسالہ زیادہ سنجیدہ زیادہ بلیغ، زیادہ پُر از کاوش اور زیادہ فاضلانہ اور پُر از معلومات ہونا چاہیئے۔ رسالہ دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ جامعہ ملیہ میں طباعت و کتابت کا کام بھی قابل تحسین انجام دیا جاتا ہے۔ رسالہ کا حجم ۹۵ صفحات ہے قیمت صرف للعہ سالانہ۔

اسی سلسلہ میں اگر ذکر ہو جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں صنعتی شعبہ کی طرف سے بھی سرگرم کوششیں جاری ہیں۔ چنانچہ اس سے قبل جامعہ ملیہ کے شعبہ صنعتی کا مصنوعہ کیلنڈر دفتر ہذا میں وصول ہوا تھا۔ یہ کیلنڈر خوبصورت اور میز و حجرہ کے لئے باعث زینت تھا قیمت کیلنڈر مجھے یاد نہیں۔ ملنے کا پتہ:۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ علیگڑھ۔

ظل السلطان:۔ ریاست بھوپال سے اس نام کا ماہوار رسالہ عرصہ سے جاری ہے۔ جو علیا حضرت فرمانروائے بھوپال کی زیر سرپرستی ہونے کو اپنے نام سے ظاہر کرتا ہے۔ گذشتہ دو سال کی مدت میں یہ رسالہ بند رہا۔ اب پھر جاری ہوا ہے۔ جناب محمد امین صاحب زبیری اس کے مرتب ہیں جن کے علمی ذوق کے مظاہرات بوساطت دار المصنفین اعظم گڈھ شہرت پذیر ہیں۔ رسالہ ہندوستانی خواتین کی علمی دلچسپیوں کا مواد فراہم کرتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ظل السلطان کو اپنے مقصد میں کامیابی کا سب سے بہتر اور یقینی موقع اس لئے حاصل ہے کہ اس کا مقام اشاعت اس تاریخی فرمان روا کا دار الریاست ہے جس کے فیضان قدر و نشر علوم سے ساری فضائے ہند معمور ہے۔ ساتویں جلد کا پہلا نمبر سامنے ہے۔ اور اس نمبر کا علاقہ جہانتک کہ مہارت ادارت سے ہے کہا جا سکتا ہے۔ کہ جناب محمد امین صاحب زبیری کی خوش ذوقی اور حسن ترتیبی کا وثوق ہوتا ہے۔ ضخامت ۴۸ صفحات، کتابت و طباعت گوارا۔ قیمت سالانہ تین روپے نمونہ ۳؍ منیجر ظل السلطان بھوپال سے مہر میں حاصل کیا جا سکتا ہے۔

آزاد کیلنڈر:۔ جناب آغا محمد طاہر نبیرۂ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد دہلوی مرحوم نے مرحوم موصوف کی حیات منصفانہ کی یادگار میں ایک کیلنڈر ۱۹۲۵ء میں طبع کرایا ہے جسمیں تصانیف آزاد مرحوم کا خوشنما اشتہار دیا ہے۔ کیلنڈر مولوی صاحب ممدوح مرحوم کی تصویر سے بھی مزین ہے۔ امید ہے کہ اہل ذوق اپنے گھروں کو اس یادگار کیلنڈر سے آراستہ کرینگے قیمت صرف ۲؍ آغا محمد طاہر صاحب آزاد منزل، اکبری منڈی لاہور سے طلب فرمایئے۔

درگشانتی پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوانچند پروپرائیٹر کے چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے سید افضال علی حسنی پبلشر نے شائع کیا

قیمت سالانہ چھ روپے

ہزار داستان

قیمت ششماہی ۳ روپے فی پرچہ ۱۰/

ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی اے (علیگ)

جلد ۲ | اشاعت ماہ اپریل ۱۹۲۳ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

(صفحۂ ادارت)

شمارہ ماسبق میں گنجائش کی کمی پر صفحۂ ادارت کو قربان کرنا پڑا۔ اور اسی لئے میں مضامین کے تعارف سے قاصر رہا۔ اس نمبر میں "حسینۂ مصر" کی دوسری قسط شائع ہو رہی ہے۔ یہ افسانہ اس وجہ سے بہت ہی برموقت ہے کہ حال ہی میں لکسر کے مقابر فراعین کے متعلق وہ نایاب اطلاعات موصول ہوئی ہیں جو کم و بیش اس افسانہ کا موضوع ہیں۔ یہ افسانہ ایک عربی داستان کا ترجمہ ہے۔ جن کے قابل اور نامور مترجم فی الحال اپنے آپ کو پردۂ اخفا میں رکھنا مناسب خیال کرتے ہیں۔ تاہم یہ امر مجھے اس سے باز نہیں رکھ سکتا کہ میں ان کی خدمت گرامی میں اس دلکش داستان کے کامیاب ترجمہ پر مبارکباد پیش کروں۔ ناظرین خود اس کی کامیابی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

"نقوش" اپنے سلسلہ میں تیسرا ڈراما ہے جسے میں نے اصل بنگالی سے اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ اس سے پہلے مینا اور تارا ہزار داستان میں پیش کئے جا چکے ہیں۔ میرا منشا ان تراجم سے فقط یہ ہے کہ میں ان کوششوں کا اعتراف کروں جو بنگالی مصنفین نے مغربی ڈراما نگاری کے تتبع میں ہندوستانی ڈراما کو اظہارِ جذبات اور انکشاف حقائق معاشرتی کا ذریعہ بنانے میں صرف کی ہیں۔ اور اس وسیلے سے اردو دان ناظرین کو بنگال کے ترقی یافتہ مصنفین کے نکتہ خیال طرز نگارش اور اصول معاشرت سے واقف کر دوں۔ ترجمہ میں میں نے حتی المقدور سلاست زبان کا لحاظ رکھا ہے۔ ان ناچیز ادبی کوششوں کو میں محض ترجمہ کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتا ہوں اور ناظرین کو بھی انہیں اسی زاویہ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔

میں جناب اعز از الدین احمد کا ممنونِ احسان ہوں کہ انہوں نے شعر اور اس کے اصناف کا سا مفید اور معلومات سے لبریز مضمون ہزار داستان کے لئے انگریزی سے ترجمہ کیا۔ اگر اسی طرح مغرب کے گرامی قدر نتائج فکر اردو زبان میں منتقل ہو جائیں تو جہانِ اردو کم از کم مختلف خیالات اور جذبات سے روشناس ہونے کے علاوہ اپنے ادب کی فراوانی پر بیسویں صدی میں بھی فخر کر سکتا ہے۔

جنابِ موسیٰ صدیقی کے گوناگوں الطاف کے شکریہ سے عہدہ برا ہونا ناممکن ہے۔ ان کا تبحرِ علمی ان کا ذوق ادب اور ان کی قدرتِ تحریر ہر دفعہ ایک نیا میدان عمل تلاش کر لیتی ہے۔ "نونہال" میں ان کے مضامین ملک کے بچوں کے لئے ویسے ہی دلچسپ کارآمد اور سبق آموز ہوتے ہیں جیسے وہ مضامین جو مختلف کیفیتوں میں ہزار داستان کے صفحات کی زینت ہیں۔ اس وجہ سے خاص طور پر ان کا مرہونِ منت ہوں کہ وہ ہمارے رسالے کو اپنی ادبی مساعی کا آئینہ بنا کر انہیں ایک مختص فخر سے بہرہ اندوز کرتے ہیں۔

ایک مدت کے تقاضوں کے بعد ہمشیرہ محترمہ جنابہ نذر سجاد حیدر صاحبہ نے ہزار داستان کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ جانباز کا مسلسل ہو نا ہی اس امر کی کافی شہادت ہے کہ اب وہ اس سلسلہ کرمفرمائی کو منقطع نہ ہونے دینگی۔ اور ہزار داستان کو اس خصوصیت سے ممتاز فرمائینگی۔ کہ وہ ہندوستان جدید کی ایک قابل قدر مصنفہ کے نتائج فکر سے بھی گل بدامن ہے۔ کاش کہ وہ ان عواطف کو مدِنظر رکھ کر جو ادب اردو کو انکی ذات سے بہت کچھ توقعات رکھنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اپنے نامور شوہر کی توجہ کو ہزار داستان کے تشنہ لب صفحات کی طرف مائل کر سکیں جن کی صدائے نارسا نے ابتک ان کے کانوں تک رسائی نہیں کی۔

میں بہت مسرور ہوں کہ جناب سدرشن اب صحتیاب اور نسبتاً فارغ البال ہو کر ہزار داستان کو فردوس نظر بنانے کے لئے ہمہ تن تیار ہو گئے ہیں چنانچہ اب پھر ہزار داستان کی اشاعتیں ان کے دلچسپ اور رنگین افسانوں سے مزین نظر آتی ہیں۔

گذشتہ نمبر میں حصہ نظم کی کمی نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔ کہ اس مرتبہ میں رسالہ کے ایک خاص حصہ کو صرف نظم کے لئے وقف کر دوں۔ اس تدبیر سے غالباً میں ان شکایات کی تلافی بھی کر سکونگا جو تاخیر اشاعت کی بنا پر ان معزز معاونین ہزار داستان کو جائز طور پر مجھ سے ہوتیں جنہوں نے اپنا کلام بھیجکر مجھے رہین منت کیا ہے۔

ہزار داستان کا پہلا سال ختم ہونے کو ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ نئے سال کے آغاز ہی سے اسکے حجم میں معتدبہ اضافہ کر سکوں قیمت جسقدر جلد ممکن ہو سکا کم کر دی گئی ہے۔ اور اس امر میں ناظرین غالباً مجھ سے اتفاق کرینگے۔ کہ پہلے ہی سال میں دو روپے کی کمی ایک معقول کمی ہے لیکن کیا ہزار داستان کی خدمات ادب یہ توقع رکھنے کی جسارت کر سکتی ہیں۔ کہ اس کے گرامی قدر معاونین اس کی اشاعت کی ترقی میں حصہ لیکر اپنا فرض ادا کریں۔

ایڈیٹر

کلام شاد

بدلے شعار اس نگہ جاں گداز کا
پردہ رکھے خدا مرے عجز و نیاز کا

قید مکاں سے مجھ کو چھڑایا عتاب نے
شرمندہ میں نہیں نگہ دل نواز کا

کھینچیگا جذب شوق تو پہنچونگا بزم میں
پروانہ بن کے شمع رخان حجاز کا

صانع کو دیکھنا ہے تو عالم پہ کر نگاہ
آئینہ آئینہ ہے خود آئینہ ساز کا

عالم کو خود پسند ہیں نیرنگ سازیاں
اس میں قصور کیا نگہ فتنہ ساز کا

ان کی نگاہ ناز جو پلٹی تو دیکھنا
منہ دیکھتی رہے گی حقیقت مجاز کا

دیکھا تو ہوگا ہم نے ازل میں ترا جمال
لیکن وہ کوئی وقت نہ تھا امتیاز کا

کس طرح دل کو فتنۂ محشر کا ہو اثر
ہنگامہ یاد ہے تری رفتار ناز کا

شاید صف نعال ہی تھوڑی سی جا ملے
اے شاؔد ہم بھی رکھتے ہیں دعوے نیاز کا

شاد

غزل

اظہار آرزو پہ ملامت نہ کیجئے
اتنا بھی مجھ کو وقف ندامت نہ کیجئے

یا دل کو واقف غم الفت نہ کیجئے
یا کیجئے تو فکر اذیت نہ کیجئے

بیگانۂ کرم سے دل خوگر جفا
ہم پر ہجوم لطف و عنایت نہ کیجئے

بیکاری جنوں میں کوئی مشغلہ نہیں
کیا کیجئے جو ان سے محبت نہ کیجئے

ناکامی امید کی لذت بھی دیکھئے
کچھ چارۂ سکون طبیعت نہ کیجئے

بڑھ جائیں اور بھی نہ کہیں سرگرانیاں
ان سے بیان درد محبت نہ کیجئے

عابدؔ وہ مثلِ شیوۂ معمول آ چکے
تکلیف انتظار کی زحمت نہ کیجئے

عابد

لمعاتِ عرش

چہرے سے صاف رازِ محبت عیاں رہے
کیا واسطہ جو پائے سخن درمیاں رہے

ظالم ہے آسماں تو زمیں فتنہ خیز ہے
اب ان سے کوئی جان بچا کر کہاں رہے

ہمدم ترے خیال سے بڑھ کر نہیں کوئی
چھوڑا کبھی نہ ساتھ ہمارا جہاں رہے

تم اور اضطرابِ شب وعدہ کا یقین
اچھا ہوا کہ غیر مرے رازداں رہے

خاموشیوں سے فاش ہوا مدعائے دل
ہم مثلِ شمعِ بزم سراپا زباں رہے

ان بدگمانیوں کا برا ہو کہ ہجر میں
اپنی خودی سے دور رہے ہم جہاں رہے

ہو کر سبک نظر میں تری مثلِ سنگ راہ؟
جس سرزمیں پہ جا کے رہے ہم گراں رہے

تم بے نقاب ہو تو زمانہ قرار لے
گردش میں یہ زمیں نہ یہ آسماں رہے

عرش

غزل

ڈھونڈتا پھرتا ہے ہر بیگانہ اور اپنا مجھے!
بے خودیِ عشق نے گم کر دیا ایسا مجھے

اس بھری محفل میں میرے ضبط کی رکھی نہ لاج
چشمِ پُرنم تو نے آخر کر دیا رسوا مجھے

کس کو دیکھوں اے فروغِ حسن تجھ کو دیکھ کر
کوئی دُنیا میں نظر آتا نہیں تجھ سا مجھے

میری امیدوں کی محفل پھر ہوئی زیر و زبر
اے نگاہِ فتنہ ساماں دیکھ، پھر دیکھا مجھے

عاقل

خیالِ دوست

(۱)

اے خیالِ یار تو جانِ دلِ بیتاب ہے
تجھ سے اِک رونق ہے تو شانِ دلِ بیتاب ہے

اے خیالِ یار میرے دِل کو راحت تجھ سے ہے
تجھ کو اُلفت مجھ سے ہے مجھ کو محبت تجھ سے ہے

وہ شبِ غم کی اُداسی وہ بلا کی تیرگی
وہ مرے دل کی تڑپ جانِ حزیں کی بیکلی

شب کو تنہائی ڈراتی تھی اکیلا دیکھ کر
آہ یہ کیسا ستم تھا مجھ کو تنہا دیکھ کر

آرزوئیں مضطرب تھیں دل بھی قابو میں نہ تھا
بیکسی تھی اور کوئی میرے پہلو میں نہ تھا

اے خیالِ یار تو آکر مسیحا ہو گیا!
مٹ گیا غم اور دل کا درد اچھا ہو گیا

(۲)

اے خیالِ یار تجھ سے ہے نشاطِ زندگی
تیرے دامن میں ہے لطفِ انبساطِ زندگی

اے خیالِ یار، پہلو میں بجائے دل ہے تو
مل گیا ہے دِل میں ایسا آشنائے دِل ہے تو

تیرے ہونے سے ہے گویا اک خوشی میرے لئے
اے خیالِ یار تو ہے زندگی میرے لئے

(۳)

آج پھر بامِ فلک پر ہے گھٹا چھائی ہوئی
آرزوئیں پھر رہی ہیں دل میں گھبرائی ہوئی

اشک گر پڑتے ہیں بوندوں کا ٹپکنا دیکھ کر
دِل تڑپ جاتا ہے بجلی کا چمکنا دیکھ کر

ضبط کا میں کونسا پہلو نکالوں کیا کروں
دل کو تھاموں یا کلیجے کو سنبھالوں کیا کروں

جان ہے اک کشمکش میں آ۔ خیالِ یار۔ آ
آ مرے مونس۔ مرے ہمدم۔ میرے غمخوار آ

قلب میں تجھ سے چمک ہے نور تو اس گھر کا ہے
آ کہ تو ہی تھامنے والا دِلِ مضطر کا ہے

اے خیالِ یار ہے تجھ سے بہارِ زندگی
غم مری ہستی کا دشمن تو ہے یارِ زندگی

تجھ کو ہم رکھینگے ہر حالت میں اپنے ساتھ ساتھ
تجھ کو لیجائینگے ہم تربت میں اپنے ساتھ ساتھ

حشر تک سوئیں گے ہم لیکر تجھے آغوش میں
شورِ صورِ حشر سے آئیں تو آئیں ہوش میں

ابو محمد ثاقب

عورت

حسن کی دیوی ہے اے بانوئے عفت آفریں
یہ ادائے دلربا تیری یہ طرزِ دل نشیں !

رونق افزائے جہاں ہے شانِ زیبائی تیری
یعنی اس دنیا میں ہے سب بزم آرائی تیری

جلوۂ حسنِ ازل کا عکس رخساروں میں ہے
فطرتاً گویا بشر تیرے پرستاروں میں ہے

کس قدر دلچسپ ہے وہ عالمِ دوشیزگی
سادگی زیور تھا اور گہنا تیرا پاکیزگی

ماں کی رہتی تھی نگاہِ نکتہ چیں کردار پر
بندشیں رفتار پر پابندیاں گفتار پر

اپنی اس حالت میں بھی تو کس قدر مسرور تھی
جنت الفردوس گھر تھا اور تو اس کی حور تھی

درسِ الفت جو ملا تھا سب وہ ازبر یاد ہے
دل لبھا لینے کا گویا تجھ کو منتر یاد ہے

مونسِ خلوت ہے تو دلسوزِ تنہائی ہے تو
اس جہاں میں ساز و برگِ صحبت آرائی ہے تو

خندۂ لب میں تیرے پنہاں ہے رازِ زندگی
یعنی تجھ پر منحصر ہے ساز و رازِ زندگی !

زندگانی واقعی مجموعۂ آلام تھی !
جنبشِ موجِ نفس اک موت کا پیغام تھی

تیری خلقت سے مگر پیدا دل آویزی ہوئی
اک حلاوت آگئی ایسی شکر ریزی ہوئی

تیرے دم سے ہے بپا دنیا میں یہ بزمِ نشاط
یعنی تیری وجہ سے قائم ہے دورِ انبساط

نسلِ آدم کی یہ سرسبزی ہے تیرے ہاتھ سے
یعنی ہے تخلیق کی تکمیل تیری ذات سے

تو نہ ہوتی تو یہ عالم صورتِ ویرانہ تھا
آفرینش تیری کارِ خالقِ فرزانہ تھا

ایم بی خلیق

خونِ تمنا

یاد ہیں وہ دن کسی بت کا میں شیدائی نہ تھا
آستانِ حسن پر شوقِ جبیں سائی نہ تھا
دل کسی کے جلوۂ رخ کا تمنائی نہ تھا
وقفِ درد و غم نہ تھا حرفِ شکیبائی نہ تھا
بادۂ عشرت سے تھا معمور جامِ زندگی
میں ریاضِ دہر میں تھا شادکامِ زندگی

حسن نے الفت کا مجھ پر راز افشا کر دیا
میرے دل میں اک بلا کا درد پیدا کر دیا
عشق کا جادو میرے دل پر بھی آخر چل گیا
بندۂ بے دام مجھ کو ایک بت کا کر دیا
بادۂ الفت سے جس کی اسقدر سرشار تھا
ہر گھڑی ہر وقت مجھ کو بس خیالِ یار تھا

حاصلِ کشتِ تمنا انتہائے آرزو
حدِ پروازِ تخیل منتہائے جستجو
مقصدِ معراجِ ہستی رونقِ باغِ مراد !
جادۂ لطفِ بقا تھا بس وہی اک ماہ رو
جس کا ہر اندازِ نو مستانہ رکھتا تھا مجھے
شورشوں سے دہر کی بیگانہ رکھتا تھا مجھے

بے خبر تھا ہجر کے غم چرخ کے آزار سے
ہمدمِ رشکِ قمر تھا طالعِ بیدار سے
خانۂ تاریک روشن تھا جمالِ یار سے
سایۂ غم دور تھا بام و در و دیوار سے
شاکیِ قسمت نہ تھے سوزش بھری آہیں نہ تھیں
راحتِ گیتی کی مجھ پر بند یوں راہیں نہ تھیں

دفعتاً چرخِ حوادث خواہ کی بدلی نظر
چھا گئی بختِ درخشاں پر سیاہی سربسر
آ گئی بادِ فنا ایسی وہ گل مرجھا گیا !
طائرِ اوجِ "سعادت" گر پڑا بے بال و پر
ہو گیا محروم دن کے چین شب کے خواب سے
رات دن بیتاب ہوں دستِ دلِ بیتاب سے

چرخِ دوں کتنا ستم یہ کسقدر بیداد ہے
باغِ عشرت تیرے ہاتھوں سے میرا برباد ہے
اسقدر میری تمناؤں کا تو نے خوں کیا
دل نہیں پہلو میں میرے اک عدم آباد ہے
وہ ہجومِ یاس کی کالی گھٹائیں چھا گئیں
غنچۂ امید کی سب پتیاں مرجھا گئیں

وسیم

انتظار

شام ہو چکی تھی، سناٹا بڑھ رہا تھا، مست و مغرور گنگا اپنی دلکش روانی پر مسکرا رہی تھی، حباب آسمانی دیوتا کے خیر مقدم کے لئے چشم براہ تھے۔ اور شفق شام کی گلابی روشنی سطح آب کو عناب زار بنانے میں مشغول ۔ ۔ ۔ ۔ کہ دفعتاً دریا کی روانی دامن سکون میں اپنا منہ چھپانے لگی، حباب نے فرط محبت سے آنکھیں بند کرلیں۔ اور کائنات کا ذرہ ذرہ کسی کے انتظار میں خاموش ہوگیا۔

میں اپنے اُنہیں حسرت ناک ایام ماضیہ کی طرح اُس ساحل پر جہاں کا ذرہ ذرہ مجھے پہچانتا ہے۔ اور جہاں کتنی سال کسی ایفائے عہد کی امید میں گذرے تھے، آج بھی اس سے پہلے کہ شام ہو کسی کا دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ انتظار کر رہا تھا۔

میرا خیال تھا، نہیں بلکہ امید تھی کہ وہ ضرور میری گذشتہ ناکامیوں سے متاثر ہوئے ہونگے۔ اور آج اس سے پہلے کہ چاند اپنی ننھی سی طلائی کشتی دریا میں ڈالے وہ اپنی گذشتہ تغافل کیشیوں کی تلافی کے لئے آئینگے اور دریائے حسین موجوں کے ساتھ اپنا وہی سادہ اور دلکش کھیل کھیلینگے، جنہیں دیکھکر میرے جذبات مرتعش ہیں سکون راحت کی مطمئن لہر دوڑ جائیگی۔

"لیکن آہ! اے میرے مالک میری یہ آخری امید بھی تحسر افزا مایوسیوں سے بدل گئی"۔ کیونکہ شفق شام کی ہلکی روشنی آہستہ آہستہ تاریکی میں فنا ہونے لگی۔ یہانتک کہ آسمانی مخلوق کے بادشاہ نے اپنی چھوٹی طلائی کشتی دریا کے نیلے نیلے پانی میں ڈالی میں نے بیتاب ہوکر اپنے ارد گرد انہیں تلاش کیا لیکن سوائے بڑھتی ہوئی تاریکی اور پانی کے غمگین راگ کے اور کچھ نہ سنائی دیا۔

کیا اے میری بیقرار روح پر حکومت کرنے والے آقا! آج بھی انہوں نے میری بے صبر تمناؤں کو بھلا دیا، کیونکہ شفق کی مسکراہٹ میری دنیائے تمنا کی طرح تاریکی میں فنا ہو چکی ہے۔ اور ساحل پر موجوں کا آنا بند ہوگیا ہے۔

ابو محمد ثاقب

تخیلات

جب میں دنیا کی اس خاموش تحیر سے معمور فضاؤں میں تیرے نغموں کی آواز سنتا ہوں تو میرے دل میں خواہش پیدا ہوتی ہے کہ تیرے نغموں کا ہمنوا ہو جاؤں، مگر میری آواز نغمہ بننے کی قدرت نہیں رکھتی۔

محبت سے معمور قلب و جگر، مظاہر حسن کی طالب نظارہ آنکھیں، آرزوئیں، تمنائیں، وفور شوق تمام ملکر میرے دل کو عالم بیخودی میں پہنچا دیتے ہیں۔ اس وقت تقاضائے جنون ہوتا ہے۔ کہ تمہارے سامنے اپنا سینہ چیر کے رکھ دوں۔ دل نکال کر تمہاری نذر کروں، اور میرے قلب متحرک میں یہ تمنا ہوتی ہے کہ میری نیازمندیاں تیری بے التفاتیوں پر قربان ہو جائیں اور میری راحت مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

جب شام کی نیم باز آنکھیں ڈوبتے ہوئے آفتاب کے زریں تاج کی چمکوں سے خفیف سی پڑ جاتی ہیں۔ اس وقت میں چاہتا ہوں کہ تیرے خوش ہنگام نغموں کا ذخار سمندر موجزن ہو۔ میرے تمام احساس حیات میں تیرے دلکش اور دلنشین نغمے جاذب ہو جائیں پھر اس ہنگام وحشت میں جو میری حیات مضطرب کا حصہ ہے۔ تڑپوں، لرزوں، اور امتیاز شخصیت کھو دوں،

(ٹیگور)

افتخار الرسول بدر

شعر اور اُس کے اصناف

شعراء وقت و ماہرین فنِ شعر سے حقیقت شعر کے متعلق تقریباً ہر عہد و ہر زمانہ میں سوالات کئے جاتے رہے ہیں اور اگرچہ ان سوالات کے متعدد و مختلف جوابات بھی دئے گئے۔ جن میں سب سے زیادہ لغو، سب سے زیادہ نامکمل اور ایک شاعر کے لئے سب سے کم تسلّی بخش وہ تعریفِ شعر ہے جس کی رو سے "کلام موزوں" کو شعر کہا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ابھی تک شعر کی کوئی ایسی جامع و مانع تعریف نہیں ہوسکی جس سے مصطلح شعر اور اس شاعری میں جو دوسرے عنوانات سے موسوم ہے کوئی امتیاز پیدا کیا جا سکے۔ اس لئے عوام الناس کو یہ مضحکہ انگیز تعریف شعر تسلیم کرلینا پڑی۔ شعر ایک نہایت جامع و وسیع المعنی لفظ ہے۔ اس کا اطلاق محض کلام موزوں ہی تک محدود نہیں۔ خود نثر میں بھی شعریت پائی جاتی ہے۔ (یا کم از کم پیدا کی جاسکتی ہے) اور نثر ہی پر کیا موقوف ہے۔ جس چیز میں بھی انسانی جذبات کو متاثر کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی۔ اس میں کم و بیش خصوصیات شعر ضرور پائی جائینگی۔ چنانچہ علم موسیقی، مصوّری، معماری، بت تراشی وغیرہ وغیرہ فنون لطیفہ میں شعریت کے مختلف مدارج نظر آتے ہیں۔ اور جن اصحاب ذوقِ سلیم کی رائے میں محض تنظیم خیالات ہی کا نام شعر نہیں ہوسکتا۔ اور جن اربابِ کمال کے خیال کے مطابق اثراتِ شعر کانوں میں جھنجھناہٹ پیدا کرنے سے کچھ اور بھی زیادہ ہونے چاہئیں۔ وہ ہر لطیف و دلکش شے میں شعریت محسوس کرتے ہیں۔ بہر حال "شعر" و "غیر شعر" میں ایک اصلی فرق معلوم ہوتا ہے۔ اسی بناء پر اصول فلسفہ کے مطابق یہ ایک اساسی و حقیقی فرق ہونا چاہئے جس کی تشریح و تحقیق ایک فلسفی کا فرض اولین ہے۔

ہم یہاں "شعر" و "غیر شعر" کے متذکرہ بالا فرق کو واضح کرنیکی کوشش کرینگے۔ اور اس بات کا لحاظ رکھینگے۔ کہ فطرت (نیچر) کو اک مستبدانہ تعریف کی چار دیواری میں محدود و محصور نہ کیا جائے۔ بلکہ اس کی ذاتی حدود وسعت کوشش و تلاش کے بعد واضح و نمایاں کردی جائیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ "شاعری کا جذبات سے تعلق ہے" یعنی شعر انسانی جذبات و احساسات کو متأثر و متحرک کرتا ہے۔ لیکن چونکہ نثر کے ذریعہ بھی جذبات کو

متحرک و برانگیختہ کیا جاسکتا ہے۔ اس لئے اس تعریف کی رو سے شعر و نثر میں کوئی امتیاز و افتراق نہیں کیا جاسکتا۔ ہاں! چونکہ سائنس کا ادراک و اعتبارات اور شعر کا تحریک جذبات و انفعالات سے تعلق ہے اس لئے تعریف مذکور حکمت (سائنس) و شعر میں تو امتیاز پیدا کرسکتی ہے لیکن فسانہ نگاری وغیرہ اصناف نثر کو جس میں ایک حد تک شاعری کی رُوح پائی جاتی ہے۔ شعر سے ممتاز کرنے سے بالکل عاجز و قاصر ہے اور چونکہ تعریف مذکور شعر کو ہر غیر شعر سے ممیز نہیں کرسکتی اس لئے یہ شعر کی حقیقی تعریف نہیں ہوسکتی۔

اگرچہ شاعری و فسانہ نگاری دونوں واقعات و احساسات کی الفاظ میں محاکات کرکے جذبات کو متاثر کرتے ہیں۔ اگرچہ عموماً اعلےٰ اعلےٰ نظمیں اور مثنویاں از قبیل فسانہ ہی ہوتی ہیں، اور تقریباً تمام عمدہ فسانوں میں شاعری کی رُوح پائی جاتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات یہ دونوں کمالات ایک ہی شخص میں بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں (مثلاً شیکسپیر) لیکن فی الحقیقت شاعری و فسانہ نگاری دو ایسے مختلف و متباین کمالات ہیں جن کے اثرات، جن کی تحصیل کے ذرائع جن کی دلچسپیاں سب ایک دوسرے سے بالکل جدا و مختلف ہیں۔ اور شاعر و فسانہ نگار میں اتنا ہی فرق ہے جتنا کہ فسانہ نگار و خطیب یا شاعر و ماہر الٰہیات میں ہونا چاہیئے۔

باوجودیکہ فسانہ و شعر دونوں میں ایک قسم کی دلکشی پائی جاتی ہے۔ جس سے ہم کو ان کے مطالعہ کا شوق اور ان کے پڑھنے سے مسرت فرحت حاصل ہوتی ہے۔ تاہم ان کو پرلطف و دلکش و کامیاب بنانے کے بالکل مختلف اسباب ہیں۔ جہاں مذکرہ بالا خوبیاں فسانہ نگاری میں خارجی واقعات کے بیان سے پیدا کی جاتی ہیں وہاں شعر میں صرف جذبات و کیفیات کی صحیح مصوری سامعین کے لطف و مسرت کا باعث ہوتی ہیں۔ فسانہ و شعر میں ایک اور بڑا فرق یہ ہے۔ کہ اگرچہ دونوں انسان کے دل و دماغ پر اپنا اپنا عمل کرتے ہیں۔ لیکن ان کے اثرات، دماغ انسانی کے اجتماعی و انفرادی ارتقا کے مختلف مدارج میں مختلف پائے گئے ہیں۔ تجربہ سے یہ بات ثابت ہوئی ہے۔ کہ اقوام عالم کو اپنے ابتدائی زمانہ میں فسانہ گوئی سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ اور ان کے اوائل عمر میں فسانہ گوئی ہی زیادہ تر ان کی تفریح کا آلہ بنتی آئی ہے۔ اگرچہ ارتقاء اقوام کے اس ابتدائی زمانہ میں شاعری کے اثرات بھی پائے جاتے ہیں۔ لیکن اس شاعری کا دارومدار خود محض فسانہ نگاری ہی پر ہوتا ہے۔ یعنی ان کی شاعری میں سوائے اس کے کہ ان کے کسی ہیرو کے کچھ کارنامے نظم ہوں۔ شاعری کی اور کوئی خصوصیت نہیں پائی جاتی۔

لیکن جوں جوں انسانی دماغ ترقی کے مدارج طے کرتا جاتا ہے۔ اس کی طبیعت کا رجحان فسانہ سے شعر کی طرف منتقل ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ آج بھی دنیا شائقین ناول کو بہت وقعت کی نظر سے نہیں دیکھتی۔ بلکہ ان کو ضعیف الحس وبد مذاق خیال کرتی ہے۔ لیکن شعرا وہ شعر جو کہ پوشیدہ ترین جذبات انسانی کی مصوّری کرتا ہے۔ اس سے صرف وہی اصحاب لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ جو احساسِ قوی، جذباتِ مکمل اور مذاقِ سلیم رکھتے ہوں۔ یا کم از کم ان کا تخیّل اسقدر قوی ہو کہ وہ اس کے ذریعہ ہر قسم کے جذبات کا صحیح اندازہ کر کے ان سے متاثر ہو سکیں۔ چنانچہ احساس قوی و ذوق سلیم ایک شاعر کی (جو کہ حقیقی معنے میں شاعر ہو) لاینفک خصوصیات تصوّر کی جاتی ہیں۔

علاوہ ازیں اگرچہ شعر و فسانہ ہر دو اقسام کلام میں حقیقت نگاری کی خاص ضرورت ہوتی ہے لیکن ان دونوں کا مختلف قسم کے حقائق سے تعلق ہے۔ شاعر تو انسانی جذبات و انفعالات کی حقیقت و صحت کو مدِّ نظر رکھتا ہے۔ لیکن فسانہ نگار کو انفعالات سے کچھ زیادہ سروکار نہیں۔ وہ اس کے افعال کا نہایت عمیق نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ اور بس۔ شاعر کو اس بات کا لحاظ کرنا ہوتا ہے کہ انسانی (روح) جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کی جائے۔ یعنی جب اس کا کوئی شعر پڑھا جائے تو سامعین پکار اٹھیں کہ خدا کی قسم ایسا ہی ہوتا ہے۔" فسانہ نگار اپنی تمام توجہ اس بات پر صرف کرتا ہے کہ اس کے فسانہ میں انسانی معاشرت کا جو نقشہ کھینچا جائے وہ ہو بہو اصل کے مطابق ہو۔ اور اس میں کسی قسم کی بے ترتیبی نہ واقع ہونے پائے۔ واقعات بالا سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری و فسانہ نگاری بعض خصوصیاتِ مشترکہ کے باوجود دو مختلف و متبائن چیزیں ہیں۔ اور یہی نہیں بلکہ شاعر و فسانہ نگار کے اشغال ان کے مقاصد اور ان مقاصد کے تحصیل کے ذرائع بھی جدا ہیں۔ عام طور پر تمام بڑے بڑے شعرا (ڈراما نویسوں سے یہاں بحث نہیں ہے) انسانی زندگی کے خارجی واقعات سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ لیکن خود انکی ذات فطرت انسانی کا ایک نہایت لطیف و حساس نمونہ ہوتی ہے۔ جس پر قوانین جذبات نہایت روشن الفاظ میں مرقوم ہوتے ہیں۔ اور چونکہ شاعر کو خصوصاً ہمارے جذبات کی کیفیات کی مصوّری سے غرض ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو فطرت انسانی کے متعلق ضروری معلومات بہم پہنچانے کے لئے صرف اپنی ذات کا بنظر تعمق مطالعہ کرنا کافی ہے۔ اور انسانی معاشرت کے وہ تفصیلی معلومات جو اختلاط و ارتباط باہمی سے حاصل ہوتے

ہیں۔ اس کے لئے بحیثیت شاعر ضروری و لازمی نہیں شاعر کو انسانوں کے مطالعہ کی ضرورت نہیں۔ اس کا صرف یہی کام ہے۔ کہ وہ انسان کا مطالعہ کرے۔ اور جو جذبات و کیفیات اس کو محسوس ہوتے رہیں۔ انہیں الفاظ کے ذریعہ اس طرح محفوظ کرتا جائے۔ کہ جب کبھی وہ الفاظ دوہرائے جائیں تو قریب قریب وہی وجدانی عالت جو ان الفاظ کو موزوں کرتے وقت خود شاعر پر طاری تھی۔ سامعین پر بھی طاری ہو جائے لیکن فسانہ نگار کو ہمارے جذبات و انفعالات سے کچھ زیادہ غرض نہیں ہوتی۔ وہ انسانی طرز معاشرت و طریقہ زیست کا نہایت غور سے مطالعہ کرتا ہے۔ جس کے لئے اس کو انسان نہیں بلکہ انسانوں کا مطالعہ کرنا ہے۔ اگر وہ انسان کا مطالعہ کرنے لگے تو ایک فسانہ نگار کی حیثیت سے اسکی وقعت بہت کم ہو جائیگی۔

گو متذکرہ بالا اختلافات پر بھی شعر و فسانہ کے عناصر مثنوی و ڈراما وغیرہ میں ممزوج پائے جاتے ہیں۔ اور کبھی کبھی ایک ہی کتاب اعلےٰ شاعری و مکمل فسانہ نگاری کا نمونہ پیش کرتی ہے۔ (شاہنامہ شیریں خسرو وغیرہ) تاہم جس طرح کہ کسی کے عارض سیمین میں سرخی کی جھلک یا جام بلورین میں آتش سیال کی رنگ آمیزی سرخ و سپید ایک نہیں کر سکتیں۔ اسی طرح شعر و فسانہ کی خصوصیات مشترکہ بھی ان کے اصولی فرق کو معدوم کرنے سے بالکل قاصر ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ڈراما میں بھی جہاں دیگر اصناف کلام کے مقابلہ میں شعر و فسانہ کی حدود قریب قریب مل جاتی ہیں۔ ان کے اختلافات بدستور قائم رہتے ہیں۔

فسانہ و شعر کی بحث سے ہم اس نتیجہ پر پہنچے ہیں۔ کہ شعر کا کیفیات و جذبات سے تعلق ہے۔ مادیات سے نہیں۔ اور نہ خارجی واقعات کا بیان کرنا ضروریات شعر میں داخل ہے۔ شاید اس پر یہ اعتراض کیا جائے کہ جس غلطی سے احتراز کرنے کا ہم نے ابتدا میں وعدہ کیا تھا۔ اس سے ہم بچ نہ سکے۔ اور شعر کی حدود تعریف دریافت کرنے کی بجائے ہم نے خود اس مروجہ خیال کے خلاف کہ واقعہ نگاری بھی اقسام شعر میں داخل ہے ایک خود ساختہ تعریف پیش کر دی ہے۔ لیکن اس اعتراض کا یہ جواب ہو سکتا ہے۔ کہ گو مثنوی و ڈراما وغیرہ اقسام شعر میں واقعہ نگاری کی خاص طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ محض کسی چہرہ کے خط و خال بیان کر دینے کا نام (چاہے یہ نقشہ اصل کے بالکل مطابق ہی کیوں نہ ہو) شاعری ہے۔ کیونکہ اگر خارجی واقعات کے اظہار کو شاعری تسلیم کر لیا جائے۔ تو پھر اس منطق کے تحت سائنس و شاعری میں بھی کوئی فرق نہیں رہتا لیکن جس طرح کسی عمارت کے خاکہ کو فوٹو نہیں کہہ سکتے

اسی طرح کسی چیز کی عرض وطول و رنگ و ماہیت وغیرہ بیان کر دینے کا نام شاعری نہیں ہو سکتا۔ شاعری حقیقت میں انسانی دماغ کی اس حالت کا نام ہے جبکہ شاعر کو گلاب کے پھول میں عارض گلگوں کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اور اس کی مہک شاعر کو اس کے معشوق کے پسینہ کی خوشبو یاد دلا کر اس قدر بیخود و مست کر دیتی ہے۔ کہ وہ بیساختہ پکار اُٹھتا ہے۔

"اے گل بہ تو خرسندم تو بوئے کسے داری"

یہی وجہ ہے۔ کہ شاعرانہ واقعہ نگاری و عالمانہ یا حکیمانہ واقعہ نگاری میں بڑا فرق ہے۔ شاعر کو کسی چیز کی ماہیت و اصلیت سے غرض نہیں ہوتی۔ وہ جب کسی شے کی تصویر کھینچتا ہے تو صرف انہی اثرات کو جو اس چیز کے مشاہدہ سے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے لیکن ایک سائنسدان کو ان اثرات سے غرض نہیں ہوتی۔ اس کے نزدیک گویا وہ ایک بے معنی چیز ہیں۔ وہ ظاہری حقیقت سے اپنی نظر نہیں ہٹاتا اور جذبات و انفعالات کو پس پشت ڈال دیتا ہے۔ مثلاً علم الحیوانات کا کوئی ماہر اگر گھوڑے کے متعلق کچھ کہنا چاہے تو وہ استعارات و تشبیہات سے اجتناب اپنا فرض اولین سمجھیگا۔ اور پھر چند غیر مانوس مصطلحات میں وہ ٹھوس واقعات بیان کریگا۔ جس کا سمجھنا بھی ہر شخص کا

کام نہیں لیکن اگر ایک شاعر اُسی گھوڑے کی تصویر پیش کرے تو وہ اپنے تخیل کی مدد سے عام فہم استعارات و تشبیہات کے ذریعہ اس جانور کی ایسی تصویر کھینچیگا کہ جو کیفیت ایک صحیح الدماغ انسان پر کسی عمدہ اور شوخ گھوڑے کے دیکھنے سے طاری ہونا چاہئے۔ اس کے الفاظ سے سامعین پر طاری ہو جائیگی۔ اگرچہ شاعر ایسے مواقع پر (یعنے مصورانہ شاعری میں) مبالغہ سے بھی کام لیتا ہے۔ لیکن اسے اس کے شعر پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ اس کا فوٹو اور زیادہ دلچسپ اور اس کے اشعار شیر یں تر ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقی شاعری او وہ شاعری ہے۔ جس میں انفعالات و جذبات انسانی کی ترجمانی کی جاتی ہے۔ جو ذرا سی غلط بیانی سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ اور اچھے سے اچھا شعر خاک میں مل جاتا ہے۔

(مومن مرحوم کا یہ شعر ؎

"تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا"

پڑھو اور غور کرو کہ اگر اس شعر میں ذرا سی غلط بیانی سے کام لیا جاتا تو کیا یہ شعر اس قابل رہتا کہ غالب جیسا باکمال اُستاد اس کے عوض اپنا دیوان دینے پر تیار ہو جاتا؟)

ضروریات شعر کو واضح کرنے کی جدو جہد اور جدہ شعر

کی جستجو و تلاش میں دو جدید ترین تعریفات شعر جو قبل ازیں شائع ہو چکی ہیں۔ ہماری نظر سے گذریں۔ جن میں ایک حد تک وہ بات پائی جاتی ہے۔ جس کی ہمیں تلاش تھی۔

ان میں ایک تعریف تو فاضل ایبنزر ایلیٹ

( ) مصنّف

کارن لاء رائمس ( )

کی ہے۔ جس کے نزدیک بیساختہ اظہار حقیقت کا نام شعر ہے۔ (

) اور دوسری ایک مشہور مصنّف کے تخیل کا نتیجہ ہے۔ جس کے مطابق ہمارے ان خیالات کا نام شعر ہے جن میں جذبات کا رنگ جھلکتا ہو۔

(

) اگرچہ اس میں کچھ شک نہیں کہ ہر اس چیز میں جو انسانی خیالات اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہو، بیساختگی اور غم و غصہ، عشق و محبت، رحم و تنفر وغیرہ جذبات کی رنگ آمیزی سے شعریت پیدا کی جاسکتی ہے۔ اور باوجودیکہ کوئی چیز، کوئی واقعہ بذاتہ چاہے کتنا ہی دلفریب و دلچسپ کیوں نہ ہو، جذبات کی رنگینیوں کے بغیر ہرگز شعر نہیں ہوسکتا، تاہم تعریفات مذکورہ میں ایک یہ نقص ہے۔ کہ ان کے مطابق شعر و خطابت میں کسی قسم کا امتیاز نہیں کیا جاسکتا۔ گو شاعری و خطابت دونوں کا بیساختہ اظہار حقیقت سے یکساں تعلق ہے۔ گو شعر و خطابت دونوں سے جذبات میں ڈوبتے ہوئے خیالات کو منسوب کیا جاسکتا ہے۔ گو بعض اوقات یہ فیصلہ کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔ کہ کسی خاص مصنّف کو شاعر کہا جائے یا خطیب کے لقب مخاطب کیا جائے تاہم شعر و خطابت ایک چیز نہیں ہیں۔ اور اگرچہ ابھی ان دونوں اصناف کلام میں کوئی حدِ فاصل قائم نہیں کی گئی ہے۔ لیکن ان میں بھی ایسا ہی اصولی و اساسی فرق ہے جیسا کہ شاعری و فسانہ نگاری میں بتایا جاچکا ہے۔

ہم یہ بات پہلے بتاچکے ہیں کہ خطابت و شاعری دونوں کا اظہار جذبات سے قریب قریب یکساں تعلق ہے فرق صرف اتنا ہے کہ خطیب تو اظہار جذبات کے وقت دوسروں سے مخاطب ہوتا ہے لیکن ایسی حالت میں شاعر کسی دوسرے سے نہیں۔ بلکہ محض اپنے نفس سے تخاطب کرتا ہے۔ اور دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہوجاتا ہے گویا عالم تنہائی اور حالت بیخودی میں ایسے جذبات کی، جو شاعر کے دماغ میں پنہاں ہوں۔ قریب الفہم تشبیہات و استعارات کے ذریعہ ہو بہو تصویر کھینچنا شاعری اور دوسروں کو اپنا ہمنوا بنانے اور ان سے کوئی خاص کام لینے کے لئے اپنے جذبات سے متاثر کرنا خطابت ہے۔

حقیقی شاعری جیسا کہ سطور بالا سے ظاہر ہوتا ہے اپنی ماہیت و اصلیت کے لحاظ سے قریب قریب ایسی ہی ہے جیسے کسی مجذوب کی بڑ یعنی جس طرح اکثر دیوانے اپنے دل سے باتیں کیا کرتے ہیں اسی طرح شاعر بھی جو کچھ کہتا ہے اولاً تو وہ محض اپنے ہی لئے کہتا ہے دوسروں کے سُنانے کو نہیں کہتا یا کم از کم شعر کہتے وقت یہ خیال اپنے دل میں نہیں آنے دیتا کہ وہ دوسروں کو سُنانے کے لئے شعر کہہ رہا ہے ورنہ جس طرح ایک ایکٹر کے دل میں ناظرین کی موجودگی کا خیال آتے ہی اس کا پارٹ خراب ہو جائیگا اسی طرح اگر شعر کہتے وقت شاعر کے دل میں اپنا کلام پبلک میں پیش کرنے کا ذرا سا خیال بھی پیدا ہو جاتے تو اُس کے کلام میں آمد کے بجاتے آورد اور بیساختہ پن کے عوض تکلف اور تصنع پیدا ہو جائیں گے اور یہی نہیں کہ اس کے اشعار پست ہو جائیں۔ بلکہ صحیح معنی میں وہ شعر ہی نہ رہینگے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شاعر اپنی طبیعت سے کوئی نظم وغیرہ لکھتا ہے۔ تو عموماً شاعرانہ نقطۂ نظر سے وہ کلام بہت بلند و موثر ہوتا ہے لیکن جس وقت کوئی نظم یا قصیدہ وغیرہ انعام و صلہ یا شہرت و نام آوری کی امید پر تیار ہو تو کیونکہ ایسی حالت میں جذبات انسانی کی مصوّری کی صحت کا پورا پورا لحاظ نہیں رکھا جا سکتا اس لئے وہ نظم محض چند فصیح

و موزوں جملوں کا مجموعہ بنکر رہ جاتی ہے (کلام انوری ان دو قسموں کا عمدہ نمونہ پیش کرتا ہے)۔

واقعاتِ بالا کی بنا پر ہم شعر کو تنہائی و تجرد فکر کا قدرتی ثمر اور خطابت کو اختلاط و ارتباطِ باہمی کا نتیجہ کہہ سکتے ہیں۔ انہیں متذکرہ بالا واقعات سے اسقدر پتہ اور چلتا ہے کہ ایک شاعر کے لئے سب سے پہلے پاکیزہ تخیّل قوی احساس اور باریک بین نظر کی ضرورت ہے۔ اور اگر کسی شخص میں یہ اوصاف موجود ہوں تو اس کو ایک عمدہ و کامیاب شاعر بننے کے لئے صرف اس قدر دماغی تربیت کی اور ضرورت ہوگی کہ وہ اپنے خیالات و جذبات عمدہ پیرایہ میں ادا کر سکے۔ اور بس لیکن خطابت کے لئے ان تمام اوصاف کی ضرورت نہیں کسی خطیب کے لئے صرف یہی کافی ہے کہ وہ دوسروں کی کمزوریاں ان کے میلانِ طبعی اور ان کے جذبات بر انگیختہ کرنے کے ذرائع کا ایک ہی نظر میں صحیح اندازہ کر سکے۔ اس کے بعد تقریر کرنے کی تھوڑی سی مشق بھی اس کو ایک کامیاب خطیب بنا سکتی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ خطابت و شاعری کے امتیاز کا جو نظریہ ہم نے پیش کیا ہے وہ بالکل مکمل نہ ہو لیکن اس میں کسی قسم کے شک کی گنجائش نہیں۔ کہ ان دونوں کمالات میں ایک آئینی و اصولی فرق ہے اور بہرِ فن لطیف

میں یہ نازک فرق محسوس کیا جاتا ہے۔ اب ہم ناظرین کی سہولت کے خیال سے اس فرق کو دو ایک مثالوں کے ذریعہ واضح کرنا چاہتے ہیں:۔

موسیقی ایک ایسی دلکش و موثر چیز ہے کہ اس کو سحر حلال بھی کہتے ہیں لیکن اس سرتاپا دلکش فن میں بھی شاعری و خطابت کا فرق محسوس ہوگا۔ اگر کوئی رقاص یا کوئی مطرب سامعین کی موجودگی سے بیخبر ہوکر اپنے رقص و سرود کی بیخود فضا میں اس طرح محو ہوجاتے کہ اس کو خود اپنے سروپا کا بھی ہوش نہ رہے۔ نہیں! بلکہ اپنے سامعین کو بھی موسیقی کے اسی فضا میں لے اڑے۔ جس میں وہ خود محو رقص ہو تو ایسا رقص ایسے نغمات فن موسیقی کے شعر کہلائیں گے۔ لیکن اگر وہی مطرب اپنے سامعین کی خوشنودی طبع کے زہریلے خیالات سے متاثر ہوکر نغمہ سنج ہو، تو ایسے راگ اور ایسے نغمے فن موسیقی کی خطابت سے منسوب کیئے جائینگے۔

فن مصوری کا بھی بعینہٖ یہی حال ہے۔ یعنی اگر کوئی مصور بیرونی اثرات سے خالی الذہن ہوکر ایک ایسی تصویر بنائے جو واقعی جذبات انسانی کی صحیح تصویر کہی جاسکتی ہو۔ اس نقش کو شاعرانہ مصوّری کہیں گے۔ اور اگر کسی تصویر میں دوسروں کے مذاق و دلچسپی کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ تو اس کو خطیبانہ مصوّری کا نمونہ خیال کریں گے۔ فرانس و اٹلی کے مصوّروں اور نقاشوں میں بھی اک مابہ الامتیاز فرق ہے۔ کہ اٹلی کی مصوّری میں شعریت پائی جاتی ہے اور فرانسیسی نقاشی میں خطابت۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ہم نے اس مضمون کی شروع میں شعر کی حقیقت اور اس کی حدودِ وسعت، کسی مستبدانہ تعریف کے بغیر واضح کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ سطور بالا میں ہم نے شعر کا ان تمام اصناف کلام سے (فسانہ خطابت وغیرہ) جن کی سرحد حدودِ شعر سے ملتی ہیں۔ علیحٰدہ علیحٰدہ مقابلہ کرکے ہر صنف کلام کی امتیازی خصوصیات واضح کرنے کی کوشش کی ہے جس سے ناظرین کو شعر کی حقیقت و حدودِ وسعت کا اندازہ کرنے میں سہولت ہوگی۔ اور یہی ہمارا مقصد تھا۔

(ترجمہ جے۔ ایس مل)

اعزاز الدین احمد

منتوش

از بابو کشیرود چندر چیٹرجی ——— مترجمہ و ممثلہ حکیم احمد شجاع بی۔ اے

اشخاص ڈراما

کمار جیت پرسن - راجہ دیوی پرسن رائے کا بیٹا
بابو مراری موہن چکرورتی - وکیل ہائیکورٹ کلکتہ
منتوش - مراری بابو کا منشی
پنڈت رام چرن - راجہ دیوی پرسن کا گرو
مدہومتی - مراری بابو کی بیوی
شرت کماری - مراری بابو کی بیٹی
کانتی - مراری بابو کی بہو
سریندر موہن - مراری بابو کا لڑکا

پہلا منظر

مراری بابو کا کمرۂ نشست

ہدایات :- مراری بابو اور اس کی بیوی مدہومتی باتیں کر رہے ہیں۔

مراری (گھبرا کر) لڑکیاں کالج سے ابتک نہیں آئیں (گھڑی دیکھ کر) ساڑھے پانچ بج گئے۔ آخر اتنی دیر تک کہاں بیٹھ رہیں۔

مدہومتی - نہ معلوم ان کو اتنی دیر کہاں ہوگئی۔ شاید کالج میں کوئی لکچر ہو۔ کہتے ہیں کہ آجکل پرنسپل صاحب ایوننگ لکچر بھی دے رہے ہیں۔ مگر میں تو سریندر کے خط کا انتظار کر رہی ہوں۔ آج ہی تو ولایتی ڈاک آنے کا دن ہے۔

مراری - ہاں آج تو اس کا خط نہیں آیا۔ ڈاک تو آچکی۔ شاید سریندر ولایت سے چلدیا ہے۔

مدہو - تو آپ نے اس کا سفر خرچ بھیجدیا تھا کیا۔

مراری - ابھی پچھلے مہینے ہی میں تو پانچ ہزار روپے بھیجے تھے۔

مدہو - یہ کیوں۔

مراری۔ کچھ قرض اٹھا بیٹھا تھا۔

مدہو۔ اتنا قرض! سر جیسے تو اس کو خرچ سمجھا جاتا ہے
تمہیں تو عقل ہی نہیں ہے۔ بس دھوپ ہی میں بال سفید
کر لئے ہیں۔ لڑکی کی شادی کا تمہیں کچھ فکر ہی نہیں۔ لڑکے
پر دھڑا دھڑ روپیہ خرچ کرتے ہو۔

مراری۔ تم ولایت کی باتیں کیا جانو۔ ولایت میں ادھر
اُدھر کے خرچ بھی تو بہت ہوتے رہتے ہیں۔ وہاں جا کر
اگر انسان کتاب کا کیڑا ہی بن جائے تو فائدہ ہی کیا؟
شہر شہر کی سیر، نئے نئے لوگوں کی ملاقات آخر پیسہ
خرچ کئے بغیر تو میسر نہیں آسکتی۔ وہاں تو منہ ہاتھ
دھونے پر بھی دام صرف ہوتے ہیں۔

مدہو۔ مگر بہو کو کتنک کالج بھیجتے رہو گے۔ شادی شدہ
لڑکیوں کو پڑھنے سے کیا کام؟

مراری۔ سریندر ولایت کا پڑھا لکھا کیا جاہل بیوی کو
پسند کریگا۔ مجھ جیسا تھوڑا ہی بیوقوف ہوگا۔ اسی کی خاطر
تو میں بہو کو اعلےٰ تعلیم دلا رہا ہوں۔ تمہارے باپ کو تو
عقل ہی نہیں تھی۔ اور سشرت بھی تو اکیلی کالج جانے سے
گھبراتی ہے۔

(سشرت اور کانتی حواس باختہ پریشان حال داخل ہوتی ہیں)

مراری و مدہو ممتی (حیران ہو کر) کیوں کیا ہوا۔

سشرت۔ راستہ میں گھوڑا بھاگ نکلا تھا۔

کانتی۔ پرماتما نے بچا لیا۔

سشرت۔ گھوڑا بے تحاشا بھاگ اٹھا۔

مراری۔ کوئی گاڑی کے نیچے تو نہیں آیا۔

سشرت۔ ایک راہ رو نے جلدی سے گھوڑے کو پکڑ لیا
ورنہ ہمارے ساتھ اور بھی دو ایک کی جان جاتی۔

مراری۔ اس نے گھوڑوں کو روکا کیسے۔

کانتی۔ وہ شاید سامنے سے آرہا تھا۔ ہماری چیخ پکار
سن کر لپکا۔ اور گھوڑوں کے منہ پر اپنی چادر ڈال دی۔
گھوڑے گھبرا کر پیچھے ہٹے۔ اور گاڑی الٹ گئی۔ اسکے
بعد کی مجھے کچھ خبر نہیں۔

مدہو۔ کیوں کیا تم بیہوش ہو گئی تھیں۔

کانتی۔ ہاں گاڑی الٹتے ہی یہ بیہوش ہو گئیں،

مراری۔ پھر

سشرت۔ بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ہمیں گاڑی سے
نکالا۔ اور گاڑی کو سیدھا کر دیا۔ وہی شخص جس نے
گھوڑوں کو روکا تھا بھاگ کر پانی لایا۔ کانتی کے منہ پر
چھینٹے دئے تو جا کے انہیں کہیں ہوش آیا۔

مراری۔ کوچبان کو کیا ہوا۔ تمہیں یہاں تک کون لایا۔

سشرت۔ وہی شخص گاڑی ہانک کر لایا ہے۔ کوچبان تو
پہلے ہی کود پڑا تھا اسکو چوٹ لگ گئی تھی۔ وہ تو سیدھا
بیٹھ بھی نہ سکتا تھا۔

مدہو۔ تو وہ کوئی شریف آدمی ہے کیا؟

مراری۔ خیر اس کی شرافت سے کیا۔ مجھے اس کا شکریہ ادا کرنا چاہیے۔

کانتی۔ اس کے شریف ہونے کی ہمیں کیا خبر۔

شرت۔ ہمدردی تو شریفوں کی سی کی۔ مگر کپڑوں سے کوئی قلی یا مزدور معلوم ہوتا ہے۔

مراری۔ آخر ان سوالوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اسے بُلا ہی نہ لو۔

(ملازم کو آواز دیتا ہے) بیرا

ملازم (حاضر ہو کر) حضور۔

مراری۔ جو شخص گاڑی ہانک کر لایا ہے۔ اسے اندر بھیج دو۔

(منتوش ننگے پاؤں، ننگے سر پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک عجیب انداز بے پروائی سے داخل ہوتا ہے)

مراری (منتوش کو مخاطب کرتے ہوئے) تم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(اس کا چہرہ دیکھ کر) آپ ۔ ۔ ۔ ۔ (پھر کپڑوں پر نگاہ ڈال کر) تم ۔ ۔ ۔ (پھر اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر) آپ

منتوش (مسکرا کر) مجھے آپ، تم ہی کہیے۔

مراری۔ تم نے ہم پر بہت احسان کیا۔ میں حیران ہوں کہ تمہارا شکریہ کیسے ادا کروں۔

منتوش۔ میں نے ایسا کیا احسان کیا ہے۔ خوش قسمتی تھی جو گھوڑا رک گیا۔

مدہومتی۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹا۔

منتوش۔ میرا نام ۔ ۔ ۔ ۔ منتوش

مدہو۔ تمہارا مکان کہاں ہے۔

منتوش۔ مرشد آباد

مدہو۔ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں۔

مراری (سوچتے ہوئے) ماں باپ کے متعلق سوال نہیں پوچھا کرتے۔ اچھا بھئی وہ کیا کرتے ہیں۔

منتوش۔ کچھ زمین وہین کا سلسلہ ہے۔

مراری۔ کلکتہ میں کیسے آتے تھے۔

منتوش۔ ہوڑہ سٹیشن سے

مراری۔ اچھا اچھا (بیوی سے) تو اس کو کیا دیں ۔ ۔ ۔ کچھ پڑھے لکھے بھی ہو۔

منتوش۔ کچھ یوں ہی سا۔

مراری۔ انگریزی بھی جانتے ہو کیا

منتوش۔ کسی قدر۔

مراری۔ اچھا اچھا۔ تو اس کو کیا دیں

منتوش۔ نہیں صاحب آپ تکلیف نہ کیجیے۔ میں کچھ نہ لوں گا۔

مدہومتی۔ تو بیٹا ہمیں تمہارا احسان بھی تو اُتارنا ہے۔ پھر بھی۔

منتوش۔ اگر آپ کے کسی دوست کو نوکر کی ضرورت ہو۔ تو میری سفارش کر دیجئے۔

مراری۔ ہمارے ہاں ایک منشی کی جگہ خالی ہے

منتوش۔ پھر تو نوکر ہمارے ہاں رکھا جائیگا۔

مراری۔ پھر تو تمہارا یہاں گھر میں کام کرنا۔ کتابوں کے نام تو پڑھ لیتے ہو گے؟

منتوش۔ جی ہاں۔

مراری۔ تو جب ہم مقدمات کی تیاری کیا کریں۔ ہمیں کتابیں نکال نکال کر دے دیا کرو۔

منتوش۔ بہت بہتر۔

مراری۔ تیس روپیہ ماہوار اور کھانا کپڑا منظور ہے؟

منتوش۔ مگر میں رہونگا کہاں۔

مراری۔ شاگرد پیشہ کے کمروں میں سے ایک کمرہ تمہارے لئے خالی ہو جائیگا۔

منتوش۔ وہاں تو مجھ سے نہ رہا جائیگا۔

مراری۔ تو تم کہاں رہنا پسند کرو گے۔

منتوش۔ میرے رہنے کا ایسا کیا ہے۔ آپ کی لائبریری کے کسی کونے میں پڑا رہونگا۔

مراری۔ سامان کہاں رکھو گے۔

منتوش۔ سامان ہی کیا ہے۔ یہ ایک چادر ہے۔ اسی کو اوڑھ بچھا لیا کرونگا۔

مراری۔ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ ہاں کب سے کام شروع کرو گے۔

منتوش۔ کل صبح ہی سے، ہاں جب آپ کچہری چلے جائیں تو مجھے باہر جانے کی اجازت ہوگی نا۔

مراری۔ ہاں ہاں میری غیر حاضری میں تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔

منتوش۔ تو اب مجھے اجازت ہے کیا۔

مراری (جیب سے نوٹ نکالکر) لو یہ بیس روپے تم اپنے کپڑے وغیرہ بنوا لینا۔

منتوش۔ آپ کی مہربانی، مگر میں کام سے پہلے مزدوری نہیں لے سکتا۔ کپڑے میرے پاس ہیں۔

مراری۔ تو اچھا تم جا سکتے ہو۔ کل صبح ہی آجانا۔

(منتوش جاتا ہے)

مدہومتی (شرت اور کانتی سے) جاؤ تم بھی منہ ہاتھ دھوؤ کپڑے بدلو۔ دیکھو تو تمام ساڑی گیلی ہو رہی ہے۔

(شرت اور کانتی جاتی ہیں)

مدہومتی۔ تم نے یونہی نوکر رکھ لیا۔ جانے کیسا آدمی ہو۔

مراری۔ شکل صورت سے تو آدمی شریف معلوم ہوتا ہے۔

مدہومتی۔ گفتگو کا انداز بھی پڑھے لکھوں کا سا ہے۔

مراری۔ آخر یہ ہے کون۔ بے پروا کتنا ہے۔ یہ کسی غریب گھر کا تو معلوم نہیں ہوتا۔ ہم نے بھی تو زمانہ

دیکھا ہے۔

مدہوشی۔ چلو آؤ بھی ہمیں اپنے کام سے کام ہے اس کی امیری غریبی سے کیا غرض۔

(مراری سوچتا ہوا مدہوشی کے ساتھ جاتا ہے)

پردہ

دوسرا منظر

مراری بابو کی لائبریری

(منتوش مراری بابو کی کرسی پر بیٹھا ہوا ایک قانون کی کتاب بہت غور سے پڑھ رہا ہے۔ شرت داخل ہوتی ہے۔ اسے کتاب پڑھتے دیکھ کر پردے کی آڑ میں چھپ جاتی ہے۔ کچھ دیر کے بعد سامنے کے دروازے سے داخل ہوتی ہے)

شرت۔ کیا پڑھ رہے ہو منتوش بابو۔

منتوش (ٹالتے ہوئے) آج آپ کالج نہیں گئیں کیا۔

شرت۔ کل کی چوٹ سے سر میں درد ہو گیا ہے۔

منتوش۔ مگر ہاں یہ کہیے۔ آپ اپنے نوکر کو بابو کہہ کر کیوں پکارتی ہو۔

شرت۔ بابو نہیں تو اور کیا کہوں۔

منتوش۔ منتوش ہی کیوں نہ کہو۔

شرت۔ یہ نام تو بہت لمبا ہے۔

منتوش۔ منتوش بابو سے تو چھوٹا ہے۔

شرت۔ پھر بھی ضرورت سے کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے۔

منتوش۔ تو اچھا صرف من کہہ کر پکاریے۔

شرت۔ بہت اچھا یونہی سہی۔ تو من آپ کیا پڑھ رہے تھے۔

منتوش۔ یہ من کے ساتھ آپ کیا خاک سجے گا۔ کیا نوکروں سے بھی کوئی آپ کہہ کے خطاب کرتا ہے۔

شرت۔ تو پھر اور کیا کہنا چاہیے۔

منتوش۔ تم۔

شرت۔ اچھا تو من تم کیا پڑھ رہے تھے۔

منتوش۔ ذرا اس کتاب میں تصویر دیکھ رہا تھا۔

شرت۔ دیکھوں

(کتاب لیکر دیکھتی ہے)

ارسطو کے فلسفہ کی کتاب میں تصویروں کا کیا کام؟

منتوش۔ یہ آپ ہی جان سکتی ہیں۔ ہمیں کیا معلوم۔

شرت۔ تصویروں کی کتابیں اور بہت سی رکھی ہیں۔ مگر ان کو تو تم نے چھوا تک نہیں۔

منتوش۔ تو آپ کی سی عقل کہاں سے لاتا۔

شرت۔ یہاں کے نوکر جا کر صرف بھائی جان کو آپ کہہ کے خطاب کرتے ہیں۔ مجھ سے تو تم کہہ کے ہی بات چیت کرتے ہیں۔

منتوش۔ مگر ان میں اور آپ میں یہ فرق کیسا۔
نشرت۔ ان کی شادی ہو چکی ہے نا۔ اور پھر میں تو اس گھر کی بیٹی ہوں، وہ بہو ہیں۔
منتوش۔ کیا آپ کی شادی نہیں ہوئی؟ آپ دونوں ایک ہی جماعت میں پڑھتی ہیں۔
نشرت۔ ہاں ہم دونوں تھرڈ ایر میں پڑھتی ہیں۔
منتوش۔ تھرڈ ایر! سائنس یا آرٹس، اے کورس یا بی کورس؟
نشرت۔ نہیں ہسٹری (بھولی صورت بنا کر) تم نے من ایم۔ اے میں کیا مضمون لیا تھا۔
منتوش۔ آپ سے کس نے کہا کہ میں ایم۔ اے ہوں۔
نشرت۔ پھر وہی آپ، تم اس آپ کہنے سے باز نہیں آؤ گے کیا؟
منتوش۔ بھولا بھولا، مگر یہ تو فرمایئے۔ آپ کو نوکر چاکر کیا کہہ کر پکارتے ہیں۔
نشرت۔ مجھے بی بی کہتے ہیں۔
منتوش۔ "تو بی بی یہ تم نے تھرڈ ایر کیا کہا تھا۔
نشرت۔ من تم بہت کچھ کہہ کر بھول جاتے ہو۔ اب ان فقروں میں میں نہیں آنے کی۔ آرٹس اور سائنس کورس جاننے والا تھرڈ ایر کو خوب اچھی طرح سمجھتا ہے۔
منتوش (ٹالتے ہوئے) مراری بابو ابتک کچہری سے واپس نہیں آئے۔ بھلا کبتک آئینگے۔
نشرت (مسکرا کر) بھلا گنتی کی فکر کر رہے ہو کیا۔ ڈرو مت میں کسی سے نہ کہونگی۔ مگر مجھے کچھ رشوت دینی ہوگی۔
منتوش۔ کیا؟
نشرت۔ کبھی کبھی ہمیں پڑھا دیا کرو۔
منتوش۔ تو اس فالتو کام کی تنخواہ کون دیگا۔
نشرت۔ تنخواہ کیسی یہ تو رشوت ہے۔ اچھا بعد میں انعام دے دیا جائیگا۔
منتوش۔ لیکن اگر تم مجھ سے پڑھا کرو گی تو باوا کو معلوم ہو جائیگا۔
نشرت۔ تو اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ میں اماں سے سچ سچ کہہ دونگی۔
منتوش۔ سچ سچ کیا؟
نشرت۔ کہ تم بہت پڑھ پڑھ کر دیوانے ہو گئے ہو۔
منتوش (سوچتے ہوئے) مگر بی بی تم اتنی شریر کیوں ہو۔
نشرت۔ اس لئے کہ تم شریر ہو۔
منتوش۔ بھلا دیوانے بھی شریر ہو سکتے ہیں۔
نشرت۔ دیوانوں کی بھی تو دو قسمیں ہوتی ہیں۔
منتوش۔ کیا کیا۔
نشرت۔ ایک تو دیوانہ محض اور دوسرے بکار خویش ہشیار

تم دوسری قسم کے دیوانے ہو۔

منتوش۔ مگر تم ایک قسم کو تو بھول ہی گئیں۔

شررت (جھک) ایسے لچھن تو تم میں نظر نہیں آتے۔

منتوش۔ سب کے سب لچھن کیا ایک ہی دن میں نظر آجاتے ہیں۔ ابھی تو دیکھتی جاؤ۔

شررت۔ اگر ایسے ہی لچھن نظر آتے تو پاگل خانہ موجود ہے۔

منتوش۔ بڑی عنایت، بڑی مہربانی (باہر دیکھ کر) مگر مراری بابو ادھر آرہے ہیں۔ میں جاتا ہوں، ابھی پھر آجاؤنگا۔　　　(جاتا ہے)

(مراری بابو، مدہومتی اور کانتی داخل ہوتی ہیں)

شررت (آگے بڑھ کر) باوا یہ منتوش تو کچھ پاگل سا ہے۔

مراری (سوچتے ہوئے) ممکن ہے۔ خیال تو میرا بھی کچھ ایسا ہی تھا۔

شررت۔ مگر ہے بہت پڑھا لکھا۔ پڑھ پڑھ کے اس کا دماغ خراب ہوگیا۔

مراری۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ اس کی تعلیم کا اندازہ تو میں آج ہی کرلونگا۔ مگر وہ ہے کہاں۔ کیا ابھی تک واپس نہیں آیا۔

مدہو (گھبرا کر) اگر وہ پاگل ہی ہے تو اس کو گھر میں رکھنا مناسب نہیں۔

شررت۔ اماں تو رائی کا پہاڑ بنا دیتی ہیں۔ کیا وہ اتنا پاگل ہے کہ لوگوں کو کاٹتا پھریگا۔

مدہو۔ بہو تم بھی تو کچھ کہو تمہاری کیا رائے ہے۔

کانتی۔ پاگل واگل تو وہ ہے نہیں۔ البتہ اس کی طبیعت میں بے پروائی بہت معلوم ہوتی ہے کسی خاص خیال میں مست رہتا ہے شاید۔

مدہومتی۔ آدمی تو خاندانی معلوم ہوتا ہے

شررت۔ ہاں خاندانوں کی حالت بگڑتے کیا دیر لگتی ہے

مراری۔ خیر اب اس کا ذکر جانے دو۔ میں آج بہت تھک گیا ہوں۔

(آواز سُنکر) یہ باہر کون کھانس رہا ہے۔ شاید منتوش ہے۔

شررت۔ باوا اسے اندر ہی بُلا لیجئے۔ دیکھئے تو کچھ واقعی پڑھا لکھا ہے بھی کہ یونہی بنتا ہے۔

مراری (آواز دیکر) منتوش اندر آجاؤ بھائی۔

منتوش (داخل ہوکر) تسلیم۔

(منتوش صوفے پر نہایت بے فکری سے بیٹھ جاتا ہے)

میں شاید مخل ہوتا ہوں؟

شررت۔ نہیں تو۔ ہاں آپ کچھ گانا جانتے ہیں تو گائیے۔

(منتوش مراری اور مدہومتی کی طرف دیکھتا ہے)

مراری۔ ہاں اگر گانا جانتے ہو تو ضرور گاؤ۔

منتوش۔ جو کچھ بُرا بھلا آتا ہے حاضر ہے۔

گیت

مدن، موہن مرلی دھاری - مرہر رمار نجن
بنکم، بن مالی، شیام تو، بار و گنجن
پنکج آنکھی - پیا سر، نٹ ہر، سر جا پچر چپک
دہن بند ہو، پریم بند ہو - کانز بجے جھنجن

شرت - آپ تو خوب گاتے ہیں منتوش بابو۔

مراری - آپ نے تو معلوم ہوتا ہے - گانے کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔

منتوش - جی ہاں بچپن میں کچھ تھوڑا بہت سیکھ لیا تھا۔

مراری - تو اب کیا تمہارے گھر کی حالت کچھ کمزور ہوگئی ہے۔

منتوش - جی گذارہ ہو ہی جاتا ہے۔

مراری - کہاں تک پڑھے ہو۔

منتوش - باوا نے کچھ سنسکرت، کچھ انگریزی کچھ فلسفہ پڑھا دیا تھا۔

مراری - تو تم تو خاصے پڑھے لکھے ہو۔ مگر پھر تم نے منشی کا کام کیوں منظور کر لیا۔

منتوش (بے پروائی سے) آپ نے فرمایا آپ کو منشی کی ضرورت ہے - میں بھی بیکار تھا۔ مگر ہمیشہ منشی گری توکرتا ہی نہ رہونگا۔ جبتک آپ کو دوسرا آدمی نہیں ملتا۔ میں حاضر ہوں۔ اور اگر ضرورت نہ ہو۔ تو ابھی جانے کو تیار ہوں۔

مراری - نہیں نہیں - میرا مطلب اس سے یہ نہ تھا۔ تم نے تو منتوش بابو ہم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔

منتوش - اس احسان کا اگر آپ ذکر ہی نہ فرمائیں تو میں بہت ممنون ہونگا۔

شرت - باوا - اگر یہ فلسفہ جانتے ہیں - تو ہم انہیں سے کیوں نہ پڑھ لیا کریں۔ بعض جگہ تو بہت دقت ہوتی ہے - کیوں کانتی؟

کانتی ہاں ہاں ٹھیک ہے۔

مراری - کیوں منتوش بابو تمہاری کیا رائے ہے - یہ فالتو کام بھی کروگے کیا۔

منتوش - میں نے تو پہلے ہی عرض کر دیا - میں بالکل بیکار آدمی ہوں - جس کام کو کہو وہیں حاضر ہوں۔ اور پھر پڑھنے پڑھانے کا کام تو بہت ہی دلچسپ ہے۔

شرت - تو پھر فلسفہ کے ساتھ ساتھ اگر آپ کبھی کبھی سنسکرت اور انگریزی بھی پڑھا دیا کریں تو کیا بات ہے۔

مراری - یہ دیکھو منتوش - تم نے تہذیب سے کام لیا۔ اور تم پر اور بوجھ پڑ گیا۔

منتوش - (پر معنی انداز سے) اس بوجھ سے میں مرتو نہیں جاؤنگا

اچھا لیجئے، اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ آپ کے کھانے کا وقت ہو گیا ہوگا۔

مراری۔ ہاں ہاں میں تو بھول ہی گیا تھا۔ آؤ چلیں۔

(جاتے ہیں)

پردہ

تیسرا منظر

مراری بابو کے مکان کا برآمدہ

(کانتی ایک تپائی پر سر رکھے مغموم بیٹھی ہے، شرت داخل ہوتی ہے)۔

شرت۔ بھابی جان کیوں خیر تو ہے۔ کیا سوچ رہی ہو، کہیں بھائی جان کی یاد تو نہیں آگئی۔

کانتی۔ شرت ان کے واپس آنے میں اتنی دیر کیوں ہوتی جا رہی ہے۔ کہیں انہوں نے ولایت ہی میں کسی میم سے شادی نہ کر لی ہو۔

شرت۔ توبہ توبہ کرو۔ اجی وہ آجکل ہی آتے ہونگے اسی لئے تو کوئی خط نہیں آیا۔

کانتی۔ شاید وہاں سے چل پڑے ہونگے۔

شرت۔ مگر بھابی تم نے منتوش کی باتیں سنیں۔ بھلا بتاؤ یہ ہے کون۔

کانتی۔ کچھ ہی ہو آدمی ہے خاندانی۔

شرت۔ تم نے دیکھا کیسے ذرا سی دیر میں ہم سب سے بے تکلف ہو گیا۔

کانتی۔ ہاں میں حیران تھی۔ صوفے پر ایسے بیٹھ گیا، جیسے اس کے لئے یہ کوئی نئی بات ہی نہ تھی۔

شرت۔ اتنا لائق آدمی کبھی نہیں دیکھا۔

کانتی۔ تو شرت کیا تم سچ مچ اس سے پڑھوگی۔

شرت۔ اور نہیں تو کیا۔

کانتی۔ نہیں شرت میری رائے میں تو ایک غیر آدمی سے پڑھنا درست نہیں۔

شرت۔ تو کالج کے پروفیسر کیا ہمارے رشتہ دار ہیں۔

کانتی۔ مگر تم منتوش کی بابت کچھ بھی تو نہیں جانتی۔ اسی لئے تو باوا نے تمہارے لئے کبھی کوئی اُستاد مقرر نہیں کیا۔ جوان لڑکیوں کے لئے ذرا احتیاط ہی کرنی چاہیئے

شرت۔ تو اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ ہم پر اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔

کانتی۔ تو تم کیا اپنے آپ کو ایسا ہی معتبر خیال کرتی ہو

شرت۔ کیوں میں نے ایسی بات ہی کونسی کی ہے۔ کہ جس سے اعتبار جاتا رہے۔

کانتی۔ لیکن خطرہ تو ضرور ہوتا ہے نا

شرت۔ کیوں خطرہ کیسا۔

کانتی۔ یہی کہ کہیں پڑھتے پڑھتے محبت کا سبق ہی پڑھنا نہ شروع کر دو۔

شرت۔ تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اگر محبت ہو گئی تو ہم اس سے شادی کر لینگے۔

کانتی۔ یہ بھی تم نے ایک ہی کہی۔ تم ایک امیر گھرانے کی بیٹی ہو، تمہارے باوا ایک بے نام و نشان کنگال محتاج سے تمہاری شادی کرنے پر کیسے رضامند ہو سکتے ہیں۔

شرت۔ مَیں ہی ایسے کونسے بادشاہ کی بیٹی ہوں محبت چاہیئے۔ امیری غریبی سب بے معنی چیزیں ہیں۔

کانتی۔ چُپ چُپ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ لو آؤ چلیں دیر ہو رہی ہے۔

شرت۔ تم چلو۔ مَیں کتابیں لیکر آتی ہوں۔ مجھے کل کے لئے سبق تیار کرنا ہے۔

کانتی۔ اچھا، مگر جلدی آجانا۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائیگا۔

(کانتی جاتی ہے)

شرت۔ یہ کانتی نے کیا کہا۔ منتوش غریب ہے۔ تو کیا اس لئے کہ مَیں ایک امیر گھرانے میں پیدا ہوئی۔ مجھے ایک غریبانہ زندگی سے ڈرنا چاہیئے۔

(کتابیں لئے ہوئے کمرے سے جانا چاہتی ہے کہ منتوش چپ چاپ دروازے سے داخل ہوتا ہے)

(شرت حیران ہو کر دیکھتی ہے)

منتوش۔ شرت۔

(دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں۔ شرت آنکھیں نیچی کر لیتی ہے)

شرت (سنبھلکر) کہیئے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ آپ رُک کیوں گئے۔

منتوش۔ آج مجھے آپ کہہ کے کیوں مخاطب کر رہی ہیں؟

شرت۔ آپ ہی ٹھیک ہے۔ ہاں کہیئے۔

منتوش۔ ایک معاملہ میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔

شرت۔ ایسا کیا معاملہ ہے۔

منتوش۔ آسام میں مجھے ایک نوکری ملتی ہے کر لوں؟

شرت۔ نہیں نہیں کہیں ایسا نہ کر بیٹھنا۔

منتوش۔ تنخواہ اچھی ہے۔

شرت۔ (سنبھلکر) تو آپ کی مرضی، آپ اچھی تنخواہ کیوں چھوڑنے لگے۔

منتوش۔ مگر وہاں کالا آزار اکثر ہو جاتا ہے۔

شرت (گھبرا کر) مت جاؤ۔ منتوش ایسی تنخواہ پر خاک ڈالو۔

منتوش۔ مگر آئندہ ترقی کی بہت امید ہے۔

شرت (سنبھل کر) تو جیسی آپ کی مرضی . . . .

مَیں جاتی ہوں مجھے کام کرنا ہے۔

منتوش۔ مَیں تو آپ کی رائے پوچھنا چاہتا تھا۔

شرت۔ ایسے معاملے میں میری رائے کی کیا وقعت ہو سکتی ہے۔

منتوش۔ آپ ہی کی رائے کی تو وقعت ہے۔

شرت۔ کیوں

منتوش۔ یہاں سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔

شرت۔ کیسے۔

منتوش۔ آپ کی عنایتوں کی وجہ سے۔

شرت۔ ایسے عنایت کرنے والے تو وہاں بھی بہت مل جائینگے۔

منتوش۔ ایسے تو کہیں نہیں ملینگے۔

شرت۔ تو پھر نہ جایئے۔

منتوش۔ مَیں روپے کی لالچ سے تو جاتا نہیں۔

شرت۔ آپ کے جانے کی وجہ تو مَیں نے دریافت نہیں کی۔

منتوش۔ مگر مَیں تو بتانا چاہتا ہوں۔

شرت۔ مجھے بتانے سے فایدہ۔

منتوش۔ آپ ہی کی وجہ سے تو مَیں یہاں ہوں۔

شرت۔ میری وجہ سے۔ یہ کیوں۔

منتوش۔ یہ تو مَیں خود بھی نہیں جانتا۔ صرف اسی قدر جانتا ہوں۔ کہ آپ کو چھوڑ کر جانے کو جی نہیں چاہتا۔ . . . آپ کی عنایتیں ہی ایسی ہیں۔

شرت۔ پھر میری عنایتوں کا ذکر۔

منتوش۔ مگر مجھے تو آپ کی عنایتوں کا ذکر کرنا ہے۔

شرت۔ وہ کیسی۔

منتوش۔ جیسی مالک اپنے ملازموں پر کرتے ہیں۔

شرت۔ ایسی، تو اس کا ذکر شاید باوا سے کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔

منتوش۔ لیکن مَیں تو اپنی عقیدت کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

شرت۔ تو یہ بھی ان سے ہی زیادہ مناسب ہے۔

منتوش۔ مگر مجھے تو آپ سے عقیدت ہے۔

شرت۔ اس کی وجہ۔

منتوش۔ شاید کسی پچھلے جنم میں مجھے آپ سے محبّت رہی ہو۔

شرت۔ ممکن ہے میری شکل کسی ایسے شخص سے ملتی جُلتی ہو تو پچھلے جنم میں آپ کا رشتہ دار رہا ہو۔ اور آپکی آنکھیں دھوکا کھاتی ہوں۔

منتوش۔ مَیں تو دل کی عقیدت کو کہہ رہا ہوں۔ آنکھوں کا اس سے تعلق۔ مگر یہ تو کہیئے آپ کے دل میں بھی مجھے دیکھ کر کچھ خیال آتا ہے یا نہیں

شرت۔ بالغرض اگر آیا بھی ہو تو کیا۔

منتوش۔ یونہی مَیں پُوچھتا تھا۔ لو ذرا سچ کہہ دو۔

شرت۔ بالکل نہیں آیا۔

منتوش۔ شرت تم شرارت کر رہی ہو۔

شرت۔ شرارت میں کر رہی ہوں یا تم۔ یہ آسام جانے کی کہانی کس نے گھڑی تھی۔

منتوش۔ تو کیا تم نے سب کچھ سمجھ لیا۔

شرت۔ میں نے کیا کچی گولیاں کھیلی ہیں۔ کہیں باوا نہ آجائیں مجھے معاف کیجئے۔ میں جاتی ہوں۔

منتوش۔ ذرا تو ٹھہریئے۔ یہ تو بتا جایئے۔ کہ آپ کس وقت پڑھا کرینگی۔

شرت۔ نہیں۔ میں اب آپ سے نہیں پڑھ سکتی۔

منتوش۔ کیوں، آپ نے خود پڑھنے کی ضرورت بیان کی تھی۔

شرت۔ اب ضرورت نہیں رہی۔

منتوش۔ تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے۔

شرت۔ یہ بھی اپنے دل سے پوچھئے۔

(جاتی ہے)

منتوش۔ شرت یقیناً مجھ سے محبت کرتی ہے۔ محبت کے باوجود اس قدر ضبط۔ اتنی حیا۔ دیوی تو پرستش کے قابل ہے۔

(جاتا ہے)

چوتھا منظر

مراری بابو کا کمرۂ ملاقات

(مراری بابو اور مدہومتی باتیں کر رہے ہیں)

مدہو۔ تم دوسروں کے دھندوں میں ہی رہوگے۔ یا کچھ اپنی بیٹی کی بھی فکر ہے۔

مراری۔ مجھے تو تم ایسا بے فکرا ہی سمجھتی ہو۔ میں نے شرت کی شادی کے لئے سب دوستوں سے کہہ رکھا ہے۔

مدہو۔ دوسروں کو کیا غرض پڑی ہے۔ کہ وہ بر تلاش کرتے پھریں۔ جب تک تم خود کوشش نہ کروگے۔ کچھ نہ ہوگا۔

مراری۔ دوارکا بابو نے مجھ سے راجہ دیوی پرسن رائے کے بیٹے کا ذکر کیا تھا۔

مدہو۔ اب لگے تم بے پرکی اڑانے، راجہ دیوی پرسن رائے کے بیٹے سے تو کم پر تمہاری نظر ہی نہیں پڑتی۔ ان کی سالانہ آمدنی تو دس لاکھ روپے ہے۔ وہ کسی راجہ کی بیٹی سے ہی شادی کرینگے۔

مراری۔ دس لاکھ آمدنی ہے۔ تو ہوا کرے۔ ہم کسی سے کچھ مانگنے جا رہے ہیں۔ ان کو کچھ دے ہی دینگے۔

مدہو۔ تمہیں کچھ امید بھی ہے یا یونہی خیال ہی خیال میں

مست ہو۔

مراری۔ وہ ارکا بابو نے کہا تھا۔ کہ سب کچھ کمار کے گرو کے ہاتھ میں ہے۔ میں کل سنتے ہی ہگلی پہنچا۔ اور ان سے ذکر کیا۔ شرت کی جنم پتری بھی میں ساتھ ہی لے گیا تھا۔

مدہو۔ اگر گرو جی کو دو چار ہزار روپے دے کر کام ہو سکتا ہے تو دے ڈالو۔

مراری۔ نہیں وہ ایسے آدمی نہیں ہیں۔ وہ خود بہت خوشحال ہیں۔ وہ تو دان تک نہیں لیتے۔

مدہو۔ پھر انہوں نے کہا کیا۔

مراری۔ وہ اب آتے ہی ہونگے۔ شرت کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ چھ بجے آنے کو کہا تھا۔

مدہو (گھبرا کر) او ہو چھ تو بج گئے۔ اور تم نے مجھ سے ذکر تک نہیں کیا۔ شرت نے نہ کوئی کپڑا پہنا ہے نہ زیور۔ یہ تم نے کیا کیا؟

مراری۔ زیور دیور کی کچھ ضرورت نہیں۔ انہوں نے خود ہی منع کر دیا تھا۔

(ملازم داخل ہوتا ہے)

ملازم۔ حضور باہر موٹر پر کوئی پنڈت جی تشریف لاتے ہیں۔

مراری (خوش ہو کر) لو گورو جی آ گئے۔ میں ان کی پیشوائی کو جاتا ہوں۔

(جاتا ہے)

مدہو۔ (جاتے ہوئے) پرماتما کرے یہ کارج سدھ ہو جائے۔

(جاتی ہے)

(مراری بابو اور پنڈت رام چرن نیاے نالنکار داخل ہوتے ہیں)

رام چرن۔ مراری بابو اس بات کا خیال رکھنا کہ میرے یہاں آنے اور لڑکی کو دیکھنے کا حال کسی کو معلوم نہ ہو۔

مراری۔ مگر میں نے اپنی بیوی سے تو کہہ دیا ہے۔

رام چرن۔ اس میں کچھ ہرج نہیں۔ باہر کے کسی آدمی کو معلوم نہ ہو۔ اور خصوصاً لڑکی کو تو بالکل بے خبر رہنا چاہئے۔

مراری۔ جو ارشاد۔

رام چرن۔ ایک بات اور بھی ہے۔ میں لڑکی سے بھی دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

مراری۔ آپ نے جنم پتری بھی دیکھ لی۔

رام چرن۔ جنم پتری نہ دیکھ لی ہوتی تو یہاں کیوں آتا آپ کی بیٹی کا لگن بہت اچھا ہے۔ برہسپتی کا اثر غالب ہے۔ اسے کسی راجہ کی رانی ہی بننا چاہئے۔

مراری (خوش ہو کر) اب یہ تو سب کچھ آپ کے اختیار ہی میں ہے۔

رام چرن۔ مگر یہ تو کہو مراری بابو آپ کا مکان کہاں ہے۔

مراری۔ چندر نگر

رام چرن۔ چندر نگر، میں خود وہیں کا رہنے والا ہوں۔ وہاں کے تو میں بچے بچے سے واقف ہوں آپ کے والد کا نام

مراری۔ رام ہری نیاسے رتن

رام چرن۔ اچھا! رام ہری تو وہ تو میرے بہت بڑے دوست تھے۔ بس تم سے مل کر بہت ہی خوش ہوا تمہاری بچی تو پھر اپنی ہی بچی ہے۔ اس میں تمہارے کہنے سننے کی کیا بات ہے۔ اچھا تو انہیں اب بلا لو نا۔

مراری۔ ابھی حاضر ہوا۔

(جاتا ہے)

رام چرن۔ مراری بابو۔ مدہو۔ کانتی۔ شرت

(مراری بابو۔ مدہومتی۔ کانتی اور شرت داخل ہوتے ہیں)

(مدہومتی بڑھ کر سلام کرتی ہے)

مراری بابو۔ یہ ہیں شرت کی ماں۔

رام چرن۔ سکھی رہو۔

مراری بابو۔ (کانتی کی طرف اشارہ کرکے) یہ میری بھو ہیں۔

رام چرن۔ پرماتما تمہاری بپتا دور کرے۔

کانتی (الگ ہوکر) یہ کیا انتریامی ہیں۔

مراری (شرت کی طرف اشارہ کرکے) یہ ہے آپ کی کنیز، شرت۔

رام چرن۔ تو راج رانی ہو۔

مراری۔ آپ کی کنیز آپ کی خدمت میں حاضر رہے گی میں تھوڑی دیر کے لئے اجازت چاہتا ہوں۔

(جاتا ہے)

مدہو۔ (شرت اور کانتی سے) تم گورو کی سیوا میں بیٹھو بس آپ کے لئے کھانے کا کچھ انتظام کرتی ہوں۔

رام چرن۔ نہیں یہ تکلیف نہ کیجیے گا۔ مجھے آج راجہ دیوی پرسن راے کے ہاں کھانا کھانا ہے۔

مدہو۔ راجوں کے ہاں تو آپ روز کھاتے ہیں۔ آج غریبوں کا دال بھات بھی کھا لیجیے۔

رام چرن (مسکرا کر) مگر ایک شرط ہے۔ اگر شرت خود کھانا پکائے تو میں کھا لونگا۔

شرت۔ بڑی خوشی سے۔

(مدہومتی جاتی ہے)

رام چرن۔ تو بیٹی تم ابھی تک کالج میں پڑھتی ہو۔

شرت۔ جی ہاں۔

رام چرن - کالج میں تو گانا بھی سکھایا جاتا ہے۔

کانتی - جی ہاں شرت بہت اچھا گاتی ہے۔

شرت - نہیں گورو جی، کانتی مجھ سے بہت بہتر گاتی ہے۔

رام چرن - تو معلوم ہوا تم دونوں اچھا گاتی ہو۔ لو تو کچھ سناؤ۔ ہم خود دیکھ لینگے۔ تم میں سے کون اچھا گاتی ہے۔ بیٹی تم بڑی ہو تم شروع کرو۔

کانتی - مجھے سُنکر کیا کیجیئے گا۔ میں خود ہی ہار مان لیتی ہوں۔ آپ انعام شرت ہی کو دے دیجیے۔

شرت - یہ تو کبھی نہ ہوگا۔ تمہارا حق میں کیسے لے سکتی ہوں۔ میں تمہارے سامنے کیا گاؤنگی۔

رام چرن - نہیں نہیں تم دونوں گاؤ۔ اچھائی بُرائی کا فیصلہ میں کرونگا۔ لو بیٹی اب گاؤ۔

شرت - اگر ایسا ہی حکم ہے تو میں حاضر ہوں۔

گیت

(امن)

کوئلیا بولے ری پیہو پیہو
ان کی اور مورا من لاگے ری
جب سوں ہو شٹ پڑی بالم کی
ان بنا کچھو نا سہائے ری

رام چرن - واہ واہ تم تو بہت اچھا گاتی ہو۔ یہ سب تکلف ہی تھا۔ اب دیکھیں کانتی کیسا گاتی ہے۔ ہاں بیٹی اب تمہاری باری ہے۔

کانتی - میں تو تھوڑی سی ستار ہی بجاتی ہوں۔

گیت

(بھاگیسری)

تم بنا کیسے رہونگی پیا مورا رے - تم بنا
نسدن موہے کٹھن بپت ہے
بیاکل ہے جیا مورا رے - تم بنا

رام چرن - شاباش، شاباش

(دونوں جُھک کر سلام کرتی ہیں)

(گورو جی ان کو اشیرباد دیتے ہیں)

کانتی بیٹا، ہماری سندھیا کا وقت ہوگیا ہے ذرا پوجا کے لئے انتظام کردو۔

کانتی - بہت بہتر گورو جی۔

(جاتی ہے)

رام چرن - شرت - یہ باہر برآمدے میں کون بیٹھا ہے۔

شرت - کون گورو جی۔

رام چرن - یہی نوجوان سا لڑکا، کچھ لکھ رہا تھا عجیب بے پروائی سے بیٹھا تھا۔

شرت ۔ (گھبرا کر اور شرما کر) وہ . . . یہ . . .
. . یہ . . . وہ چند دنوں سے . یہاں
. . کچھ باوا کا کام کرتے ہیں۔

رام چرن ۔ کیا کام۔

شرت ۔ یہی کچھ کتابوں کی فہرست بنانے کا کام

رام چرن ۔ تو تمہارے ہاں ملازم ہے۔

شرت ۔ نہیں نہیں کچھ ایسا ملازم بھی نہیں بس یونہی کام کرتے ہیں۔

رام چرن ۔ کچھ تنخواہ پاتا ہے۔

شرت (ٹالتے ہوئے) وہ بہت عالم ہیں۔ اور خاندانی بھی۔ پہلے ان کی حالت بہت اچھی ہوگی۔

رام چرن ۔ تو اب بیچارہ غریب ہوگیا ہے۔ جب ہی نوکری کرتا ہے۔

شرت ۔ یہ تو میں نہیں کہہ سکتی۔

(کانتی آتی ہے)

کانتی ۔ گورو جی پوجا کا سب سامان تیار ہے تشریف لے چلئے۔

رام چرن (شرت سے) بیٹی تم تو ہمارا کھانا پکانے کو کہتی تھیں۔ جاؤ ذرا پکتے ہوئے کھانے کو ہاتھ ہی لگا دو۔ میں سندھیا کے بعد ہی کھانا کھایا کرتا ہوں۔

شرت (جاتے ہوئے) جو ارشاد

(جاتی ہے)

رام چرن ۔ واہ بیٹا منتوش خوب لڑکی چنی۔

(مراری داخل ہوتا ہے)

میں نے لڑکی کو دیکھ بھال لیا ہے۔ پھاگن کی بائیس تاریخ شادی کے لئے بہت مبارک ہوگی۔

مراری (خوش ہوکر) آپ کی مہربانی، میں شکریہ کیسے ادا کر سکتا ہوں۔ مگر اتنے تھوڑے سے عرصے میں میں تیاری کیا کر سکونگا۔

رام چرن ۔ ایسی تیاری کی ضرورت ہی کیا ہے

مراری ۔ آخر کمار ایک راجہ کا بیٹا ہے۔ کچھ نہ کچھ تو تیاری چاہیئے ہی۔

رام چرن (اٹھکر) نہیں یہ لگن بہت ہی مبارک ہے اور میں تم پر زیادہ بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔ ہاں یہ یاد رکھنا لڑکی کو شادی کی بالکل خبر نہ ہو۔ جنم پتری بھی کہتی ہے۔ کہ شادی کے دن تک لڑکی کو پتہ نہ لگے

مراری (اس کے پیچھے پیچھے جاتے ہوئے) آپ ہی کو ہماری شرم ہے۔

پردہ

باقی آئندہ

دُنیا میں جہنّم

(۱)

پیرس میں دولتمند اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کی ایک اخلاقی انجمن ہے۔ جس کا کام تفریح و تفنن کے علاوہ ارکان میں اُن پاکیزہ خصائل کی رُوح پھونکنا ہے۔ جو تمدن و تہذیب کے ضامن اور اخلاقی معاشرتی تباہی سے بچانے کے کفیل ہیں۔ اس انجمن کے ارکان میں صرف وہی نوجوانان پیرس ہیں۔ جنہوں نے فرانس کے بڑے بڑے مشہور و نامور کالجوں میں تکمیل و تحصیل علم کی ہے۔ اور جو اپنے مال و دولت نیز اعزاز و وجاہت خاندانی کے لحاظ سے ممتاز ترین سوسائٹی کے افراد خیال کئے جاتے ہیں۔

انجمن کے قواعد و مقاصد کو تفصیل سے بیان کرنا تو طول عمل سے خالی نہیں۔ مگر سب سے بڑا اصول و مقصد یہ ہے کہ عادات ذمیمہ مثلاً شراب نوشی، بدکاری وغیرہ اس کے ارکان میں نہ پیدا ہو۔ اگر ہو جائے تو مختلف عمدہ طریقوں سے ان خانماں خراب رذائل سے ان کو بچایا۔ اور دُور کیا جائے۔

باوجود ان تمام مساعی اور زرّیں اصول کے سوسائٹی کے ارکان میں ایک نوجوان ہے جو شرابخواری کا نہایت دلدادہ، عیش پرستی میں ہمہ تن گرفتار اور لذائذ نفسانی میں محو و مستغرق ہے۔ سوسائٹی کے تمام ارکان اور اُس کے مختلف احباب نے ہر چند سمجھایا اور عواقب و نتائج سے ڈرایا۔ مگر یہ بلائے بے درماں امراض کچھ اس طرح اس کے گلے لگے ہیں۔ کہ کوئی نصیحت و تنبیہ کارگر نہ ہوئی۔

سوسائٹی کے ارکان جو درحقیقت جارج سے بہی خواہ اور سچے مخلص و شفیق تھے تنگ آ گئے اب اُن کے نزدیک اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ کوئی ایسا زبردست لائحہ عمل تیار کیا جائے کہ ہمیشہ کیلئے جارج کو ان معائب سے پاک کر دے۔ اور توبہ کرائے اس کے لئے جارج سے مخفی ایک خاص جلسہ ہوا۔ کہ جارج کو کیونکر اُس کی حرکات سے روکا جا سکتا ہے سب اپنی اپنی تجویزیں پیش کریں۔ اور مؤثر و کارگر تدبیر جو باتفاق آراء پاس ہو۔ اُس کو عمل میں لایا جائے

(۲)

اتوار کا دن ہے۔ جون کی ۱۷۔ تاریخ، سوسائٹی کا ہال نہایت آراستہ ہے۔ برقی روشنی نے تمام ہال کو پیکرِ نور بنا دیا ہے۔ ملازمین ضروری انتظامات میں

مصروف ہیں۔ ٹھیک آٹھ بجے شب تک تمام اراکین آگئے۔ چارلس کی صدارت میں جلسہ کی کارروائی شروع ہوئی۔ اُس نے اپنی صدارتی تقریر میں جارج کے اعمال و فضائل پر تبصرہ کیا۔ پھر جلسہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی۔ اور حاضرین کا شکریہ ادا کرکے وہ اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ بتدریج اکثر ارکان نے اپنی اپنی تجویزیں پیش کیں۔ مگر بحث و مباحثہ کے بعد کثرت رائے سے سب مسترد ہوتی چلی گئیں۔

سوسائٹی کے ارکان میں چرچل کی قابلیت اور سلامت مذاق کا بڑا شہرہ تھا۔ وہ اب تک مرسح (اسٹیج) پر نہیں آیا ہے۔ احباب بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور اکثر کا یہ خیال ہے کہ چرچل کی تجویز غالباً سب سے انوکھی اور مقبول و کارگر ہوگی۔ اور حق یہ ہے کہ چرچل ہی کی مجوزہ اسکیم جارج کو اس کے تباہ کن عادات سے بچا سکیگی۔ اتنے میں چاروں طرف سے آوازیں آئیں: چرچل۔ چرچل۔ چرچل۔ معلوم ہوا کہ تمام ہال اس کی تقریر و تجویز کا مشتاق اور اس کے اسٹیج پر آنے کا ہمہ تن محو انتظار ہے۔

صدر نے باداتے خاص مسٹر چرچل کی طرف دیکھا اور وہ پیکر متانت و سکوت مسکراتا ہوا اسٹیج پر آیا اور اپنی موثر مگر غیر اشتدادی تقریر یوں شروع کی:

"جنابِ صدر و احبابِ کرام! میں شکرگذار ہوں کہ جناب نے اس مجلسِ خصوصی میں جس کے ارکان تمامتر شرفاء پیرس اور سب کے سب تعلیم یافتہ نوجوانانِ فرانس ہیں۔ مجھے اپنی تجویز پیش کرنے کا موقع دیا۔ اپنے عزیز دوست جارج کی حالتِ زار پر میں نے بارہا افسوس کا اظہار کیا ہے۔ اور کئی راتیں اس غور و فکر میں صرف کی ہیں۔ کہ جارج کو کیونکر اُس کی موجودہ تباہ کن عادات سے باز رکھا جاسکتا ہے۔ ہماری انجمن جیسا کہ اس کے ہر ممبر کو معلوم ہے۔ اصلاحِ اخلاق کے ساتھ ساتھ ایک مرکز تفریح و تفنن بھی ہے۔ لہٰذا میرا یہ خیال بھی رہا کہ اس کام کے لئے جو صورت اختیار کی جائے۔ وہ بھی دلچسپ اور اپنی نوعیت کے لحاظ سے نیز تفریح و تفنن کے نقطۂ نظر سے ضرور کوئی اپنے اندر جدت رکھتی ہو۔ شکر ہے کہ میری یہ راتوں کی بیخوابی بیکار نہ گئی۔ اور میں ایک کامیاب تحریک پیش کرنے کے قابل ہو سکا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ میری مجوزہ تدبیر یقیناً کارگر ثابت ہوگی۔ اور ہم زندہ دلانِ پیرس کے لئے غالباً اس سے بہتر تجویز مشکل سے کوئی دماغ پیدا کر سکتا ہے۔ احبابِ کرام سے میری یہ استدعا بھی ہے۔ کہ اختلاف میں عجلت سے کام نہ لیں۔ بلکہ بجائے خود بھی غور و خوض کر لیں۔"

انجمن کے ہال میں خاموشی مطلق فرمان روا تھی۔ تمام حاضرین ہمہ تن گوش بنے ہوئے تھے سب کو اشتیاق آمیز انتظار تھا کہ دیکھیں کیا سُننے میں آتا ہے۔ مقرر نے یہ بھی کہا کہ "یوں تو ہم میں سے ہر فرد کی تمنائے دلی یہ ہے کہ جارج کی اصلاح حال کے لئے کوئی حیلہ کارگر سوچا جائے۔ اور تمام احباب نے اس راہ خلوص میں جو کچھ اُن کے دماغ نے یاوری کی۔ اظہار خیال کیا۔ اس مختصر تمہید کے بعد میں اپنی رائے پیش کرتا ہوں"

اس کے بعد چرچل مے نے وہ حصّہ شروع کیا جسے وہ اپنے گھر سے لکھ کر لایا تھا۔ تقریر کے ختم ہوتے ہی تمام ہال تالیوں کے شور سے گونج گیا۔ اور اسی گونج میں تجویز پاس ہوگئی۔ تجویز کیا تھی یہ آگے چلکر ارکان کے عمل سے خود ناظرین کو معلوم ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ دوسرے دن صبح ہوتے ہی سکرٹری کی جانب سے جارج کو یہ اطلاع ملی۔ کہ :۔

"کل ۱۹۔ جون کو ارکان انجمن خلوص شہر سے باہر کس قدر دور ایسے مقام پر تفریح کے لئے چلنا چاہتے ہیں۔ جہاں کی سرزمین اب تک انسانی نقوش قدم سے پامال نہیں ہوئی ہے۔ براہ مہربانی آپ بھی تیار رہیں۔ اس سفر کا مقصد تفریح کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

جارج نے بڑی جوش مسرت کے ساتھ اس تقریب کا خیر مقدم کیا۔ اور لکھ دیا کہ جارج ایسے مبارک سفر کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ اور بڑے جوش سے اس تجویز کو لبیک کہتا ہے۔

(۴۴)

دوسرے دن علی الصباح تمام احباب خاص ہال میں موجود تھے۔ حسبِ ضرورت سفر کا انتظام رات ہی کو سکرٹری کے حسنِ انتظام و توجہ سے ہوگیا تھا۔ یہ لوگ روانہ ہوئے اور ایک صحرائے لطیف میں پہنچ گئے۔ جو ایک دلپذیر ساحل کے بحر پر واقع تھا۔ میدان نہایت وسیع اور منظر نہایت دلچسپ و نظر فریب تھا۔ نیچرل سینریاں، ہر ہر قدم پر،

"کرشمہ دامنِ دل مے کشد کہ جا ایں ست"

کا مصداق تھیں۔ ارکان نے بالاتفاق اس جگہ کو پسند کیا۔ جارج کا دل خدا جانے کیوں اندر ہی اندر سے کھلایا جاتا تھا۔ وہ کسی قدر خلاف تھا۔ مگر کثرت رائے نے اُس کو زبان سے ایک حرف بھی نہ نکالنے دیا۔

سامان رکھا گیا۔ اور یہاں آئے ہوئے کچھ زیادہ دیر نہ ہوئی تھی۔ کہ ایک ممبر نے جارج کو ایک خوشبودار چیز دیکر کہا:۔

"مسٹر جارج یہ ایک لطیف خوشبودار پھولوں کا

جوہر ہے۔ آپ اپنی قوتِ شامہ کو بھی محروم نہ رکھئے۔
مجھے امید ہے کہ آپ اسے سونگھ کر خوش ہونگے۔"

نوجوان جارج نے اس کے ہاتھ سے شیشی لے کر ناک سے لگائی، لگانا تھا کہ وہ اپنے ہوش میں نہ تھا اور اسی وقت گر پڑا۔ بالکل بے حواس و مدہوش، بے خود و بیخبر تھا۔ ارکان نے فوراً اپنا نظامِ عمل شروع کیا۔ چند لوگ جنگل کی لکڑیاں چن لائے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ایک عمدہ جھونپڑی بن کر تیار ہو گئی۔ اندر تارکول یا کوئی اور سیاہ روغن پھیر دیا گیا۔ جہاں تاریکی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا۔ اس کے تمام سوراخ اور درازیں بالکل بند کر کے پھر اس پر فاسفورس مل دیا گیا۔ اس کے بعد خود چند ممبروں نے کپڑے اتارے، صرف قبائے برہنگی اور ملبوسِ فطری کو کافی سمجھ کر اپنے جسموں پر خوب سیاہی اور اوپر سے فاسفورس مل لیا۔ تاریکی میں یہ اور ان کا مکان بالکل آتشین نظر آتا تھا۔

اب یہ آتشیں مخلوق نوجوان جارج کے بے حس و حرکت لاشہ کے پاس گئے۔ اور اٹھا کر اسے اس تاریک آتشیں جھونپڑی میں ڈالا پھر خود اندر داخل ہو کر اس کے درازوں، سوراخوں اور دروازے کو اس طرح بند کر دیا۔ کہ آفتاب عالمتاب کی زرّیں شعاعیں اندر داخل ہو سکیں اور یوں اپنے مجوزہ انتظامات و استحکامات کی تکمیل کر کے نوجوان جارج کو ایسی دوا سونگھائی گئی کہ اس نے فوراً آنکھیں کھول دیں۔ آنکھیں کھلیں اور ہوش و حواس درست ہوئے تو اسے ایک عجیب و غریب اور بالکل حیرت انگیز جلوہ نظر آیا۔ وہ ادھر ادھر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا ہے مگر آتشیں مخلوق اور آتشیں مکان کے سوا اپنے سامنے کچھ نہیں پاتا۔ نہ وہ احباب خلوص شعار ہیں نہ وہ لطیف سبزہ زار۔ نہ وہ ساحل بحر ہے۔ نہ وہ میدانِ وسیع و ناپیدا کنار۔ جارج بہت گھبرایا۔ اس کا دل دہل گیا۔ وہ کانپنے لرزنے لگا۔ یہ دیکھ کر کہ جس مکانِ تنگ میں وہ محصور ہے۔ وہ آگ کی طرح دہک رہا ہے۔ اس کے سامنے جسقدر لوگ ہیں وہ صورتاً انسان مگر سب آگ کے بنے ہوتے اور برہنہ و خاموش ادھر ادھر کھڑے ہیں۔ کوئی کسی سے بات نہیں کرتا۔ سامنے ایک آتشیں کرسی پر ایک آتشیں انسان جاہ و جلال سے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں شعلوں کی طرح چمک رہی ہیں۔ انداز سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان سب کا سردار ہے۔ غرض مکیں آتشیں، مکاں آتشیں، کرسی آتشیں، گویا آگ ہی آگ اس کو چاروں طرف سے محیط ہے۔ بھاگنے کو کہیں راستہ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ جارج کی حالت زار قابلِ دید تھی۔ حیرت ہی نہیں بلکہ خوف و ہراس اس پر طاری تھا۔ اس ہولناک نظارہ کو دیکھ کر وہ کانپ

گیا۔ اُس کا خون بدن میں خُشک ہونے لگا۔ اُس کے اضطراب و قلق کی کوئی حد نہ تھی۔ ابھی وہ کچھ بولنے اور پوچھنے بھی نہ پایا تھا کہ رئیس نے جو کرسی پر جلوہ افروز تھا خشونت و وقار کے لہجہ میں خونخوار آنکھیں جارج کی طرف نکال کر نہایت غضب آگین پیرایہ میں کہا:۔

لاؤ! لاؤ!! اس بدمعاش و گنہگار انسان کو ہمارے سامنے لاؤ۔ کہ یہ اپنے کئے کی سزا کو پہنچے۔ اور ابتک جو کچھ بدکاریاں کرتا رہا ہے۔ اُس کا خمیازہ بھگتے۔ اسکے ہاتھ بدکاری میں رنگے ہوتے ہیں۔ اس کے رگ و پے میں شراب سے ممزوج خون دورہ کر رہا ہے۔

اس مہیب حکم نے جارج کی رہی سہی قوتِ استقلال کا خاتمہ کر دیا۔ وہ بہت ہی پریشان و مضطرب تھا مگر چارہ کار ہی کیا تھا۔ یہ فرمان سُنتے ہی دو تین شخص پیرس کے عیش دوست و بادہ پرست نوجوان جارج پر ٹوٹ پڑے۔ اُٹھا کر کرسی کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اور جو آتشیں لوگ موجود تھے وہ آگے بڑھے۔ اور آتشیں دُرّے جارج پر برسانا شروع کر دئے۔ نوجوان، مہذب، تعلیم یافتہ نوجوانِ پیرس کے جسم پر تڑ تڑ ہنٹر پڑنے لگے۔ ایک، دو، تین۔ تین تک تو ہمارا بہادر صبر آزما جارج ضبط کر سکا۔ مگر اب اُس میں تاب ضبط و قوتِ صبر باقی نہ تھی۔ "ہائے مار ڈالا ہائے مار ڈالا۔ خُدا کے لئے مجھ پر رحم کرو۔ اب میں ایسا نہ کرونگا۔ اور مجھے چھوڑ دو۔ اس عذاب سے نجات دو" جارج برابر چیختا چلاتا رہا فریاد و واویلا کرتا رہا۔ مگر یہاں نہ کوئی اُس کا بچانے والا تھا اور نہ فریاد رس، تھوڑی ہی دیر میں جارج کے نازک و گلابی جسم سے خون بہنے لگا۔ اور اُس کی حالت قابلِ رحم ہو گئی۔ رئیس بولا

رئیس۔ او بدمعاش! تجھ سے کس نے کہا تھا کہ بدکاریاں کر، نشۂ شراب میں مدہوش رہ۔ او ذلیل و نالائق انسان تجھے کس نے آمادہ کیا تھا کہ ایسے بڑے بڑے گناہوں کا مرتکب ہو۔ تو قہرِ خدا اور عذابِ آخرت سے نہیں ڈرتا تھا۔ کیوں اس بیباکی سے شراب پینے کا مزہ معلوم ہوا۔ کیوں یہ زنا اور بدکاری کی معصیت کو اس آزادی سے مقصد زندگی بنانے کا انجام دیکھ لیا او بدکردار تو اپنے اس پروردگار سے نہ ڈرا جس نے تجھے پیدا کیا ہے۔ کیا تو ننھا نادان تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ یہ جو کچھ تو دُنیا کی زندگی میں کر رہا ہے۔ مرنے کے بعد اس کا انجام عذاب شدید ہے۔ حیاتِ بے ثبات کی رنگ رلیاں آخرت میں عقوبت کی مرادف ہیں۔ تو بے شبہ عذاب سخت کا مستحق و سزاوار ہے۔ کیا تجھے تیرے معبود نے بادہ خواری سے منع نہیں کیا تھا۔ کیا تجھے ہوس پرستی اور ارتکاب زنا و عیاشی سے باز رہنے کی ہدایت نہیں

کی لگاؤ اے دوزخ کے فرشتو! اس بدمعاش کو آگ کے دھتے لگاؤ۔ اے زبانیہ! اسے اس کے افعال کا مزہ چکھاؤ۔ ابھی یہ اس سے زیادہ عذاب کا سزاوار ہے۔

داروغہ جہنم یعنی اپنے رئیس کا حکم سنتے ہی عذاب میں اور شدت ہو گئی۔ زبانیہ (دوزخ کے فرشتے) پل پڑے دُرّوں کا مینہ پھر برسنے لگا۔

جارج چیختا ہے۔ چلاتا ہے۔ "یا اللہ توبہ۔ توبہ مغفرت مغفرت۔ خدا کے لئے مجھے بخشو۔ میرا گناہ معاف کرو۔ میں اپنے کئے کی سزا کو پہنچا۔

رئیس۔ کیا تو اب یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہاں سے پلٹ کر دُنیا اور اپنے گھر پھر واپس جائیگا۔ یہ خیال دل سے نکال ڈال۔ دور زندگی ختم ہو چکا۔ وہ سب رنگ رلیاں عیش پرستیاں اور مینوشیاں حیات مستعار کے ساتھ ختم ہو گئیں۔ اب تو تجھے ہمیشہ اسی گوشۂ جہنم میں رہنا اور یہی سزا بھگتنا ہے۔ یہ عالم آخرت ہے۔ بھلا یہاں سے بھی پلٹ کر کوئی انسان پھر وہاں جا سکتا ہے۔ اور گیا ہے۔

جارج۔ چلا کر۔ نہیں نہیں او میرے آقا اب میں توبہ کرتا ہوں۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ میں خدائے پاک کی بارگاہِ فیاض میں بصد زاری ملتجی ہوں۔ کہ اب مجھ سے ایسے گناہوں کا ارتکاب نہ ہوگا۔ میں نے اپنے کئے کا پھل پایا۔ میں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچ گیا۔ میری توبہ قبول اور میرا جرم معاف ہو۔

رئیس۔ اچھا ابتک جو کچھ تو نے کیا اور کرتا رہا ہے اس سے سچی توبہ کرتا ہے۔ ہمیں اختیار معافی بھی دیا گیا ہے اور پھر دُنیا میں بھیجا جا سکتا ہے۔ تاکہ دُنیا والوں کے لئے نمونۂ عبرت ہو۔ اور لوگ ایسے گناہوں سے باز آئیں۔

جارج۔ حضور والا! میں بالکل سچی توبہ کرتا ہوں۔ میرے دل سے غفلت دُور ہو چکی۔ اور میری آنکھیں اب کھل گئی ہیں پردہ اٹھ گیا۔ میں نے بچشم خود سب کچھ دیکھ لیا۔ اب مجھ سے یہ گناہ ہرگز نہ ہونگے۔ اور میں اپنی پوری طاقت ایسے افعال کو روکنے میں صرف کرونگا۔ میری زندگی اب اتقائی زندگی ہو گی۔

رئیس۔ اچھا اچھا تیری توبہ قبول ہے۔ تیری مغفرت کی جاتی ہے۔ مگر فی الحال عارضی۔ او بندۂ ہوا و ہوس۔ او پرستارِ نفس، اگر اب تو نے ایسی معصیت کا ارتکاب کیا۔ اور اب تو نے حرام چیزوں کو حلال سمجھ کر پروا نہ کی۔ تو یاد رکھ۔ آج جو عذاب تجھے چکھایا گیا ہے۔ اس سے زیادہ شدید عذاب تجھے بھگتنا ہوگا۔ اور اس سے زیادہ خوفناک و مہلک سزا تجھے دی جائیگی۔ جو آج تجھے دی گئی ہے۔

نوجوان جارج۔ میں خدا کی قسم کھاتا ہوں اور عہد کرتا ہوں۔ کہ اب پھر کوئی ایسا کام نہ کرونگا۔ جو خدائے پاک کی ناراضی و غضب کا موجب ہو۔ میری توبہ، توبۂ نصوح ثابت

ہوگی۔ اور میری موجودہ تکلیف آئندہ میری راہنما۔

رئیس الزبانیہ۔ (سردار دوزخ) اچھا اچھا، اب اس کو چھوڑ دو۔ اے دوزخ کے فرشتو! جانے دو۔ ہم اس کا قصور معاف کرتے ہیں۔ اور اسے پھر دُنیا میں بھیجکر اس کی آزمائش کریں گے۔

اتنے میں ایک فرشتہ دوزخ ایک ہیکلِ آتشین نے بڑھ کر اُسے کچھ سونگھا دیا۔ اور جارج پھر بے ہوش و بے خبر تھا۔

(۴)

ناظرین! چرچل کی جس تجویز سے سوسائٹی کے ارکان نے اتفاق کیا تھا۔ اور جس کے عمل میں لانے کے لئے صبح ہی سے کارروائی شروع ہوگئی تھی۔ وہ تجویز کیا تھی۔ اب آپ خود ہی سمجھ گئے ہونگے۔ آپ نے بچشم خود اس کو عملی لباس میں دیکھ لیا۔ جارج نے اس کی بدولت "دُنیا میں عذابِ عقبےٰ" پالیا۔ اور تمام ارکانِ سوسائٹی خوش ہیں کہ وہ اپنی مجوزہ اسکیم میں ناکام نہ رہے۔ جو لائحہ عمل اُنھوں نے پاس کیا تھا وہ عملاً بہت ٹھیک نکلا۔ اور بہت کامیاب ثابت ہُوا۔

چرچل، جس نے آتشین کُرسی پر رئیس الزبانیہ کا فرض انجام دیا تھا یقین رکھتا ہے۔ کہ اس سزا کے بعد جارج کی آنکھیں ضرور کھل جائینگی۔ اور اب وہ ایسے افعال کا ارتکاب ہرگز نہیں کرسکتا۔ جن کی وہ پوری سزا بھگت چکا ہے۔ اور جو نہ صرف ارکانِ انجمن بلکہ تمام اخلاقی دُنیا کے نزدیک قابلِ نفرین ہیں۔

سب نے یہ پارٹ ختم کرکے گھروندے کو بگاڑا۔ یہ خانۂ جہنم توڑ تاڑ کے فوراً پھینکدیا گیا۔ تمام دوزخی فرشتے یا آتشین انسان جلدی جلدی نہائے۔ اپنے اپنے کپڑے پہنے۔ اور جہنم پھر ایک سبزہ زار لطیف و نظر فریب میدان بنگیا۔ وہی ساحلِ دلپذیر ہے وہی مناظرِ دلستاں۔ فرشتگانِ دوزخ نہایت خوش پوشاک، اور حسین صورت و بہترین انسانی قالب میں جلوہ افروزِ وادی ہیں۔ جس طرح وہ جہنم کا پارٹ دکھلانے سے پہلے تھے۔ وہ انجمن خلوص کے ارکان اور پیرس کے تعلیم یافتہ و متمول نوجوان ہیں۔ غرض ان تمام ضروریات سے فارغ ہو کر ایک نے جارج کو دوا سُونگھائی کہ اس کے اثر سے کچھ دیر بعد بیدار و ہوشیار ہو سکے۔ اور خود سب وہاں سے چلتے نظر آئے۔ جارج کو ہوش آیا تو اس نے بہت کچھ ادھر ادھر دیکھا بھالا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ دُنیا میں ہے اور ہوش و حواس کے ساتھ ہے۔ پہلے تو اپنی زندگی پر اسے شبہ ہُوا۔ مگر شکستہ بدن اور اپنے کو زخموں سے چور دیکھ کر اُسے کچھ یقین سا آنے لگا۔ کہ مَیں دُنیا میں آگیا ہوں۔ وہ شکستہ دل و شکستہ بدن اُٹھ کر وادی سے شہر کو روانہ ہوگیا۔ مگر ابتک اُسے اپنی حیاتِ دُنیاوی اور نجات میں کچھ کچھ شبہ پیدا ہوجاتا تھا۔ آخر پیرس میں

پہنچ گیا۔ شہر میں داخل ہو کر زندگی پر یقین آ ہی گیا۔ ابھی وہ گھر نہ پہنچنے پایا تھا کہ راستہ میں چند احباب ملے۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔

والٹر۔ آہا! جارج ہیں۔ اجی حضرت اتنے دنوں سے کہاں غائب تھے۔ آپ نے تو ہم تمام مخلصین کو فراموش ہی کر دیا مدتیں ہو گئیں کہ انجمن خاص کے تمام ارکان آپ کی زیارت سے محروم ہیں۔ ایسی بھی کیا عیش پرستی و بادہ نوشی کہ عزیز دوستوں تک کو انسان بھول جائے۔ آپ کی ذات گرامی اور اخلاقِ کریمانہ سے تو یہ توقع ہرگز نہ تھی۔ تمام احباب آپکے اس جورِ تغافل کے شکوہ سنج ہیں۔ اتنے دن کی غیر حاضری تو نہایت خطرناک ہے اور ہم سب کو شبہ میں ڈالتی ہے۔ خیر آیئے چلیں۔ ذرا ہوٹل میں تھوڑی دیر بیٹھ کر تبادلہ خیالات و حالات کریں۔ ہم بھی تو آپکے دیکھنے کو ترس گئے۔ آئیے نا ہوٹل میں چلکر کچھ نوش جان بھی کرینگے۔ وہی کہ . . . . . "

والٹر اپنے فقرے کو پورا نہ کرنے پایا تھا کہ جارج کانپ گیا۔ اُس کا چہرہ زرد ہو گیا۔ اور یہ کہکر قطع کلام کیا۔

جارج۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے معاف رکھئے۔ اللہ آسمان سے فرشتے بھی اتر آئیں اور کہیں کہ اللہ نے تیرا قصور معاف کر دیا۔ شراب پینے کی بھی تو اجازت ہے عذاب نہ ہوگا۔ تب بھی ہرگز ہرگز اُس کا کہا نہ مانونگا۔ اور ساغر و شراب سے ہاتھ نہ لگاؤنگا۔ خدا مجھے اس بلا سے محفوظ رکھے۔

والٹر۔ یا وحشت! ارے بھئی بتاؤ تو یہ ماجرا کیا ہے تم تو عجیب بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ ہماری تو سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کہہ رہے ہو۔ کیوں یہ توبہ تلا کیسی؟ شراب اور تم نہ پیو۔ ہوٹل اور تم کو اس میں جانے سے نفرت ہو۔ یا اللہ یہ میرے کان آج کیا سُن رہے ہیں۔ کیا میں ہوش میں ہوں۔

والٹر سوسائٹی کا بڑا زندہ دل اور چلتا ہوا ممبر تھا اُس میں خاص کمال یہ تھا کہ کیسے ہی پُر مذاق و قصہ طلب بات کیے مگر ہنسی نہ آتی تھی اور اسی کا کام تھا جو اس مصنوعی متانت سے جارج کو مخاطب کیے رہا۔ تجاہل عارفانہ اُسکا ایک ادنیٰ وصف تھا

جارج۔ بھائی والٹر۔ چلو ہوٹل میں چلکر بیٹھو میں تمہیں اپنا سارا ماجرا سناؤں۔ مگر خدا کی قسم میں کچھ پیونگا نہیں۔ میری داستان بہت پُر درد ہے میں مجروح ہوں۔ تم کو اپنے زخم بھی دکھاؤنگا۔

والٹر۔ اچھا! اب میں سمجھ گیا۔ پھر کسی نازنین پیرس سے محبت ہو گئی۔ اور پھر کسی نے آپکے دلِ عشق منزل میں درد و کرب بھر دیا۔ ہاں ہاں یہ گھاؤ یہ زخم عشق ہی کے ہونگے۔ کیوں جارج سچ کہنا؟

جارج کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو ٹپک پڑے۔ سامنے ہی ایک ہوٹل تھا۔ وہ ہاتھ پکڑ کر والٹر کو لے گیا۔ اور پوری تفصیل کے ساتھ بے کم و کاست افسانہ جنتم، سرائے نازیانہ آتشین وغیرہ سب بیان کیا۔ مگر اس طرح کہ اس کا بدن کانپ رہا تھا اسکی زبان میں لکنت اور آواز میں تھرتھراہٹ تھی۔ اور اس کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

محمودی صدیقی

بجلی

(۱)

بہت دنوں کا پُرانا، مگر سچّا واقعہ ہے سُنیئے :-

ستیندر جب بی۔ اے کا امتحان پاس کر کے گھر آیا تو اُس کی ماں نے کہا۔ "بیٹا لڑکی کیا ہے۔ لکشمی کا اوتار ہے۔ تو جا کر ایک دفعہ اُسے دیکھ آ۔"

ستیندر نے شرما کر جواب دیا۔ "ماں! میں ابھی بیاہ نہیں کرونگا۔ مجھے وکالت کا امتحان دینا ہے۔"

"تو میں بہو کو تیرے ساتھ تھوڑا ہی بھیج دُونگی۔ وہ میرے پاس رہیگی۔ تو کلکتے کالج میں پڑھنا۔ وہ تیرے ہاتھ سے کتاب تو نہیں چھین کر پھینک دیگی۔"

مجھے ابھی فرصت نہیں۔ تو اس وقت اس ذکر کو رہنے دے۔

یہ کہہ کر ستیندر باہر جانے کو تھا۔ کہ ماں نے کہا "مگر بیٹا! میں تو زبان دے چکی ہوں۔ اب تجھے ماں کی بات رکھنا ہی ہوگی۔"

ستیندر منہ پھیر کر بولا۔ "تو نے مجھ سے پُوچھے بغیر زبان کیوں دیدی؟"

بیٹے کا غُصّہ دیکھ کر ماں کا دِل چھوٹا ہو گیا۔ سہم کر بولی۔ اب تو غلطی ہو گئی۔ مگر تو کیا میری بات نہ رکھیگا۔ اس کے علاوہ بیٹا! وہ بیوہ کی لڑکی ہے۔ اُس پر احسان ہوگا۔ بیٹا! ماں نے تیرا کچھ ہرج تو نہیں کیا۔"

ستیندر چند لمحے کے سکوت کے بعد بولا۔ "اچھا سوچ کر جواب دُونگا" یہ کہکر وہ باہر چلا گیا۔

ستیندر کا باپ کئی سال ہُوئے مر چکا تھا۔ اُس کی ماں خود ہی زمینداری سنبھال رہی تھی۔ اُس کی دلی خواہش تھی کہ ستیندر وکالت پاس کرلے۔ تو اس کا بیاہ کیا جائے۔ چھوٹی عمر میں اس کے کمزور کندھوں پر بیوی کا بوجھ رکھنا۔ اُسے گوارا نہ تھا۔ لیکن جو ہونا ہوتا ہے۔ اُسے کون ٹال سکتا ہے۔ ایک دن اس نے گاؤں بھر کی عورتوں کو اپنے گھر بُلایا۔ سارا صحن ہمسایوں سے بھر گیا۔ اُن عورتوں میں مرحوم اُتل مکرجی کی بیوہ بھی شامل تھی۔ اور اُس کے ساتھ اُس کی گیارہ سالہ لڑکی بھی تھی۔ یہ لڑکی نہایت حسین تھی۔ وہ شکل وصورت سے شہزادی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا رنگ اُس کے نقش ونگار، اُس کا بھولا پن دیکھ کر ستیندر کی ماں خوش ہو گئی۔ وہ بہت دیر سے لڑکے کے لئے بہو کی تلاش میں تھی۔ نگہِ انتخاب اس لڑکی پر پڑی۔

اُسے یقین ہوگیا کہ ستیندر ماں کی پسند کی داد دیگا۔ اور لڑکی سے بیاہ کرنے پر رضامند ہو جائیگا۔

دوسرے دن ستیندر ماں کے کمرے میں آیا۔ تو چونک پڑا۔ اُس کی ماں کی بیٹھنے کی جگہ ایک خوبصورت لڑکی عمدہ اور بیش قیمت گہنے کپڑے پہنے بیٹھی تھی۔ ستیندر چپ چاپ کھڑا رہ گیا۔ گویا کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔

اُس کی ماں نے کہا ستیندر بیٹھ جا۔ کھڑا کیوں ہے؟"

"نہیں۔ آج میں کھانا اپنے کمرے میں کھاؤنگا۔"

ماں نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔ "بیٹا! جب بیاہ کرنا ہے۔ تو اس بچی سے شرمانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"میں کوئی نہیں شرماتا۔"

یہ کہکر ستیندر نے سر نیچا کر لیا۔ اور آسن پر بیٹھ گیا۔

اُس کی ماں نے کھانا سامنے رکھدیا۔ اور آپ کسی بہانے سے باہر چلی گئی۔ مگر ستیندر نے سر نہ اُٹھایا۔ اور جلدی جلدی کھانے سے فارغ ہوکر مردانے میں چلا گیا۔ جہاں اس کے احباب جمع تھے۔ اور چوسر کی بازی کی تیاریاں کر رہے تھے۔ مگر ستیندر نے جاتے ہی کہا "میرے سر میں درد ہے۔ میں کچھ نہیں کھیلونگا۔"

یہ کہکر اُس نے تکیہ سر کے نیچے رکھا۔ اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ یار دوستوں کو بہت حیرت ہوئی۔ مگر کیا کرتے چوسر چھوڑ کر شطرنج کھیلنے لگے۔ شام تک کئی بازیاں ہوئیں

مگر ستیندر نے کروٹ نہ بدلی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند میں سو رہا ہے۔ حالانکہ نیند اس سے کوسوں دُور تھی۔

احباب کے چلے جانے پر ستیندر کتاب لے بیٹھا مگر الفاظ اُس کی آنکھوں تلے گھومنے لگے۔ اور دماغ میں نئے نئے خیالات کا ظہور ہُوا۔ یہی کتابیں تھیں جن پر ستیندر ساری ساری رات جھکا رہتا تھا۔ تو بھی اُس کی طبیعت نہ اُکتاتی تھی۔ مگر آج اُسے ایک منٹ پڑھنا بھی دشوار ہوگیا—— یکایک چھم چھم کی آواز آئی۔ ستیندر چونکنا ہوگیا۔ اتنے میں سر سے پاؤں تک زیوروں میں لدی ہوئی لڑکی اُس کے سامنے آکر کھڑی ہوگئی۔ ستیندر اُس کی طرف دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر کے بعد لڑکی نے شیریں لہجہ میں پُوچھا۔ "ماں آپ کی رائے پُوچھتی ہیں۔"

ستیندر کا کلیجہ دھڑکنے لگا۔ آہستہ سے بولا۔ "کس کی ماں؟"

"میری"

ستیندر نے کچھ سوچ کر جواب دیا۔ "کہو! میری ماں سے پوچھ لیں۔"

لڑکی واپس مڑی ستیندر نے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے؟"

" رادھا رانی "

لڑکی چلی گئی۔

(۲)

ستیندر کلکتے چلا گیا۔ اس نے فیصلہ کر رکھا تھا۔ کہ جب تک وکالت کا امتحان نہ پاس کر لوں گا۔ تب تک بیاہ نہ کرونگا۔ بلکہ ممکن ہے اس کے بعد بھی نہ کروں۔ اُسے یقین ہو گیا تھا۔ کہ بیاہ آدمی کے پاؤں میں زنجیر بن جاتا ہے۔ اور اس کی زندگی کے تمام لطف مارے جاتے ہیں۔ مگر اُس لڑکی کا تصور محو نہ ہوتا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح یہ خیال اُس کے دماغ سے خارج ہو جائے۔ مگر حافظہ اُس کی ہر ایک کوشش کو شکست دیتا تھا۔ پہلے اُس کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی عورت سامنے آجاتی تو وہ سر جھکا لیتا۔ مگر اب یہ حال ہو گیا تھا۔ کہ جب کوئی عورت نظر آجاتی تو جب تک اُسے اچھی طرح سے دیکھ نہ لیتا۔ تب تک اُسے چین نہ آتا تھا۔

ستیندر نہاتے وقت تیرنے کا بہت شائق تھا۔ وہ چور بگان میں رہتا تھا۔ یہ جگہ گنگا کے بہت قریب ہے۔ اس لئے وہ اکثر نہانے کے لئے جگن ناتھ گھاٹ پر جایا کرتا تھا۔

پورنماشی کا دن تھا۔ گھاٹ پر عورتوں کا ہجوم تھا۔ اُس دن ایسا معلوم ہوتا تھا۔ گویا کلکتہ کی تمام عورتیں گھاٹ پر جمع ہو گئی ہیں۔ ستیندر نہانے جا رہا تھا۔ کہ ہجوم کے باعث اُسے ایک جگہ رُکنا پڑا۔ وہاں چار پانچ آدمی ایک ہی طرف ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔ ستیندر نے بھی اُدھر دیکھا مگر جو کچھ دیکھا۔ اُس سے اُس کے حواس بجا نہ رہے۔

کسی عورت کے جسم میں ایسی خوبصورتی اُس نے آج تک نہ دیکھی تھی۔ اُس کی عمر ۱۶-۱۷ سال سے زیادہ نہ تھی۔ وہ سیاہ کنارے کی دھوتی پہنے ہوئے تھی۔ اُس کے جسم پر ایک بھی زیور نہ تھا۔ مگر خوبصورتی اُس کے جسم سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہی تھی۔ اُس وقت وہ اُکڑوں بیٹھی خاموش چندن کا ٹیکا لگوا رہی تھی۔

ستیندر بھیڑ کو چیر کر آگے بڑھا۔ پانڈے کو وہ اکثر انعام دیتا رہتا تھا۔ اس لئے پانڈے اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اُس نے چاندسی صورت دیکھنے کا خیال بالائے طاق رکھ دیا۔ اور ستیندر کی دھوتی لینے کے لئے ہاتھ بڑھا دیا۔

دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں ــــ ستیندر نے کپڑے اُتار کر پانڈے کے حوالے کئے۔ اور آپ پانی میں اُتر گیا۔ مگر اُس کی طبیعت تیرنے میں نہ لگی۔ جب واپس ہوا۔ تو اُس عورت کا پتہ نہ تھا۔ ستیندر سارے دن پریشان رہا۔ اُس کی آنکھوں میں گنگا جی کا گھاٹ پھرتا رہا۔ اور دوسرے دن تو گنگا جی کی جھگنی نے ایسا زور

کیا۔ کہ وہ دن نکلنے سے پیشتر ہی گھاٹ پر پہنچ گیا۔ مگر وہ عورت واپس جا رہی تھی۔ ستیندر جلدی جلدی نہا کر واپس مڑا۔ اور اس کی خوشی کا ٹھکانا نہ تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ عورت پہلے کی طرح اسی جگہ بیٹھی چندن کا ٹیکا لگوا رہی ہے۔ ستیندر پھر وہاں پہنچا۔ پھر دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں۔ پھر ستیندر کے جسم میں بجلی کی لہر دوڑی سارے دن پھر اس کی طبیعت اداس رہی۔

(۳)

ستیندر سمجھ گیا۔ کہ وہ عورت بہت تڑکے نہا کر چلی جاتی ہے۔ اس نے بھی تڑکے جانا شروع کر دیا ہر روز ان کی آنکھیں ملتی تھیں۔ ہر روز وہ ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ مگر گفتگو تک نوبت نہیں آئی۔ اور اس کی ضرورت بھی کیا تھی۔ جہاں نگاہیں گفتگو کر لیتی ہیں۔ وہاں زبان ہلانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ عورت اس فن میں ماہر تھی ستیندر اسے سمجھ گیا۔

ایک دن وہ گھاٹ سے واپس مڑ رہا تھا کہ کسی نے پکار کر کہا۔ "ذرا سنئے تو سہی"

ستیندر نے منہ پھیر کر دیکھا ـــــ یہ وہی تھی اس کے کندھے پر گنگا جل سے بھرا ہوا پیتل کا گھڑا اور ہاتھ میں گیلا کپڑا تھا۔ اس نے ستیندر کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اور کہا "مہاشہ! آج میرے ساتھ دائی نہیں آئی۔ کیا آپ مجھے میرے مکان تک پہنچا دینگے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی"

ستیندر بھی چاہتا تھا۔ مگر اس وقت پس و پیش کرنے لگا۔ اس کے دل میں کئی قسم کے خیالات آنے لگے سوچتا تھا۔ لوگ کیا کہینگے۔ بدنام ہو جاؤنگا۔ اور اگر کسی یار دوست نے دیکھ لیا۔ تو کیا ہوگا۔ کالج میں کانا پھوسیاں ہونے لگیں گی۔ حسینہ معلوم ہوتا ہے بہت ہی سمجھدار اور تجربہ کار تھی۔ اس نے یہ خیالات ستیندر کے چہرے سے پڑھ لئے۔ اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ ستیندر مر گیا۔ جس کے چہرے پر ایسی جان لیوا اور ہوش ربا مسکراہٹ آ سکتی ہے۔ اس کے لئے کیا نہیں کیا جا سکتا۔ ستیندر حسینہ کے ساتھ ساتھ روانہ ہوا۔

چند ہی قدم گئے ہونگے۔ کہ حسینہ نے کہا۔ "آج میری دائی بیمار ہو گئی ہے۔ اس لئے وہ نہیں آئی۔ پر مجھ سے گنگا نہائے بغیر رہا نہیں جاتا۔ آپ کو بھی یہی عادت ہو گئی ہے۔"

ستیندر بولا "ہاں! نہ نہاؤں تو طبیعت سارے دن مضمحل رہتی ہے۔"

"آپ رہتے کہاں ہیں؟"

"چوریگان میں"

"میں جوڑاسانکھوں میں رہتی ہوں۔ آپ مجھے پتھریا گھاٹ

کے موڑ پر پہنچا دیجئے۔ پھر میں چلی جاؤنگی۔"

"بہت اچھا۔"

اس کے بعد خاموشی طاری ہوگئی۔ دونوں میں کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ چت پور روڈ پر پہنچکر حسینہ ٹھہر گئی۔ اور ویسی ہی مسکراہٹ ہونٹوں پر لاکر بولی میرا مکان اب قریب ہی ہے۔ آپ زیادہ تکلیف نہ کریں۔ اس نوازش کے لئے میں آپ کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔"

ستیندر نے اپنا راستہ لیا۔ اُس دن اُس کا دل نہ معلوم کیسا رہا۔ اُسے احاطہ تحریر میں لانا بھی ناممکن ہے۔ نہ ہم جانتے ہیں۔ اُسے تو وہی سمجھتے ہیں اور وہی سمجھ سکتے ہیں جن کے دل کو کے لڑکے کام دیو نے اپنے پھولوں کے تیر کا نشانہ بنایا ہے۔ جن کے دل نے اس زخم کی لذت نہیں چکھی۔ جن کے دماغ نے اسے محسوس نہیں کیا۔ وہ اس حالت کو کیا خاک سمجھ سکتے ہیں۔ اس کہانی کا مصنف بھی کچھ نہیں سمجھتا۔ وہ کیا جانیں کہ کام دیو کا تیر کھا کر کس طرح پانی ہوا زمین آسمان سب کا رنگ بدل جاتا ہے۔ اور روح پر اک غبار سا چھا جاتا ہے کس طرح دنیا کے تمام مشاغل سرد مہری کے بوسہ کے مانند خشک معلوم ہونے لگتے ہیں۔

دوسرے دن ستیندر کی آنکھ کھلی۔ تو دھوپ نکل آئی تھی۔ اُسے ایسا افسوس ہوا۔ گویا وہ وکالت میں فیل ہوگیا ہے۔ سارا دن ضائع ہوگیا۔ اُس وقت اس کا نوکر اس کے سامنے سے گذر رہا تھا۔ ستیندر نے اُسے ڈانٹ کر کہا۔" بیوقوف! اتنی دیر ہوگئی تو نے مجھے جگایا کیوں نہیں۔ اس قصور کے لئے تجھے ایک روپیہ جرمانہ کرتا ہوں"

نوکر سہم گیا۔ مگر ستیندر کو اس کا خیال نہ تھا۔ ہوتا کیسے۔ اُس کا خیال تو اُس جل پری کی طرف لگا ہوا تھا۔ وہ بغیر کپڑے تبدیل کئے باہر نکل گیا۔ اور ایک گاڑی میں بیٹھ کر کوچوان سے بولا۔ پتھریا گھاٹ کی طرف سے ہوکر جگن ناتھ گھاٹ کو لے چلو۔ گاڑی روانہ ہوئی۔ ستیندر اداس تھا۔ اُس کو اپنے دل میں کچھ خلا سی محسوس ہوتی تھی۔ جیسے کوئی بیش قیمت چیز گم ہوگئی ہو۔ مگر جگن ناتھ گھاٹ پہنچتے ہی اُداسی دُور ہوگئی۔ جس طرح سورج نکل آنے پر تاریکی نہیں رہتی۔ ستیندر نے گاڑی سے اُترتے ہی دیکھا۔ کہ حسینہ سامنے کھڑی اُسی دلوں کو برباد کردینے والے انداز سے مسکرا رہی ہے۔ اور کہہ رہی ہے۔" بابو! آج اتنی دیر کردی؟ میں تو آدھ گھنٹے سے انتظار کر رہی ہوں۔ آج بھی میری دائی نہیں آئی۔"

ستیندر نے جواب دیا۔ ایک منٹ ٹھہر جاؤ۔ اور کپڑے اُتار کر پانی میں کود پڑا۔ تیرنا یاد نہ رہا۔ اور یاد کیسے رہتا۔ جو چہرہ دیکھا تھا۔ اُسے دیکھ کر بھلا کچھ یاد رہ بھی سکتا ہے۔ وہ جھٹ پٹ نہا کر باہر نکل آیا۔ اور

حیرت سے بولا "گاڑی کدھر گئی؟"

حسینہ نے جواب دیا "میں نے کرایہ دیکر واپس کر دی۔"

"تم نے کرایہ کیوں دیا؟"

"تو غضب کونسا ہوگیا۔ اب چلئے نا۔"

یہ کہکر حسینہ نے پھر اپنے جلوہ بار تبسم سے ستیندر کے قصر دل پر حملہ کیا۔ ستیندر پر عمل تسخیر ہو چکا تھا۔ ورنہ وہ ایسا نادان بچہ نہ تھا۔ کہ ایک دفعہ بھی نہ سوچتا۔ کہ یہ معاملہ کیا ہے۔

حسینہ نے راہ میں پوچھا۔ آپ رہتے کہاں ہیں؟ چورگلی میں؟"

ستیندر بولا "جی ہاں"

"وہاں کیا صرف چور ہی رہتے ہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"آپ چوروں کے سردار ہیں؟"

یہ کہہ کر اُس نے گردن ذرا ٹیڑھی کی۔ ترچھی چتونوں سے ستیندر کی طرف دیکھا۔ اور پُر معنی انداز سے مُسکرا کر چلنے لگی۔ آج اُس کی بغل میں جو پیتل کا گھڑا تھا۔ وہ کل کی نسبت بڑا تھا۔ اس کا پانی چھلک رہا تھا۔ اور اپنی نہ سمجھ میں آنے والی زبان میں کہہ رہا تھا۔ ارے او دیوانے، محبت کے اندھے نوجوان۔ خبردار ہو جا۔ یہ سب مایا کا کھیل ہے۔ مگر ستیندر کے کان اس طرف سے بند تھے

موڑ کے قریب پہنچکر ستیندر نے ہچکچاتے ہوئے کہا "وہ گاڑی کا کرایہ؟"

حسینہ نے جواب دیا "وہ تو آپ دے چکے۔"

ستیندر نے یہ اشارہ نہیں سمجھا اور پوچھا "وہ کب؟"

"میرا اپنا کیا ہے۔ جو کچھ ہے۔ اب آپ ہی کا ہے۔ اس لئے جو کچھ میں نے دیا۔ وہ آپ ہی سے لیکر دیا۔"

ستیندر کو ایسا معلوم ہوا۔ جیسے اُس کے جسم میں بجلی دوڑ گئی ہے۔ اور اس کے دل کا ایک ایک کونہ منور ہو گیا ہے۔ وہ چاہتا تھا کہ اُن گورے گورے پاؤں پر گر پڑے مگر بازار میں لوگ دیکھ لینگے۔ تو کیا کہینگے۔ یہ سوچکر ستیندر کچھ کر نہ سکا۔ دل کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے مکان کی طرف روانہ ہوا۔

اُدھر حسینہ کی دائی نے قریب آکر کہا "تم اس غریب کو یہ ناچ کیوں نچا رہی ہو۔ مالدار ہے نا۔ چار پیسے کما سکو گی یا نہیں۔"

حسینہ نے ہنسکر جواب دیا "یہ تو بھگوان جانے۔ پر ایسے شرمیلے، سیدھے سادے نوجوانوں کو اشارے پر نچانے میں کچھ مزہ سا آجاتا ہے۔"

دائی ہنستے ہنستے بولی "تم جو نہ کرو۔ سو تھوڑا ہے مگر لڑکا ہے خوبصورت۔ کسی راجے کا بیٹا معلوم ہوتا ہے جیسا خوبصورت رنگ ہے۔ ویسے ہی نین بھی رسیلے

ہیں۔ تم دونوں کی جوڑی بہت خوبصورت بنے۔ جب تم وہاں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ اُس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پاس پاس دو گلاب کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔"

حسینہ نے زور سے ہنس کر کہا۔ "چل۔ رہنے دے اگر وہ تجھے پسند ہے۔ تو تو ہی اُسے لے لے۔"

دائی بھی چپ رہنے والی نہ تھی۔ اُس نے جواب دیا۔ "کہنے کو جو تم چاہو کہہ لو۔ مگر میری بات یاد رکھنا۔ تم اسے جیتے جی چھوڑ نہ سکو گی۔"

(۴)

داناؤں کا قول ہے کہ اگر کوئی ان ہونی بات دیکھو تو خاموش رہو۔ کیونکہ لوگ اعتبار نہ کرینگے۔ اسی باعث غریب شری منت جوانی میں مارا گیا تھا۔ مگر جو کچھ بھی ہو۔ ستیندر اُس دن مکان پر آیا۔ تو پہلا ستیندر نہ تھا۔ اُس نے آتے ہی ٹینی سن کی نظموں کا ترجمہ کرنا شروع کر دیا۔ اور اپنے نئے تجربات محبت کو اُس میں بیان کرنے لگا۔ اُس کی اتنی عمر ہو چکی تھی۔ مگر اُس کو ایک بار بھی خیال نہ آیا۔ کہ اتنے بڑے شہر میں محبت کے مدارج سڑک ہی پر طے ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اور کہ جو غوطہ وہ پریم کے ساگر میں لگا رہا ہے۔ اُس میں اُسے موتی حاصل ہوگا یا سیپ۔

دو دن بعد جگن ناتھ گھاٹ سے واپسی پر اُس اجنبی حسینہ نے کہا۔ "میں رات تھیئٹر دیکھنے گئی تھی۔ سرلا کی مصیبت دیکھ کر چھاتی پھٹتی تھی۔ کیوں ٹھیک ہے نا۔"

ستیندر نے سرلا ناٹک نہیں دیکھا تھا۔ البتہ سورن لتا ناول پڑھا تھا۔ آہستہ سے بولا۔ "بیچاری نے کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کیں۔"

حسینہ نے ناٹک کے ایکٹر کی طرح اظہار غم کرتے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ تو بتاؤ۔ کہ سرلا اپنے شوہر سے اتنی محبت کرتی تھی۔ مگر اُس کی جیٹھانی کیوں اپنے خاوند کو نہیں چاہتی تھی؟"

"اپنی اپنی فطرت"

"ٹھیک ہے بیاہ سبھی لوگ کرتے ہیں۔ مگر سب میں ایک جیسا پیار نہیں ہوتا۔ ایسے مردوں کی بھی تعداد تھوڑی نہیں۔ جو مرتے لمحہ تک پیار کا اظہار نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوتا ہے۔ یہ مادہ بھگوان نے اُنہیں دیا ہی نہیں۔ تم یہ سمجھو گانا بجانا کیسی عمدہ چیز ہے۔ مگر کتنے ہی آدمی ایسے بھی ہیں۔ جو گانے کی خوبیوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ بعض آدمی ایسے بھی ہیں۔ جو کبھی ناراض ہی نہیں ہوتے۔ دُنیا اُن کی بڑی تعریف کرتی ہے۔ مگر بھئی! مجھے تو ایسے آدمیوں سے سخت نفرت ہے۔"

ستیندر ہنس کر بولا۔ "کیوں؟"

"یہ کمزوری کا نشان ہے۔ اور کمزور آدمیوں میں زیادہ تر عیوب ہی ہوتے ہیں۔ سرلا کے جیٹھ ہی کی مثال لو۔ اُس کی بیوی اُسے کتنا تنگ کرتی تھی۔ مگر وہ چوں تک نہیں

کرتا تھا۔

ستیندر خاموش رہا۔ حسینہ پھر بولی " اور اُس کی عورت پرملا کیسی شیطان عورت تھی۔ میں اگر اُس کا خاوند ہوتی تو اُس کا گلا دبا کر مار دیتی"

" نہیں تم وہاں کیوں جانے لگیں۔ اور یہ پرملا کوئی جیتی جاگتی عورت تھوڑا ہی تھی۔ یہ تو ناٹک نویس کا تخیل ہے ––––

تو کیا تم پڑھ لکھ بھی سکتی ہو"

" ہاں بنگالی پڑھ سکتی ہوں۔ چلو نہیں اپنی کتابیں دکھاؤں"

ستیندر چونک پڑا۔ " کیا تمہارے گھر چلنا ہوگا؟"

" ہاں چلنا ہوگا۔ چلئے"

ستیندر نے بجلی کا کھمبا پکڑ لیا۔ اور آہستہ سے جواب دیا

" نہیں"

" نہیں کیا تمہیں چلنا ہوگا۔ آؤ"

" آج نہیں۔ پھر کسی دن سہی" یہ کہتے کہتے ستیندر کانپتے ہوئے پاؤں سے آگے بڑھا۔ آج اُس کے بحر دل میں محبت کی لہریں زور زور سے اُٹھ رہی تھیں۔

(۵)

صبح کا وقت تھا۔ ستیندر جگن ناتھ گھاٹ سے واپس ہو رہا تھا۔ اس وقت اُس کا دل رنجیدہ تھا۔ آنکھیں تر۔ اس کی وجہ یہ تھی۔ کہ وہ حسینہ چار دن سے گھاٹ پر نہیں آئی تھی۔ ستیندر کے دل میں وسوسے تھے۔ وہ سوچتا تھا۔ پتہ نہیں اسے کیا ہوگیا ہے۔ مجھ کو کبھی محبت کرنے کا موقعہ نہیں ملا جنکی آنکھوں نے کبھی حسن کے جلوے سے اپنی بینائی کو منور نہیں کیا۔ وہ ستیندر کی بے چینی کو نہ سمجھ سکینگے۔ اگر انہیں اس کہانی میں لطف نہ محسوس ہو۔ تو پہلے اپنے دل پر عشق کے دیوتا کا ایک تیر لگ جانے دیں۔ پھر اُنہیں مُصنف سے شکایت نہ ہوگی۔

اُس نے سوچا۔ میں بازار تو جانتا ہوں۔ مگر اُس کا مکان کہاں ہے۔ اس کے متعلق مجھے کوئی واقفیت نہیں سوچتے سوچتے وہ پچھتانے لگا۔ کہ کیوں اُس دن مکان نہ دیکھ لیا اگر دیکھ لیتا تو آج رونا کاہے کا تھا۔ ہم کہانی لکھنے بیٹھے ہیں۔ مگر جھوٹ نہ لکھیں گے۔ ستیندر کو اُس عورت سے عشق ہوگیا تھا۔ یہ عشق آنکھوں کا نہیں دل کا تھا۔ اس میں کوئی چھل کپٹ یا دھوکا نہیں تھا۔

یکایک ایک طرف سے آواز آئی " بابو"

ستیندر نے آنکھ اُٹھائی۔ سامنے وہ دائی کھڑی تھی جو اُس حسینہ کے ساتھ گھاٹ پر آیا کرتی تھی۔ وہ دوڑ کر اُسکے قریب چلا گیا۔ اور گھبرایا ہُوا بولا۔ " کیوں وہ کیوں نہیں آتی۔ اُسے کیا ہوگیا ہے؟"

یہ کہتے کہتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ دائی نے اپنی ہنسی بڑی مشکل سے روکی۔ اور کہا " وہ بہت ہی بیمار ہے۔ آپ سے ملنا چاہتی ہے"

ستیندر دائی کے ساتھ ساتھ روانہ ہُوا۔ راہ میں بولا " کیا

بیماری ہے"

دائی نے جواب دیا۔ "بخار ہے مگر بہت زور کا۔"

ستیندر نے اور کچھ نہ پوچھا مکان پر پہنچکر دیکھا کہ مکان بہت عالیشان ہے۔ اور دروازے پر ایک چوکیدار اُونگھ رہا ہے۔ ستیندر بولا۔ "میرے جانے سے اُس کے والد صاحب ناراض تو نہ ہونگے"

دائی نے جواب دیا۔ "اُس کے والد نہیں ہیں۔ صرف والدہ ہیں۔ وہ بھی آپ کو دیکھ کر خوش ہونگی۔"

ستیندر مکان کے اُوپر پہنچا۔ یہاں پہنچکر اُسے معلوم ہوا۔ کہ مکان صرف بڑا ہو۔ یہ بات نہیں۔ مکان کی آرائش میں بھی روپیہ پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا ہے۔ برامدے سے گذرتے ہوئے اُس نے جو جو کمرہ دیکھا۔ وہ اس بات کا کامل ثبوت تھا۔ آخر دائی نے ایک کمرے کے سامنے ٹھہر کر کہا۔ اندر چلے جاؤ۔"

اس کمرے سے طبلے کی تھاپ اور گھنگھروں کی جھنکار کی آواز آرہی تھی۔

دائی نے چک اُٹھا کر کہا۔ "لو بہن! میں تمہارے مٹی کے مادھو کو بلا لائی ہوں۔"

ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ستیندر نے اندر جاکر جو کچھ دیکھا اُس پر اُسے یقین نہ آیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوا۔ گویا وہ کوئی خوفناک خواب دیکھ رہا ہے۔ وہ بصد مشکل ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کمرے میں ایک بیش قیمت ایرانی غالیچہ بچھا ہوا تھا اُس پر دو تین عاشق مزاج آدمی بیٹھے تھے۔ ایک کے سامنے ہارمونیم تھا۔ دوسرے کے سامنے طبلہ۔ جو تیسرا تھا وہ مزے سے شراب پی رہا تھا۔ اور ستیندر کی محبوبہ ——— وہ ناچ رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شراب کا خمار تھا۔ جسم پر سونے کے گہنے۔ ستیندر کو دیکھ کر وہ زور سے ہنسی۔ اس ہنسی سے ستیندر اس طرح ڈر گیا۔ جس طرح بچہ رعد کے کڑکنے سے ڈر جاتا ہے۔ مگر اس نے صرف ہنسنے ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ آگے بڑھ کر ستیندر کا ہاتھ تھام لیا۔ اور بولی۔ "کیوں پیارے! تمہیں کیا مرگی کی بیماری ہے؟ بابا یہ نخرے چھوڑو مجھے خوف آتا ہے۔"

جس طرح سویا ہوا آدمی گرم پانی ڈالنے سے چونک اُٹھتا ہے۔ اُسی طرح اُس حسینہ کا ہاتھ لگنے سے ستیندر کھڑا ہو گیا۔ عورت بولی۔ میرا نام بجلی بائی ہے۔ تمہارا نام کیا ہے؟

اس پر پھر قہقہہ بلند ہوا۔ اور دائی تو ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ گئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ زیادہ ہنس کر آدمی کا یہی حال ہو جاتا ہے۔

بجلی نے بناوٹی غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "چپ رہ کیا بیہودہ ہنس رہی ہے۔" اس کے بعد اُس نے ستیندر کے سامنے کھڑے ہو کر یہ گیت گانا شروع کیا۔

جادو بھرے تورے نینا ستمگر

برچھی کا مارا کوئی دم جیوے۔ تیرے نینوں کا مارا نا ہیں بچے۔
تورے نین ستمگر۔

ستیندر ریشمی دھوتی پہنے ہوئے تھا۔ جو آدمی شراب پی رہا تھا۔ وہ اس کے پاؤں میں گر کر بولا۔ "پنڈت جی! میں بڑا پاپی ہوں۔ مجھے اپنے پاؤں کی دھول دیجئے۔"

ہارمونیم بجانے والے نے کہا۔ تم اس بیچارے کو کیوں تنگ کر رہے ہو؟"

بجلی نے ہنسکر کہا۔ "تنگ کرنے کے لئے تو بلایا ہے۔ اچھا تمہیں میرے سر کی قسم! سچ بتاؤ۔ تم نے مجھے کیا سمجھا تھا۔ روز گنگا نہانے جاتی ہوں۔ اس سے یہ تو صاف ظاہر ہے کہ میں برہمو سماجی۔ مسلمانی یا عیسائن نہیں ہوں۔ پر اتنی عمر کی لڑکی کنواری رہیگی۔ یہ تم نے کیسے مان لیا۔ کسی خاص وجہ سے میرا بیاہ نہ ہوا ہو یا بیوہ ہو گئی ہوں۔ اس کے سوا تیسری وجہ کونسی ہو سکتی ہے؟ پھر تم نے کیا سمجھکر مجھے محبت کی آنکھوں سے دیکھنا شروع کیا۔ . . . .

. . . . . کیا تمہارا یہ ارادہ تھا کہ مجھے نکال کر اڑنچھو ہو جاؤ گے۔"

کمرہ پھر قہقہہ سے گونج اٹھا۔ اتنے میں بجلی نے چونک کر کہا۔ "ارے میں تو عجیب عورت ہوں۔ کیسی! جا!! جاکر بابوجی کے لئے کچھ کھانے کے لئے لے آ۔ نہاکر انہوں نے کچھ کھایا نہیں۔ میں تو ہنسی دلگی میں یہ بھول ہی گئی تھی۔ یہ کہتے کہتے جیسے اس کا مذاق کی آگ سے جلتا ہوا گلا حقیقی محبت کے پانی سے سرد ہو گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد دائی تھالی میں کچھ مٹھائی لے آگئی۔ بجلی نے تھالی پکڑ کر گھٹنے ٹیک دئے اور آہستہ سے بولی "منہ کھولو! میں تمہیں اپنے ہاتھ سے کھلاؤنگی۔

ستیندر اس وقت تک اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یہ سنکر اطمینان سے بولا۔ "میں نہیں کھاؤنگا۔"

"مگر کیوں نہیں کھاؤ گے۔ کیا ذات خراب ہو جائیگی۔ میں ڈوم چمار تو نہیں ہوں؟"

ستیندر نے اسی طرح اطمینان سے جواب دیا۔ "ڈوم چمار ہوتیں۔ تب شاید کھا لیتا۔ تم جو ہو۔ وہ اچھی طرح سے جانتی ہو۔"

بجلی ہنس کر بولی۔ "لو۔ . . . .
کیا چمک چمک کر طعنے مارتے ہیں۔" یہ کہکر وہ پھر ہنسی مگر اس ہنسی اور پہلی ہنسی میں فرق تھا۔

ستیندر بولا۔ . . . .
. . مجھے طعنے مارنا نہیں آتے۔ ہاں جو غلطی ہو جاتے اس کی اصلاح کرنا جانتا ہوں۔"

بجلی معلوم نہیں کیا کہنا چاہتی تھی۔ پھر اس بات کو دل ہی

دل میں دبا کر بولی۔ "میرے ہاتھ کی مٹھائی نہیں کھاؤ گے؟"

"نہیں"

بجلی کھڑی ہو گئی۔ اُسے مذاق کرنا بھول گیا۔ اُس کی جگہ غصّہ آگیا۔ تڑپ کر بولی۔ "کیوں نہیں کھاؤ گے؟ آج نہ سہی کل سہی۔ کل نہ سہی پرسوں سہی۔ آخر تمہیں کھانا ہی ہوگا۔"

ستیندر نے گردن ہلا کر کہا۔ "غلطی سبھی سے ہو جاتی ہے۔ مجھ سے جو غلطی ہوئی ہے۔ وہ تو ظاہر ہے۔ مگر تم بھی غلطی کر رہی ہو۔ آج اور کل کا تو ذکر ہی کیا ہے میں اِس جنم میں یا کسی دوسرے جنم میں بھی تمہارے ہاتھ سے کوئی چیز لیکر نہ کھاؤں گا۔ اب مجھے جانے دو۔ اس مکان کی زہریلی ہوا سے میرا دم گھٹا جاتا ہے۔"

اس وقت ستیندر کے چہرے پر نفرت کے ایسے واضح آثار نمودار ہوئے۔ کہ شرابی بھی سمجھ گیا۔ اُس نے اٹک اٹک کر کہا۔ "بجلی بائی! جانے بھی دو۔ اس لڑکے کو کیوں روکتی ہو۔ جس کے سینہ میں دل نہیں۔ دل میں محبت نہیں۔ محبت میں بیتابی نہیں۔ اُس کا یہاں کیا کام تمہارے حسن کے جلوے اس کے سامنے ایسے ہی ہیں جیسے بھینس کے آگے بین۔ کیا کہوں۔ اس نے تو آج کا مزا ہی کرکرا کر دیا۔"

بجلی نے کچھ جواب نہ دیا۔ خاموش کھڑی رہی اور ستیندر کے چہرے کی طرف تاکتی رہی۔ درحقیقت وہ غلطی پر تھی۔ اُسے یہ خیال تک نہیں تھا۔ کہ ایسا خاموش آدمی اس قسم کی کھری کھری بھی سُنا سکیگا۔

ستیندر کھڑا ہو گیا۔ بجلی شیریں لہجہ میں بولی۔ "ذرا اور بیٹھ جاؤ۔"

جو شراب کے نشہ میں تھا۔ وہ اس شیرینی کو برداشت نہ کر سکا۔ چلّا کر بولا۔ "جانے دو۔ ورنہ اور سر ہو جائیگا۔"

ستیندر باہر نکل آیا۔ بجلی نے آکر اُس کا راستہ روک لیا۔ اور آہستہ سے کہا۔ "وہ سُن لینگے۔ اِس لئے آہستہ آہستہ کہتی ہوں۔ نہیں تو ہاتھ جوڑ کر، پیر پکڑ کر معافی مانگتی۔ مجھ سے بڑی بھاری غلطی ہو گئی ہے۔"

ستیندر نے کوئی جواب نہ دیا۔ بجلی نے کہا۔ "اب مجھے معاف کر دو۔"

ستیندر سیڑھیوں سے نیچے اُترنے لگا۔ بجلی نے پوچھا "کل آؤ گے۔"

"نہیں"

"کیا اب پھر کبھی ملاقات نہ ہوگی؟"

"نہیں"

بجلی کا گلا بھر آیا۔ روتے روتے بولی۔ "مجھے تو یقین نہیں ہوتا کہ نہ ملو گے۔ لیکن اگر ملاقات نہ ہو۔ تو کیا میری بات پر اعتبار کرو گے؟"

آواز میں رقت محسوس کرکے ستیندر چونک پڑا۔ لیکن

اِن پندرہ بیس دنوں میں اُس نے جو کرشمے دیکھے تھے۔ اُن کے سامنے یہ ایک معمولی دھوکا تھا۔ تاہم وہ جلتے جاتے رُک گیا۔ پر اُس کے چہرے سے

بیحد بے اعتمادی جھلک رہی تھی۔ بجلی کا دل بیٹھ گیا مگر اب کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ اعتماد کے تمام ذرائع تو اُس نے خود اپنے ہاتھ سے برباد کر ڈالے تھے۔

ستیندر نے پوچھا۔ "کس بات کا اعتماد؟"

بجلی کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ مگر زبان سے کوئی لفظ نہ نکلا۔ اُس نے ایک دفعہ اپنی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی آنکھیں اُوپر اُٹھائیں۔ اور پھر سر نیچے جھکا لیا۔ ستیندر نے سوچا۔ یہ رونا بھی ناٹک کے ایکٹروں کا سا ہی ہوگا۔ بجلی کا سر جھکا ہوا تھا۔ مگر اُس نے یہ دیکھ لیا۔ کہ ستیندر ٹھیر گیا ہے۔ تاہم وہ جو کہنا چاہتی تھی وہ نہ کہہ سکی۔

اُس کے دل میں محبت کا ظہور ہوا۔ اس محبت کی خاطر وہ اپنے جسم، حسن، زندگی، مال دولت، ہنر سب کو قربان کرنے کے لئے آمادہ تھی۔ مگر اس پر اعتبار کون کریگا۔ بجلی کا دم رُکنے لگا۔ وہ سزا یافتہ مجرم تھی۔ جج کو اس پر اعتبار کیسے ہوگا۔ وقت گذرتا گیا۔ بجلی کے اندیشے وسیع ہوتے گئے۔ آخر ستیندر میں قوت برداشت نہ رہی۔ اُس نے کہا۔

"میں جاتا ہوں"

بجلی کا سر اب بھی نہ اُٹھا۔ اُس نے اسی طرح زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "جاؤ! لیکن پُر قصور اور گنہگار ہونے پر بھی جو سچ کہتی ہوں۔ اُس پر شبہ کر کے تم بھی گنہگار نہ بنو۔ یقین کرو۔ کہ پرماتما سب کے جسم میں ہے اور ہمیشہ رہتا ہے" اس کے بعد کہا۔ "سب دیوتاؤں کی پوجا نہیں ہوتی یہ درست ہے۔ مگر پھر بھی اُن کے دیوتا ہونے میں شبہ نہیں کیا جاتا۔ اُن کے سامنے سر نہ جھکاؤ تو ہرج نہیں لیکن اُنہیں پاؤں تلے مسلنا بھی درست نہیں"

ستیندر پر ان الفاظ کا خاص اثر ہوا۔ مگر وہ آہستہ آہستہ چلا گیا۔

(۶)

فطرت کے خلاف بغاوت کی جا سکتی ہے۔ مگر اس کا نام و نشان مٹانا ناممکن ہے۔ عورت کے جسم پر سینکڑوں زیادتیاں کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اُس کی عورت کی فطرت سے انکار کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ بجلی رنڈی تھی۔ مگر عورت بھی وہ ہزاروں دفعہ گناہ کر چکی تھی۔ مگر پھر بھی اُس کا دل عورت کا دل تھا۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں واپس گئی۔ تو اُس کے دل میں اک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ اس عرصہ قلیل میں جو حیرت انگیز تبدیلی اُس میں رونما ہو گئی تھی۔ وہ ایسی نمایاں تھی۔ کہ شرابی کی نظروں سے بھی پنہاں نہ رہ سکی۔ اُس نے پوچھا۔ "کیوں بی صاحبہ آنکھوں میں آنسوؤں کے نشان کیسے ہیں؟"

بجلی نے یہ سُنا۔ مگر اس کا خیال نہیں کیا۔ یکایک اسکی نگاہ اپنے پاؤں کے گھونگھروؤں پر پڑی۔ اُسے ایسا معلوم ہوا گویا وہ بچھو ہیں۔ اُس نے انہیں کھولکر پرے پھینک دیا۔

شرابی نے پوچھا "گھونگرو کیوں کھول دئے؟"

بجلی نے مسکراکر جواب دیا "اب نہ پہنونگی۔"

"اس کے کیا معنی؟"

"یہ کہ اب انہیں کبھی نہ پہنونگی — بی بی جان کی موت ہوگئی ہے۔"

ہارمونیم بجانے والا مٹھائی کھا رہا تھا۔ کھاتے کھاتے بولا "کس بیماری سے بائی جی؟"

بجلی پھر ہنسی "اُسی بیماری سے جس سے شمع جلتے ہی اندھیرا مرجاتا ہے۔ سُورج نکلتے ہی رات مرجاتی ہے۔ آج اُس بیماری سے تمہاری بجلی بائی بھی ہمیشہ کے لئے مر گئی ہے۔"

(۷)

چار برس گذر گئے کلکتہ کے ایک مشہور زمیندار کے ہاں لڑکے کا ان پراسن[۱] سنسکار تھا۔ مہمانوں سے مکان بھر گیا تھا شام کے وقت محفل رقص و سرود منعقد ہوئی۔ چار رنڈیاں بلائی گئی تھیں۔ اوپر چک کے اندر رادھارانی بیٹھی تھی۔ اتنے میں ستیندر نے آکر کہا۔ "کیوں کیا دیکھ رہی ہو؟"

گردن موڑکر ہنستی ہوئی رادھارانی بولی۔ "جسے سب لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اُسی کو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ بائی جی کا لباس وغیرہ عجیب ہے۔ مگر تم کیوں آگئے؟"

"اس خیال سے کہ تم تنہا ہو۔"

"جھوٹ بول رہے ہو۔"

"نہیں سچ کہتا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ۔ ان سب میں سے تمہیں کون پسند ہے؟"

"وہی"

رادھارانی نے اُس رنڈی کی طرف اشارہ کرکے کہا جو سب کے پیچھے بیٹھی تھی۔ اور جس کی پوشاک بالکل معمولی تھی۔

ستیندر بولا "وہ تو بالکل مری مٹی ہے۔"

"بیمار ہے۔ مگر خوبصورت ہونے میں شبہ نہیں۔ معلوم ہوتا ہے بیچاری غریب ہے۔"

"ہوسکتا ہے۔ مگر جانتی ہو۔ ان کے گانے کی فیس کتنی ہے؟"

"نہیں"

ستیندر نے انگلی سے اشارہ کرکے کہا۔ اُن دو کی فیس تیس تیس روپے ہے۔ اُس کی پچیس ہے۔ اور تمہاری غریب بیچاری کی فیس دو سو روپیہ۔"

"دو سو؟" رادھارانی نے چونک کر کہا۔ "کیا بہت عمدہ گاتی ہے؟"

میں نے کبھی سُنا نہیں۔ کہتے ہیں آج سے چار پانچ سال پہلے اُس کے نام کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔ اب بھی

[۱] جب بچے کے مُنہ کو پہلی دفعہ اناج لگایا جاتا ہے۔

اُس کی تان میں وہ کشش، وہ تاثیر، وہ موہنی ہے یا نہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتا۔"

"تو اتنا روپیہ دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کم پر مانتی ہی نہیں تھی۔ یہ فیس بھی اُس نے بڑی خوشامدوں کے بعد منظور کی ہے۔"

زیادہ حیران ہوکر رادھا رانی نے کہا۔ "واہ! روپیہ بھی دینا اور خوشامد بھی کرنا۔ یہ کیوں؟"

ستیندر نے ایک کرسی پر بیٹھ کر کہا۔ "پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اُس نے اب یہ پیشہ چھوڑ دیا ہے۔ خواہ اس میں لاکھ گُن ہوں۔ مگر اتنی رقم کون آسانی سے دے سکتا ہے۔ اسکے فیس بڑھانے کا مدعا محض یہ ہے کہ اُسے کوئی بلا نہ سکے۔ دوسری وجہ میری غرض ہے۔"

"تمہاری غرض کیا پتھر ہے۔ اچھا یہ بتاؤ۔ اُس نے اپنا پیشہ کیوں چھوڑا؟"

"سنوگی؟"

"ہاں سنوں گی۔ کہو۔"

ستیندر نے ساری کہانی سُنا دی۔ رادھا رانی نے آہ سرد بھر کر پوچھا۔ "کیا اسی وجہ سے آج تم نے اُسے یہاں بُلوایا ہے۔ کیا انتقام لینا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں یہ خیال نہیں آتا۔ کہ مرے کو مارنا مردوں کا کام نہیں۔"

ستیندر کی آنکھیں بھی تر ہو گئیں۔ آہستہ سے بولا۔

"انتقام تو ہے۔ مگر اسے ہم تینوں کے سوائے اور کون جانتا ہے؟"

رادھا رانی نے کوئی جواب نہ دیا۔ مگر اُس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔

تھوڑی دیر کے بعد تمام مہمان آگئے۔ رنڈیاں تیار ہو گئیں۔ مگر بجلی بائی اسی طرح چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اتنے میں ایک لڑکے نے آکر اُس سے کہا۔ "ماں جی آپ کو بلا رہی ہیں۔"

بجلی نے آہستہ سے سر اُٹھایا اور جواب دیا۔ "کسے؟"

"آپ کو"

بجلی کو اعتبار نہ ہوا۔ سر ہلا کر بولی۔ "کسی اور کو بُلایا ہوگا جا کر نام پوچھ آ۔"

لڑکا چلا گیا۔ اور پھر واپس آکر بولا۔ "آپ ہی کو بُلایا ہے آپ ہی کا نام بجلی بائی ہے نا؟"

حیرت سے بجلی نے جواب دیا۔ "ہاں"

"تو چلئے"

بجلی نے گھونگرو کھول دیئے۔ اور لڑکے کے ساتھ چلی۔ رادھا رانی اپنے خوابگاہ کے دروازہ پر کھڑی تھی۔ اُس کی گود میں لڑکا تھا۔ بجلی کو دیکھتے ہی اُس نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔ اور اُسے گھسیٹ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ بجلی کا کلیجہ دھڑک رہا تھا۔

رادھا رانی نے پلنگ پر بیٹھ کر پُوچھا۔ بہن مجھے پہچانتی ہو"

بجلی حیرت میں آ گئی۔

اگر مجھے نہیں پہچانتیں تو معمولی بات ہے لیکن بہن کیا اسے بھی نہیں پہچانتیں؟

یہ کہتے کہتے رادھا رانی نے اپنے لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر ہنسنے لگی۔ بجلی اب بھی خاموش رہی۔ آہستہ آہستہ اُس کے تاریک دل میں روشنی کا ظہور ہُوا۔ اُس نے رادھا رانی کے چہرے سے ہٹا کر اپنی آنکھیں بچّے کے چہرے پر جما دیں۔ کچھ دیر وہ تعجب میں رہی۔ تب یکایک چونک کر کھڑی ہو گئی۔ اور بچّے کو گود میں لے کر دیوانہ وار چومنے لگی۔ اور رونے لگی۔ رادھا رانی نے پُوچھا" اب تو پہچان لیا؟"

"ہاں بہن پہچان لیا۔"

رادھا رانی بولی۔" سمندر بلونے سے جو زہر نکلا۔ وہ تو تم نے لے لیا۔ اور امرت اس چھوٹی بہن کو دیدیا۔ وہ عورتوں سے فطرتاً متنفر تھے۔ تم نے اُنہیں محبت کرنا سکھایا اور پھر میرے سپرد کر دیا۔"

بجلی نے جوابدیا" بہن زہر کے لئے زہر ہی امرت ہو جاتا ہے۔ مجھ سی گنہگار بھی سُدھر گئی۔ میں نقصان میں نہیں رہی۔"

رادھا نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد بولی۔" اچھا بہن! ایک دفعہ اُن سے ملو۔"

بجلی نے آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر تک دل میں کچھ سوچتی رہی۔ پھر بولی۔" نہیں بہن، آج سے چار سال پہلے جب وہ مجھے پہچان کر نفرت سے چلے آ رہے تھے۔ اُس وقت میں نے بڑے غرور و اعتماد سے کہا تھا۔ کہ تم میرے پاس پھر آؤ گے۔ مجھ سے پھر ملو گے۔ مگر وہ غرور ٹوٹ گیا وہ کبھی نہیں آئے۔ پر آج معلوم ہُوا ہے۔ کہ اُنہوں نے میرا غرور کیوں توڑا ہے۔ اور کس طرح ـــــ کونسا مُنہ دیکھ کر میری محبّت ٹھکرائی ہے۔" یہ کہکر بجلی نے اچھی طرح سے آنکھوں سے آنسو پونچھ کر کہا۔" میں نے دل کی جلن کے باعث نہ معلوم کتنی دفعہ پرماتما کو ظالم بے رحم اور غیر منصف کہا ہے۔ مگر آج معلوم ہُوا۔ کہ اگر وہ میرے پاس آجاتے تو میری تباہی میں شبہ نہ تھا۔ اُن کی نفرت ہی میرے لئے امرت بن گئی ہے۔"

رادھا رانی کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اُس کا گلا رُک گیا۔ بجلی نے دیوار سے سنیندر کا ایک چھوٹا سا فوٹو اُتار کر کہا۔ میں نے سوچا تھا۔ کہ اگر کبھی اُن سے ملاقات ہوگی۔ تو پاؤں میں گر کر معافی مانگونگی۔ پر اب اس کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔ بہن! مجھے یہ فوٹو دیدو۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔"

یہ کہکر بجلی کھڑی ہو گئی۔ رادھا رانی نے کہا۔" اچھا!

پھر کب آؤگی ؟"

"اب پھر نہیں آؤنگی۔ میرا ایک چھوٹا سا مکان ہے اُسے فروخت کرکے جلد ہی کہیں چلے جانے کا خیال ہے۔ پر یہ تو کہو۔ انہوں نے اتنے دنوں کے بعد کیوں مجھے یاد کیا اور اُن کے آدمیوں نے اُن کا اصلی نام کیوں چھپایا؟"

رادھا رانی کا سر شرم سے جھک گیا۔ رُخسارے سرخ ہو گئے۔ بجلی نے کہا "شاید! مجھ سے انتقام لینے کے لئے۔ اس کے سوائے اتنے اصرار سے بلانے کی اور کیا وجہ ہو سکتی ہے؟"

رادھا رانی نے کوئی جواب نہ دیا۔

بجلی بولی "بہن یہ اُن کی غلطی ہے۔ مَیں اب عزت بیعزتی کا خیال ہی نہیں کرتی۔ تو اس سے کیا ہوگا۔ خیر! اُن سے اس ملاقات کا ذکر کر دینا۔ اور اُن سے کہہ دینا۔ کہ بجلی تمہیں ہمیشہ یاد رکھتی ہے۔ اور تمہارے احسان کو کبھی نہیں بھولتی۔ تم نے اُسے جو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا تھا۔ یہ اُس کے لئے امرت ہو گیا۔ وہ مرتے مرتے بچ گئی۔"

یہ کہتے کہتے بجلی نے لڑکے کا مُنہ چوم کر لڑکا رادھا رانی کی گود میں دیدیا۔ اور آہستہ آہستہ باہر نکل گئی۔

(ترجمہ) سُدرشن

غزل

چشمِ مشتاقِ دیدِ یار رہی
شام تک محوِ انتظار رہی

رات کا قصّہ مختصر یہ ہے
صبح ہونے تک اشکبار رہی

تو رہا محوِ خوابِ ناز، مگر!!
آرزو تیری بیقرار رہی

گو تغافل ترا شعار رہا
مجھ کو امید بار بار رہی

راز سمجھا نہ کچھ گل خنداں
کس لئے شبنم اشکبار رہی

اے اثر لطفِ زندگی کیا ہے؟
خشمگیں جب نگاہِ یار رہی

اثر صہبائی

حسینۂ مصر

باب (۲) دوم

ایک مانوس صورت کی تلاش

نوفری سمجھ گئی۔ کہ اس وقت تخلیہ کی ضرورت ہے۔ ستار بجانے والی، رقاصہ اور دوسری سہیلیاں رخصت ہو گئیں اور نوفری نے نرم اور لجاجت آمیز لہجہ میں کہا۔

"بیوی آپ کیوں محزون اور ملول ہیں؟ ماشاء اللہ آپ نوجوان ہیں اور حسن میں اپنا جواب نہیں رکھتیں۔ اور ہر طرح سے آزاد ہیں۔ اور آپ کے والد اسقف اعظم پوٹامونا ف نے جن کی ممی ایک نہایت ہی بیش قیمت قبر میں رکھی ہے آپ کے لئے بہت بڑی دولت چھوڑی ہے۔ جسے آپ اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکتی ہیں۔ آپ کا محل نہایت خوبصورت ہے۔ اور آپ کے باغات نہایت وسیع ہیں۔ آپ کے صندوقوں میں بکثرت جواہرات بھرے ہیں۔ اور سینکڑوں جوڑے بیش قیمت کپڑے آپ کے پاس موجود ہیں۔ پھر بھی آپ کا دل بجائے کنول کی طرح کھلے ہونے کے موسم خزاں کے پھولوں کی طرح غمگین اور خاموش ہے!"

طھوسر۔ ہاں بیشک مجھ پر دیوتاؤں کی برکت ہے لیکن جب کسی کا مقصود دلی اُسے نہ حاصل ہو تو یہ بیش قیمت مقبوضات کس کام کے؟ نامراد انسان امیر سے امیر آدمی کو اس کے محل میں اسی قدر مفلس رکھتے ہیں جس طرح کوئی غلام یا حبشی۔

نوفری۔ (طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ) بیوی! کیا یہ ممکن ہے کہ آپکی چھوٹی سے چھوٹی خواہش بھی فوراً نہ پوری ہو سکے؟ اگر آپ کو کسی خوشنما جواہر کا خیال ہو۔ تو جوہری حاضر کر سکتا ہے کپڑے، خوشبو یا پھول یا لذیذ کھانا جو آپ چاہیں فوراً حاضر ہوگا۔ فلی اور ہلیا پولس میں آپ کے غلام آپ کو خوش کرنے کے لئے دلفریب اور نادر چیزیں تلاش کر رہے ہیں۔ اگر آپ کی مطلوبہ چیز مصر میں نہیں ملتی تو کیا قافلے دُنیا کے اُس سرے سے نہیں لا سکتے؟"

طھوسر نے اپنا خوبصورت سر ہلایا لیکن اُس کی سہیلی کے خیالات نے جو روانی اختیار کی تھی۔ اُس سے بےچین ہو گئی۔

نوفری۔ (اپنی غلامی کو محسوس کر کے) "حضور گستاخی معاف مجھے بیہ یاد نہیں آیا۔ کہ چار ماہ ہوتے فرعون نے بالائی حبش پر چڑھائی کی ہے۔ اور وہ خوبصورت فوجی افسر ملک معظم کے ساتھ ہے۔ یہ خوبصورت اور بہادر نوجوان فوجی لباس میں

کسقدر شاندار معلوم ہوتا تھا۔"

طھوسر نے شرم سے سر جھکا لیا لیکن نہ خود کچھ کہا اور نہ نوفری کو روکا۔

"حضور آپ کا ملال جاتا رہیگا۔ ایک سانڈنی سوار پیام لایا ہے۔ کہ بادشاہ سلامت شام سے پہلے پہلے آجائینگے اس فاتحانہ مراجعت کا نظارہ کرنے لوگ جوق جوق جارہے ہیں۔ کیا آپ بھی اپنے رنج کو دور کرکے اس منظر کو دیکھنے نہ چلینگی؟ احموسس آپ کو دیکھ کر خوش ہوگا۔ اور آپ ہنسی خوشی اپنے محل کو واپس آئینگی۔"

طھوسر "احموسس مجھ سے محبت کرتا ہے لیکن میں احموسس سے محبت نہیں کرتی۔"

نوفری کو یہ خیال نہیں ہوا کہ طھوسر نے صاف صاف اپنے دل کا حال کہا ہے۔ اور اس نے کہا۔ کہ یہ لڑکیوں کی باتیں ہیں۔ کیونکہ احموسس ہر طرح سے نہایت ہی پسندیدہ آدمی تھا۔ تاہم طھوسر اس سے محبت نہیں کرتی تھی۔ اور اپنی رازدار سے سچ سچ کہہ دیا تھا۔

طھوسر کو ایک اور خیال ہوا جس کا اس نے نوفری پر اظہار نہیں کیا۔ اس نے رنج و غم کو دور پھینکا اور نوفری کو حکم دیا۔ کہ چلنے کی تیاری کی جائے۔ طھوسر کے محل اور دریائے نیل کے درمیان صرف باغات حائل تھے۔ اور نوفری اور دوسری سہیلیوں کو ساتھ لیکر سایہ دار راستوں سے ہوتی ہوئی وہ اپنے گھاٹ پر پہنچی۔ اس روز مصری، حبشی، ایشیائی اور قبطی وغیرہ سبھی دریائے نیل کی طرف جارہے تھے۔

اس مجمع کے ساتھ مذہبی پیشوا، سپاہی اور امرا جارہے تھے۔ اور مکانات کی دیواروں سے چھپی ہوئی برقع پوش خواتین تجمل کے بار سے جھکی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ اعلیٰ طبقہ کی خواتین غلاموں کو ساتھ لئے ہوئے شفاف اور مکلف و مرصع لباس زیب تن کئے غرور کے ساتھ گذر رہی تھیں۔ ان کے جسم سے عطر اور پھولوں کی خوشبو مہک رہی تھی۔ حبشی کہار تیز۔ اور برابر کے قدم بڑھاتے ہوئے فینسیں بھی لئے جارہے تھے۔

دریائے نیل پر غیر معمولی سرگرمی کا اظہار ہو رہا تھا اور باوجود دہانہ کی تنگی کے مصر کے تمام جہاز چھوٹے اور بڑے موجود تھے۔ طھوسر خود اپنے جہاز پر سوار ہوئی جو نہایت ہی خوشنمائی سے آراستہ کیا گیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ دریا کے اس پار پہنچ گئی۔ جہاں اس کی گاڑی تیار کھڑی تھی۔ نوفری نے گاڑی کے بیلوں کی باگ لی۔ اور آگے بڑھایا۔ اور طھوسر بے حس و حرکت اس کے برابر بیٹھی رہی۔ دونوں لڑکیاں منقش گاڑی پر نہایت ہی دلفریب معلوم ہو رہی تھیں۔

دریا کے اس طرف ممنونیا اور اس کے قریب کے مواضعات کے باشندے بھی آگئے۔ اور تماشائیوں کا مجمع

لحظہ بلحظہ بڑھنے لگا۔ خود شہر تھیبہ ایسا ویران ہوگیا جیسے کوئی فاتح آکر تمام آبادی کو قید کر کے لے گیا ہے۔

اس عجیب و غریب دریائی منظر کا نقشہ نہایت ہی دلفریب تھا۔ ہرے بھرے کھجور کے درختوں کے درمیان سرود خانے سرمائی مکانات، قصر اور کوٹھیوں کے رنگ ابھرے ہوئے تھے۔ جنہیں سرو و صنوبر کے درخت حلقہ کئے ہوئے تھے۔ فواروں پر سورج چمک رہا تھا۔ اور انگور کی بیلیں آپس میں بغلگیر ہو رہی تھیں۔ سامنے قصر رسیس میمون کی سیاہ عظیم الشان عمارت نظر آرہی تھی۔ اور شمال کی طرف آگے بڑھ کر دو بڑے بڑے تاجپوش مجسمے تھے۔ جو انسان کی شکل کے پہاڑ معلوم ہوتے تھے۔ اور امینافیم کے پھاٹک کے سامنے آگے بڑھکر رسیسیم کو اور اسقف اعظم کے مقبرے کو ایک حد تک چھپائے ہوئے تھے۔ لیکن منفشا کا قصر نظر آرہا تھا۔

طھوسر نے اس مانوس منظر کا کچھ لحاظ نہ کیا اور اسکی بدحواس نظروں میں تعریف و تحسین کی کوئی جھلک نہ آئی۔ لیکن ایک مکان کے سامنے سے گذرتے وقت جو سرسبز اور شاداب گھنے گھنے پودوں میں چھپا ہوا تھا۔ وہ ہجوم خیالات سے چونکی اور بظاہر اس کی مشتاق نگاہیں مکان کی فصیل پر کسی مانوس اور محبوب تصویر کو تلاش کرنے لگیں

ایک بے نظیر حسن و صباحت کا نوجوان فصیل کے ایک ستون کا سہارا لئے ہوئے کھڑا تھا۔ اور دریا کے ہجوم کو بے پروائی سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اس کی غمگین نگاہیں اس گاڑی کی طرف نہیں متوجہ ہوتیں۔ جس پر طھوسر اور نوفری سوار تھیں۔ تاہم پیٹامونات کی لڑکی کا نازک ہاتھ گاڑی کے اگلے حصہ پر پہنچگیا۔ اور اس نے لرزکر اوٹ کو پکڑ لیا اس کے رخسار زرد ہوگئے۔ اور اس نے کنول کے پھولوں کے گلدستہ میں اپنا منہ چھپالیا۔

باب سوم

فرعون کی فاتحانہ واپسی

باوجود اپنی خلقی ہوشیاری کے نوفری یہ نہیں دیکھ سکی۔ کہ ایک غیر معلوم قابل نفرت انسان نے اس پر کیا اثر ڈالا۔ اس نے یہ نہیں دیکھا۔ کہ طھوسر کا چہرہ زرد ہوگیا اور شرم سے گردن جھک گئی۔ اور آنکھیں یکایک چمکنے لگیں اور دل کی حرکت تیز ہوگئی۔ بیشک اس کی ساری توجہ گاڑی ہانکنے پر مبذول تھی۔ کیونکہ اس مجمع میں جو فرعون کی فاتحانہ واپسی کا نظارہ کرنے والوں سے بڑھتا جاتا تھا۔ اس کا کام بہت مشکل ہوگیا تھا۔

آخرکار گاڑی اس وسیع میدان میں پہنچ گئی۔ جو فوجی نمائش اور شان و شوکت کے لئے منتخب کیا گیا تھا طھوسر اور نوفری کے ملازمین نے ان کے لئے راستہ صاف کر دیا۔

اور اب سمندر کے بڑھاؤ کی طرح مجمع کو حرکت ہوئی اور دور سے غل وشور کی آوازیں آنے لگیں۔ جن سے مجمع کی تمام آوازیں دب گئیں۔ اس کے بعد ہی جنگی گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ اور پیادہ سپاہ کے پیروں کی آواز سنائی دی۔ اور سامنے سے ایک اُمنڈتا ہوا غبار نظر آیا۔ یہ غبار ایک کوچ کرتی ہوئی سپاہ سے اُٹھا تھا۔ جس کے گرد وپیش بیشمار تماشائیوں کا ہجوم تھا۔

اب شور وغل بڑھنے لگا۔ اور غبار کے بادل کٹ گئے اور سینکڑوں گانے والے میدان میں پہنچ گئے۔ جس سے مجمع میں کچھ سکون ہوا کیونکہ باوجود اپنے بادشاہ فرعون کی وقعت کے وہ تیز دھوپ میں کھڑے کھڑے تھک گئے تھے۔ دھوپ اس غضب کی تھی۔ کہ مصریوں کے علاوہ دوسروں کا سر پگھلا دیتی۔

گویوں کا مقدمۃ الجیش ٹھہر گیا۔ اور مذہبی پیشواؤں کے گروہ اور ثیبہ کے ممتاز لوگ ادب سے قطاریں باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ گانے والے تعداد کے لحاظ سے بجائے خود ایک چھوٹی سی فوج کے برابر تھے جس میں نقارچی طنبورئے طبلچی مجیرئے اور ستار باز سبھی تھے۔

اس کے بعد مرد اور عورت قیدیوں کے جھرمٹ نظر آئے۔ جو زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ اور فوجی آدمی اُن کی حفاظت پر تھے۔ ان کے پیچھے علمبردار تھے جنکے ساتھ ایک نقیب تھا۔ جو فرعون کی فتوحات قیدیوں مالِ غنیمت اور مفتوحہ اقوام اور شہروں کی منادی کر رہا تھا آخر میں خود فرعون کی سواری آئی۔ جس کے آگے آگے مذہبی پیشوا اور بخورات جلانے والے تھے۔ اس وقت ایک عجیب وغریب واقعہ ظہور پذیر ہوا۔ فرعون کی گاڑی مجمع کے سروں پر جا رہی تھی۔ اور چند افسر کاندھا دئے ہوئے تھے جس وقت یہ گاڑی اُس مقام پر پہنچی۔ جہاں طھوسرا اور نوفری کھڑی ہوئی تھیں۔ اُس وقت فرعون اس حسین لڑکی کے برابر سے ہو کر گذرا۔ بادشاہ نے اس پر غائر نظر ڈالی۔ اُس کا سر اُسی طرف کو جھک گیا اور چہرے کے تمام اعصاب ساکن ہو گئے۔ چہرے کی شکل ممی کی طلائی نقاب کی طرح ہو گئی۔ بہر نوع اس کی سیاہ آنکھوں نے طھوسرا کو صاف صاف دیکھ لیا۔ اور ان میں شوق کی ایک جھلک پیدا ہو گئی۔ اُس نے اپنا ہاتھ ذرا بلند کیا۔ اور اپنے ہمنشیں کی طرف کچھ اشارہ کیا۔ اس ہمنشیں نے پیٹامونان کی لڑکی کو دیکھا اور تاڑ گیا۔

باب چہارم

پیامبر کی واپسی

فرعون اعظم اپنے قصر میں پہنچ گیا۔ جو دریائے نیل کے بائیں کنارے پر مقام سلامی سے قریب ہی واقع تھا

رات کی شفاف تاریکی نے اس محل کی عظمت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا تھا اور اس کے گوشوں سے رعب وداب اور قوت کا اظہار ہو رہا تھا۔ اور اپنی مطلق العنان اور اعلےٰ طاقت کے خیال نے قصر کی عمارت میں ایک شان پیدا کر دی تھی اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس عمارت پر صدیوں کے امتداد کا وہی اثر ہو گا جو سنگِ مرمر کے ٹکڑے پر ایک قطرہ پانی کا ہوتا ہے۔

فرعون نے ذرا آرام لیا اور کچھ ناشتہ کر کے درباریوں کے ساتھ رقص و سرود میں مشغول ہو گیا۔ لیکن اس کے چہرے پر خوشی کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی اور وہ بلا ایک حرف زبان سے کہے ہوئے اپنی خلوتگاہ میں چلا گیا۔ دروازے ہی پر وہ ملازم بے حس و حرکت کھڑا ہوا تھا۔ جس نے فاتحانہ واپسی کے وقت بادشاہ کے اشارہ کی تعمیل کی تھی۔ اس نے ادب سے سر جھکا لیا اور کہا۔

"حضور ملک معظم دیوتاؤں کے عزیز میں حضور کے پاس سے روانہ ہوا اور ایک چھوٹی سی کشتی پر دریائے نیل کو عبور کیا۔ اور اس عورت کا خفیہ تعاقب کیا جس پر حضور کی نظر التفات پڑی تھی۔ یہ عورت طوسر پیٹامو ناف اسقف اعظم کی لڑکی ہے۔"

فرعون مسکرایا اور جواب میں اپنی خوشی کا اظہار کیا اور اس پیامبر کو بہت کچھ انعام و اکرام دیا

. . . .

باب پنجم

کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

دریائے نیل کے بائیں کنارے پر اُس نوجوان کا محل تھا جس کا نام پوٹری تھا۔ اور جس نے فرعون کی فاتحانہ واپسی کے نظارہ کے وقت طوسر کی نگاہِ ناز کو بیچین کر دیا تھا۔ یہ محل نہایت ہی عمدہ موقعہ پر تھا۔ اور دیہات کے مکان اور باغ دونوں کا لطف آتا تھا۔ باغات اور غلّہ خانے وغیرہ الگ الگ پتھر کی دیواروں سے بنے ہوئے تھے۔ اس میں تین پھاٹک تھے اور دیوار کے قریب ایک برآمدہ تھا جہاں سے باغات اور سڑک کا منظر دکھائی پڑتا تھا۔ یہ برآمدہ تھیبہ کے اُمرا کے مکانات سے مشابہ نہ تھا۔ اس کی عمارت اور ساخت میں ایک تازگی اور سادگی تھی۔ جو شہر کے باہر کی مطمئن زندگی اور سبزہ زار کے لئے بالکل مناسب تھی۔ مکان کی منزل زیریں میں ایک بارہ دری تھی۔ جس میں بہت سے ستون تھے۔ اس میں چاروں طرف کی ہوا آتی تھی۔ تمام مکان مختلف رنگوں سے رنگا ہوا تھا۔ جس میں نہایت ہی نازک دلفریب اور خوشنما نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ ستون کے بالائی حصّے نیلے سبز اور گلابی رنگ کے تھے۔ برآمدہ کے چاروں طرف زمین مزروعہ تھی۔ جس میں پھل پھول اور درخت سبزہ زار کی طرح لہلہا رہے تھے۔

بڑا باغ سورج کی روشنی سے منور تھا جس میں مسرت اطمینان اور فرحت کی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔ درختوں کی شادابی پھولوں کی کثرت اور آب و ہوا کی صفائی تمام عمارت کو نقش ارم بنائے ہوئے تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ یہ مقام جنت کا نمونہ بنایا گیا ہے۔ جہاں ہر خوشگوار خواب کی تعبیر موجود تھی۔ . . . یکایک برآمدہ کا دروازہ کھلا اور اس کے زینوں پر پوٹری نظر آیا۔ گو اُسکا لباس مصری تھا۔ تاہم اُس کی شکل و صورت مصر کی قومی وضع سے مختلف تھی۔ ہر شخص کہہ سکتا تھا کہ وہ دریائے نیل کے باشندوں کی اصلی نسل سے نہیں تھا۔ چھوٹی عقاب نما ناک، سرخ رخسار، خوبصورت لب اور بیضاوی چہرہ یہ تمام باتیں مصریوں کی معمولی شکل سے بالکل مختلف تھیں۔ اس کے علاوہ اس کا رنگ تیز زیتونی تھا۔ اور اُس کی آنکھیں گہرے نیلے رنگ کی تھیں۔ وہ انسانی حسن و جمال کا ایک غیر معمولی نمونہ تھا اور پیٹاموناف کی لڑکی اُسے دیکھ کر اپنا دل قابو میں نہ رکھ سکی۔

جس دن سے اس نے اُسے برامدہ میں کھڑا ہوا دیکھا اُس دن سے وہ کئی بار اپنی گاڑی پر سوار ہو کر اُدھر سے گذری۔ لیکن گو پوٹری کا دل لُبھانے کے لئے طھوسر اعلیٰ سے اعلیٰ اور زر و جواہر سے مرصع لباس پہنکر نکلی۔ تاہم پوٹری کبھی اُس طرف نہیں نظر آیا۔ کہ اس بناؤ سنگار پر کچھ توجہ کرے۔

باوجود اس کے طھوسر نہایت ہی حسین تھی اور جس حسن و جمال سے اس مکان کے مالک کو اسقدر بے اعتنائی اور نفرت تھی اُس پر خود فرعون مفتون تھا اور اس محبت پر بالائی اقلیم نیل کا باعظمت بادشاہ اپنے حرم کی خوبصورت سے خوبصورت عورت کو قربان کرنے پر تیار تھا۔ وہ اپنا تمام ایشیائی مالِ غنیمت، زر و جواہر کے خزانے، جنگی گاڑیاں اپنی فوج اپنا تاج و تخت اور سب سے بڑھکر یہ کہ اپنی وہ قبر بھی دے دیتا، جسے ہزاروں غلاموں نے مدت العمر کی محنت سے بنایا تھا۔ . . . . .

محبت ایشائی ممالک میں جہاں کے باشندے تپتی ہوئی دُھوپ میں رہتے ہیں۔ سرد اور کہر اور برف کے ممالک سے مختلف ہے۔ کیونکہ ایشیائی باشندوں کی رگوں میں محض گرم خون ہی نہیں دوڑتا ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ جذبات کے شعلے بھی رقیق حالت میں ہوتے ہیں حسین طھوسر کا پھول سا چہرہ محبت کی گرمی سے کمہلانے لگا اور غش پر غش آنے لگے۔ باوجودیکہ اس کی ہر سانس پھولوں کی خوشبو سے بسی رہتی تھی۔ اور اُن مشروبات کا دور رہتا تھا جو ہر طرح کی فکر اور غم کو بُھلا دیتے ہیں۔ سرود سے اُسے نفرت ہونے لگی۔ کیونکہ وہ اُس کے جذبات محبت کو اور شعلہ زن کر دیتا تھا۔ اور تکلیف کا احساس ارمان اور درد دل کے ساتھ بڑھ جاتا تھا۔ اب اُسے اپنی خادماؤں یا سہیلیوں کے رقص میں کوئی لطف نہیں آتا تھا۔ رات کی نیند غائب

ہوگئی تھی۔ اور اگر کبھی آنکھ جھپک بھی جاتی تھی۔ تو فوراً پھڑک جاتی تھی۔ وہ درد بھرے دل کے ساتھ سر پکڑتے ہوئے اور آہیں بھرتی ہوئی اُٹھ پڑتی تھی۔ اور اپنا پرشکوہ بستر چھوڑ کر سنگ مرمر کے فرش پر لیٹ جاتی تھی۔ اور اُس کی پرسکون سردی کا مزا لینے لگتی تھی۔

فرعون کی فاتحانہ واپسی کے بعد جو رات گذری اُس میں طہوسر اسقدر غمگین تھی۔ کہ اُسے زندگی دوبھر معلوم ہوتی تھی۔ اور اُسے خیال ہُوا۔ کہ اگر اُس نے جی کڑا کر کے ایک سخت کوشش نہ کی تو محض رنج ہی سے اُس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اُس نے نہایت ہی سادہ لباس پہنا اور سفید صبح کے نمودار ہوتے ہی بغیر لونڈی سے کہے ہُوئے دریا کی طرف نکل کھڑی ہُوئی۔ اور سر سے پاؤں تک لرزتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھے ہُوئے پوٹری کے برآمدہ کا رُخ کیا۔

اس وقت دن اچھی طرح چڑھ آیا تھا۔ اور پھاٹک کھل گئے تھے۔ جس میں سے گاڑیاں اور گلے چراگاہ کی طرف جا رہے تھے۔ طہوسر داخل ہُوئی۔ اور ڈیوڑھی پر پوٹری سے دوچار ہوگئی۔

اس نے نہایت عجز کے ساتھ سر جھکا لیا۔ اور اس سادگی میں غالباً اُس کا حسن اس وقت سے دوبالا ہو گیا جبکہ وہ اپنے خوبصورت مکان میں شان و شوکت کی زندگی بسر کرتی تھی۔ اس وقت طہوسر کا دل دھڑک رہا تھا۔ اور اس کے زرد رخسار پر آنسو بہ رہے تھے۔

پوٹری نے کہا۔ "آؤ بیخوف چلی آؤ۔ یہ مکان تمہاری ہر طرح سے مہمان نوازی کریگا۔"

باب ششم

حصولِ محبّت کی کوشش

پوٹری کے اس ہمدردانہ فقرے نے طہوسر کی ہمت بڑھائی اور وہ اُٹھ کھڑی ہُوئی۔ اُس کے زرد رخسار جھلکنے لگے۔ اور امید کے ساتھ ساتھ اسے کچھ حیا کا بھی احساس ہُوا۔ وہ اپنی اس حرکت پر نادم ہُوئی۔ جو عشق کی بدولت سرزد ہوئی تھی۔ اور جس در کو اُس نے کئی بار خواب میں دیکھا تھا اُس میں داخل ہوتے ہُوئے پس و پیش کرنے لگی۔ اُس کے جذبات اُسے دبا رہے تھے۔ اور مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔ حقیقت کے سامنے اُس کے سارے خواب بیکار ہوگئے۔

نوجوان پوٹری کو خیال ہُوا کہ افلاس کے ساتھ قدرتاً انکسار پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وہی طہوسر کو اس مکان میں آگے بڑھنے سے مانع ہے۔ چنانچہ اُس نے مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"نوجوان لڑکی اندر آ۔ لرزنے کی ضرورت نہیں ہے یہ مکان تیرے پناہ دینے کے لئے کافی وسعت رکھتا ہے اگر تو تھکی ہُوئی ہے تو آرام کر۔ اگر تجھے بھوک یا پیاس لگی

ہے تو میرے نوکر تجھے کھانا لادینگے"۔

ان الفاظ سے دختر پیناموناف کی ہمت بڑھی۔ اور وہ محل میں داخل ہوئی۔ اور دیکھا کہ وہ دیہات کے ایک بڑے مکان کی طرح خوبصورتی کے ساتھ آراستہ ہے۔

پوٹری بیٹھ گیا اور طھوسر اس کے سامنے بیٹھی۔ پوٹری کی نظر اس کی آنکھوں پر پڑی۔ جو مشفقانہ استعجاب سے مملو تھیں۔

طھوسر اس طرح جھککر خوشی کے مارے آپے سے باہر ہو گئی۔ حریر کا برقعہ جو اس کے جسم پر لپٹا ہوا تھا پیچھے گر پڑا۔ اور اس کی پیچدار زلفیں اور خوبصورت اور غمگین چہرہ کھل گیا۔ اس کا بے آستین کا کرتہ کہنیوں تک ہاتھوں کو نمایاں کئے تھا۔ جس سے ہاتھوں کی جنبش میں آسانی ہو رہی تھی۔

پوٹری۔ "میں پوٹری ہوں، شاہی جائداد کا محافظ"۔

طھوسر (ایک کہانی سناکر) "میں حورا ہوں۔ میرے والدین کا انتقال ہو چکا ہے۔ اُن کی جائداد صرف اُن کی تجہیز و تکفین کے لئے کافی ہوئی۔ میں تنہا ہوں اور کوئی حامی و مددگار نہیں لیکن اگر آپ میری امداد کرنا چاہتے ہیں۔ تو میں آپکی مہمان نوازی کا معاوضہ دے سکتی ہوں۔ میں سینا اور گانا جانتی ہوں اور بین بجا سکتی ہوں اور ناچ سکتی ہوں۔

پوٹری۔ "حورا! پوٹری کے مکان میں آرام سے رہو تم نازک اندام ہو۔ تمہیں یہاں ایسا کام کرنا ہوگا۔ جو ایسی لڑکی کے لئے مناسب ہو۔ جس نے کبھی اچھے دن دیکھے ہوں۔ میرے ملازموں میں چند خوبصورت اور تربیت یافتہ لڑکیاں ہیں۔ جن کی رفاقت کو تم پسند کروگی۔ یہ لڑکیاں تمہیں اس گھر کا طرزِ معاشرت سمجھا دینگی۔ ممکن ہے جو کچھ دن گذرنے پر تمہارے دن پھریں۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو یہیں آرام سے رہو۔ جو مہمان خدا کا بھیجا ہوتا ہے وہ مبارک ہوتا ہے"۔

یہ کہکر پوٹری اُٹھ کھڑا ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جھوٹا نام بتانے والی حورا کے الفاظِ شکریہ کو سننا نہیں چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ اس کے قدموں پر گر پڑی تھی۔

پوٹری۔ جب تک میں تمہارے لئے کوئی کمرہ علیحدہ نہ کردوں۔ اُس وقت تک یہیں رہو۔ میں تمہارے لئے کچھ ناشتہ بھیجتا ہوں"۔

اس کے بعد وہ چلا گیا اور طھوسر اپنی شائق نگاہوں سے حدِ نظر تک اُسکا تعاقب کرتی رہی۔

ایک نوکر آیا اور اس کے لئے کھانا پھل اور پانی لایا۔

طھوسر بہت بھوکی نہ تھی لیکن اُس نے بھوک ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اور پیاسوں کی طرح پانی پیا۔

نوکر کے جانے کے بعد وہ پھر سوچنے لگی۔ اُسکے نوجوان اور حسین دماغ میں سینکڑوں خلفشار پیدا کرنے والے خیالات گذرنے لگے۔ کبھی تو وہ ایک کنواری لڑکی کے احساس کے

ساتھ اپنی اس حرکت پر افسوس کرتی تھی۔ اور کبھی عشق کی ماری ہوئی عورت کی طرح اس پر خوش ہوتی تھی۔

"میں پوٹری کے مکان کے اندر ہوں۔ میں اُسے روز دیکھونگی۔ اور اُس کی آواز سُنونگی۔ لیکن وہ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ شخص جس نے مجھ پر اس وقت توجہ نہیں کی۔ جبکہ میں اپنی گاڑی پر حشم و خدم کے ساتھ خوبصورت لباس اور زیورات سے ساتھ نکلی۔ وہ اس وقت مجھ پر کیوں توجہ کرنے لگا۔ جب کہ میں ایک ایسے غرضخواہ کی طرح معمولی لباس میں ہوں جس پر اُسے رحم آتا ہے!"

یہاں پہنچکر وہ ٹھیر گئی۔ اور ادھر اُدھر دیکھا۔ اس کے بعد اُس کے خیالات کی روانی پھر سے شروع ہو گئی۔ "میرے عیش و عشرت نے جو اثر نہیں ڈالا۔ وہ میری مصیبت سے ہرگز نہیں پڑسکتا۔ بہرحال غالباً میں بدشکل ہوں۔ اور نوفری محض خوشامد سے یہ کہتی ہے۔ کہ دریائے نیل کے دونوں کناروں پر تیرے حسن کا جواب نہیں! میں خوبصورت ہوں۔ لوگوں کی شائق نگاہوں نے ہزاروں بار اس کا اظہار کیا ہے۔ اور عورتوں کی حاسدانہ نگاہوں میں بھی میں نے اسے محسوس کیا ہے۔ کیا پوٹری مجھ سے محبت کر سکتا ہے یا کریگا؟ دوسرا کوئی ہوتا تو مجھے کسی لباس میں بھی پہچان لیتا۔"

ان خیالات نے طھوسر کا جی چھوٹا کر دیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد اسے ڈھارس آئی۔ اور اُس نے سوچا کہ پوٹری کے سخت دل کو رام کرنے میں اس کا تمام حسن اور جوانی اور محبت خرچ ہو جانا چاہیے۔ اُسے اسقدر دلچسپ اور مائل اور مفتون ہونا چاہیے۔ اور اپنے سنگار میں اس قدر نازو ادا کا اظہار کرنا چاہیے۔ کہ پوٹری کی بے توجہی کسی طرح بہت دنوں تک نہ قائم رہ سکے۔ اس کے بعد وہ اُس پر ثابت کر دیگی۔ کہ یہ معمولی ملازم اعلےٰ طبقہ کی ہے جس کے بہت سے غلام اور جائداد اور مکانات ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس کے بعد ایک خیالی زندگی شروع ہوگی۔ جو انتہائی مسرت کیساتھ مدت العمر قائم رہیگی۔

اُس نے کہا "سب سے پہلے تو مجھے اُس کے سامنے حسین بن جانا چاہیے۔" یہ کہکر اُس نے اپنا مُنہ دھویا۔ گلا اور بازو صاف کئے۔ اور چند کنول کے پھول آراستہ کئے۔ اور برآمدہ کے دروازے پر پوٹری کا انتظار کرنے لگی۔ طھوسر نے دلی مسرت کے ساتھ اس دلفریب منظر کا تصور کیا جو اُس کے پیش نظر تھا۔ اور سوچا کہ اس خوبصورت مکان میں پھولوں کی مہک میں محبوب ہو کر رہنا نہایت ہی دلچسپ ہوگا۔

پوٹری دن کی گرمی کو اپنے کمرے میں گذارنے کے لئے پھر واپس آیا۔ طھوسر چند قدم آگے بڑھی۔ لیکن اُس نے روک کر کہا۔

"حورا تم نے مجھ سے کہا تھا۔ کہ تم بین بجا سکتی ہو۔ اچھا لو یہ چھوٹی سی بین لو۔ اور مجھے کوئی پُرانی خوشگوار راگ سُناؤ۔"

جس کا اُتار چڑھاؤ بہت تیز نہ ہو۔ نیند خوشگوار خوابوں سے معمور ہوتی ہے۔ بشرطیکہ نغمہ و سرود سے اسکی خدمت کی جائے"۔

اسقف اعظم کی لڑکی نے بین ہاتھ میں لی۔ اور ایک قدیم مصری راگ چھیڑا۔ جس میں کسی موہوم اور مغموم پچھلی سرگذشت کا تذکرہ تھا۔ اس کے الفاظ خوشگوار اور موثر تھے۔

پوٹری "حقیقت یہ ہے۔ کہ تم نے مجھ سے اپنی نہایت ہی معقول تعریف کی۔ تم تو خوشگوار نغمے ماہر مغنیوں کی طرح جانتی ہو۔ تمہاری صورت بھی اب وہ نہیں معلوم ہوتی۔ جو میں نے اس سے پہلے دیکھی تھی۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُس عورت کی آڑ میں ایک دوسری عورت چھپی ہوئی تھی جس طرح پردہ کی آڑ میں روشنی چھپی رہتی ہے۔ سچ بتاؤ تم کون ہو؟"۔

طھوسر (غلط بیانی سے) میں حورا ہوں۔ کیا میں نے اپنا قصہ آپ سے پہلے ہی نہیں کہہ دیا ہے؟ اس کی کیا ضرورت ہے۔ کہ اگر میں غریب ہوں تو شکل و صورت بھی بری ہو؟ لیکن کیا میرا نغمہ و سرود نہیں بھلا معلوم ہوتا ہے؟"

پوٹری۔ "ہاں وہی راگ پھر چھیڑ دو۔ یہ میرا دل لبھاتا ہے اور مست کرتا ہے۔ میں التجا کرتا ہوں کہ اسے پھر چھیڑ دو۔ یہانتک کہ مجھے نیند آجائے۔ اور میری آنکھیں بند ہو جائیں"۔

پوٹری بہت جلد سو گیا۔ طھوسر دیر تک غور و فکر میں غلطان و پیچان رہی۔ اور پھر اُس کی خاموشی سے کچھ ہمت بڑھی۔ اور اس کے حسن نے ایک شوق پیدا کیا۔ طھوسر نے ہاتھ سے اپنا کلیجہ دبا لیا۔ اور اس کے چہرہ پر بوسہ دیا۔ اور پھر شرم اور خوف سے پیچھے ہٹ آئی۔

سونے والے نے نیم خوابی کی حالت میں طھوسر کے گرم اور ملائم ہونٹ کو محسوس کیا۔ اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ اور اپنے جسم کو حرکت دی۔ اور طھوسر نے یہ الفاظ سنے:۔ راحیل! اُف راحیل سب سے زیادہ پیاری راحیل" لیکن یہ الفاظ عبرانی زبان کے تھے جس سے مصری لڑکی بالکل ناآشنا تھی۔ اس لئے اُس نے پروں کا ایک پنکھا لیا۔ اور امید و بیم کی حالت میں اپنے محبوب سونے والے پر ہلانے لگی۔ کہ وہ جلد بیدار ہو کر اُس سے گفتگو کریگا۔

باب (۷) ہفتم

فرعون کا تحفہ

طھوسر کے فرار کے روز جب دن چڑھ آیا۔ تو نوفری جو اپنی مالکہ کے پائین ایک کھٹولے پر سو رہی تھی بیدار ہوئی۔ اور اُسے سخت حیرت تھی کہ روزمرہ کی طرح آج وہ دستک دیکر کیوں نہیں طلب کی گئی۔ اُس نے سر اُٹھایا۔ اور دیکھا کہ اُس کی مالکہ کا بستر خالی پڑا ہوا ہے۔ طھوسر ہمیشہ بستر سے اُٹھنے کے پیشتر اپنی ملازمہ کی مدد سے کپڑے پہنا کرتی تھی

اور بال سلجھا کر خوشبودار پانی لیا کرتی تھی۔

نوفری نے برآمدے اور باغات اور تہ خانوں میں تلاش کیا۔ اور اس کے بعد بدحواس ہو کر سارے محل میں شور مچانے لگی۔ طھوسر کا قطعاً کہیں پتہ نہ تھا۔ ایک قدیم ملازم محل کے باہر جانے والے ریگستانی راستوں پر نقشِ قدم کی شناخت کرنے لگا۔ اس چھوٹے پیر کا ایک ہلکا نشان نظر آیا۔ آخر کار یہ پورے طور پر معلوم ہو گیا۔ کہ طھوسر کس راستے گئی ہے۔ لیکن گھاٹ پر کچھ پتہ نہ چلا جس کشتی پر وہ گئی تھی۔ اُس کا کشتی بان واپس نہیں آیا تھا۔ دوسرے کشتی بان سو رہے تھے۔ اور کہنے لگے۔ کہ انھوں نے کچھ نہیں دیکھا یا سُنا صرف ایک نے یہ کہا کہ ایک عورت پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے جو بظاہر ادنٰے طبقہ کی معلوم ہوتی تھی علی الصباح دریا پار ممنونیا کی طرف گئی ہے۔ اس کی غرض یقیناً رسوم تجہیز و تکفین کی ادائیگی ہو گی۔ اس سے خوش پوش طھوسر کا شبہ نہیں ہوتا تھا۔ اور اسی لئے نوفری اور دوسرے ملازمین قدیم بہک گئے۔ اور مایوس اور غمگین گھر واپس آ گئے۔ ملازمین اور غلام نہایت ہی بیکسی کی حالت میں زمین پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور ایک ہاتھ سر پر رکھ کر اور دُوسرا آسمان کی طرف سر اٹھا کر غمگین لہجہ میں ایک ساتھ کہہ رہے تھے۔ "ہائے قسمت! ہمارے مکان کی مالکہ ہم سے چھوٹ گئیں۔"

سوہیم (ایک قدیم ملازم) "اوسِس کی قسم مَیں اُنھیں تلاش کراؤنگا۔ چاہے مجھے دُنیا کے اُس پار تک جانا پڑے۔ میری بیوی نہایت ہی نیکدل تھیں۔ ہمیں بکثرت کھانا ملتا تھا۔ اور نہ زیادہ کام لیا جاتا تھا۔ اور نہ مار پڑتی تھی۔ اُن کا نازک پیر ہمارے کندھوں پر بھاری نہ تھا اور اُن کے گھر میں غلام اپنے کو آزاد سمجھتا تھا۔"

دیگر ملازمین مرد و عورت سر جھکا کر چلانے لگے۔ "ہائے قسمت! ہائے قسمت!!!"

نوفری (آبدیدہ ہو کر) "افسوس! اے پیاری بیوی خدا جانے اس وقت تم کہاں ہو۔ شاید کسی جادوگر نے تمہیں جادو کے زور سے نکال لیا ہے۔ اب شاید تمہیں اپنے والد تقفاعلم پیٹامونات کی ممی دیکھنا نصیب نہ ہو۔ اور اس کا وہ درجہ تمہیں نہ مل سکے۔ جس میں تمہارے لئے قبر بنائی گئی ہے۔"

سوہیم۔ نوفری! اس طرح بیقرار نہ ہو۔ ہمیں اسقدر جلد مایوس نہ ہو جانا چاہیئے۔ ممکن ہے کہ طھوسر جلد واپس آ کر ہم سے ملیں۔ وہ کسی ایسے خیال میں مست ہو گئی ہیں جسکا ہمیں علم نہیں اور ہم جلد دیکھینگے۔ کہ وہ مُسکراتی ہوئی اور بشاش پھول ہاتھ میں لئے ہوئے آ رہی ہیں۔"

نوفری نے آنسو پونچھے اور اس امید پر خاموش ہو رہی کہ شاید ایسا ہی ہو۔ سوہیم بیٹھ گیا۔ اور اپنا سر دونوں ہاتھوں کے بیچ میں رکھ کر غور کرنے لگا۔ اُس کا گندمی رنگ کا چہرہ

اور حلقہ دار آنکھیں اور ابھری ہوئی رخسار کی ہڈیاں عجیب و غریب معلوم ہو رہی تھیں۔ بالآخر اس کے حسن غرور و خوص نے نتیجہ کا نوفری کو اسقدر بیچینی سے انتظار تھا۔ وہ یہ تھا:۔

"نوفری اپیٹا مونات کی لڑکی کو عشق ہو گیا ہے"

نوفری (اس غرور کے ساتھ کہ اپنی مالکہ کے دل کی بات صرف وہی جان سکتی ہے) "یہ تم سے کس نے کہا؟"

سوہیم "کہا تو کسی نے نہیں لیکن طھوسر نہایت حسین ہے اس نے دریائے نیل کے سالانہ اوتار چڑھاؤ کو سولہ بار دیکھا ہے۔ اور سولہ عیش و عشرت کی علامت ہے۔ اس طرف کئی بار اس نے اپنے مغنیوں کو بے وقت طلب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے مضطرب دل کو سکون دینا چاہتی تھی۔"

نوفری "تم ٹھیک کہتے ہو۔ اور تمہارے معمر دماغ میں کچھ عقل بھی ہے لیکن تمہیں عورتوں کا حال کیسے معلوم ہوا؟ تم تو صرف باغ میں آبپاشی کرتے رہے۔ اور ادھر کی چیز اٹھا کر ادھر کرتے رہے۔"

بڈھا غلام مسکرایا اور اپنے جی میں کہنے لگا۔ کہ میں ہمیشہ یونہی بڈھا نہیں رہا ہوں۔ اور نہ تمام عمر قید اور غلامی میں گذری ہے۔

سوہیم کی تجویز سے نوفری کو ذرا سمجھ آئی۔ اور اسے فوراً حسین احموسس فرعون کی فوج کے افسر کا خیال ہوا۔ چونکہ وہ اسے خود چاہتی تھی۔ اس لئے اس نے سمجھا کہ اس کی بیوی بھی اسے چاہتی ہوگی۔ اس نے مناسب حال کپڑے پہنے اور فوجی افسر کے مکان کی طرف روانہ ہوگئی۔ اور دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھی۔ کہ وہاں اسے پیاری طھوسر ضرور مل جائیگی۔

نوجوان فوجی افسر نوفری سے واقف تھا۔ اور اسے آتے دیکھکر سلام کے لئے ہاتھ اٹھایا اور خوشی کا اظہار کیا۔ اسے خیال ہوا۔ کہ نوفری طھوسر کے پاس سے کوئی پیام لائی ہوگی۔ گو طھوسر کبھی اس کی طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی لیکن جس شخص کو خدا نے مردانہ حسن عطا کیا ہو۔ وہ نہایت آسانی سے یہ خیال کریگا۔ کہ تمام عورتیں اس کی پرستش کرتی ہیں۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا۔ اور نوفری کی طرف بڑھا جس کی مضطرب نگاہیں کمرے کے چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

احموسس (نوفری کو خاموش اور متفکر دیکھکر) "کہو کہاں چلیں۔ مجھے امید ہے کہ تمہاری مالکہ بخیریت ہونگی۔ ہاں میں نے انہیں فرعون کی واپسی کے وقت دیکھا تھا۔"

نوفری۔ اگر میری مالکہ بخیریت ہیں تو تمہیں معلوم ہوگا کیونکہ تمام مصر میں یہ خبر مشہور ہے کہ وہ بلا اطلاع کے مفرور ہوگئی ہیں۔ اور میں ہاتھر کی قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں۔ کہ انکی جائے پناہ تمہیں معلوم ہوگی۔"

احموسس (تعجب سے) مفرور ہوگئیں؟ ..... اپنے

گھر سے بھاگ گئیں، کیا کہتی ہو؟"

نوفری۔ میرا خیال تھا۔ کہ وہ تم سے محبت کرتی تھیں۔ لڑکیوں کو اکثر خبط ہو جایا کرتا ہے۔ اور خواہ اُن کی کسی قدر داشت و پرداخت کی جائے۔ اور خواہ کتنی ہی امیر کبیر ہوں۔ ان کا سر بہت جلد پھر جاتا ہے۔ لیکن کیا وہ واقعی یہاں نہیں ہیں؟"

احموسس۔ اُن کی جائے پناہ کو صرف دیوتا ہی جان سکتے ہیں جو عالم الغیب ہیں۔ وہ یہاں نہیں آئیں۔ لیکن اگر تم چاہو تو میرے مکان کے تمام کمرے دیکھ سکتی ہو۔"

نوفری۔ احموس مجھے تمہارا اعتبار ہے۔ اور اب میں واپس جاتی ہوں۔ اگر طوسر یہاں ہوتیں تو تم اُن کی وفادار نوفری سے نہ چھپاتے۔ کیونکہ میں اپنی پیاری بیوی کی محبت میں اور ہر کام میں مدد کرنا اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔"

اب نوفری اور زیادہ پریشان حال ہو کر مکان واپس آئی۔ اسے اندیشہ ہوا کہ کسی غلام نے طوسر کو قتل نہ کر دیا ہو۔ شاید دولت کی لالچ میں کسی نے اُس کی جان لے لی ہو....

ادھر فرعون خود حسین طوسر کا تصور کر رہا تھا۔ اور غور و فکر میں غلطاں پیچاں تھا۔ اپنے مذہب کے مطابق رسوم شرعی ادا کرنے کے بعد وہ حرم کے بیرونی صحن میں بیٹھ گیا۔ اور ایک خوشگوار خواب دیکھا۔ ایک بڑے فوارے کے حوض میں پھولوں کا تاج پہنے ہوئے چند عریاں لڑکیاں اپنی شوخیوں سے اُس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کیونکہ اپنی واپسی کے بعد سے فرعون نے اُن میں سے کسی کو نہیں منتخب کیا تھا۔

یہ حسین لڑکیاں بہت ہی دلفریب معلوم ہو رہی تھیں اُن کے نازک اور سڈول جسم شفاف پانی کی جھلک سے چمک رہے تھے۔ اور رنگین ستون اس پانی پر عکس فگن تھے۔ یہ تمام منظر نیلگوں آسمان سے آنے والی خالص روشنی سے منور تھا۔

اس کی محل خاص انیسی اور طویہ پیرتے پیرتے تھک گئیں اور پانی سے باہر نکل آئیں۔ اور فوارے کے کنارے جھک کر اپنے بال دھوپ میں سوکھنے کے لئے کھول دیئے لیکن فرعون کو کسی بات کی خبر نہ ہوئی۔ آج اس کی دماغی حالت ایسی نہ تھی کہ کسی بات سے خوش ہو۔ اُس نے ان سب کو وہیں چھوڑا اور اپنے سنگ مرمر کے بنے ہوئے کمروں کی طرف چل کھڑا ہوا۔ ان میں سے ہر کمرہ پتھر کے بڑے بڑے دیو پیکر ٹکڑوں سے بنا ہوا تھا۔ اور ہر کمرے میں پتھر کے دروازے لگے ہوتے تھے۔ جنہیں بغیر اصل راز جانے ہوئے کوئی انسانی طاقت نہیں کھول سکتی تھی۔ ان کمروں میں فرعون کی دولت اور مفتوح اقوام سے چھینا ہوا مالِ غنیمت محفوظ تھا۔

اس میں ڈھلے ہوئے جواہرات کے زیور اور سونے چاندی کے تاج رکھے ہوئے تھے۔ اور نادر ہیروں کے

سینہ بند اور بالیاں طوق اور کڑے اور کمر بند اپنی اپنی جگہ پر محفوظ تھے۔ اور بیش قیمت لکڑی کے صندوقچے اور ملباقوں میں ریشم اور شتر مرغ کے پر اور ہاتھی دانت اور سونے اور دوسری قیمتی دھاتوں کے برتن اور اُس زمانے کے بہترین صناعوں کی بنائی ہوئی تصویریں رکھی ہوئی تھیں۔

ہر کمرہ میں سے فرعون نے قیمتی تحائف انتخاب کئے اور پالکی میں جمع کر کے دو مضبوط غلاموں کے کندھوں پر رکھوائے۔ اس کے بعد طمافت کو بلایا جو طوسر کا تعاقب کرنے گیا تھا۔ اور اُسے ان قیمتی تحائف کی پالکی کو سپرد کر کے حکم دیا۔ "انہیں استف اعظم پیٹا موناف کی لڑکی طوسر کے مکان پر لیجاؤ۔ اور کہو کہ یہ فرعون نے بھیجے ہیں۔"

طمافت ان تحائف کو لیکر چلا اور ایک شاہی کشتی میں بیٹھکر دریائے نیل کو عبور کیا۔ اور بہت جلد طوسر کے مکان پر پہنچگیا۔ اور شاہی حکم سنایا۔ ان بیش بہا تحائف کو دیکھ کر نوفری کو غش آجانے والا تھا۔ لیکن بڑی دقت سے اُسنے اپنے کو قابو میں رکھا۔ اُس کے دماغ میں خوف و استعجاب کے منتشر خیالات چکر لگانے لگے۔ غالباً خوف ان خیالات پر غالب تھا۔ کیونکہ اُس نے سوچا کہ اگر بادشاہ کو یہ معلوم ہوا کہ طوسر مفرور ہوگئی ہے اور کسی نے اُسے جاتے ہوئے نہیں دیکھا۔ تو وہ جس آزادی سے اس وقت تحائف بھیج رہا ہے اُسی آزادی سے موت کا بازار گرم کر دیگا۔ اور یہ بات چھپائے نہیں چھپ سکتی۔۔۔۔

نوفری (لرزکر) "طوسر یہاں سے چلی گئی ہے اور اپنا گھر چھوڑ دیا ہے۔ اور میں قسم کھاتی ہوں۔ کہ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کہاں گئی ہے۔

طمافت۔ "فرعون" امن را کے چاہتے نے یہ تحائف بھیجے ہیں۔ میں انہیں قصر شاہی کو پھیر کر نہیں لے جا سکتا۔ انہیں اُس وقت تک محفوظ رکھو جبتک کہ طوسر واپس نہ آئے یا اُس کا پتہ نہ چلے۔ تم میری طرف سے اس کی ذمہ دار ہو اور اگر ذرا بھی خلاف ورزی کی۔ تو تمہاری جان کی خیریت نہیں ہے۔ ان تحائف کو کسی کوٹھری میں مقفل کر دو۔ اور چند وفادار ملازمین اس کمرے کی نگرانی پر معین کر دو۔" لیکن جب وہ واپس آیا۔ اور فرعون کے قدموں پر گر کر سارا ماجرا بیان کیا تو فرعون غصّہ سے بیقرار ہوگیا۔ اور اپنا عصائے شاہی اس زور سے زمین پر مارا کہ جس پتھر پر کھڑا تھا وہ چور چور ہوگیا۔

باب ہشتم

"پوٹری رات کو کہاں جاتا ہے؟"

ادھر طوسر کو نہ اپنی وفادار نوفری کا خیال تھا۔ اور نہ اس کی فکر تھی۔ کہ اُس کی عدم موجودگی نے گھر کے آدمیوں کو کس قدر پریشان کیا ہوگا۔ پیاری بیوی پر جیسے کسی نے جادو کر دیا تھا کہ وہ یکایک ثیبہ میں اپنا خوبصورت مکان اور اپنے ملازمین

کپڑے اور حتیٰ کہ جواہرات بھی بھول گئی۔ گویا ایک عورت کے لئے جواہرات کی فراموشی غیر قابلِ یقین ہے۔ پیٹا توناف کی لڑکی کو فرعون کے عشق کی بالکل خبر نہ تھی۔ اُس نے فرعون کی وہ شائق نگاہیں نہیں دیکھی تھیں جو اس کی صورت دیکھنے کے بعد اب دُنیا میں کسی چیز سے دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔

اس وقت وہ پوٹری کے مکان میں بیٹھی ہوئی چرخہ کات رہی ہے۔ کیونکہ پوٹری نے یہی کام اس کے سپرد کیا ہے۔ اور اپنے جدید آقا کی تمام حرکات کو دزدیدہ اور شائق نگاہوں سے دیکھ رہی ہے۔ وہ خاموشی کے ساتھ محض پوٹری کے قرب کی مسرت کے مزے لے رہی تھی۔ اگر پوٹری اُسکی طرف بغور دیکھتا۔ تو وہ اس کی آنکھوں کی نمی، اور چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور دل کی تیز حرکت پر متعجب ہوتا۔ لیکن وہ لکھنے کی میز پر بیٹھا ہُوا تھا۔ کیا پوٹری طہوسر کے عشق کو تاڑ گیا تھا؟ اور کیا وہ کسی خفیہ اسباب سے اس انکشاف کو چھپا رہا تھا؟ طہوسر کی طرف اُس کا رویہ خوش کن تھا۔ لیکن متانت لئے ہُوئے اور یہ بات صاف صاف ظاہر ہوتی تھی۔ کہ وہ راز و نیاز کی اجازت نہیں دینا چاہتا تھا۔

تاہم فرضی حورا نہایت حسین تھی۔ اُسکی ادائیں اس کی وضع کی سادگی اور کم مائگی سے اور بھی دلفریب ہوگئی تھیں۔ اگر وہ بیش قیمت لباس پہنے ہوتی تو اُس کے چہرے اور جسم کا حسن دب جاتا۔ دِن میں شدید گرمی کے وقت جبکہ چلچلاتی ہوئی دُھوپ زمین پر جھلکتی ہوتی تھی۔ اُس وقت اُس کے گرد دلفریبی کا ایک حلقہ کھنچ جاتا تھا۔ اس کے خوبصورت نیم باز ہونٹوں پر عشقیہ الفاظ اس طرح لرز رہے تھے۔ جیسے کوئی طائر پرواز کے لئے بے چین ہو۔ وہ اکثر چپکے چپکے یہ کہا کرتی تھی۔ "پوٹری میں تجھ سے بے انتہا محبت کرتی ہوں" لیکن اس کے الفاظ کوئی سُن نہیں سکتا تھا۔

یہ فصل کٹنے کا وقت تھا۔ اور پوٹری اپنے کام کا معائنہ کرنے چلا۔ طہوسر سر جھکائے ہُوئے اس کے پیچھے ہولی۔ لیکن پوٹری نے کہا:۔ "رنج اور فکر دُنیا کے پرسکون کاموں میں بہل جاتا ہے۔ اچھا آؤ اور اس درخت کے سایہ میں بیٹھکر چرخہ کاتو"

طہوسر نے ادب کے ساتھ تعمیل کی۔ اور فصل کاٹنے کی مشقتوں کو دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے محبوب نے اُسے مخاطب کیا اور کہا:۔ "اخاہ حورا کیا اس منظر سے تمہیں دلچسپی ہے؟ یہ کھلی ہوا اور کھیتوں کی تفریح ہے۔ تھیبہ کی طرح ہم لوگ یہاں گانے بجانے والے اور شہر کی اور دلچسپیاں نہیں رکھتے۔ لیکن اب جاؤ ذرا سب کے ساتھ کچھ ناشتہ کر لو۔ مجھے کچھ حسابات تیار کرنے ہیں۔"

طہوسر نے سلام کیا اور رخصت ہوگئی۔ جس بڑے کمرے میں پوٹری کے ملازمین کے لئے کھانا چنا گیا تھا۔ اُس میں غپ شپ اور معمولی عیب جوئیاں ہو رہی تھیں۔

ایک لڑکی۔ (شرارت سے) ہمارے مالک روز رات کو کہاں جاتے ہیں"

دوسری لڑکی۔ "اُن کا جہاں جی چاہتا ہے جاتے ہیں۔ کیا تم کوئی قاضی ہو؟ یہ تو یقینی ہے۔ کہ تمہارا اُن پر کوئی اثر نہیں ہے۔

پہلی لڑکی۔ "کیوں یہی حالت یہاں سب کی ہے۔ خود حورا جو ہم سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اُن پر کوئی اثر نہیں رکھتی۔ گو اُن کا نام مصری ہے۔ اور وہ فرعون کے ملازم ہیں۔ تاہم وہ اسرائیل کی نسل سے ہیں۔ اور رات کے وقت یقیناً اسرائیلیوں کی قربانیوں میں شرکت کرنے جاتے ہوں گے"

طھوسر چپکے سے نکل کھڑی ہوئی۔ دو گھنٹہ بعد پوٹری اپنے مکان سے روانہ ہوا۔ اور طھوسر سایہ کی طرح خاموشی سے اُس کے پیچھے ہولی۔ (باقی آئندہ) (م۔ ص)

تابانیِ شفق

نجاتِ دائمی ہے مصیبت پر رو کے مرجانا ۔۔۔ یہ وہ دریا ہے جس میں ڈوبنا بھی ہے اُبھر جانا

کسی کے جستجو میں حد امکاں سے گذر جانا ۔۔۔ اسی کو اصطلاحِ عام میں کہتے ہیں مرجانا

دیارِ حسن میں پائے نگہ ٹھوکر نہ لگ جاتے ۔۔۔ رُخِ محبوب تک جانا تو رُشتہ دیکھ کر جانا

وہی جلوہ نما ہے کعبہ و دیر و کلیسہ میں ۔۔۔ جب اے دل یہ نظر آئے تو پھر چاہیے جدھر جانا

مری مسلک میں ہے خوف و رجا اک جزو ایمانی ۔۔۔ نڈر ہونا اب اس کو کوئی سمجھے خواہ ڈر جانا

طریقہ کوئی جینے کا ہمیں بھی اے فلک بتلا ۔۔۔ اُنہیں تو آگیا ہے عہد کرنا اور مکر جانا

شفقؔ آمادۂ مرگ و مہیائے قضا ہو کر
رہِ اُلفت میں رہزن کو بھی ہم نے راہبر جانا

شفقؔ



جناب سدرشن
مگر
جناب سدرشن کی تحریریں ان دونو خوبصورتیوں سے
آراستہ ہے
مصنف کی دیگر کتب
بک ڈپو - لاہور


وہ کتابیں
جن کا مطالعہ ہر ایک اردو داں
پر فرض ہے۔

ہر ایک کتاب ۳/۴ قیمت میں

... ان کو ہر ایک کتاب تین چوتھائی قیمت پر دی جائیگی۔ اس کے ...
... ہر ایک کتاب تیار ہوتے ہی آپ کی خدمت میں بھیج جائیں گی۔

قواعد خریداری

... داخلہ دینا ہوگا۔ ۲۔ ... خریداری ...
... تین چوتھائی قیمت ... ۳۔ ہر ...
... کتاب کے ... قیمت سے مطلع کیا جائے ...
... دینے پر ان کی خدمت میں کتاب نہیں بھیجی جائے گی۔ مگر ...
... سکتا ہے۔ ...
... دیا جائے گا۔
... اصحاب خریدار رہیں گے۔ ... نقصان کی تلافی ... کر دیں۔

شائع شدہ کتب

اس وقت تک جو کتب اس سلسلہ میں شائع ہو چکی ہیں ...

[illegible]
[illegible] تاریخ
[illegible] مضامین و مقالات شائع ہوتے ہیں
[illegible] کے گوشہ گوشہ کی وسعت پر [illegible]
[illegible] کے تجلیات و انکشافات کا ذکر
[illegible] کے عنوان سے ہر مہینہ کی تصنیفات و
[illegible] تبصرہ میں عربی، فارسی اور انگریزی
[illegible] کا خلاصہ ہوتا ہے۔ دیباچہ میں اساتذہ
[illegible] اور آثار علمیہ و ادبیہ میں اکابر و مشاہیر کے
[illegible] اوراق کہنہ کے زیر عنوان اردو کے قدیم
[illegible] ہوتا ہے۔ لکھائی چھپائی کاغذ اعلیٰ
[illegible] صفحے، قیمت پانچ روپے۔

منیجر دار المصنفین اعظم گڑھ

الناظر

[illegible] جناب مولانا
[illegible] ہے۔ اور آپ ہی
[illegible]

[illegible]
[illegible] سے [illegible]
[illegible] ہندوستان کی ۲۲ [illegible]
[illegible] گئی ہیں [illegible]
[illegible] سادہ، خوشنما، چھپا کے [illegible]
سے درج کئے جاتے ہیں اور جو [illegible]
میں اشاعت پذیر ہے۔ لکھائی چھپائی [illegible]
سب اعلیٰ ہے چندہ حسب ذیل [illegible]
اشتہار دینے کے لئے اس سے بہتر [illegible]
کا پرچہ مفت منگا کر ملاحظہ فرمائیے

[illegible]	ممالک [illegible]	قسم خریداران صاحبان
[illegible]	[illegible]	شرح
[illegible]	[illegible]	چندہ

پتہ۔ منیجر رسالہ [illegible] دہلی

زمانہ

مشہور و معروف ماہوار ادبی رسالہ ہے جو [illegible]
[illegible] صاحب نگم بی اے کی [illegible]
[illegible] ادبی، تاریخی، مستند مجموعہ
نمونہ کا پرچہ [illegible]

[illegible]

برقعہ نوایجاد

آپ کی خواتین کو اس کی ضرورت ہے

پرانی وضع کے بدنما تکلیف دہ اور ناکافی پردہ دار برقعہ بنانے میں اپنا روپیہ ضائع نہ کریں۔ انہی دام میں برقعہ نو ایجاد خرید کے خواتین کو زیب تن کرائیں۔ تاکہ وہ آرام کے ساتھ مکمل پردہ کر لیں۔

برقعہ نو ایجاد

سولہ سال سے ہندوستان کے ہر طبقہ اور ہر گوشہ کے مسلمانوں میں مقبول ہے۔ ریل کے سفر، شغل اور گاڑی کی سواری میں یکساں آرام دیتا ہے۔ ہر موقعہ اور ہر جگہ کے لئے موزوں ہے۔

آج ہی منگوائیں۔ خود ملاحظہ کریں و خواتین کو معاینہ کا موقعہ دیں۔ پسند نہ ہو واپس کر دیں۔

سفید سوتی ۔ رنگین ۔ الکپلہ ۔ چینی ریشم ۔ رنگین ریشم

[illegible]

(ناپ) کندھے سے ایڑی تک قد کی لمبائی اور سر کے دور کی ناپ۔

ترکی ٹوپیاں

ہم نے ترکی ٹوپیاں ساختہ مصر قسطنطنیہ و آسٹریا براہ راست منگوانے کا انتظام کیا ہے آپ کو شوقیہ [illegible] روانہ کر سکتے ہیں۔ ایک دفعہ منگا کر ضرور ملاحظہ کریں۔

احتاج (عہ) ۔ زوانی (للعہ) ۔ سلطانی (عہ)

ملنے کا پتہ ۔ خاتون اسٹورز ۔ نمبر ۲۱ ۔ فیض بازار دہلی

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی تیار کردہ ۱۹۲۳ء کی کافوری جنتری نہایت خوبصورت چھپ کر تیار ہو چکی ہے اگر دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک خط لکھ کر بھیج دیجئے۔ مذکورہ بالا جنتری آپ کی خدمت میں مفت روانہ کر دی جائیگی

خاص ڈاکٹر ایس کے برمن کے کیمیا خانہ کا تیار کردہ کیش راج تیل

فائدہ اور خوشبو کے لحاظ سے یہ ایک ہی تیل ہے

آجکل سینکڑوں قسم کے خوشبودار تیل بازاروں میں بکتے ہیں۔ جو ظاہری چمک دمک اور خوشبو میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں۔ مگر ان تیلوں میں وائٹ آئل عموماً جز ہوتا ہے۔ جو بجائے فائدہ کے دماغ اور بالوں کو سخت نقصان پہنچاتا ہے ایسے تیلوں کے چند روزہ استعمال سے بال بیوقت سفید ہو جاتے ہیں۔ آنکھ اور دماغ سے خاص تعلق ہے اس لئے ایسے تیل دماغ میں گرمی پہنچا کر آنکھ کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آجکل کے نوجوانوں کو بیوقت چشمہ کی ضرورت ہو جاتی ہے ان سب خرابیوں کو مد نظر رکھکر کیش راج تیل کی تیاری میں خوشبو سے زیادہ فائدہ کا خیال رکھا گیا ہے اسکے لگانے سے جڑیں مضبوط اور بال شل بھونرے کے سیاہ اور گھونگر والے ہو جاتے ہیں۔ دماغ کو ٹھنڈک اور دل کو فرحت پہنچاتا ہے قیمت فی شیشی عمر محصول الگ

ہیلک

یہ ہر قسم کے گھاؤ۔ درد۔ ہاتھ موچ۔ گانٹھ گلٹی۔ جھائی۔ مہاسہ۔ چکتہ۔ ہاتھ پاؤں کا پھٹنا۔ رکھاپن۔ بواسیر۔ آگ سے جلے ہوئے گھاؤ۔ جلن۔ چوٹ کی وجہ سے درد یا خون کا بہنا وغیرہ وغیرہ کے لئے حکمی دوا ہے۔ چوہے۔ بلی۔ مکڑی۔ برنی۔ بچھو وغیرہ کے کاٹے ہوئے جگہ سے زہر دور کرنے کے لئے ہیلک ایک شرطیہ دوا ہے۔ فٹ بال۔ کرکٹ۔ جمناسٹک کے کھلاڑیوں کے لئے ہیلک روزانہ استعمال کی چیز ہے۔ اس کے لگانے سے کسی قسم کی جلن وغیرہ نہیں ہوتی۔ زنانہ اس قسم کی تمام تکلیفوں کے دور کرنے پر ہیلک سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے ہر گرہست کو ہیلک کی ایک ڈبیہ ضرور رکھنا چاہیے۔ قیمت فی ڈبیہ ۸/ محصول الگ

ایجنٹ۔ منیجر صاحب پیسہ اخبار لاہور۔

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تارا چند دت اسٹریٹ کلکتہ

(دارالشاعت پنجاب لاہور میں باہتمام لالہ دیوان چند پروپرائٹر کے چھپا اور دارالاشاعت پنجاب کے ... سید امتیاز علی تاج پبلشر نے شائع کیا)

سالانہ قیمت چھ روپیہ

ہزار داستان

ایڈیٹر۔ حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

جلد ۲ | اشاعت ماہ مئی سنہ ۱۹۲۳ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

ایک گذارش ضروری

صفحہ ادارت کی گنجائش اس اشاعت میں میں نے جناب ایڈیٹر صاحب سے بعض ضروری امور کے اظہار کے لئے حاصل کرلی ہے۔ کیونکہ جو امور اس مرتبہ ناظرین کے گوش گذار کرنے ہیں اُن کا علاقہ دفتر ہزار داستان کے صیغۂ انتظامی ہی سے ہے۔

ہزار داستان کی اشاعت کو گیارہ مہینے گذر چکے ہیں۔ اور یہ سترھواں نمبر ہے جو دوسری جلد کے پانچویں نمبر کی صورت میں پیش نظر ہے ناظرین نے ملاحظہ فرمایا ہوگا۔ کہ جب سے رسالہ کی اشاعت بجائے پندرہ روزہ کے ماہوار ہوئی ہے رسالہ نے باعتبار مضامین کے اپنا ایک خاص ادبی معیار بنانے میں تدریجی لیکن مسلسل و نمایاں ترقی کی ہے۔ اور کر رہا ہے۔ اور ارزانی حاصلہ کی بنا پر نہیں بلکہ محض عام معصروں کی قیمتوں پر نظر کرتے ہوئے اپریل ۱۹۲۳ء سے اس کی قیمت میں دو روپے گھٹا دئے ہیں۔ معاصرین میں "معارف" کو چھوڑ کر جو ایک مخصوص معیار کا رسالہ ہے۔ بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ ہزار داستان کا کوئی رسالہ مثیل و نعم البدل نہیں لیکن ہماری کوششیں محض اسی دعوے پر ختم نہیں ہوجاتیں بلکہ اس کی ہر پہلو کی ترقی کے متعلق بہت کچھ ارادے ہیں۔ جو یوماً فیوماً انشاء اللہ عملی صورت اختیار کرتے جائیں گے۔ اضافہ حجم، نوعیت مضامین، معیار خاص اور عمدگی کاغذ وغیرہ کے اہتمام عنقریب ناظرین ملاحظہ فرمائینگے۔ کوشش تو یہی ہوگی کہ ایسے تمام امور کا احاطہ و التزام کیا جائے۔ جو ہزار داستان کے ناظرین کو ہندوستان کے ہر قسم اور ہر زبان کے رسالہ سے مستغنی کردے۔ تاہم یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور قبل از وقت بھی۔

جولائی کی اشاعت پر ایک سال ختم ہوجاتا ہے۔ اور بیشتر خریداروں کا چندہ بھی ختم ہوجائیگا۔ لہذا ایک ماہ قبل ہی یہ عرض کردینا بیجا نہ ہوگا۔ کہ جولائی کی اشاعت اُن حضرات کی خدمت میں جن کا چندہ جولائی میں ختم ہوجاتا ہے۔ آئندہ سال کے لئے ذریعہ وی پی ارسال کی جائیگی۔ جو حضرات پچھلے سال ایک سال کے لئے خریدار ہوئے اُن کے پاس ایک سال کا وی پی ہوگا۔ اور جن حضرات کا چندہ ششماہی ختم ہوتا ہے اُن کی خدمت میں چھ مہینے کی قیمت کا وی پی بھیجا جائیگا۔ ہمیں امید ہے کہ سال گذشتہ کے خریدار اپنے یکسالہ انیس مطالعہ کو واپس نہ فرمائینگے۔ اور جو حضرات کہ کسی طرح آئندہ خریدار نہ رہ سکیں اُن کو چاہیے کہ ۱۵۔ جون تک انکاری اطلاعیں دفتر ہذا میں بھیجدیں۔ تاکہ دفتر ہذا مصارف ارسال کے نقصانات سے محفوظ رہے۔ قدردانان رسالہ سے یہ بھی توقع ہے کہ وہ کم از کم توسیع اشاعت میں اعانت فرمائینگے۔

ناظرین یقیناً محسوس کرتے ہونگے کہ تصاویر کا التزام رسالہ میں نہ ہوسکا۔ لیکن اُن کو یقین فرمانا چاہیے۔ کہ ہم نے اس مسئلہ کو بالارادہ نظرانداز نہیں کردیا ہے۔ بلکہ ہمہ گیر دقتیں حائل ہیں جن کا دفعیہ بیک سعی و وقت ناممکن سا ہے۔

جولائی یعنی دوسرے سال کی پہلی اشاعت کے لئے قدیم مغل فن مصوری کا ایک رنگین مرقع "محبت کی بازی" پیش کیا جائیگا اور بہت ممکن ہے کہ اس ڈیڑھ دو ماہ کے وقفہ میں جو جولائی تک ہم کو ملے گا۔ اپنی کوششوں میں کامیاب ہوکر تہدیۂ تصویر کے سلسلہ کو التزاماً جاری رکھ سکیں۔ والسلام

خاکسار

مہتمم دار الاشاعت ادب لطیف

غم نصیب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۲۰-جولائی

تمہاری تجویز ہے کہ میں سفیر صاحب کے ہمراہ فلاں جگہ چلا جاؤں لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں کسی کے سامنے سرِ اطاعت خم کرنا! یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔ اور پھر ایسے سخت و کرخت انسان کے ساتھ تو بسر اگذارہ ایک دن بھی محال ہے۔ تم نے مجھے ترغیب دینے کا نرالا طریقہ نکالا ہے کہنے کیا ہو۔ کہ تمہاری والدہ تمہیں کسی کام میں لگانا چاہتی ہیں" خوب! اُنہوں نے شاید مجھے نکّما سمجھ رکھا ہے۔ جو اس انداز میں تلقینِ عمل کرتی ہیں۔ بھلا کھُلے بندوں پھرنا اور جو جی چاہے کرنا کوئی کام نہیں؟ پھر ہم کسی کے پیچھے لگ کر اور کوئی کام کیوں کریں؟ دُنیا کا تو دستور العمل ہی یہ ہے۔ کہ آئے دن حماقتوں پر حماقتیں کرتی چلی جا رہی ہے۔ اور وہ شخص جو محض اس وجہ سے کہ اُسے رائے جمہور کا بہت پاس و ادب ہے، کسی ذاتی خواہش یا ضرورت کے بغیر، زر و مال، نام و نمود یا اسی قسم کے کسی پیکرِ موہوم کی جستجو میں اپنی جان کھپاتا ہے ایسا شخص ایک احمق سے زیادہ عزت کا مستحق نہیں۔

۲۴-جولائی

تمہاری متواتر تاکیدیں مقتضی ہیں کہ میں مصوّری کی مشق بلاناغہ جاری رکھوں لیکن سچ پُوچھو تو تمہاری تاکیدوں کو پندِ رائگاں سے زیادہ وقعت حاصل نہیں ہُوئی۔ اور یہ میرے بس کا روگ نہیں۔

مَیں خوش ہوں، بیحد خوش ہوں، اور فطرت کی گوناگوں رنگینیوں میں اس طرح ڈوب گیا ہوں کہ ننھی ننھی ٹہنیاں اور گھاس کی ذرا ذرا سی پتّیاں بھی میرے لئے دفترِ حقیقت ہیں۔ یہ سب کچھ ہے۔ لیکن اگر قدرت کی ان بوقلموں جلوہ آرائیوں کو زیبِ قرطاس کرنا چاہوں۔ تو عاجز ہوکر رہ جاتا ہوں میرے قوائے اظہار اس حد تک معطّل ہوگئے ہیں کہ ہر چیز مجھے ایک دھُندلا دھُندلا نقاب پہنے نظر آتی ہے اور اس لئے میں کسی چیز کا ایسا صاف اور واضح خاکہ نہیں اُتار سکتا کہ اُسے ہمشکلِ اصل کہا جاسکے۔ تاہم میرا خیال ہے کہ اگر میں مٹّی یا موم کے مجسّمے بنانے پر اُتر آؤں تو مجھے ضرور ایک شاندار کامیابی حاصل ہو۔ اگر کوئی دن اور میرے دل کی یہی حالت رہی تو ضرور اس صنفِ فن میں ہنر آزمائی کرونگا۔ اور اُس

میں مہارت بہم پہنچاؤنگا۔ چاہے میری اوّلین مشقیں کیسی ہی مضحکہ انگیز ہوں۔

تین مرتبہ میں چارلوٹی کی تصویر بنانے بیٹھا ہوں اور تینوں مرتبہ میں نے اپنی بے ہنری کا پول کھول دیا ہے یہ انحطاطِ کمال میرے لئے بیحد رنج کا باعث ہے کیونکہ کبھی مجھ میں وہ جوہر تھا کہ میری تصویریں نقل مطابق اصل کا رُتبہ رکھتی تھیں۔ تاحال میں نے اُس کے چہرے کے صرف ایک رُخ کی تصویر بنائی ہے۔ اور اسی کو غنیمت سمجھتا ہوں۔

---

۲۵ - جولائی۔

ہاں اے میرے دل وجان کی مالکہ! میں تیرے ارشاد کے مطابق ہر کام انجام دُونگا۔ میری تو خواہش یہی ہے کہ تو مجھے حکم پر حکم کرے اور احکام مجبر کا تانتا باندھ دے۔ اور میں تعمیلِ ارشاد کے لئے ہر وقت بسر وچشم آمادہ رہوں مگر ایک التجا میری بھی قابلِ سماعت ہے۔ خدارا اپنے اُن گرامی ناموں کو جن سے تو مجھے گاہ بگاہ سرفراز کرتی ہے رائٹنگ سینڈ سے سامانِ تعزیر نہ بنایا کر۔ آج میں نے تیرا خط لیتے ہی ہونٹوں سے لگا لیا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ کاغذ کے اس ذراسے پُرزے میں میرے لئے اس قدر آزار کا سامان پوشیدہ ہے۔

---

۲۶ - جولائی

میں نے بارہا ارادہ کیا ہے۔ کہ ملاقاتوں کی اس بے اعتدال اکثریت میں کچھ تخفیف کروں لیکن اس ارادے کو پُورا کون کر سکتا ہے؟ ہر روز شوق دیدار کی فریب انگیز کشش مجھ پر غالب آجاتی ہے۔ اور ہر روز میں صدقِ دل سے اقرار کرتا ہوں۔ کہ کل میں یقیناً اس ارادے سے باز رہونگا۔ لیکن جب کل کا دن طلوع ہوتا ہے۔ تو کہاں کا اقرار اور کیسا باز رہنا؟ ایک ناقابلِ اندفاع کشش مجھے کشاں کشاں اُس کی جانب لے جاتی ہے۔ اور اس سے پیشتر کہ میں عقل وفکر سے کام لے سکوں۔ میں اپنے آپ کو اُس کے حضور میں پاتا ہوں۔ واقعات خود بخود میرے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ مہیا کر دیتے ہیں۔ یا تو چارلوٹی ہی رخصت کے وقت مجھ سے فرمائش کرتی ہے کہ "کل ضرور آنا"۔ اور پھر کس کا دل گردہ ہے کہ تعمیلِ ارشاد سے سرِمُو انحراف کر سکے! یا یوں ہوتا ہے۔ کہ وہ کوئی کام میرے سپرد کر دیتی ہے۔ اور پھر میں یہ اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ خود جاکر اُسے انجامِ کار سے آگاہ کردوں۔ یا قدرت ہی میرے لئے خود فریبی کا سامان بہم پہنچا دیتی ہے۔ یعنی موسم خوشگوار ہوتا ہے۔ اور میں ہواخوری کے ارادے سے جو اُٹھتا ہوں تو پھرتا پھراتا والہیم جا نکلتا ہوں۔ پھر وہاں سے چارلوٹی کا مکان کونسا کالے کوسوں پر ہوتا ہے؛ بھلا اس سحر آگین فضا

میں آکر باہر نکل جانے کی تاب و تواں کس میں ہے! آنکھ جھپکنے کی دیر میں مَیں اپنے آپ کو ملکۂ طلسم کے حضور میں پاتا ہوں۔ خدا غریقِ رحمت کرے۔ دادی امّاں ہمیں ایک مقناطیسی پہاڑ کی کہانی سُنایا کرتی تھیں۔ کوئی جہاز اُسکے قریب آیا نہیں۔ اور ایک دم میں پاش پاش ہُوا نہیں۔ لوہے کی تمام میخیں اُکھڑ کر پہاڑ کی طرف اُڑ جاتیں، اور بیچارے جہاز والے ایک ٹوٹے پھوٹے ڈھانچے پر بیٹھے رہ جاتے، جو موجوں کے تھپیڑوں سے پارہ پارہ ہو کر اُنہیں سمندر کے حوالے کر دیتا۔

۳۰۔ جولائی

البرٹ آگیا ہے اور اب مجھے اس جگہ کو خیرباد کہنا چاہیئے۔ وہ چاہے دُنیا کا بہترین اور نیکو ترین انسان ہی کیوں نہ ہو۔ اور مَیں ہر حیثیت میں اُس سے کمتر و کہتر ہی کیوں نہ ہوں۔ پھر بھی مجھ سے یہ نہیں دیکھا جاتا۔ کہ وُہ ایک ایسی بے عیب ہستی کا مالک ہو۔ مالک!۔ بس ولیم بس اب اُس کا منگیتر یہاں آگیا ہے۔ اور ایک میان میں دو تلواروں کا سمانا مشکل ہے۔

وہ یوں تو ایک شائستہ اور خوش خُلق آدمی ہے جو اپنے حُسن سلوک سے دوست و دشمن ہر ایک کے دل میں گھر کر لیتا ہے۔ لیکن رقابت کے اس فتنہ پرداز خیال کو کیا کروں۔ جو میرے اور اُس کے درمیان ایک سنگِ راہ کی طرح حائل ہے۔ یہ میری خوش قسمتی سمجھو۔ کہ مَیں ان دونوں کی ملاقات کے موقع پر حاضر نہ تھا۔ ورنہ میرا دل ضرور ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا ہوتا۔ اگرچہ وہ اس قدر معاملہ فہم واقع ہُوا ہے۔ کہ کیا مجال جو اُس نے میری موجودگی میں کوئی ایسا فعل کیا ہو۔ جس سے میرے دل میں رشک و حسد پیدا ہو سکے۔ خدا اُسے اس کے عوض میں اجرِ جمیل عطا کرے! وہ چارلوٹی سے کچھ ایسے ادب و احترام کے ساتھ پیش آتا ہے کہ مجھے خواہ مخواہ اُس کی عزّت کرنا پڑتی ہے۔ وہ بھی مجھ سے عزّت کا سلوک کرتا ہے لیکن مجھے شک ہے کہ اس عزّت کے سلئے مَیں خود اُس کی نیک طبعی کا اسقدر مرہونِ منّت نہیں۔ جس قدر کہ چارلوٹی کی مصلحت اندیشی کا ممنون ہوں۔ عورتیں ایسے معاملات میں مہارتِ تامہ رکھتی ہیں۔ اور یہ ایک مفید مطلب وصف ہے۔ وہ ہمیشہ دو مخالف رقیبوں کو باہم شیر و شکر نہیں رکھ سکتیں لیکن اگر کبھی وہ اس مقصد میں کامیاب ہو جائیں۔ تو اس میں خود ان کا فایدہ ہے۔

میرے دل میں البرٹ کی عزّت روز بروز زیادہ ہوتی جارہی ہے۔ اُس کے مزاج کی پُر سکون ہمواری اور میری شورش طبعی میں، جسے مَیں ہزار چاہوں پھر بھی چھپا نہیں سکتا، زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اُس کا دل نازک جذبات اور لطیف حسیّات سے مملو ہے۔ اور وہ نہ دل سے

اس گنجینۂ بے بہا کی قدر کرتا ہے۔ جو خوش قسمتی نے اُس کے قبضہ میں دیدیا ہے۔ علاوہ بریں اُس کی طبیعت میں بدمزاجی کا شائبہ تک نہیں جس سے تم جانتے ہی ہو کہ مجھے بیحد نفرت ہے۔

وہ مجھے ایک ذی ہوش اور فہمیدہ آدمی خیال کرتا ہے اور وہ اُلفت و دلبستگی (محبت) جو مجھے چارلوٹی سے ہے اُس کی کامرانی کے لئے ایک طرۂ افتخار ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ شاید وہ کبھی کبھی چارلوٹی کے نازک دل کو رشک آلود افعال و اقوال سے صدمہ بھی پہنچاتا ہو۔ مجھے یقین ہے۔ کہ اگر مَیں اُس کی جگہ پر ہوتا تو مَیں تو ہرگز یہ دعوے نہ کرسکتا کہ میرا دل رشک آمیز جذبات سے یکقلم مبرا ہے۔ کیونکہ یہ دعوے تو کسی نیک و پاک فرشتہ ہی کو زیبا ہے۔ ایک انسان یہ کتنا بھلا نہیں لگتا۔

بہرحال حقیقت یہ ہے کہ عیش و طرب کے وہ لمحاتِ زرّین جو مَیں آرزوؤں کے خوابستان میں گذارا کرتا تھا۔ اب ختم ہو چکے ہیں۔ اور لطفِ حیات مجھے ایک افسانہ سا معلوم ہوتا ہے تم اسے حماقت کی حد کہو، یا شوریدہ سری کی انتہا، امر واقعہ یہ ہے کہ مَیں نے اپنے ہاتھوں خود کو گرداب بلا میں گرفتار کیا ہے۔ البرٹ کے آنے سے پہلے ہی مجھ پر اپنی محبّت کا انجام روزِ روشن کی طرح واضح تھا۔ مَیں جانتا تھا کہ مجھے چارلوٹی کی آرزو کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ اور نہ کبھی مَیں اپنے مدّعائے دل کو زبان پر لایا۔ مَیں نے دل پر اُسی قدر ضبط کیا۔ جس قدر کہ ایک انسان اس عالمِ آشوب حسن و جمال کے رُوبرو اپنے جذبات و خواہشات کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ اور اب دیکھو تو صورتِ حالات کا نقشہ ہی کچھ اور ہو گیا ہے۔ مَیں ایک بُتِ بیجس کی طرح "صُمٌّ بُکمٌ" کھڑا اپنی آرزوؤں کے سبز باغ کو اُجڑتے دیکھ رہا ہوں کوئی شخص کہیں سے آتا ہے اور دن دہاڑے مجھے لوٹ لیتا ہے میری بےبسی دیکھو۔ کہ مَیں اُس کے خلاف ہاتھ تک نہیں اُٹھا سکتا۔

مَیں غم و غُصّہ سے اپنے ہونٹ چباتا ہوں۔ اور اُن لوگوں کی طرف سے بکمال حقارت مُنہ موڑ لیتا ہوں۔ جو مجھے رضا بقضا کی تعلیم دیتے ہیں۔ اور قسمت کی خودسری کے قصّے سُنا کر میری ڈھارس بندھانا چاہتے ہیں۔ اس قسم کی احمقانہ تدبیریں مجھ پر کچھ اثر نہیں کرسکتیں۔ اور مَیں ہمیشہ اُنہیں پائے حقارت سے ٹھکرا دیا کرتا ہوں۔

مَیں جنگلوں اور ویرانوں میں دیوانہ وار پڑا پھرتا ہوں اور جب مَیں واپس آ کر چارلوٹی اور البرٹ کو باغ میں دوش بدوش بیٹھے دیکھتا ہوں۔ تو یہ منظر مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ مَیں ایک ہوش باختہ احمق کی طرح بات بات پر بگڑ بیٹھتا ہوں، اور نہ معلوم کیا کیا زیادتیاں مجھ سے سرزد ہوجاتی ہیں۔ آج چارلوٹی مجھ سے کہنے لگی: "خُدا کے لئے کل کی طرح پھر کبھی نہ کیجئے گا۔ آپ تو اپنے زہریلے غُصّے سے میری جان ہی نکال

لیتے ہیں؟ تم جانتے ہو کہ مجھے اُس کی خاطر کس قدر منظور ہے اس لئے میں ہمیشہ احتیاط برتتا ہوں۔ کہ جب وہ اکٹھے ہوں میں اُن کے لطفِ صحبت میں مداخلتِ بیجا کا باعث نہ بنوں۔ لیکن جب وہ مجھے اکیلی مِل جائے تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اور میں اس زرّیں موقعہ کو غنیمت سمجھتا ہوں۔

---

۸ اگست۔

پیارے دوست، یقین کرنا کہ میں نے جہاں ان لوگوں کی نسبت دل کا بخار نکالا ہے۔ جو تقدیر کی بلا سے بید رساں کے خلاف چارہ جوئی نہ کرنے کی تعلیم دیتے ہیں تو وہاں میں نے تمہاری طرف بالکل اشارہ نہیں کیا۔ مجھے تو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ کہ تم ایک ایسے عامیانہ خیال سے متفق ہو گئے۔ تاہم حقیقت میں تمہارا خیال درست معلوم ہوتا ہے۔ میں صرف ایک اعتراض وارد کرنا چاہتا ہوں۔ اس دنیا میں شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا ہے۔ کہ کسی شخص کے سامنے صرف دو راہیں کھلی ہوں۔ جن میں سے ایک کو اُسے چار و ناچار اختیار کرنا پڑے۔ قول و فعل کی اُسی قدر مختلف و متباین قسمیں ہیں۔ جس قدر کہ ایک پتلی اور سڈول ناک سے لیکر ایک بھدّی اور چپٹی ناک تک خط و خال کی مختلف انواع۔

اس لئے میں اجازت چاہتا ہوں کہ تمہاری اس دلیل کے بھنور جال سے نجات کی راہ نکالوں۔ اگرچہ میں اسے تسلیم کرنے کو تیار رہوں۔

تمہاری دلیل یوں ہے:۔ "یا تو تمہیں چارلوٹی کے حصول کی امید ہے یا نہیں۔ اگر تمہیں امید ہے۔ تو بلا تامل اپنی راہ پر چلے چلو۔ یہانتک کہ منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤ۔ اور اگر تمہیں امید نہیں، تو تمہیں چاہیئے کہ انسان بنو۔ اور اس خام خیالی کے جوئے کو اُتار پھینکو۔ ورنہ یہ تمہیں کسی کام کا نہ رہنے دیگی" میرے پیارے دوست کہنے کو تو یہ ایک آسان سی بات ہے لیکن کہنے اور کر دکھانے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

مجھے بتاؤ کیا تم اُس خستہ حال شخص کو، جو ایک طول طویل اور لاعلاج مرض میں مبتلا ہو کر اپنی جان آہستہ آہستہ نذرِ عذاب کر رہا ہو، یہ مشورہ دوگے کہ وہ نوکِ خنجر سے سارا قضیہ چکا دے؟ کیا نظامِ زندگی کی وہ ابتری جو اُس کی طاقت و قوت کو زائل کر دیتی ہے۔ اُسے حصولِ نجات کی جُرأت سے بھی عاری نہیں کر دیتی؟

تم اگر چاہو تو اس کے جواب میں ایک ایسی ہی مثال پیش کر سکتے ہو:۔ "کون ہے ایسا شخص جو بجائے اس کے کہ پس و پیش اور التوا کے اپنی جان جوکھوں میں ڈالے ایک بازو کا کٹوا دینا منظور نہ کرے؟" لیکن مجھے نہیں معلوم کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ وہ درست بھی ہے یا نہیں۔ اس

لئے میں اس بحث و مباحثہ سے دست بردار ہوتا ہوں۔

لیکن یہ یاد رکھنا، ولیم کہ میری زندگی میں سینکڑوں ایسے اوقات آتے ہیں۔ جب میں اس طوقِ غلامی کو اُتار کر پھینک سکتا ہوں۔ اور اس جگہ سے بھاگ کر جا سکتا ہوں۔ بشرطیکہ مجھے یہ معلوم ہو جائے۔ کہ یہاں سے نکل کر مجھے کہاں ٹھکانا نصیب ہو سکتا ہے۔

۸۔ اگست

آج میری نظر اتفاق سے اپنے روزنامچہ پر جا پڑی جسے میں نے مدت سے معرضِ تعویق میں ڈال رکھا ہے۔ میں دیکھ کر حیران ہوں کہ میں نے کس طرح اپنے آپ کو آہستہ آہستہ دامِ بلا میں گرفتار کیا ہے۔ اپنے انجام کو اس طرح صاف صاف دیکھنا، اور پھر بچوں کی طرح اندھا دھند بڑھے چلے جانا! عجیب معاملہ ہے! اور کچھ اسی پر منحصر نہیں۔ اب بھی میں عاقبتِ کار سے بخوبی آشنا ہوں۔ لیکن میرے دل میں دُور بینی اور مصلحت اندیشی نام کو پیدا نہیں ہوئی۔

محمد ہادی حسین

"کیا کہئے"

جگر کے پاس کہ دل کے قریں ہے کیا کہئے — کہیں تو درد نہیں ہے کہیں ہے کیا کہئے
زبان بند ہے ظالم کی بدگمانی سے — حسین کون ہے جو دلنشیں ہے کیا کہئے
ہر ایک لفظ میں خنجر دکھا رہا ہے مجھے — ہر ایک بات پہ چینِ جبیں ہے کیا کہئے
وہاں یہ شوق کہ اک داستانِ خوش سُنئے — یہاں یہ عذرِ دلِ اندوہگیں ہے کیا کہئے

غزل یہ خوب ہے غالب کے رنگ میں شامی
بلند کتنی سخن کی زمین ہے کیا کہئے

شامی

اشکِ ندامت

(۱)

جن لوگوں کو جذبات کے احساس کی قابلیت نہیں نصیب نہیں ہوئی یا جنہوں نے نہایت بے دردانہ تضیع اوقات میں پرورش پائی ہے۔ اُن کا عام شیوہ ہے کہ وہ عشق و محبّت کے تمام قصّوں کا استہزا کرتے ہیں۔ اور جذبۂ عشق کی داستانیں اُن کے نزدیک من گھڑت افسانوں سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتیں۔ مگر میں اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر کہتا ہوں۔ کہ دِل ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ اور محبّت کی مایوسی سے موت کا واقع ہونا ممکن ہے۔ لیکن میں مایوسی کے آزار کو صرف اپنی ہی صنف کے لئے مہلک نہیں سمجھتا۔ بلکہ مجھے یقین ہے کہ یہ نامراد مرض بہت سی حسین و جمیل عورتوں کو بھی عین عنفوانِ شباب میں زندہ در گور کر کے قبل از وقت قبر میں اُتار دیتا ہے۔

مرد صرف شہرت۔ عزّت۔ دولت کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ چاہتا ہے۔ کہ دنیا کے دل میں جگہ پائے۔ لیکن عورت کی ساری زندگی ایک داستانِ شفقت، ایک تاریخ محبّت ہے۔ دل ہی اس کی ساری دُنیا ہے۔ اُس کی ہوسِ جہانگیری سلطنتِ دل ہی کی خواہاں ہے اس کی حرص و آز دل ہی کے پوشیدہ خزائن کی حریص ہے۔ وہ اپنی شفقتوں کو خطرات کے حوالے کر دیتی ہے وہ اپنی ساری رُوح کو محبّت کے جہاز پر سوار کر کے بحرِ ناپیداکنار کی موجوں کو سونپ دیتی ہے۔ پھر اگر ساحلِ مراد پر پہنچنے سے پہلے ہی وہ گرداب مایوسی میں غرق ہو جائے تو اُس کی ناامیدی کا کیا ٹھکانا ہے۔ کیونکہ اس سے اُس کے دل کا "افلاس" حدِّ انتہا پر پہنچ جاتا ہے

عورت کی سب سے بڑی خوش قسمتی یہ ہے کہ "وہ کسی کی محبوب ہو اور کوئی اس پر فتح پائے۔ لیکن جب وہ محبّت ہی میں مایوس و شکستہ دل ہو جائے تو اُس کا اُجڑا ہوا دِل اُس قلعہ کی مانند ہو جاتا ہے۔ جس پر دشمن نے قبضہ کر لیا ہو۔ اور پھر اُسے تاخت و تاراج کر کے ویران و تنہا چھوڑ گیا ہو یا اُس سرسبز پودے کی طرح ہے۔ جو حسنِ باغ و فخرِ گلزار ہو لیکن اُس کے تنے کے اندر خوفناک کیڑے اُس کی شادابی کا استیصال کر رہے ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ آخر مرجھا کر گر پڑتا ہے۔ پھر اگر ہم اُس کی بربادی کے سامان پر غور کریں تو اُس وقت ہماری تمام کوششیں ناکام رہ جاتی ہیں کہ کونسی

بادِ خزاں آئی۔ کونسا طوفان بپا ہُوا جس کے ظالم تھپیڑوں نے اُسے ساحلِ فنا پر پہنچا دیا۔

اس کے علاوہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی تمام بیماریاں مثلاً کھانسی۔ زکام۔ جنون۔ تپدق وغیرہ سب ناکامیِ محبّت ہی کے نتائج ہیں ہزاروں خوبصورت ہستیاں موت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ تاراجِ حسن کا باعث کیا تھا۔

جس طرح تیر کھلنے پر کبوتر اپنے بازوؤں کو پہلوؤں سے چمٹا کر اس خدنگِ حیات سوز کو چھپا لیتا ہے عین اسی طرح عورت کی فطرت ہے کہ وہ اپنی محرومِ محبّت کی مصیبتوں کو دُنیا والوں پر ظاہر نہیں ہونے دیتی۔ اُس کا آرام تباہ ہو جاتا ہے۔ اُس کی خوابِ نوشیں خوابِ پریشاں کی ناگوار کیفیات سے سم آلودہ ہو جاتی ہے۔ رنج و غم اُس کا خون چوس لیتے ہیں۔ لیکن آہ! اُس کے دل کی بیماری کا حال کون جانے؟ جس نے اُسے اس قدر نحیف اور کمزور کر دیا۔ اور اسقدر جلد شکارِ اجل بنا دیا۔

(۲)

ڈگری کے امتحان کے بعد جب میری تعلیم کا زمانہ ختم ہُوا تو چاروں طرف سے شادی کے تقاضے ہونے شروع ہُوئے۔ مختلف خاندانوں سے پیام آئے دُور دُور کے رشتہ داروں نے کوششیں کیں آخر میرے والدین نے میری شادی ایک اوسط درجہ کے خوشحال گھرانے میں طے کر لی۔ منشی ست نرائن پُرانے خیالات کے آدمی تھے اُن کے گھرانے میں ابھی تک نئی روشنی کی شعاعیں نہ پہنچی تھیں۔ بھابی کے ذریعہ مجھے معلوم ہُوا کہ لڑکی صرف ہندی پڑھی ہُوئی ہے لیکن انگریزی تعلیم نے آزادی کے جو خیالات میرے دماغ میں بھر دیئے تھے اُن کو اس کارروائی سے شدید دھکا لگا۔ مگر مجبور تھا کیا کرتا۔ پاس ادب والد کے بالمشافہ گفتگو کرنے کی اجازت نہ دیتا تھا۔ بس جانتا تھا کہ اُن کا ارادہ اٹل ہے۔ اور اُن سے اس معاملہ کے متعلق گفتگو کرنا اُنہیں ناراض کرنا ہے۔ اس لئے چُپ ہو رہا۔ اور آنے والی مصیبت کا انتظار کرنے لگا۔ آخرکار وہ دن آگیا۔ کہ ہم چند رسموں کے بعد ایک دوسرے سے ناقابلِ گسل استحکام کے ساتھ وابستہ کر دیئے گئے۔

دیوی نے دلفریب صورت پائی تھی۔ اُس کے حُسن میں غضب کی تاثیر تھی۔ اُسے پیار کرنا مشکل تھا۔ وہ پرستش کے قابل تھی۔ اُس کی ایک ایک نگاہ، ایک ایک حرکت، ایک ایک بات، اُس کے دل کی پاکیزگی

اور خلوص کا اثر دل پر پیدا کرتی تھی۔ اُس کی آنکھوں سے رُوحانی جذبات کی شعاعیں نکلتی تھیں۔ مگر آہ! یہ تمام اخلاقی اور جسمانی خوبیاں مجھ پر کچھ بھی اثر نہ کر سکیں۔ اُس کی میٹھی آواز مجھے ایک خوشامدی اور وہ بھی گنوار خوشامدی کی چرب زبانی معلوم ہوتی تھی اور جب وہ میری بے اعتنائیوں سے تنگ آکر رونے لگتی۔ تو مجھے ایک سفاکانہ خوشی ہوتی۔ کہ دیوکی اور اُس کے متعلقین اپنے کئے کی سزا بھگت رہے ہیں۔ مَیں کس مُنہ سے کہوں کہ باوجود میری ان تمام کمزوریوں کے بھی دیوکی کو مجھ سے محبّت تھی۔ اور مجھے حیرت ہوتی تھی۔ کہ مجھ میں ایسا کونسا وصف تھا جس نے دیوکی کو جذبۂ اُلفت سے بیخود کر دیا تھا۔ میرے پاؤں کی آہٹ پاتے ہی وہ مُنہ اُٹھا کر انتظار کرنے لگ جاتی تھی۔ مگر مجھے اُس سے اتنی نفرت تھی۔ کہ بات چیت کرنا بھی ناگوار معلوم ہوتا تھا ایک سال گذر گیا۔ اس ایک سال کے عرصہ میں ہم دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات چیت نہیں کی۔ کیا شوہر اور بیوی میں اس قسم کی خاموشی رہ سکتی ہے؟ اس سے پیشتر مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اُف! تم لوگ یہ نہ سوچ سکو گے۔ یہ خاموشی ناقابل برداشت سر بسر ناقابلِ برداشت! ہاں ناقابلِ برداشت تھی۔ تاہم اس قفلِ سکوت کے توڑنے کا حوصلہ ہم دونوں میں سے کسی کو نہ تھا۔

ایک دن ناگہاں مجھے بخار آگیا۔ باہر کے کمرے میں لرزہ بخار سے کانپتے کانپتے میں بیہوش ہوگیا۔ اس کے بعد سب یار دوست میرے پاس رہنا غیر ضروری سمجھ کر چلے گئے۔ اور نوکر مجھے اُٹھا کر اندر لے گئے۔ مجھے اس کا قطعی علم نہیں۔ خاموش اور پُرسکون رات میں کمرے کی گھڑی یکایک بج اُٹھی۔ اسی آواز سے مجھے ہوش آیا۔ مَیں نے سُنا۔ ایک دو تین۔ چار رات کے آخری سناٹے کو توڑ کر گھڑی پھر خاموش ہوگئی۔ ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی میرے جسم پر ہاتھ پھیر رہا ہے۔ کون میری تیمارداری کر رہا تھا؟ یہ بات میری سمجھ میں کسی طرح بھی نہ آسکی۔ سمجھنے کی کوشش بھی نہیں کی۔

"بڑی پیاس لگی ہے ذرا سا پانی"

میرے مُنہ سے کسی نے پانی کا گلاس لگا دیا۔

پانی پی کر مَیں بہت دیر تک سوتا رہا۔ اندھیرے میں دیکھ نہ سکا۔ مگر کون مجھے پنکھا جھل رہا تھا۔

یکایک میری پیشانی پر پانی کی دو بوندیں پڑیں۔ یہ کیسا پانی؟ سمجھ گیا یہ آنکھوں کا پانی ہے۔ اس تاریک رات میں میرے پاس بیٹھا ہوا کون رو رہا تھا؟

آہستہ آہستہ بولا "دیوکی؟"

جواب نہیں ملا۔

"دیوکی ؟"
پنکھے کی ہوا رک گئی۔
"دیوکی باتیں کرو"
نہایت آہستہ سے کانپتی ہوئی آواز میں جواب ملا۔
"کیا کہتے ہو؟"
"تم روتی کیوں ہو؟"
"روتی نہیں"
"جھوٹ کہتی ہو"
ڈرتے ڈرتے لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے دیوکی نے کہا۔"لو ـــــ اب اور نہ روؤنگی"۔
صبح ہوئی بخار اُتر گیا۔مگر دیوکی کے ایثار نے مجھ پر کچھ بھی اثر نہ کیا۔میرا پتھر دل موم نہ ہوا۔

(۳)

ساون کا مہینہ آیا۔دیوکی کے بھائی بھتیجوں کے تیوہار کے موقع پر اپنی بہن کو اپنے گھر لے جانے کے لئے آئے۔دیوکی کو اس سے پہلے کھانسی اور بخار کی شکایت رہنے لگی تھی۔میرے والدین نے کئی عذرات پیش کئے مگر اُنھوں نے ایک نہ مانی۔آخر تین دن کے بعد دیوکی کی رخصت کا دن آگیا۔وہ اتوار کی رات کو وداع ہونے والی تھی۔دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا آسکر وائلڈ کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی آیا اور یہ کہہ کر کہ"بھابی آپ کو بلا رہی ہیں" چلا گیا۔میں مطالعہ میں اسقدر محو تھا کہ یہ دریافت بھی نہ کرسکا۔کہ مجھے کس نے بُلایا ہے۔میں اُٹھا۔دیوکی کے کمرے میں آیا۔وہ ہندی کی ایک کتاب پڑھ رہی تھی۔آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔دل پاکیزہ جذبات سے بھرا ہوا تھا۔مجھے دیکھتے ہی اُس نے کتاب بند کرلی گویا وہ اپنی دہقانیت کو مجھ سے چھپانا چاہتی تھی۔میں نے پوچھا"دیوکی کیا کررہی ہو"
دیوکی نے خطاوار نگاہوں سے میری طرف دیکھ کر کہا۔"ذرا کتاب دیکھ رہی تھی"۔
"میں نے یہ کتاب بچپن کے زمانے میں پڑھی تھی۔کتاب بیشک بہت اچھی تھی اور جذبات کے پہلو خوب دکھائے گئے ہیں۔لیکن انسانی فطرت پر وہ غائر نگاہ نہیں ڈالی گئی۔جو انگریزی یا فرانسیسی مصنفوں کی خصوصیت ہے۔"دیوکی نے آہستہ سے جواب دیا۔"میرے لئے تو یہی بہت ہے۔انگریزی کتابیں کیسے سمجھوں۔یہ کہہ کر اُس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔جذبات درد اُٹھ آئے۔رقت سے آواز رک گئی۔زبان سے صرف اتنا نکلا۔میں آج جارہی ہوں۔آپ کے درشن کئے بغیر کیسے جاتی ؟ اور آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔
میری آنکھوں کے سامنے سے پردہ ہٹ گیا۔

دیوکی کی بے چینی اور شتابی، بے صبری اور افسردگی کا راز سمجھ گیا۔ اور بے اختیار میری آنکھوں سے بھی آنسو کے چند قطرے ٹپک پڑے۔ کیا یہ دیوکی کی آخری ملاقات تھی؟

میں کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہلتا رہا۔ اور جب چلنے لگا تو دیوکی نے میرے ہاتھ میں ایک لفافہ دیکر کہا۔

"اسے میرے جانے کے بعد پڑھ لیجئے گا" لفافہ تو میں نے لے لیا۔ لیکن جب میں نے متعجب نگاہوں سے اُس کی طرف سر اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ رو رہی تھی اُس کا چہرہ زرد تھا۔ اُسے دو راتوں سے نیند نہیں آئی تھی۔ جدائی کے اس صدمہ نے اُس کی دردمند طبیعت پر بہت اثر پیدا کر دیا تھا۔ ہنسی اُس کے ہونٹوں پر یوں بھی بہت کم آتی تھی۔ ہاں چہرہ شگفتہ رہتا تھا۔ مگر آج وہ شگفتگی بھی رخصت ہو گئی تھی۔

دیوکی کے جانے کے بعد میں نے اس خط کو کھولا پڑھا۔ جن جذباتِ مختلف کا تلاطم اس وقت میرے دل میں بپا ہوا بیان سے باہر ہے۔ آہ! میں نے اُس کے ساتھ نہایت بیدردی کا برتاؤ کیا۔ اُس کی زندگی کے ان دو تین برسوں کی بربادی کی ذمہ داری میرے سر پر ہے۔ تف ہے۔ ایسے علم پر جو انسانی رُوح کی قدر و قیمت کا اندازہ اُس کے ظاہری لباس سے کرتا ہے۔ اے کاش! میں ان گناہوں کی تلافی کر سکتا!

میں انہی خیالات میں سرگرداں تھا کہ دیوکی کے مصیبت بھرے دن اختتام کو پہنچ رہے تھے۔ ایک دن شام کا وقت تھا۔ دن اور رات باہم بغلگیر ہو رہے تھے۔ آسمان پر متوالی گھٹائیں چھائی ہوئیں تھیں۔ میرے نوکر نے آکر میرے ہاتھ میں ایک تار دیا۔ یہ دیوکی کے بھائی کی طرف سے تھی مضمون یہ تھا

"دیوکی چند گھنٹوں کی مہمان ہے فوراً آئیے گا"

زمین میرے پیروں تلے سے نکل گئی۔ گھر والوں نے یہ سمجھ کر کہ میرے لئے دیوکی کی زندگی اور موت دونوں یکساں ہیں۔ مجھ سے جانے کے لئے کچھ نہ کہا۔ لیکن دیوکی کی پہلی اور آخری التجا کا خیال کر کے دوسرے دن میں راولپنڈی جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ رات نہایت بے چینی سے کٹی۔ صبح سویرے ہی گاڑی پر سوار ہوا طرح طرح کے خیالات میرے دماغ میں چکر لگا رہے تھے۔ چنانچہ جب منزلِ مقصود پر پہنچا۔ تو معلوم ہوا کہ دیوکی اُس دیس میں پہنچ چکی تھی۔ جہاں محبت کا آنند ہے۔ مگر فراق کا غم نہیں۔ میں دیوکی کی لاش پر بیٹھا روتا رہا۔ چند روزہ زندگی کی بہار ختم ہو گئی۔ دل کی بستی ویران ہو گئی۔ تیسرے دن واپس مکان پر پہنچا۔ اس ویرانے

میں اب کون رہتا؟ اشک ریزی کی آرزو مجھے یہاں تک لائی تھی۔ دیوی کی روح کو خوش کرنے کا اس سے سوا اور کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اب اپنی اس مختصر دنیا سے آوارہ ہو کر جہاں خراب کی وسعتوں کا قائل ہو گیا ہوں۔ اور قدم قدم پر خاک چھانتا پھرتا ہوں۔ دن اور رات کے پُرشورش و پرسکون گھنٹوں میں۔ ربط کائنات سے مغموم نغمے نکلتے ہیں۔ اور ان کو سن سن کر میرے جسم خاکی کا ایک ایک ذرّہ اس طرح تحلیل ہونے لگتا ہے جس طرح سطحِ آب پر حباب۔ یہ ہے میری حیاتِ مختصر کا قصّہ۔ اب میں اس دُنیا سے رخصت ہوتا ہوں۔ اور وہاں جا رہا ہوں۔ جہاں کی نسبت مجھے خود معلوم نہیں۔ ہاں اتنا جانتا ہوں کہ وہاں "بس تنہائی ہوگی اور کسی کی یاد"

کرشن

افتخار الرسول بدر

آزادی

(نظم معرّا)

ہوگئی ہے صبح اور جنگل میں کچھ کچھ دھوپ ہے
چر رہے ہیں جانور اور سبزہ محو خواب ہے
جھیل پر مرغابیاں آئیں بہ فکرِ معاش
گر رہی ہیں ٹوٹ کر وہ مچھلیوں کی تاک میں
کیسی خوش خوش اُڑ رہی ہیں پا کے وہ اپنی غذا
اتحاد ایسا ہے گویا اُن کا مجمع ایک ہے
ٹھیر جاتی ہیں فضا میں پر کو اپنے کھول کر
اور پھر تیزی سے گرتی ہیں وہ سطحِ آب پر
گونجتے ہیں جب ہوا میں اُن کے نغمے متصل
جی میں آتا ہے کہ مل جاؤں انہیں میں اُڑ کے میں
بہ رہے ہیں ایسی آزادی سے چشمے دشت میں
گویا تم کو زندگی کا دے رہے ہیں وہ سبق
چپکے چپکے کہہ رہے ہیں ہاں سُنو تم غور سے
زندہ رہنا ہے تو پابندی ہے بدتر موت سے

ابو محمد ثاقب

دادِ شجاعت

"آہ میں بھی کیا عجیب بے سمجھ آدمی ہوں۔ بھلا کیا ضرورت پڑی تھی۔ مجھے یہاں دشمنوں کے علاقے میں بھاگ آنے کی۔ میری کوتہ اندیشی اور الّھڑ پن کے کاموں میں سے بس یہ آخری ہوگا۔ کون احمق باور نہ کرے کہ تھوڑی سی آہٹ پانے پر یہ پہاڑی بچھو چاروں طرف سے میرے گرد ہو جائینگے۔ انہیں معلوم تو ہے ہی کہ ہماری فوجیں ڈون پر پڑی ہوتی ہیں۔ کمبخت بھوکے کتّوں کی طرح میری تلاش میں لگے ہوتے ہونگے۔ اب کہیں چھپ کر ہو بیٹھوں۔ سورج غروب ہونے کے بعد چلونگا۔ تاکہ کوئی پہچان نہ سکے۔" یہ خیال کرکے بادشاہ جیمز چہارم والیٔ سکاٹ لینڈ ایک جھاڑیوں کے جھنڈ میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ یہ علاقہ ایسا ہے۔ کہ جہاں کے لوگ حکومت سے باغی ہیں۔ یہ اُن کی سرکوبی کے لئے آیا ہے۔ فوجیں سرحد کے قریب ڈون کے مقام پر ٹھیر گئیں۔ اور خود کچھ سودا جو اُٹھا ایک سپاہی کا لباس بدلکر اس طرف آنکلا۔ دشمنوں کو معلوم ہوگیا کہ کوئی اجنبی آیا ہوا ہے۔ سب راستے روک لئے۔ اب بادشاہ سلامت کی آنکھیں کھلیں۔ کہ اوہو غلطی اور دیوانگی ہی کی۔ کچھ سوجھتی نہیں۔ کہ کدھر کو جائیں۔ بیٹھے ہیں سر تھامے،

سورج چھپنے کو ہے۔ شام کے سائے نے آہستہ آہستہ درختوں اور پہاڑوں کو ڈھانپ لیا۔ کچھ اور اندھیرا ہُوا۔ تو غریب الوطن شاہ جیمز اپنی نافہم جرأت پر افسوس کرتا ہُوا اُٹھا۔ تاکہ شفق کی دھندلی دھندلی روشنی میں کسی جانب کوئی راستہ ڈھونڈے۔ لیکن کیا بنے۔ پہاڑوں کے اینچ پینچ۔ کہیں چڑھاؤ۔ کہیں اُتار اور پھر جب تھکے ہُوئے جسم پر سرد ہوا کا جھونکا لگتا ہے تو تمام طاقت سلب کئے دیتا ہے۔ جھاڑوں اور درختوں کا دُور تک پھیلاؤ اندھیری رات کے پرطوفان بحرِ بے پایاں کا خوفناک نظارہ دکھا رہا تھا۔ گرتا پڑتا جیمز کچھ دُور تک چلا۔ تو ایک آواز سُنائی دی۔ "کون ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی سیکسن قوم کا باشندہ ہے۔ کیا کام ہے یہاں؟" آخر بکرے کی ماں کب تک خیر منائیگی دیکھا تو سامنے ایک پہاڑی جنگجو سپاہی نے کھڑے ہوکر اپنے اُوپر سے کمبل اُتار پھینکا۔ اور ہاتھ تلوار کی طرف لیجاکر اس کی طرف متوجہ ہے۔

جیمز۔ "میں ایک مسافر ہوں۔"

سپاہی۔ "کیا چاہتا ہے"۔

جیمز۔ "بھوکا ہوں۔ تھکا ہوا ہوں۔ اور راستہ بھولا ہوا ہوں"۔

سپاہی۔ "ہمارے سردار روڈرک کے خیر خواہوں میں سے ہے"۔

جیمز۔ "نہیں"

سپاہی۔ "تو یوں کہہ کہ اس کا دشمن ہے"۔

جیمز۔ "اس میں کیا شک ہے۔ اس کا اور اسکی تمام رعایا کا دشمن ہوں۔"

سپاہی۔ "خوب! بہادرانہ الفاظ! لوگ کہتے ہیں کہ تم ایک مکار مخبر ہو۔ لیکن غالباً وہ جھوٹ کہتے ہیں"۔

جیمز۔ "بخدا وہ جھوٹ بکتے ہیں۔ اگر میں صبح تک آرام کرلوں۔ اور روڈرک اور ان کے دو بہادر سردار بھی آجائیں تو میں فوراً جھوٹ اور سچ نکھار کے دکھادوں"

سپاہی۔ "تمہاری طرز و روش سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کوئی جنگجو سردار ہو"۔

جیمز۔ تو اس سے تم خیال کرسکتے ہو کہ میں ظالموں اور ستمگاروں کا جانی دشمن ہوں۔

سپاہی۔ آفرین ہے تمہاری راستبازی پر بیٹھو ایک سچائی پسند سپاہی کے ساتھ کھانا کھاؤ۔ اور آرام کرو۔ مگر تم کو یہ خیال رہے۔ کہ میں روڈرک کے وفادار خادموں میں سے ہوں۔ یہ میرا فرض ہے کہ جو میرے سردار کے ذرا بھی خلاف بولے اس کی خبر لوں۔ اگر میں اس وقت چاہوں تو تم اپنے آپ کو ہزاروں آدمیوں کے درمیان گھرا ہوا پاؤ۔ لیکن نہیں۔ میں سلوک و مدارت کے اصولوں کو توڑنا نہیں چاہتا۔ اس وقت تم میرے مہمان ہو۔ رات یہاں کاٹو۔ میں خود صبح کو تمہیں محفوظ تمہاری حد تک پہنچاؤنگا"۔

دونوں بہادروں نے کھانا کھایا۔ اور سگے بھائیوں کی طرح ایک ہی کمبل میں سو گئے۔ صبح ہوئی مشرقی کرنوں نے رات کی خوفناک سیاہی کو دور کرکے اندھیرے راستوں کو روشن کردیا۔ کیا ہی دلنواز ہیں۔ یہ کھیلتی ہوئی اور مسکراتی ہوئی کرنیں۔ مگر زیادہ دلنواز ہے وہ سچا اور بیدریغ بہادرانہ حسن سلوک جو خصومت اور عداوت کی نامبارک سیاہی میں چمک کر انہیں شاندار اور دلاویز بنا دیتا ہے۔ فجر سے انگڑائیاں لیتے ہوئے اور سینے کو پھیلاتے ہوئے دونوں جنگجو اٹھے۔ اور کچھ حمد خداوندی ادا کرکے ناشتہ کیا۔ سپاہی اپنے وعدے کے مطابق مہمان کے ساتھ ہولیا۔ ہنستے کھیلتے اور شجاعت دلیری کی باتیں کرتے ہوئے ایک درے میں پہنچے۔ یہاں پر سپاہی ٹھیر گیا اور بولا۔

سپاہی۔ "دلیر سیکسن! یہ تو بتاؤ کہ اس طرف تمہارا آنا کیسے ہوا۔ یہ تو ایسی مخدوش جگہ ہے۔ کہ روڈرک کا پاس لئے بغیر کسی کو سفر کرنے کی مجال نہیں"۔

جیمز۔ پاس میرے کمر بند میں لٹک رہا ہے۔ بڑے
سے بڑے خطرات میں آزمایا ہوا۔ یہ تلوار۔ مگر یہاں پر
مجھے ابتک اس کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تھی۔ آج
سے تین دن پہلے میں ادھر آیا تھا۔ بالکل امن امان تھا۔
شاید تمہارا غدار سردار بھی کسی سیاہ کاری پر گیا ہوا تھا۔

سپاہی۔ اور پھر دوبارہ آتے ہو۔ آخر کوئی مقصد بھی کہ
کیوں آتے۔

جیمز۔" جنگجو ہوکر پوچھتا ہے 'کیوں' ہم لوگ آزاد
ہیں۔ جہاں چاہیں آئیں جائیں۔ کسی بالکل معمولی وجہ
پر کہیں چل دیں، تو کیا عجب۔ سمجھ لو کہ کسی گم شدہ شکاری
کتے یا باز کی تلاش میں آگیا ہوں۔ یا جان لو کہ کسی پہاڑی
نازنین دوشیزہ کی نگاہیں کھینچ لائیں۔ شکار کی خاطر یا سیر
کے لئے ہی سہی۔"

سپاہی۔" اچھا بھئی اپنا راز نہ بتا۔ میں بھی مجبور نہیں کرتا
کچھ خبر ہو کہ بادشاہ جیمز فوجیں لیکر آیا ہوا ہے۔ اور ہمارے
قبیلہ الپائن کے خلاف لڑائی کی ٹھنی ہے۔ آیا اس معاملہ
کے متعلق تم کچھ جانتے ہو؟"

جیمز۔" نہیں۔ البتہ فوجیں ضرور آئی ہیں۔ بادشاہ کے
سیر و شکار کی حفاظت کے لئے جب آپ لوگوں کی تیاری
کے متعلق جیسا کہ سب اہلِ قبیلہ اکٹھے ہو رہے ہیں انہیں
خبر پہنچی۔ تو یقیناً شاہی پھریرے یہاں آکر لہرائینگے اور
لڑائی ہوگی۔"

سپاہی۔" ہاں ہاں ضرور لہرائیں۔ ہم بھی نہیں چاہتے۔
کہ انہیں صندوقوں میں دیمک ہی کھا جائے۔ اور ایسا ہی
ہمارے جھنڈے بھی بلند ہوکر ہوا سے باتیں کرتے دکھائی
دینگے۔ لیکن اے اجنبی ہمارے سردار سے تیری وجہ خصومت
کیا ہے جو تو اسقدر بیزار ہے؟"

جیمز۔ میں تمہارے سردار روڈرک کو سوائے ایک
سرکش باغی کے اور کچھ نہیں جانتا۔ اس نے مدارالمہام
کی عدالت کے سامنے ایک سردار کو قتل کیا۔ یہ کوئی
تھوڑا سا جرم نہیں۔"

سپاہی۔ نہیں اس کا سبب بھی معلوم ہے۔ سب کے
روبرو اس سردار نے روڈرک کی تحقیر و بے عزتی کی تھی اور
کچھ ایسے طنز و طعن کئے تھے۔ کہ جن کو روڈرک برداشت نہ
کر سکا۔ ایک راستباز بہادر کا فرض ہے۔ کہ حق و ناحق
میں تمیز کر کے دکھائے۔ اور ناحق کرنے والے کو اس کے
کیفر کردار تک پہنچائے۔ خواہ آسمانی عدالت کے سامنے
کیوں نہ ہو۔

جیمز۔ خیر اس کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ دراصل
کم عمر بادشاہ اس وقت اپنے پورے اختیار میں نہیں تھا۔
اور اس کے مدارالمہام البانی کا انتظام حکومت کچھ ایسا کمزور
تھا۔ کہ بہت سے ایسے واقعات ہو گذرے۔ اچھا یہ

بتاؤ کہ تیرا سردار لٹیروں کی زندگی کیوں بسر کرتا ہے خواہ مخواہ لڑائی ڈھونڈ کر خدا کے بندوں پر ستم ڈھاتا پھر رہا ہے اپنی باغی جماعت کو لیکر میدانی علاقوں کے غریب کسانوں پر جا لوٹتا ہے۔ انہیں لوٹ کھسوٹ کر سب مال و مویشی چھین کر لے آتا ہے۔ کون انسان یہ ظلم کی کمائی کھانا پسند کرے۔

سپاہی۔ آہ سیکسن! ذرا انصاف تو کرو۔ یہ مشرق سے جنوب تک سب میدان جن میں دُور تک چراگاہیں اور فصلیں لہلہا رہی ہیں کیا ہمارے اپنے نہیں تھے۔ یہ ہماری گال قوم کی اصلی ملکیت ہیں۔ سیکسن قوم نے یہ ہم سے چھین کر ہمیں اوپر بے آباد پہاڑی علاقوں میں ہانک دیا جب ہم پر پہلے ظلم کیا گیا ہے۔ تو کیوں نہ ہم بدلہ لیں۔ ہماری زمینوں کے مالک تو تم لوگ ہو بیٹھے۔ ہم ٹھنڈی خشک چٹانوں میں پتھر کھائیں۔ یا برف سے پیٹ بھریں۔ یہ تو تمہارے اعتراض فضول ہیں۔ دشمنی کی کوئی اور وجہ نکالو۔

جیمز۔ "اچھا تو میرا راستہ کیوں چاروں طرف سے بند کر دیا ہے۔ تمہارے سب لوگ میری زندگی کے درپے ہیں"

سپاہی۔ "ہمارے علاقے میں کسی کا خفیہ طور پر آنا مضرت سے خالی نہیں گمان کیا جا سکتا۔ اگر تم صاف طور پر کہلا بھیجتے۔ کہ کسی باز یا شکاری کتے کی تلاش میں یا کسی پہاڑی دوشیزہ کی خاطر آ رہے ہو تو تمہارا راستہ بالکل کھلا اور بےخطر تھا۔ آزادی سے آ جا سکتے تھے۔

جیمز۔ "خیر جو ہوگا۔ کوئی وجہ ہو یا نہ ہو میں عہد کر چکا ہوں کہ ذرا اس مغرور سردار کی خبر لے کے چھوڑونگا۔ دو دفعہ میں یہاں آ چکا ہوں۔ اب تیسری دفعہ لڑائی کے لئے تیار ہو کر آؤنگا۔ میرا دل اس وقت خوش ہوگا۔ جب میں نابکار روڈرک اور اس کے باغی گروہ کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھوں گا"

سپاہی۔ تیرے دل کی خواہش ابھی کیوں نہ پوری کی جائے۔ یہ کہکر اس نے بگل میں سے ایک آواز دی۔ یکدم اردگرد کی جھاڑیوں نے جنبش کی۔ اور آن کی آن میں ان میں سے بے شمار جنگجو سپاہی کود کر باہر آ کھڑے ہوئے۔ چٹانوں اور پتھروں میں سے خودوں سے ڈھنپے ہوئے سر اوپر ابھرتے ہوئے دکھائی دئے۔ نہ معلوم ابھی نیچے سے اُگ آتے ہیں ہزاروں بلند ہوتے ہوئے نیزے اور چمکتی ہوئی تلواریں نظر آئیں۔ ایک جرار لشکر تیار ہو کر سامنے کھڑا ہے بس ایک اشارے کی دیر ہے۔

سپاہی۔ سیکسن یہی تھی تمہاری خواہش؟ لو یہ قبیلہ الپائن ہے۔ اپنے قبیلے پر فخر کرنے والا سردار روڈرک۔ وہ روڈرک جس کے پاس تم نے بے خبری میں رات بھر آرام کیا۔ اور جو اب تک تمہارے ساتھ ایک سپاہی کی حیثیت میں باتیں کرتا ہوا آ رہا تھا۔ اس وقت تمام اقتدار کے ساتھ اپنی

باغی جماعت کو لئے تمہارے سامنے کھڑا ہے کیا منشا ہے بولو۔"

ایک دفعہ تو شاہ جیمز کا منہ کچھ سفید سا ہونے لگا۔ لیکن نبرد آزمودہ تھا۔ فوراً سنبھل گیا۔ اپنی کمر کو ایک سیدھی چٹان سے لگا کر دونوں پاؤں کو اچھی طرح جمایا۔ روڈرک کی طرف ایک غرور کی نگاہ سے دیکھ کر بولا۔

"ہاں آؤ۔ حملہ کرو۔ ایک ایک کرکے یا سب اکٹھے۔ مجھے یہاں سے ہلا دینا گویا اس چٹان کو اکھاڑ دینا ہے۔

یہ ماجرا دیکھ کر شجاعت پسند روڈرک دنگ رہ گیا۔ لشکر کو واپس ہٹ جانے کا اشارہ کیا۔ اور ایک لمحہ بھر میں پہلے کی طرح سنسان پہاڑ دکھائی دینے لگے۔ روڈرک جیمز سے مخاطب ہوا۔

"آفرین وتحسین اے منچلے بہادر۔ ذرا اندیشہ نہ کرو اس طرح گھیر کر دھوکے سے مارنا میں بھلا کب گوارہ کرتا ہوں میں صرف یہ دکھانا چاہتا تھا۔ کہ کس طرح تم روڈرک سے پاس لئے بغیر اس جگہ سفر کر سکتے ہو۔ گو ہم ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ لیکن تم میرے مہمان ہو چکے ہو۔ آؤ چلیں" یہ کہکر وہ پھر جیمز کے آگے آگے ہولیا۔ جیمز چل رہا تھا اور حیران تھا۔ اسے کچھ اعتبار سا نہ آتا تھا۔ تھوڑی سی آہٹ پانے پر کان متاثر ہوتے جاتے تھے۔ اور رہ رہ کے یہی گمان ہوتا تھا۔ کہ وہ کھیت کہیں پھر اُگنا شروع نہ ہو جائے۔ کسی پرندے کی آواز سنائی دیتی تو دل میں یہی خیال دوڑتا کہ روڈرک کی سیٹی ہے۔ شاید پھر وہ اپنے ساتھیوں کو بلانا چاہتا ہے۔ کبھی نگاہیں اپنے خیالی وہم میں درختوں کی آڑ میں سبزہ کو ہلتے ہوئے دیکھتی تھیں۔ اور شک غالب ہوتا تھا۔ کہ بس پہنچا چاہتے ہیں۔

اب درّہ گذر چکا اور کھلا میدان آگیا۔ روڈرک کے علاقے کی حد بھی گذر گئی۔ کوئی ایسی جگہ دکھائی نہیں دیتی جہاں کسی آدمی کے چھپے ہونے کا گمان کیا جاسکے روڈرک ٹھیر گیا اور اپنے ساتھی سے بولا۔

"بہادر سکسن! اس باغیوں کے سرغنے غدار وظالم سردار نے تمہیں اپنے وعدے کے مطابق یہاں تک پہنچا دیا۔ یہ علاقہ قبیلہ الپائن کی حد سے باہر ہے۔ اب میری تمہاری لڑائی کا مزہ ہے۔ سامنے ہو جاؤ اور مردانہ لڑو تمہارے پاس ڈھال نہیں ہے؟ لو میں بھی اپنی ڈھال پھینکے دیتا ہوں۔"

جیمز۔ آج تک جب کبھی مجھ سے کسی نے لڑنے کے لئے کہا میں نے کبھی ٹال نہیں کیا۔ لیکن تمہارے خلاف تلوار کھینچنے کو میری طبیعت نہیں چاہتی۔ گو میں تمہاری موت کا عہد بھی کر چکا ہوں۔ مگر تمہارا بیدریغ مخلصانہ سلوک اور تمہارا میری زندگی بچا کر مجھے مرہون منت کرنا مجھے اجازت نہیں دیتے۔ کیا ہمارے مابین تنازعات کا تصفیہ خون

کے سوا کسی اور طریقہ سے نہیں ہو سکتا؟

روڈرک ۔ نہیں اور کوئی طریقہ نہیں ۔ اور دوسرے میں تمہیں بتا دوں تاکہ تمہارا خون کچھ گرما جائے ۔ کہ ہماری پیشینگوئی ہے اس سیکسنز اور گالز کی لڑائی میں جو اپنے دشمن کا پہلے خون گرائیں وہی فتحیاب ہونگے ۔ سو اس کے مطابق سیکسن قوم کی کامیابی تمہاری زندگی پر منحصر ہے ۔

جیمز ۔ یہ پیشینگوئی تو پوری ہو چکی ۔ وہ پہاڑی جوان جو کل میرا رہنما بنا تھا مجھے کچھ دھوکے باز معلوم ہوا اور نہ جانے وہ مجھے کہاں لے جانا چاہتا تھا ۔ میرا شک جو یقین تک پہنچا تو اس دغاباز کا وہیں فیصلہ کر چھوڑا ۔ تب تمہیں چاہئے کہ اپنی پیشینگوئی کے مطابق رضا بہ قضا ہو جاؤ ۔ اور بادشاہ کے حضور میں چلکر اپنے عفو تقصیر کی التجا کرو ۔ اگر اس نے منظور نہ کیا تو مجھے اپنی عزت و ناموس کی قسم تمہارا ایک ذرہ بھی نقصان نہیں ہونے دونگا ۔ اور واپس تمہیں سلامتی سے یہاں تک پہنچا دونگا ۔

روڈرک (غصے سے لال ہو کر) ہائے غضب تم ہمارے ایک آدمی کو مار بھی آئے ہو ! اف رے مغرور ! اور پھر روڈرک جیسے شخص کو کہتے ہو ۔ کہ معافی مانگے اور اطاعت کرے ۔ جو انسان تو کیا قضا و قدر کی بھی اطاعت کرنے والا نہیں ۔ اچھا میں اپنے آدمی کا بدلہ لونگا ۔ تم ابھی تک تیار نہیں ہوئے ۔ ارے مرد میدان ہو یا کسی امیر کے کمینے فراش ہو ۔ میں نے غلطی کی ۔ تم اس قابل نہیں تھے ۔ کہ تمہارے ساتھ میں ایسا اچھا سلوک کرتا ۔

جیمز ۔ تو لڑکر ہی رہوگے ! لو اب تمہارے الفاظ سے میری طبیعت بھی بھڑک اٹھی ہے ۔ اور اس وقت یہاں پر میرے بگل کی بھی چھوٹی سی آواز تمہیں بہت کچھ دکھا سکتی ہے لیکن ڈرو نہیں ۔ ہم دونوں اکیلے ہی شمشیر آزمائی کرینگے ۔

دونوں نے تلواریں کھینچیں ۔ زمین ۔ آسمان اور سورج کو الوداعی نظر سے دیکھ کر نعرے مارتے ہوئے ایکدوسرے کے مقابل ہوئے ۔ سپر کا پھینک دینا جانباز روڈرک کے لئے ازحد مضر ثابت ہوا ۔ بہادر تو تھا اور طاقت میں بھی جیمز سے زیادہ ۔ لیکن اکیلی تلوار سے لڑ نہیں سکتا تھا ۔ اور جیمز ایک نہایت چالاک اور ہوشیار لڑاکا ۔ یورپ کے بہت سے ملکوں میں پھرا ہوا ۔ بہت سی لڑائیاں دیکھی ہوئیں ۔ تجربہ کار ہر قسم کے داؤ گھات سے واقف ۔ تلوار سے مارنے اور بچنے کے دونوں کام لے سکتا تھا ۔ دشمن پر تین کاری زخم کر گیا ۔ اور اس نے بھی غصہ کھا کر اندھا دھند بارش کی طرح تلوار برسانی شروع کی ۔ مگر جیمز جیسے چابک دست آدمی نے ایک وار بھی تو اپنے اوپر نہیں آنے دیا ۔ اور موقع پاکر اس سے تلوار چھین کر اسے زانو کے بل گرا دیا اور کہنے لگا ۔

"اب اطاعت قبول کرو ۔ ورنہ میری شمشیر تیار ہے

کہ تمہارے دل کے خون سے رنگے جانے کی سرخروئی حاصل کرے۔

روڈرک۔ ہرگز ہرگز میں رحم کا ملتجی نہیں ہونگا مطیع ہونے والا بزدل ہے۔ جو موت سے ڈرے، یہ کہکر وہ ایک خوفناک سانپ کی طرح اچھلا۔ اور لپک کر دشمن کا گلا پکڑ کر بولا: "اب تم کہو۔ تمہارے بدن کے ارد گرد کسی دوشیزہ کے نازک ہاتھ نہیں ہیں۔ جو سہل چھوٹ جاؤ۔ لوہے اور پیتل کی زرہ کے اندر تم خوب محسوس کرتے ہوگے کہ ہاں کوئی پکڑے ہوتے ہے۔ ہر دو جنگ جو بہت دیر تک جدوجہد کرتے رہے۔ آخر روڈرک کو موقع ہاتھ آیا۔ کہ تلوار کی ایک ضرب سے اس کشمکش کا فیصلہ کردے۔ مگر آہ جو زخم اس نے پہلے کھائے تھے۔ اس کے لئے مہلک ہوچکے تھے۔ اور خون اسقدر نکل چکا تھا۔ کہ تمام حواس کمزور پڑگئے۔ اور زندگی کی لہریں دھیمی پڑتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ تاب نہ لاسکا۔ تلوار اوپر اٹھائی۔ لیکن ہاتھ کانپنے لگ گیا۔ اور وہ گھاس پر جاگی۔ اور خود بیہوش ہوکر زمین پر گرا اور پھر نہیں اٹھا۔

(ترجمہ)

محمد شریف

افکار ہادی

ہجر میں ہے انیس تنہائی
خواب عشرت کی بزم آرائی

دہر میں ہوں وحید رسوائی
کیوں نہ ہو مجھ کو ناز یکتائی

الوداع، اے امید ابلہ فریب
دیکھ لی تیری وعدہ فرمائی

میری خواہش کا کیا ہے لبِ لباب؟
درِ دولت کی ناصیہ سائی

عشق کی سرفرازیاں دیکھو
حسن ہے برسرِ خود آرائی

زہے، زاہد فریب، پہنائی!
زہے، موسے فریب، پیدائی

آیا پھر موسم جنوں ساماں
مژدہ، اے شوقِ دشت پیمائی

رسمِ الفت ہے بندگیٔ خموش
خود نمائی ہے نامِ رسوائی!

دلِ مردہ کو زندہ کرکے دکھا
ہم بھی دیکھیں تری مسیحائی

محمد ہادی حسین

نشیدِ اقبال

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
الصين والهند جميعاً لنا
اقطار ذي الارض غدت موطنا

مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا
ومنشاء الاعراب اهل الشمم
لامة الاسلام خير الامم

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
امانة التوحيد طي الصدور
فليس سهلاً محوها والدثور

آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا
من نسلها الباقي طوال العصر
لا سمها كلا ولا للاثر

دُنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
نحن حماة البيت دون الانام
وهو لنا يحمي ويرعى الذمام

ہم اُس کے پاسباں ہیں، وہ پاسباں ہمارا
اول بيت للهدى قد وضعا
ما اشرقت شمس وبدر طلعا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
نحن نشأنا في ظلال السيوف
شعارنا القومي يعاف الخسوف

خنجر ہلال کا ہے، قومی نشاں ہمارا
حتى شببنا للهدى والنضال
ذاك الهلال الخنجري المثال

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
هناك في اودية بالمغرب
منا وسيل فاض من يثرب

تھمتا نہ تھا کسی سے سیلِ رواں ہمارا
دوى اذان داعيا للفلاح
عم بنور العلم تلك البطاح

باطل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم
لسنا من الباطل یوماً ننضغط
جربت مرتنا فکف ولا تشط

سو بار کر چکا ہے تو امتحاں ہمارا
یا دھر للباطل انا نزھق
ابلغتھا مائۃ وسعدك یخفق

اے گلستانِ اندلس وہ دن ہیں یاد تجھ کو
ویا ریاضاً کن فی الاندلس
یوم لنا وکر بغصن مائس

تھا تیری ڈالیوں میں جب آشیاں ہمارا
ھل تذکرین زماننا الماضی
یصدح فیہ کل ھاض

اے موجِ دجلہ تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
وانت یا امواج دجلۃ تعرفی
لا زال نھرك جاریا یا الطرف

ابتک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا
منافعالا للعلی لا توصف
یقص عنا للانام و یطرف

اے ارضِ پاک تیری حرمت پہ کٹ مرے ہم
ایتھا الارض المطھرۃ التی
لازالت الاعصاب من ذی الامۃ

ہے خوں تری رگوں میں ابتک رواں ہمارا
نجود بالارواح فی حرمتھا
تجری الدماء بھا التی اودعتھا

سالارِ کارواں ہے میرِ حجاز اپنا!
قافلۃ الامۃ ذی قائدھا
اروا حنا ر احتھا یعیدھا

اس نام سے ہے باقی آرامِ جاں ہمارا
سید بطحاء الحجاز العربی
اسم الرسول العربی خیر نبی

اقبالؔ کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
نشید "اقبال" کصوت الجرس
یخبرنا الشاعر فی ذا النفس

ہوتا ہے جادہ پیما' پھر کارواں ہمارا
یرن فی فضاء ارض المشرق
عن عودۃ الرکب لقص الطرق

نہایت فخر و مسرت کے ساتھ ہم اس ترجمہ کو "الجامعہ" سے عربی دان ناظرین ہزارداستان کے لئے نقل کرتے ہیں۔ اور اس ترجمہ کو جو عالم اسلامی کی آسمانی زبان میں ہے۔ سر ڈاکٹر محمد اقبال مدظلہٗ کی شاعری کے کمال و نفاذ پر دلالت سمجھتے ہیں۔
ایڈیٹر

نقاب

(خواتین ہند کی دلچسپیوں اور ضرورتوں کا ایک ادبی ماہوار رسالہ)

جس وقت اس دارالاشاعت نے رسائل ہزار داستان و نونہال شائع کرنے کی تجویز کی تھی اُسی وقت طبقۂ نسوان کے لئے ایک بہترین رسالہ کی ضرورت کو بھی محسوس کر لیا تھا۔

نونہال ایک ایسا رسالہ ہے جو طلباء اور طالبات لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے یکساں طور پر مفید ہے۔ کیونکہ اسکے مضامین کی نوعیت جنسیت کے مسئلہ کو نہیں چھیڑتی لیکن ہزار داستان کا معیار اور اُسکی نوعیت مذاق یقیناً مردانہ ہے۔ اس لئے دارالاشاعت ادب لطیف کا سارے ملک کے لئے خدمتِ ادب کا جذبہ ہنوز تشنہ تھا اسی دوران میں ملک کے بیشتر حامیان ترقیٔ نسوان کا ایسے رسالہ کے لئے تقاضا بھی ہوتا رہا۔ اب اُس احساس ضرورت کے عملی مواقع حاصل کر لئے ہیں۔ اور دارالاشاعت "نہایت مسرت کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ انشاء اللہ ماہ جولائی ۱۹۲۳ء سے ایک ماہوار ادبی رسالہ خواتین ملک کے لئے جاری کر دیگا۔ اور یہ رسالہ بھی جناب حکیم احمد شجاع صاحب بی۔ اے (علیگ) کی ایڈیٹری میں شائع ہوگا جن سے ناظرین ہزار داستان و نونہال خصوصاً اور ملک کے عام ارباب ادب عموماً اچھی طرح واقف ہیں۔

مضامین علمی، فنی، اخلاقی، امور معاشرت، اصلاح ہیئت اجتماعی کے مضمون پر، نیز افسانے ذخیرہ ادب لطیف کی اصناف میں شائع کئے جائینگے

"نقاب" ہر نوع کوشش کریگا۔ کہ خواتین ہند کی ہندی و مشرقی لوازم نسوانیت کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنی ناظرات کیلئے ضروری اور جائز ترقیوں کے مواقع و مرقع بہم پہنچانے میں پوری پوری خدمت کرے۔ اور ملک کی اس "نصف زندگی" کو سنوارنے میں جدوجہد کا ثبوت دے۔

امید ہے کہ ہزار داستان کے ناظرین اپنے حرم سراؤں میں "نقاب" کے مقاصد و اہمیت کی ترجمانی فرماتے ہوئے اسکے خریدار ہونگے اور خریدار کرینگے۔

خریداری کا رجسٹر کھول دیا گیا ہے۔ اور بفضلہ تعالیٰ فرمائشیں آنی اور نام رجسٹر ہونے شروع ہو گئے ہیں۔ بہتر ہوگا کہ تمام خواہشمند ابتدائے اشاعت ہی سے اس موقع کو ضائع نہ فرمائیں کہ رسالہ کی جلدیں مکمل اور معلومات مسلسل رہیں۔

تقطیع مثل ہزار داستان۔ حجم ۵۶ صفحات قیمت صرف للعہ سالانہ اور دو روپے آٹھ آنے ششماہی۔ نمونہ کی قیمت چھ آنے۔

المشتہر مہتمم دارالاشاعت ادب لطیف لاہور

حسینۂ مصر

گذشتہ سے پیوستہ

باب (۹) نہم

راحیل کا مکان

طھوسر نے پوٹری کا اس لئے تعاقب کیا کہ آتشِ رشک سے اس کا دل بیقرار تھا۔ اُسے ایک لمحہ کے لئے بھی یقین نہیں آیا کہ اس کا اسرائیلی مالک رات کے وقت کسی رسم یا مذہبی فرض کی ادائیگی کے لئے اپنے گھر سے باہر جاتا ہے اُسے خیال ہوا یہ رات کا جانا یقیناً کسی عورت کے لئے ہوگا۔ اور اُسے یہ معلوم کرنے کی خواہش ہوئی کہ اس کا رقیب کون ہے وہ ایک حسین لڑکی تھی اور پوٹری کی بے توجہانہ ہمدردی سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے دل میں کسی اور کی محبت ہے اُس کے حسن کا تمام مصر میں شہرہ تھا۔ اور یہ معلوم کرکے وہ کیونکر اپنے قابو میں رہ سکتی تھی؟ یہ کیونکر ممکن تھا کہ اُس پر ایک ایسی لڑکی کا اثر نہ ہو جس نے شاہی افسروں اور عالموں اور مذہبی پیشواؤں اور بعض شاہی خاندان کے نوجوانوں کی نیند میں خلل ڈال دیا ہے۔ یہ بات اُسے نہایت ہی عجیب اور پُراسرار معلوم ہوئی لیکن کیا یہ واقعہ نہ تھا؟

پوٹری دریا کے کنارے پہنچا اور ایک چھوٹی سی نازک کشتی پر سوار ہوگیا۔ طھوسر پانی میں کود پڑی۔ اور کشتی کے پیچھے پیچھے پیرنے لگی۔ اُس نے خیال کیا۔ "جب پوٹری مجھ سے محبت نہیں کرتا تو مجھے اس کی کیا پرواہ کہ دریائی جانور مجھے مار کر کھا جائیں"

دریائی جانوروں کا خوف خصوصاً رات کے وقت واقعی ٹھیک تھا۔ دن کے وقت کشتیوں کی نقل و حرکت گھاٹ کے کاروبار اور شہر کے شوروغل میں یہ جانور دُور دُور رہتے تھے۔ اور دریا کے کنارے فاصلے پر دھوپ لیا کرتے تھے۔ لیکن رات کی تاریکی سے اُن میں جسارت آجاتی تھی۔ طھوسر نے ان کا کچھ خیال نہ کیا۔ جذبات راستے کے خطرات کا اندازہ نہیں کرتے۔ اور اب جبکہ خطرات کا سامنا ہوگیا۔ تو اُس نے نہایت بہادری سے ان کا سامنا کیا۔ گو اس کے پیشتر وہ نہایت ہی بُزدل تھی۔ یکایک کشتی رُک گئی۔ حالانکہ کنارہ ابھی دُور تھا۔ پوٹری پتوار چھوڑ کر بےچینی کے ساتھ ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس نے طھوسر کے کپڑوں کا سفید نشان پانی کی سطح پر دیکھ لیا تھا۔

جانباز نوجوان ہیراک نے اپنی جان سے ہاتھ دھو کر نہایت جُرات سے غوطہ لگایا۔

پوٹری نے خیال کیا "میں قسم کھا سکتا ہوں کہ کوئی شخص میرا تعاقب کر رہا تھا" لیکن دریا کو ساکن دیکھ کر اس نے پھر پتوار چلانا شروع کردیا۔ رات کے وقت دریائے نیل کے خطرات کا کون سامنا کرسکتا تھا؟ جس چیز کو اس نے آدمی کا سر سمجھا تھا وہ کنول کا پھول ہوگا یا دریا کا بہاؤ ...... طھوسر نے جب سانس لینے کے لئے سر نکالا۔ تو کشتی اطمینان کے ساتھ روانہ ہوچکی تھی۔

پوٹری نہایت سکون کے ساتھ پتوار چلا رہا تھا اور اب عظیم الشان قصر شمالی کے سایہ نے طھوسر کو چھپا لیا تھا پوٹری کشتی پر سے اترا اور طھوسر نے درد بھرے دل کے ساتھ جھکے جھکے اس کا تعاقب کیا۔ اور ہوش و حواس کو درست کرکے اسرائیلی کی طرف دیکھتی ہوئی قصر کے کونے پر گھوم پڑی۔ اور تھیبہ کی سڑکوں پر روانہ ہوگئی۔

پندرہ منٹ چلنے کے بعد قصر معبد اور عالیشان مکانات پیچھے چھوٹ گئے۔ اور غریب آبادی نظر آئی۔ قرب و جوار میں کمتر درجہ کے مکانات دکھائی پڑے۔

طھوسر (اپنے جی میں) کیا لوگوں نے ٹھیک کہا؟ کیا پوٹری وحشی دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھانے یہاں آتا ہے۔ یہ جگہ تو سچ مچ وحشیانہ قربانیوں اور خوفناک رسوم کے لئے مناسب معلوم ہوتی ہے۔

آخر کار پوٹری مٹی کے بنے ہوئے ایک جھونپڑے کے اندر گھسا۔ دیوار کے کسی شگاف سے ایک ہلکی ہلکی زرد روشنی آرہی تھی کمرے کے اندر ایک چھوٹا سا چراغ جل رہا تھا۔ جو قیمت میں اپنی ظاہری وضع سے بہتر تھا۔ طھوسر نے دیوار کے ایک چھوٹے سے شگاف کے ذریعہ سے سب کچھ دیکھا یا اور یہ بھی دیکھا۔ کہ ایک چارپائی پر کسی اجنبی قوم کی ایک عورت عجیب و غریب حسن کی بیٹھی ہوئی ہے۔ وہ مصر کی تمام عورتوں سے زیادہ گوری تھی۔ اور اس کا رنگ دودھ یا کنول کی طرح صاف تھا۔ اس کی ابرو آبنوس کے محراب کی طرح تھیں۔ جن کے دونوں سرے چھوٹی سی عقاب نما ناک کے اوپر ملے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں روشن اور خمار آلود تھیں۔ اس کے ہونٹ سرخ تھے۔ جو موتی کی طرح کے دانتوں کو حلقہ کئے ہوئے تھے۔ اس کے بال گھنے سیاہ اور چمکدار تھے۔ جن میں دونوں کانوں کے پاس حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے سفید اور شفاف گلے میں ایک سونے کا طوق پڑا ہوا تھا۔

اس کا لباس بالکل عجیب تھا۔ وہ ایک طرح کی قمیص پہنے ہوئے تھی جس پر مختلف رنگوں کے نقش و نگار کڑھے ہوئے تھے۔ یہ قمیص شانہ سے لیکر گھٹنوں تک پڑی ہوئی تھی اور ہاتھ کھلے ہوئے اور آزاد تھے۔ پوٹری اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور گفتگو کرنے لگا لیکن طھوسر ان الفاظ کو نہ سمجھ سکی۔ تاہم اسقدر مطلب اس نے بآسانی سمجھ لیا۔ جو

اس کے دل کو بیقرار کر دینے والا تھا۔

پھر بھی عشق سے بھرا ہوا دل مشکل مایوس ہوتا ہے۔

طھوسر (آپ ہی آپ) شاید یہ اس کی بہن ہے اور وہ اسے چھپ کر دیکھنے آتا ہے۔ تاکہ کسی کو یہ معلوم نہ ہو۔ کہ وہ ایسی قوم کے ہیں جو غلامی کی حالت کو پہنچ گئی ہے۔

طھوسر تمام الفاظ اور ان کے اتار چڑھاؤ کو بغور سنتی رہی اور ہر لفظ کا راز معلوم کرنے کے لئے وہ اپنی تمام عمر صرف کر دینے پر تیار تھی۔ یہ الفاظ مبہم اور غلط ملط سنائی پڑتے تھے۔ جیسے تیز ہوا درختوں میں ہو کر یا دریا کی سطح پر سے گذر رہی ہو۔

پوٹری بار بار کہتا تھا "راحیل! میری پیاری راحیل!"

طھوسر نے اس نام کو پکڑ لیا اور اس کے بعد اسے یاد آیا اس نے پوٹری کے مکان میں اس کی زبان سے یہی الفاظ اس وقت سنے تھے جبکہ وہ گا کر اور پنکھا جھلکر اسے سلا رہی تھی۔

طھوسر (اپنے جی میں) وہ اسے سوتے میں بھی یاد کرتا ہے یہ تو مجھے پورے طور پر معلوم ہو گیا کہ اس کا نام راحیل ہے۔ یہ سوچ کر غریب طھوسر جی چھوڑ کر رہ گئی۔

راحیل نے اپنا سر پوٹری کے شانے پر رکھ دیا۔ یہ سر پھول کی طرح خوشبو سے مہک رہا تھا۔ پوٹری نے بالوں کو بوسہ دیا۔ اور راحیل نے مخمور نیم باز آنکھوں سے اسے دیکھا اور اپنے لب سامنے کر دیئے۔ دونوں کے ہاتھ فرط شوق میں ایک دوسرے سے مل گئے۔۔۔۔۔

بدقسمت جاسوس نے اپنے دل میں کہا۔ "اس کے مذہب کی کسی خوفناک رسم نے بھی مجھے اس منظر سے زیادہ خوفزدہ نہ کیا ہوتا۔"

رنج اور تکلیف کی شدت سے طھوسر جھونپڑے کی دیوار کے سائے میں زمین پر گر پڑی۔ اور دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن پھر گر پڑی۔ اس کی آنکھوں پر ایک غبار چھا گیا جس سے دنیا اندھیر ہو گئی۔ تھکے ہوئے اعضا بالکل بیکار ہو گئے۔ اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر لوٹنے لگی۔

. . . .

اسی اثنا میں پوٹری نے راحیل کو آخری بوسہ دیا۔ اور جھونپڑے سے رخصت ہو گیا۔

باب دہم

فرعون کی بیقراری

فرعون کو طھوسر کے گم ہو جانے کی بیقراری اور غصہ میں تبدیل مکان کی ضرورت محسوس ہوئی۔ کیونکہ ہر وہ قلب جو نہ پورے ہونے والے ارمانوں سے بھرا ہوتا ہے یہی چاہتا ہے۔ اس کی حرم خاص امنسی اور حانت ریشی اور طویہ نے ہر طرح کی چالوں سے اسے روکنے کی کوشش کی۔ لیکن

باوجود ان کے پیچ و تاب کے فرعون نے دریائے نیل کے اُس پار جا کر قصر شمالی میں رہنے کا تہیہ کر لیا۔ اُسے ایک فکر دامنگیر تھی کہ وہ عورتوں کی احمقانہ بکواس کو دھیان میں نہیں لا سکتا تھا۔ کوئی بات جس میں طوسر کا تذکرہ نہ ہو اُسے ناگوار ہوتی تھی۔ اب وہ ان حسینوں کو جن سے پہلے اُس کی اس قدر دلبستگی ہوتی تھی۔ بالکل بدشکل سمجھنے لگا۔ ان کے جوان اور خوبصورت جسم اور ان کی دلفریب ادائیں اور ان کی بڑی بڑی پر شوق آنکھیں ان کے نیلگوں لب اور چمکدار سفید دانت غرضیکہ اُن کی ہر چیز حتیٰ کہ اُن کے خوشبو سے معطر اور شبنم سے دھوئی ہوئی جلوؤں کی مہک بھی اُسے ناگوار اور ناقابل برداشت معلوم ہونے لگی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ اس تن کو جو اس وقت اسقدر بدنما معلوم ہوتا ہے وہ کیونکر کبھی بھولے سے بھی پسند کر سکتا تھا۔ جس وقت طوبیہ اپنے محبت سے بھرے ہوئے گلابی ہاتھ قدیم لطافت کو واپس بلانے کے خیال سے اُس کے جسم پر رکھتی تھی۔ جس وقت رعانت ریشی اسے شطرنج میں مشغول کرنا چاہتی تھی اور جس وقت امینسی اُسے ادب اور تنظیم کے ساتھ کنول کا خوبصورت پھول دیتی تھی۔ اُس وقت اُس کا جی چاہتا تھا کہ مار بیٹھے۔ اور نہایت حقارت آمیز نظروں سے دیکھ کر منہ پھیر لیتا تھا۔

یہ بدقسمت عورتیں جو اپنا جی مضبوط کر کے اس قسم کی جی بہلانے کی کوششوں کا خطرہ اپنے سر پر لے رہی تھیں آخرکار خاموشی کے ساتھ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے رخصت ہو گئیں اور بت بنکر منقش دیوار کی آڑ لیکر کھڑی ہو گئیں۔

اس غمگین منظر سے بچنے کے لئے فرعون خاموش ایک دوسرے محل میں چلا گیا۔ اور وہاں بجائے بے حس و حرکت شاہوں اور دیوتاؤں کی طرح اپنے تخت پر بیٹھنے کے وہ بےچینی سے بڑے بڑے کمروں میں اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

یہ ایک عجیب منظر تھا کہ فرعون قد و قامت میں دیو پیکر اور رعب وداب میں باوقار برابر اِدھر اُدھر ٹہل رہا ہے۔ گویا پیر کے نیچے کے پتھروں کو ضرب لگا لگا کر چور کر دینا چاہتا ہے۔ جس وقت وہ گذرتا تھا خوفزدہ دربان بُت کی طرح کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور ڈر کے مارے سانس نہیں لے سکتے تھے لیکن جب وہ دوسری طرف جاتا تھا۔ تو کہنے لگتے تھے۔

"فرعون کو کیا ہو گیا ہے؟ اگر وہ اپنی مہم سے ناکام واپس آتا تو بھی اسقدر محزون اور ملول نہ ہوتا۔"

اگر فرعون دس فتوحات کے لئے بیس ہزار مقتول اور دو ہزار حسین قیدی عورتوں اور سونے اور آبنوس اور ہاتھی دانت کے بڑے بڑے خزانوں اور نادر جانوروں اور پیداوار کے ذخیروں کے سامنے اپنی فوج کو لُٹتا ہوا اور اپنی گاڑیوں کو الٹتا ہوا دیکھتا اور خود ہزاروں تیروں کے بیچ میں جان

چھوڑ کر بھاگ رہا ہوتا تو بھی وہ اس سے زیادہ غمگین اور مایوس نہ ہوتا۔ ۔ ۔ کیونکہ سرزمین مصر میں لاکھوں فوجیں، بے شمار گھوڑے، لکڑی اور دھات کے کام بنانے والے اور اسلحہ ساز موجود تھے۔ اگر کوئی سخت شکست ہوئی ہوتی تو فرعون اپنی عظیم الشان افواج سے بہت جلد اُس کی تلافی کر لیتا۔ ہاں یہ اور بات ہے۔ کہ وہ کسی ایسی چیز کا خواہشمند ہو جو فوراً نہیں مل سکتی یا اُس کی مرضی اور خواہش میں کسی رکاوٹ کا سامنا ہو گیا ہو یا کوئی ایسا ارمان پیدا ہو گیا جو پُورا نہ ہو سکے!

اس جبروت والے فرعون کو ایک لمحہ کے لئے یہ بھی خیال ہُوا۔ کہ وہ بادشاہ یا دیوتا نہیں ہے۔ بلکہ محض ایک آدمی ہے۔ اپنی سنگ مرمر کی بھول بھلیاں میں ٹہلتے ٹہلتے وہ تھک گیا۔ اور ایک کوچ پر لیٹ کر طمافت کی طلبی کا حکم دیا۔ طمافت ہر قدم پر زمین بوسی کرتا ہُوا حاضر ہُوا۔ وہ اس خلفشار میں تھا کہ اس کا پرشکوہ آقا خوش ہے یا ناخوش لیکن سب سے بڑی فکر اُسے یہ تھی۔ کہ طھوسر کا مکان تو اُس نے تلاش کر لیا۔ اور اب کیا خود طھوسر کی تلاش میں وہ ناکام رہیگا۔ اُس نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھائے اور بادشاہ سے رحم کی استدعا کی۔

"جہاں پناہ! میری جان بخش دے اور مجھے معتوب نہ کر۔ پٹاموناف کی لڑکی طھوسر جس پر عالیجاہ کی نظر رحمت پڑی ہے ضرور مل جائیگی۔ اور جب وہ اپنے گھر واپس آکر ان بیش بہا تحائف کو دیکھے گی جو حضور نے بھیجے ہیں تو اس کا دل پسیج جائیگا۔ اور وہ خود اپنی خوشی سے حضور کے پاس حاضر ہو گی۔ اور اپنے حرم میں جو جگہ حضور دینگے اُسے قبول کر لیگی۔"

فرعون۔ "کیا تو نے ملازموں اور غلاموں سے دریافت کیا ہے ہ مار کے آگے بھوت بھاگتا ہے۔ اور تعذیب اُن سے وہ کہلوا لیگی جسے وہ چھپانا چاہتے ہیں۔"

طمافت۔ "نوفری اور سوہیم اُس کے قدیم اور مرغوب ملازمین کا خیال ہے کہ وہ باغ کے راستہ سے گئی ہے! اسکا پھاٹک دریائے نیل کی طرف ہے۔ اور دریا پر کچھ پتہ نہیں چلتا۔"

فرعون۔ "دریائے نیل کے کشتی بان کیا کہتے ہیں؟"

طمافت۔ "اُنھوں نے سوائے ایک غریب عورت کے جو بھاگی جا رہی تھی کسی کو نہیں دیکھا۔ یہ عورت کسی طرح حسین اور دولتمند طھوسر نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وہ بیگمات کی طرح مکلّف لباس میں نکلتی ہے۔"

طمافت کے استدلال سے بظاہر فرعون مطمئن نہیں ہوا وہ دل ہی دل میں غور کرتا رہا۔ اور طمافت خاموشی کے ساتھ عتابِ شاہی کے جوش کا منتظر کھڑا رہا۔ یہانتک کہ بادشاہ کے لبوں کو جنبش ہُوئی۔

فرعون۔ "یہ سادہ لباس ۔ ۔ ۔ محض ایک بھیس تھا ہاں بیشک یہی بات ہے۔ اور اس بھیس میں وہ دریا کے اُس پار گئی ہے۔ طمافت احمق ہے۔ اسے عقل چھو نہیں گئی۔

میرا جی چاہتا ہے کہ اسے دریائی جانوروں کے منہ میں جھونک دوں لیکن ایک عالی خاندان کنواری لڑکی کا اپنے گھر سے ہلکے کے سُنے نکل بھاگنا کیا معنے رکھتا ہے؟ کیا اس پر اسرار واقعہ میں عشق کی جھلک ہے؟

اس خیال سے فرعون کا چہرہ بے بسی کے غصہ سے تمتما اُٹھا۔ اور پھر زرد پڑ گیا وہ دانت پیس رہا تھا۔ اور اس کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ اسقدر خوفناک تھا کہ طافت اس کے سامنے مُردہ کی طرح گر پڑا۔ لیکن فرعون نے اپنا غُصہ ٹھنڈا کیا۔ اس کے چہرے پر پھر شاہی رعب و داب آ گیا۔ اور تکان کے ساتھ ساتھ نرمی کا اظہار ہونے لگا۔ طافت کو پڑا ہوا دیکھ کر اُس نے حقارت کے ساتھ پیر سے دھکیل دیا۔ طمافت رُوحانی تکلیف سے گھٹ رہا تھا۔

فرعون۔ "طمافت اُٹھ۔ اُٹھ اور جلدی سے دوڑ۔ ہر طرف آدمی بھیج۔ ہر معبد قصر مکان باغ اور ہر جھونپڑے کی تلاشی لے۔ طھوسر کو ڈھونڈ نکال۔ تمام راستوں پر تلاش کے لئے گاڑیاں جانی چاہئیں۔ دریائے نیل پر کشتیوں سے جستجو کی جائے۔ تو خود بھی جا اور ہر شخص سے دریافت کر۔ مصر کے چپہ چپہ میں اُسے تلاش کر۔ اور زندہ یا مردہ جس حالت میں ملے لیکر آ۔ ورنہ تو خود خوفناک عذاب کے ساتھ فنا کر دیا جائے گا۔"

طمافت یہ سُنتے ہی ہرن کی طرح دوڑا۔ کہ فرعون کے احکام کی ہوبہو تعمیل کرے۔ فرعون اب پہلے سے زیادہ بارُعب ہو گیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد گاڑیوں کی تند گرج سے سارا محل گُونج اُٹھا۔ جو ہر طرف بے تحاشا دوڑ پڑیں۔ اور سڑکوں کو بھر دیا۔ ہر طرف کوڑوں کی آواز اور ہانکنے والوں کی پُکار اور پہیّوں کی چرچراہٹ سُنائی پڑتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر بعد فرعون نے ایک فصیل پر سے دیکھا کہ کشتی بان پوری کوشش سے پانی کی سطح پر کشتیوں کو لئے جا رہے ہیں۔ اور دریا کے دوسرے کنارے پر پیادے تیزی کے ساتھ آبادی کی طرف جا رہے ہیں۔ کوہ لیبا کا سلسلہ گلابی روشنی اور زمردی سایہ کے ساتھ نگاہ کو روک رہا تھا اور رامسیس اور امیناف اور سنفشا کی دیو ہیکل عمارتوں کا پشت پناہ بنا ہوا تھا۔ سربفلک اور گاؤدم منارے اور دیواریں اور پہاڑ میں کٹے ہوئے دیو ہیکل مجسمے سب سُورج کی کرنوں سے مطلا ہو رہے تھے۔ ان کی جسامت اور عظمت میں اس قدر فاصلہ کے باوجود بھی کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لیکن فرعون کا خیال ان پرشکوہ عمارات پر نہ تھا۔ انہیں کھجور کے درختوں اور کھیتوں اور مکانوں اور قصروں میں کہیں نہ کہیں طھوسر ضرور چھپی ہوگی۔ کسی چھت کے نیچے یا سایہ میں یا دُھوپ میں وہ آرام کر رہی ہوگی یا پناہ گزین ہوگی۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ تمام منظر شیشہ کی طرح شفاف ہو جائے تو یقیناً طھوسر مل جائیگی۔

یہ گھڑیاں اس طرح گذر رہی تھیں جس طرح اس حالت میں گذرتی ہیں۔ کہ ایک شخص منتظر بیٹھا ہے۔ اور آتش شوق سے مضطرب ہے۔ اور دوسرا نہ آتا ہے اور نہ آواز سنتا ہے۔ آفتاب پہاڑوں کی پشت پر غروب ہو چکا۔ اور شبیہ پر اپنے آخری شعلے کا خط نمایاں کر چکا۔ پیامبر ابھی تک نہیں واپس آتے۔ لیکن فرعون اسی طرح خاموش بیٹھا رہا۔ سنسان، تازہ دم اور نیلگوں رات شہر پر حاوی ہو گئی۔ ستارے آسمان پر چمک کر دریائے نیل پر روشنی ڈال رہے تھے۔ اور اپنی زرد سنہری شعاعیں پھیلا کر آسمان کے نیلے پن اور دریا کے سکون میں اور اضافہ کر رہے تھے۔

ادھر اپنے قصر کی فصیل کے ایک کونے پر فرعون خاموش بے حس و حرکت دیوار کی آڑ لئے ہوئے بت کی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اور چاروں طرف نظر دوڑا کر اس عظیم الشان شہر کو دیکھ رہا تھا جس کا وہ خود مختار مالک ہے۔ اور سوچ رہا تھا کہ انسانی طاقت اور اثر کسقدر محدود ہے۔" ان تمام مکانات میں وہ لوگ ہیں جو میرے سامنے زمین بوس ہوتے ہیں۔ اور میرا حکم ان کے لئے دیوتاؤں کا حکم ہے۔ جب میں طلائی سکھپال پر اپنے فوجی افسروں کے شانے پر نکلتا ہوں۔ اُس وقت کنواری لڑکیوں کا دل اُچھلنے لگتا ہے۔ اور وہ دُور دُور تک شرمگیں نگاہوں سے میرا تعاقب کرتی ہیں۔ مذہبی پیشوا میرے سامنے بخورات جلاتے ہیں۔ اور لوگ کھجور یا پر کا پنکھا لیکر جھلتے ہیں۔ تاکہ میرے گرد و پیش کی ہوا ٹھنڈی ہو جائے۔ میرے تیروں کی سنسناہٹ سے قوموں کا دل دہل جاتا ہے۔ اور پہاڑوں کے برابر میناروں کی دیواریں بھی فتوحات کے کتبوں کے لئے کافی نہیں ہیں۔ میرے بڑے بڑے مجسمے تیار کرنے کے لئے پتھر کی کانیں چھان ڈالی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن ۔۔۔۔ آہ جب میں کوئی خواہش کرتا ہوں۔ اور صرف ایک خواہش پر اپنی تمنائیں مرکوز کر دیتا ہوں۔ تو وہ خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔ طافت ابھی تک نہیں آیا۔ طھوسر! ہائے طھوسر!! میرے اس ہولناک انتظار کا بدلہ دے کہ مجھے خوش کرنا تجھ پر فرض ہے۔"

اسی اثنا میں طافت کی سرکردگی میں مختلف پیامبروں نے مکانات اور قصروں کی تلاشی لی۔ اور ہر اُس جگہ اور راستہ پر پہنچے جہاں جا سکتے تھے۔ اور سوالات اور تفتیش سے لوگوں کا ناطقہ بند کر دیا۔ طھوسر کا نام اور وضع قطع ہر شخص سے بتائی جاتی تھی۔ اُس کی ہر ادا تفصیل کے ساتھ بیان کی جاتی تھی۔ تاہم کوئی شخص ایسا نہ مِلا۔ جو یہ کہتا کہ اُس نے حال ہی میں اُسے دیکھا ہے۔ ایسا کوئی جواب نہ مِلا جس سے مضطرب اور تھکے ہوئے متلاشیوں کو کوئی امداد ملتی یا امید پائی جاتی۔

آخرکار پہلا پیامبر آیا اور فصیل کے قریب گیا اور آہستہ

سے کہا کہ طہوسر کا پتہ نہیں چلا۔ فرعون نے اپنا عصائے شاہی اس زور سے مارا کہ پیامبر زمین پر لوٹنے لگا۔ اور دم توڑ دیا۔ دوسرا پیامبر بھی آیا اور فصیل کی طرف جاتے ہوئے اپنے ساتھی کی لاش سے ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ خوف وہراس سے اس کے سارے جسم میں رعشہ پیدا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ فرعون غصّہ سے بھرا ہُوا ہے۔

بادشاہ نے بلا اپنی جگہ سے حرکت کئے ہُوئے سوال کیا۔ "طہوسر کہاں ہے؟"

بدقسمت پیامبر نے ملک معظم کے قدموں کے سایہ کو بوسہ دیکر کہا "مہان پناہ اس کا کچھ پتہ نہیں چلا!"

بادشاہ کے ہاتھ کو پھر جنبش ہُوئی اور عصائے شاہی نے اس بیچارے کا سر توڑ دیا۔ جس نے کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا تھا۔

تیسری بار آنے والے پیامبر کا بھی یہی حشر ہُوا۔

خود طمافت گھر گھر تلاش کرتا ہُوا پوٹری کے برآمدہ میں پہنچا جورات کو اپنے شبینہ سفر سے واپسی پر نام نہاد حورا کو نہ پاکر سخت حیرت میں تھا۔ ہارفری اور دیگر ملازمین جنہوں نے رات کو اس کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔ کچھ پتہ نہ دے سکے۔ اُس کا کمرہ خالی تھا۔ اور اُنھوں نے باغات اور ذخیرہ خانوں اور دیگر مقامات پر تلاش کیا۔ لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

مضطرب طمافت کے سوال پر پوٹری نے طہوسر کی آمد اور دفعتہً غائب ہو جانے کا قِصّہ کہا۔ اور سارا ماجرا بالتفصیل بیان کیا۔ یہاں سے وہ کس راستہ سے گئی اس کا علم کسی کو نہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ برآمدہ میں کھانا کھا کر اور آرام لیکر اُس نے اپنی مجوزہ منزل کی طرف راہ لی۔ اس منزل مقصود کا کسی کو سان گمان بھی نہیں۔

پوٹری (اسی سلسلہ میں) وہ ایک حسین عورت تھی اور ہر وقت ملول رہتی تھی۔ اور بالکل سادے کپڑے پہنے ہوئے تھی۔ وہ غریب معلوم ہوتی تھی۔ اور اس نے اپنا نام حورا بتایا تھا۔ اُسے یہ پہلی بار معلوم ہُوا۔ کہ حورا حقیقتہً طہوسر تھی۔ . . . .

یہ خبر لیکر طمافت نہایت سرعت کے ساتھ قصر شاہی کی طرف گیا۔ اور سارا حال بادشاہ سے بیان کیا۔

فرعون۔ "وہ پوٹری کے مکان پر کیوں گئی؟" اور پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ "بیشک اگر حورا طہوسر ہی تھی تو وہ یقیناً پوٹری پر عاشق ہوگی۔ پھر بھی ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو کیونکہ اگر وہ پوٹری پر عاشق ہوتی تو اپنے محبوب کے گھر سے اس طرح نہ بھاگ جاتی۔ اُف! ایں فرعون اُسے تلاش کرکے چھوڑونگا۔ خواہ مجھے ساری سرزمین مصر کو اُلٹ پلٹ دینا پڑے۔"

باب یازدہم

راحیل کی نیکدلی

راحیل اپنے چھوٹے جھونپڑے کے دروازے پر کھڑی

ہوئی پوڑی کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ کہ اُس کے کانوں میں ایک کمزور سرد آہ کی بھنک پڑی۔ وہ بغور سُننے لگی۔

کُتّے چاند کی طرف دیکھ کر بھونک رہے تھے۔ اور دریا کے کنارے سے دریائی جانوروں کی ہولناک آوازیں آرہی تھیں نوجوان اسرائیلی عورت اندر واپس ہی جانا چاہتی تھی کہ اُس نے پہلے سے زیادہ صاف کراہنے کی آواز سُنی۔ اور ٹھہر گئی۔ اُس نے اچھی طرح سمجھ لیا۔ کہ یہ معمولی رات کی آواز نہیں ہے بلکہ کسی آدم زاد کے گلے سے نکلی ہوئی ہے۔ غالباً کوئی شخص مصیبت یا تکلیف کی حالت میں ہے۔ یہ سوچ کر اُس نے اس طرف کا رُخ کیا۔ جدھر سے آواز آرہی تھی لیکن اس خوف سے کہ مبادا کوئی فریب نہ ہو۔ اُس نے نہایت احتیاط سے قدم بڑھایا جھونپڑے کی دیوار کے قریب ماہتاب کی روشنی کی آڑ میں اُسے ایک جسم زمین پر پڑا ہُوا نظر آیا۔ یہ جورا تھی اور لباس کی قطع سے صاف ظاہر ہو رہا تھا۔ کہ کوئی عورت ہے۔

راحیل نے جب یہ دیکھا کہ محض ایک عورت ہے جو گر پڑی ہے۔ یا غش آگیا ہے۔ تو اُس کا خوف جاتا رہا۔ اور اس خوبصورت اور لرزہ براندام جسم کے پاس جُھک کر سانس اور دل کی حرکت دیکھنے لگی۔ اُس نے دیکھا کہ اس کے لب بالکل بند ہو گئے ہیں۔ اور دل کی حرکت بدقت محسوس ہوتی ہے۔ اس کے کپڑوں کو پانی سے تر دیکھ کر راحیل کو خیال ہُوا کہ یہ خون ہے۔ اور کسی نے اسے قتل کیا ہے۔ اس نے اپنی ملازمہ ثامر کو بلایا اور کسی نہ کسی طرح اس بیہوش اور تر جسم کو دونوں مل کر جھونپڑے کے اندر اُٹھا لے گئیں۔ اور ایک بستر پر لٹا دیا۔ ثامر نے ایک چراغ اُٹھایا۔ اور راحیل جھک کر اس نوجوان لڑکی کا زخم تلاش کرنے لگی۔ لیکن کہیں پر زخم نہیں ملا۔ اُنہوں نے اس کے تر کپڑے اُتارے اور ایک اونی گرم لبادہ اوڑھا دیا۔

اب طھوسر نے آہستہ آہستہ آنکھ کھولی۔ اور خوف و ہراس کے ساتھ چاروں طرف دیکھنے لگی۔ جیسے کوئی ہرن شکاریوں کے ڈر سے بدحواس ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس کے ہوش و حواس بجا ہوئے۔ اور اُس نے اپنی گذشتہ زندگی کی یاد تازہ کی۔ خیالات منتشر ہو رہے تھے۔ اور دماغ میں ایک قسم کا خلا محسوس ہوتا تھا۔ ابھی تک وہ اسے نہ سمجھ سکی۔ کہ وہ کیونکر اس کمرہ میں اور اس بستر پر پہنچی۔ ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی اُس نے پوڑی اور راحیل کو ایک ساتھ ہاتھ میں ہاتھ ملاتے عشقیہ راز و نیاز میں مصروف دیکھا تھا۔ اور یہ سماں دیکھ کر وہ خود خائف ہو رہی تھی۔

آخر کار تھوڑی دیر بعد یاد تازہ ہوئی اور اُسے اصل صورت معاملہ معلوم ہوئی۔ اس وقت روشنی نے راحیل کے خوبصورت چہرے کا پورا نقشہ اس کے سامنے کر دیا۔

اب طھوسر آرام لے چکی تھی۔ اور مصیبت کا خیال دل سے دُور ہو چکا تھا۔ اس نے راحیل کو بغور دیکھنا شروع کیا اور

اُسے اسقدر حسین اور قبول صورت دیکھ کر اُسکا دل بیٹھ گیا اور اُس نے زنانہ حسد کے ساتھ راحیل کی صورت میں کوئی نہ کوئی عیب نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن بالکل ناکام رہی۔ حقیقتاً راحیل کا حسن طھوسر سے دوبالا تو نہ تھا لیکن برابر ضرور تھا۔ راحیل اسرائیلی حسن کا نمونہ تھی۔ اور طھوسر مصری حسن کا۔ اور جہانتک اُن کی ظاہری شکل و صورت کا تعلق تھا۔ اصل حقیقت یہی تھی۔

گو ایک عشق سے بھرے ہوئے دل کے لئے یہ بہت مشکل تھا تاہم طھوسر کو یہ تسلیم کرنا پڑا۔ کہ پوٹری کا عشق نہایت ہی مناسب موقع پر استعمال ہوا ہے۔ اور اُس نے غلطی نہیں کی۔ یہ خوشنما آنکھیں، حسین ابرو، اُٹھی ہوئی ناک اور سُرخ مسکراتے ہوئے لب یقیناً اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہونگے۔ اُس کا لباس گو مصنوعی اور شوخ تھا۔ تاہم اُس پر بالکل موزوں معلوم ہوتا تھا اور اُس کی دلفریبی میں اضافہ کر رہا تھا۔

طھوسر (آپ ہی آپ) "میں نے بڑی غلطی کی کہ اپنے حسن کے غرور میں خوشامد کرنے والوں کی چاپلوسیوں پر اعتماد کر کے پوٹری کے سامنے فقیر کا بھیس بنا کر غریب اور مفلس کی صورت میں گئی۔ میں بڑی احمق ہوں! یہ تو وہی بات ہوئی۔ کہ کوئی جنگجو فتح کرنے کے خیال سے نکلے اور اپنی ڈھال تلوار ساتھ نہ لے جائے۔ آہ اگر میں مرصع اور مکلف لباس پہنے ہوئے اور جواہرات سے لدی ہوئی غلاموں کے حلقہ میں اپنی گاڑی پر سوار اُس کے پاس گئی ہوتی تو اگر اُسے مجھ سے محبت نہ بھی ہوتی تاہم میرا رعب وداب اُسے مائل کر لیتا۔ میں نے غلطی کی۔ میں نے اپنی عزت آبرو کو خطرہ میں ڈالا اور سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا!"

راحیل (مصری زبان میں کیونکہ اس نے سمجھ لیا کہ اس کا مہمان اسرائیلی نہیں ہے) "اب کیا حال ہے؟" یہ آواز خوشگوار اور دلفریب تھی اور غیر مانوس لہجہ نے اس میں ایک مہربانی اور لطف کی جھلک پیدا کر دی تھی۔

طھوسر اپنی مرضی کے خلاف اس سے متاثر ہوئی۔ اور آہستہ سے جواب دیا۔ "میں اب کچھ اچھی ہوں۔ تمہاری تیمارداری نے مجھے قریب قریب اچھا کر دیا"۔

راحیل (طھوسر کے لبوں پر انگلی رکھ کر) "اب بات چیت کر کے اپنا جی نہ تھکاؤ۔ سونے کی کوشش کرو۔ تاکہ آرام لیکر طاقت آجائے۔ ثامر اور میں سوتے وقت تمہارے پاس بیٹھیں گی"۔

جذبات کی کثرت، دریائے نیل کا پیرنا اور تھیبہ کے غریب حصہ میں دیر تک کا سفر ان تمام باتوں نے پیٹا مونات کی ہمت ور لڑکی کا جسم تھکا دیا تھا۔ اور اس کا جوش بھی قریب قریب ماند پڑ گیا تھا۔ اُس کا نازوں کا پالا ہوا جسم ڈھیلا پڑ گیا۔ اور پلکیں جھپک گئیں۔ اور خوبصورت سیاہ حلقے نظر

آنے لگے۔ رخساروں پر خفیف سی حرارت معلوم ہو رہی تھی۔ نیند تو آہی گئی لیکن نہایت ہی بےچین اور عجیب و غریب خوابوں اور ہولناک واہموں سے بھری ہوئی۔ وہ لرز رہی تھی۔ اور ٹوٹے ہوئے الفاظ اور جملے مُنہ سے نکل رہے تھے۔ اور نیم باز ہونٹوں سے خواب کے سوالات کا خواب کی حالت میں جواب دے رہی تھی۔

راحیل اور ثامر اس بخار میں سونے والی کی ہر نقل و حرکت کو دیکھ رہی تھیں لیکن ثامر کے دل میں اپنی مالکہ کی طرح ملاطفانہ خیالات نہیں تھے۔ اُسے تعجب تھا کہ یہ عجیب و غریب حُسن کی دیوی کہاں سے آگئی۔ اور کیوں آئی؟ اُس کے تحیر آمیز سوالات کا کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ ملا۔ راحیل خاموش تھی لیکن ثامر نے سلسلہ گفتگو چھیڑا۔

ثامر۔ "بیوی میرا خیال ہے کہ اس عورت کا آنا مبارک نہیں ہے"

راحیل۔ "کیوں ثامر؟"

ثامر۔ یہ عجیب بات ہے کہ وہ بالکل ہمارے دروازے ہی پر بیہوش ہوئی۔"

راحیل۔ "یہ کوئی بات نہیں۔ جہاں اس کے مرض نے اُس پر قابو پایا وہیں پر وہ گر پڑی۔"

معمر ماما نے شبہ کے ساتھ سر ہلایا۔

راحیل۔ کیا تجھے یقین نہیں ہے کہ اُس کی بیہوشی واقعی ہے تھکی ہوئی نگاہ، زرد لب اور زرد رُخسار، بےحس و حرکت اعضا اور مُردوں کی طرح سرد جسم ..... کیا یہ باتیں مصنوعی ہو سکتی ہیں؟

ثامر۔ نہیں یہ تو نہیں لیکن ایسی باتیں مکاری کی ہو سکتی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ بیہوش ہو گئی تھی۔

راحیل۔ "پھر تجھے یہ شکوک کیوں پیدا ہوئے؟"

ثامر۔ "آدھی رات کے وقت ایک ایسے دُور دراز مقام پر جہاں ہماری قوم کے غریب قیدی بستے ہیں۔ جن سے ظالم فرعون اینٹیں بنانے کا کام لیتا ہے یہ کیونکر آگئی؟... اس نوجوان مصری عورت کا ہمارے غریب جھونپڑے کے پاس آنے سے کیا منشا ہے؟ اس کے کپڑے کیوں اس طرح تر ہیں۔ جیسے کوئی کسی چشمے یا دریا سے نکل آیا ہو؟ یہی باتیں ہیں جو اس اجنبی مہمان کے متعلق میری سمجھ میں نہیں آتیں۔"

راحیل۔ (آہستگی سے) "ان باتوں سے میں اسی طرح ناواقف ہوں جس طرح تو ہے۔"

ثامر۔ اگر یہ ہمارے آقاؤں کی مُلازم کوئی جاسوس ہے تو جو کچھ ہو جائے وہ تعجب ہے۔ اور ممکن ہے کہ ہم مصیبت میں پڑ گئے ہوں۔"

راحیل۔ یہ نوجوان لڑکی اپنی اس مصیبت اور بےبسی کی حالت میں ہمیں کیا نقصان پہنچا سکتی ہے؟ اس کی قسمت ہمارے

ہاتھ میں ہے۔ اگر ذرا بھی دغابازی کا اندیشہ ہو تو ہم اسے قید رکھ سکتے ہیں۔"

ثامر۔ "راحیل یہ سمجھ لو کہ یہ عورت اُس طبقہ کی نہیں ہے جس کی وضع میں وہ اس وقت ہے۔ اس کے خوبصورت بنے ہوئے ہاتھوں کو دیکھو۔ اس کی غربت اور سادہ لباس محض ایک دھوکہ ہے۔"

آخر کار ثامر کے الفاظ اور استعجاب سے راحیل بھی متاثر ہوئی۔ اور اپنے غیر معمولی مہمان کو بغور دیکھنے لگی۔ اور چراغ کی دھندلی روشنی میں اُس کے خط و خال کا مطالعہ شروع کیا۔

اُس نے طھوسر کے ہاتھ، بازو اور چہرے پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ یہ نوجوان مصری عورت کس قدر خوبصورت ہے۔ گو اس انکشاف سے راحیل کے مشفقانہ خیالات ذرا بھی برے نہیں ہوئے۔ اُسے یہ نہیں یقین آیا اس قدر حسن اور دلآویزی کیونکر ایسی بری روح کی حامل ہو سکتی ہے۔ جو دغابازی کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اس معاملہ میں نوجوان اور صاف باطن اسرائیلی عورت کا خیال اپنی معمر اور تجربہ کار رفیقہ کے خیال سے زیادہ پختہ نکلا۔

رات کسی نہ کسی طرح گذر گئی۔ اور اُن کے ساتھ بیمار کی حرارت بھی بڑھ گئی۔ وہ سوتے سوتے چونک پڑتی تھی اور ہذیان بکنے لگتی تھی۔

ثامر (غضبناک) "اگر یہ یہاں مر جائیگی۔ تو ہم پر قتل کی تہمت لگی جائیگی۔"

راحیل (آہستگی سے) "یہ مریگی نہیں۔"

ثامر۔ "میں اس کی لاش دریائے نیل میں پھینک دونگی اور دریائی جانور اسے کھا جائینگے۔"

رات کے وقت پوٹری آیا۔ اور حورا کو پہچان لیا۔ وہ طھوسر کو یہاں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس کے استعجاب پر راحیل کو بھی حیرت ہوئی۔ وہ پوٹری کے سامنے کھڑی ہو کر اُس کا منہ دیکھنے لگی۔ تاکہ اُس کی آنکھوں کی حرکت سے حقیقت دریافت کرے۔ اور کہنے لگی۔

راحیل۔ "تو تم اسے جانتے ہو؟"

پوٹری۔ "ہاں"

ثامر کی آنکھیں اندرونی مسرت سے چمکنے لگیں کہ اُس کی رائے ٹھیک نکلنے والی ہے۔ لیکن راحیل مطمئن رہی اُسے اپنے عاشق پر اعتماد تھا۔

پوٹری نے سارا ماجرا شاہی جستجو تک بیان کیا۔

ثامر۔ "بوی میرا اندیشہ ٹھیک تھا۔ کیونکہ حورا اور طھوسر ایک ہی چیز ہیں۔"

پوٹری۔ "ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو۔ لیکن اب بھی چند ایسے اسرار باقی رہ جاتے ہیں۔ جو میری سمجھ سے باہر ہیں۔ . . . . طھوسر نے بھیس کیوں بدلا اور یہاں کیونکر آئی۔"

راحیل "۔یقیناً وہ تمہارے پیچھے پیچھے آئی "

آخرکار بحث مباحثہ کے بعد سلسلہ کی مختلف کڑیوں کو جوڑ کر اُنھوں نے سمجھ لیا۔ کہ طھوسر اِس اسرائیلی گھر میں کس طرح پہنچی۔

پوٹری۔ بیشک واقعات اسی طرح گذرے۔ جیسا ہم لوگوں کا گمان ہے۔ تاہم افعال تو میں دیکھ سکتا ہوں۔ لیکن منشا سمجھ میں نہیں آتا۔"

راحیل (مسکراکر) میں تمہیں یہ بھی سمجھا دونگی۔ حورایا طھوسر بھیس بدل کر تمہارے گھر آئی۔ تاکہ تمہارے پاس رہے۔ اور رشک کی وجہ سے اُس نے تمہارا تعاقب کیا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا۔ وہ تم پر عاشق ہے۔ تم خوبصورت مضبوط اور نیک دل ہو۔ تاہم میرا کوئی ہرج نہیں۔ مجھے بالکل رشک نہیں ہے۔ کیونکہ تم اُس سے محبت نہیں کرتے۔ اب سب کچھ اچھی طرح سمجھ گئے ؟

پوٹری کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ اُسے اندیشہ ہوا کہ راحیل کو غصّہ ہے۔ اور وہ کسی طرح اس کی محبت کا امتحان لینا چاہتی ہے لیکن راحیل جس ملاطفت اور صاف دلی کی نظروں سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ اُس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ ان روشن اور صاف نگاہوں کے پس پشت کوئی دوسرا خیال نہیں ہے۔ ہاں وہ یہ البتہ نہیں چاہتی تھی۔ کہ اُس کے دل کے مالک پوٹری سے طھوسر محبت کرے۔ راحیل کی محبت اس کے لئے کافی ہے۔

یکایک خواب و خیال کے واہمہ کے ساتھ طھوسر نے پوٹری کو اپنے پاس کھڑا ہوا دیکھا۔ خوشی کے مارے اُس کا چہرہ تمتما اُٹھا۔ اور اپنے جسم کو جنبش دیکر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اپنے لبوں سے لگالیا۔

پوٹری (بے پروائی سے) "اس کے لب جل رہے ہیں۔"

راحیل۔ ان لبوں میں بُخار کے ساتھ ساتھ محبت کی آگ بھی جل رہی ہے۔ لیکن وہ واقعی بیمار ہے۔ ثامر ذرا جاکر موسےٰ کو بلا لائیگی؟ وہ فرعون کے بنے ہُوئے حکیموں اور دعا تعویذ کرنے والوں سے زیادہ سمجھدار ہے۔ فرعون کے مشیر جو کچھ کر سکتے ہیں وہ سب کچھ وہ بھی کر سکتا ہے۔ اُسے نباتات اور تمام جڑی بوٹیوں کا علم ہے۔ میں اسقدر سنگدل نہیں ہوں کہ یہ خواہش کروں کہ وہ اچھی نہ ہو۔"

ثامر رخصت ہوئی اور ایک سفید ریش روشن آنکھوں والے طویل القامت شخص کو لئے ہوئے واپس آئی۔ اس کی وضع پیغمبروں اور صاحب کرامات لوگوں کی طرح تھی۔ پوٹری نے اُس سے کچھ باتیں کیں اور وہ طھوسر کے بستر کے پاس بیٹھ گیا۔ اور اپنے ہاتھ اُس پر پھیر کر کہنے لگا۔

" اُس قادر توانا کے نام سے جس کے سامنے تمام دوسرے دیوتا محض بُت اور شیطان ہیں۔ اے نوجوان لڑکی اگر تو خُدا کی پسندیدہ قوم کی نہیں ہے۔ تاہم تو اچھی ہوجا!"

باب دوازدہم

ثامر کی دغا بازی

یہ معمر شخص متانت کے ساتھ قدم بڑھاتا ہوا رخصت ہوا۔ اور سب لوگ امید کی نظروں سے مریضہ کو دیکھنے لگے۔

طھوسر بیماری کی الجھن میں تعجب کے ساتھ کمرے کے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اور جو کپڑا اسے دیا گیا تھا اسے اپنے جسم پر لپیٹ کر اٹھی اور اپنے بستر پر بیٹھ گئی۔ تکان اور بخار بالکل جاتا رہا۔ اس کی طبیعت اس طرح بشاش ہو گئی۔ جیسے کوئی دیر تک آرام کر کے اٹھا ہو اور اس کا حسن اپنی تمام دلفریبی کے ساتھ پھر سے واپس آگیا۔ اس نے اپنے بالوں کی لٹوں کو جو کانوں کے پاس بے ترتیبی سے لٹک رہے تھے پیچھے پھینک دیا۔ اور سیدھی کھڑی ہو گئی تاکہ پوٹری اس کی طرف متوجہ ہو۔ لیکن یہ دیکھ کر کہ وہ راحیل کے پاس بے حس و حرکت لیٹا ہوا ہے۔ اور کسی اشارے یا جنبشِ ابرو سے اس کی ہمت افزائی نہیں کرتا۔ وہ نوجوان اسرائیلی کے پاس گئی۔ اور اپنے ہاتھ اس کے گلے میں ڈال دیے۔ اور اسی طرح بڑی دیر تک جھکی رہی۔ اس کا سر راحیل کے سینہ میں چھپا ہوا اور آہستہ آہستہ آنسو بہ رہے تھے آخر کار چند سسکیاں نکل آئیں اور وہ اپنے رقیب سے چمٹ گئی اور اسے ہلانے لگی۔ اس بیکسی اور بے بسی سے راحیل کا دل بھی پسیج گیا۔ طھوسر نے بظاہر اپنی شکست کا اعتراف کر لیا۔ اور اپنی عاجزانہ اور بے زبان التجاؤں سے رحم اور توجہ کی درخواست کرنے لگی۔ اس نے اپنے رقیب کی نیک دلی سے استدعا کی۔

راحیل کا دل نرم ہو گیا۔ اس نے طھوسر کو پکڑ لیا۔ اور کہنے لگی۔

راحیل۔ "آنسو پونچھ ڈالو اور اسقدر بے بس نہ ہو تم پوٹری سے محبت کرتی ہو۔ اچھا کرو۔ مجھے رشک نہیں ہو گا۔ ہماری قوم کے پیشوا یعقوبؑ کے دو بیویاں تھیں اور وہ ہنسی خوشی ایک ساتھ رہتی تھیں۔"

طھوسر راحیل کے قدموں پر گر پڑی۔ اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا۔ لیکن راحیل نے اسے نہایت ہی خواہرانہ انداز سے اٹھا لیا۔ اور اپنا ہاتھ طھوسر کی کمر میں ڈال دیا۔

یہ ایک نہایت ہی دلفریب منظر تھا۔ کہ دو مختلف قوموں کی عورتیں اور دونوں حسین ایک دوسری سے ملی ہوئی کھڑی تھیں۔ طھوسر نازک اندام خوبصورت اور موزوں خط و خال کی جوانی پر مائل لڑکی تھی۔ اور راحیل دلفریب مضبوط اور خوش اندام عین عنفوان شباب میں تھی۔

پوٹری (بیدار ہو کر) "طھوسر ...... تم طھوسر ہو؟"

طھوسر (جھک کر) "ہاں"

پوٹری۔ تعجب ہے کہ تم ثیبہ کے ایک عالیشان مکان میں

غلاموں اور دیگر لوازمات امارت کے ساتھ رہتی ہو۔ اور تم نے ایک ایسے شخص کو محبت کے لیئے انتخاب کیا۔ جو ایسی قوم کا ہے جو اس وقت غلامی کی حالت میں ہے۔ ایسا شخص جو تمہارے لئے بالکل اجنبی ہے۔ اور تمہارے مذہب کا نہیں۔ ایسا شخص جو تم سے کوسوں دُور ہے؟"

راحیل اور طھوسر دونوں مسکرانے لگیں۔ انسان کا دل جس سے چاہتا ہے محبت کرتا ہے اور جذباتِ محبّت پر قابو نہیں چلتا۔

پوٹری۔" گو فرعون مجھ پر مہربان ہے تاہم مَیں تمہاری برابر کا نہیں ہوں۔ مصریوں کی نظر میں مَیں ایک غلام ہوں۔ اور تم مذہبی پیشواؤں کے طبقہ سے ہو جس کی سب سے زیادہ عزّت اور وقعت کی جاتی ہے۔ اگر تم مجھ سے محبّت کرتی ہو جیسا کہ واقعہ ہے۔ تو تمہیں اپنی عزّت سے دست بردار ہونا پڑیگا۔ کیا ہم دونوں کی شادی ہوسکتی ہے؟"

طھوسر۔ کیا مَیں پہلے ہی تمہارے گھر کی غلامی نہیں کر چکی ہوں؟

پوٹری۔ تمہیں اپنا مُلک چھوڑنا پڑیگا۔ اور میرے ساتھ صحراؤں میں ہو کر اجنبی ممالک میں جانا پڑیگا۔ جہاں چلچلاتی ہُوئی دُھوپ اور گرم ہوائیں ہیں۔ اور بالو کے اُڑتے ہوئے تودے سڑکوں کو مٹاتے رہتے ہیں۔ وہاں کوئی درخت یا خوشگوار چشمہ نہ ملیگا۔ سڑکوں پر اُن لوگوں کی ہڈیاں پٹی پڑی ہیں۔ جو پیشتر اسی راستہ سے گئے اور منزلِ مقصود تک نہ پہنچنے پائے۔"

طھوسر (اطمینان کے لہجہ میں)" مَیں چلونگی"

پوٹری۔" ہاں ابھی بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ تمہارے دیوتا ہمارے دیوتا نہیں ہیں۔ ہمارے خدا یہوداہ نے کہا ہے کہ ہمیں پتھر یا لکڑی یا دھات کی پرستش نہ کرنی چاہیئے۔ صرف ایک خدا غیر محدود غیر فانی اور بلا جسم اور رنگ کے اُس تمام خلا کو بھرنے کے لئے کافی ہے۔ جسے تم مصریوں نے وہمی تصویروں سے بھر دیا ہے۔ ہمارے خدا نے ہمیں پیدا کیا ہے اور تم اپنے خداؤں کو خود پیدا کرتے ہو۔"

طھوسر جھجھک گئی اور اس کے دل میں طرح طرح کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ کیا وہ اپنا مذہب چھوڑ سکتی ہے؟ اُس نے پوٹری سے کہا کہ تم اپنے خدا کی صفات بیان کرو تو میں سمجھنے کی کوشش کرونگی۔

پوٹری۔" یہ بات ٹھیک ہے۔ اب تم میری بیوی ہوگی لیکن اس اثنا میں تم یہیں رہو۔ اور ذرا انتظار کرو۔ کیونکہ فرعون جو تمہارے عشق میں مبتلا ہے۔ سارے مصر کی تلاشی لے رہا ہے۔ اس غریب جھونپڑے میں تمہیں کوئی نہ پائیگا۔ اور چند دنوں میں ہم اس کے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔ ہاں اب رات جا رہی ہے مجھے رخصت ہونا چاہیئے۔

یہ کہکر پوٹری رخصت ہوگیا۔ اور دونوں عورتیں ہاتھ میں ہاتھ ملا کر چھوٹے سے تنگ بستر پر سوگئیں۔

ثامر جو اس تمام گفتگو کے دوران میں ایک کونے میں چپکی لیٹی ہوئی تھی۔ اب اٹھی اور دونوں بیویوں کے خراٹے سننے لگی جب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ بے خبر سو رہی ہیں۔ تو وہ چپکے چپکے ٹٹولتی ہوئی دروازے کی طرف گئی۔ اور وہاں سے تیز قدم بڑھاتے ہوئے دریائے نیل کا رخ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ صاف راستہ پر آ گئی۔ اور وہ خطرے کے مقامات اور جنگل پیچھے چھوڑ دیئے۔ جہاں کبھی کبھی ڈاکو آکر چھپ رہتے تھے اور شہر کے آباد حصہ پر چھاپہ مارتے تھے۔ تین چار سڑکیں سامنے تھیں۔ جن پر دو رویہ عالیشان مکان بنے ہوئے تھے جن کا سایہ دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ آخر کار وہ قصر شاہی کے بیرونی حصہ میں پہنچ گئی۔ اور یہی سر دست اُس کی منزلِ مقصود تھی۔ لیکن اب داخلہ کیونکر ہو! ایک بڈھی اسرائیلی عورت کو جو پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے اور راستہ کی خاک میں اٹی ہوئی ہے۔ آدھی رات کے وقت کون اندر جانے دیگا۔ چند درباریوں نے اُسے ڈپٹ کر روکا۔ اور چند ڈنڈے رسید کئے۔ لیکن آخر کار اُنھوں نے پوچھا کہ آخر کیا چاہتی ہے۔

ثامر ۔" میں فرعون سے ملنا چاہتی ہوں۔"

دربان ہنسی سے لوٹنے لگے۔ لیکن وہ نہایت سختی سے اپنے ارادہ پر قائم رہی۔

ثامر ۔" میں فرعون سے ملنا چاہتی ہوں مجھے فوراً وہاں تک پہنچاؤ۔"

ایک سپاہی (پیچھا چھڑانے کے خیال سے) " ہاں یہ بہت اچھا وقت ہے۔ فرعون تین پیامبروں کو مار چکا ہے۔ اور اس وقت فصیل کے ایک طرف بدی کا دیوتا بنا ہوا کھڑا ہے۔" ثامر نے زبردستی داخل ہونا چاہا۔ لیکن دربانوں نے پھر مار کر الگ ہٹا دیا۔ اس کی چیخ پکار کو سنکر ایک افسر آیا اور اس نے چلا کر اس افسر سے کہا۔

ثامر ۔" میں فرعون کے پاس پہنچنا چاہتی ہوں مجھے فرعون کے پاس لے چلو۔"

افسر ۔" یہ بالکل ناممکن ہے۔ اگر ملک کا کوئی بڑے سے بڑا آدمی بھی ہوتا تو بھی رسائی ناممکن تھی۔ تم جیسی کم مایہ عورت کا ذکر ہی کیا۔"

ثامر (ہر لفظ پر زور دے کر) " میں طوسر کا پتہ جانتی ہوں۔"

یہ الفاظ سنتے ہی افسر کے گولی سی لگ گئی۔ اُس نے ثامر کا ہاتھ پکڑا۔ اور طمافت کو تلاش کیا۔ طمافت اسے لیکر فرعون کی خدمت میں حاضر ہوا۔ ثامر پہنچتے ہی فرعون کے قدموں پر گر پڑی۔ اور چلا کر کہا۔

باقی آئندہ

م۔ص

نقوش

گذشتہ سے پیوستہ

پانچواں منظر

مراری بابو کے مکان کا ایک کمرہ

(کمار چیت پرن کی برات باہر آئی ہوئی ہے۔ باجہ بج رہا ہے۔

مدہو سامان وغیرہ تیار کر رہی ہے۔ اور بہت ہی مصروف ہے۔

مراری داخل ہوتا ہے)

مراری۔ لگن کا وقت آگیا ہے۔ شرت کو جلد بھیجو۔

مدہو (خادمہ سے) جاؤ، کانتی سے کہو شرت کو لیکر جلدی آئے۔

مراری۔ میں تو تھک گیا ہوں۔ ہم نے تکلفات سے شادی بیاہ کو بھی ایک مصیبت بنا لیا۔ لو میں تو جاتا ہوں۔ شرت آجائے تو مجھے فوراً اطلاع دے دینا۔

(جاتا ہے)

(کانتی گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے)

کانتی۔ شرت تو کوئی بات ہی نہیں مانتی۔ رو رو کے بیحال ہوئی جاتی ہے۔

مدہو۔ آخر کیوں، جاؤ تو اُسے میرے پاس لے آؤ۔

(کانتی جاتی ہے)

مدہو۔ عجیب مشکل کا سامنا ہے۔ آجکل کی لڑکیوں میں شرم ہی نہیں رہی۔ ہمارے زمانے میں تو ہمارے منہ میں جیسے زبان ہی نہ ہوتی تھی۔

(کانتی شرت کو گھسیٹتے ہوئے لاتی ہے)

مدہو۔ یہ کیا ڈھونگ مچایا ہے تونے۔

شرت۔ میں شادی نہیں کرونگی۔

مدہو۔ تجھے شرم نہیں آتی۔ کبھی لڑکیوں نے بھی ایسی باتیں زبان سے نکالی ہیں۔

شرت۔ میں تو کہہ رہی ہوں۔

مدہو۔ آخر تجھے ہو کیا گیا۔ دیوانی تو نہیں ہوئی گیا۔

شرت۔ اس میں دیوانہ پن کی کیا بات ہے۔ میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔

مدہو۔ لڑکیوں کی مرضی کا شادی میں کیا دخل۔

شرت۔ کیوں لڑکیوں کے سینے میں دل نہیں ہوتا کیا۔

مدہو۔ یہ انگریزی کے چار حرف پڑھ کر تو ہم صاحب

ہی بن گئی۔ عورت کا وقت تو سر پر آگیا ہے۔ جاؤ جلدی کپڑے پہن لو ایسی بھی کیا ضد

(وہ نہیں جاتی کانتی جلد جلد شرت کو کپڑے الٹا پہنا دو مجھے تو ادھر سے فرصت نہیں

(دروازے پر بات ہے)

کانتی۔ اب انہونی باتوں پر ضد مت کرو۔ اٹھو۔

شرت۔ انہونی باتیں کیسی۔

کانتی۔ یہی جو تم ہر وقت عورتوں کی آزادی کے نسبت الاپتی رہتی تھیں۔

شرت۔ تو کیا میری مرضی کے خلاف تم میری شادی کرو گی۔

کانتی۔ میں کرانے والی کون ہوں۔ جو کرنے والے ہیں وہ کرائینگے ہی۔

شرت۔ میں کیا کوئی پتھر کی گٹھڑی ہوں۔ کہ جہاں چاہا اٹھا کر رکھ دیا۔ لو میں بیٹھی ہوں۔ اور دیکھتی ہوں میری مرضی کے بغیر کوئی کیا کر سکتا ہے

کانتی۔ تو مجھ سے کیوں لڑتی ہو۔ میں تمہاری دشمن ہوں کیا؟

شرت۔ ہاں آج تم بھی میری دشمن ہو۔

کانتی (شرت کو بغل میں لیکر) کیا کہتی ہو شرت میں تمہاری ہی خاطر سب کچھ کر رہی ہوں۔ تم کہتی بھی تو نہیں کہ تم چاہتی کیا ہو۔

شرت۔ یہ تو میں نہیں جانتی کہ میں چاہتی کیا ہوں مگر میں شادی کرنا نہیں چاہتی۔

کانتی۔ تو کہیں جھوٹ جھوٹ ہی میں سچ نہ کر دکھانا۔

(شرت اپنا سر کانتی کے سینے پر رکھ کر روتی ہے)

(مجبور ہو کر) عجیب مشکل ہے۔ دروازے پر برات آئی ہوئی ہے۔ ادھر یہ نہیں مانتی۔ میں کروں تو کیا کروں۔

شرت۔ میں تمہاری مشکل آسان کئے دیتی ہوں۔ اگر میں مر جاؤں تو پھر تو کوئی مشکل نہ ہوگی۔

کانتی۔ مریں تمہارے دشمن۔ ہے ہے ہوش کی باتیں کرو۔

شرت۔ تو اچھا گورو دیو کو بلا لو۔ میں اُن سے خود دو ایک باتیں کرونگی۔

کانتی۔ وہ تمہاری بات کیسے مان سکتے ہیں۔ انہوں نے ہی تو شادی کا انتظام کیا ہے۔ ان کی تو اس میں سب سے زیادہ بے عزتی ہے۔

شرت۔ تم بلاؤ تو۔

کانتی۔ اچھا ان سے کہہ کے بھی دیکھ لو۔

(جاتی ہے)

شرت۔ اس سے تو اچھا تھا کہ اس دن میں گاڑی کے نیچے دب کر مر جاتی۔ نہ نوش بنتوش۔ اگر آخر کو تمہیں میری جان لینی تھی تو اُس دن کیوں بچایا تھا۔

(گورو جی آتے ہیں شرت ان کے قدموں پر گر پڑتی ہے)

شرت۔ گورو دیو بچا لو۔ پرماتما کے واسطے مجھے بچا لو۔

گورو۔ آخر ہُوا کیا۔

شرن۔ مَیں کمار سے شادی نہیں کر سکتی۔

گورو۔ سبب؟

شرن۔ مَیں کسی سوال کا جواب دینے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

گورو۔ برات آئی ہوئی ہے۔ اگر واپس چلی گئی تو اس میں کمار کی صرف بے عزتی ہے۔ مگر تمہاری شادی پھر نہیں ہو سکے گی۔

شرن۔ نہ سہی۔ مَیں تمام عمر ایسی ہی رہونگی۔ مگر اپنی مرضی کے خلاف شادی نہیں کرونگی۔

گورو۔ تو کم از کم یہی کرو کہ کمار کو اپنے منہ سے جواب دے دو۔

شرن۔ اس سے کیا حاصل ہوگا۔

گورو۔ کچھ نہ ہو۔ اسے تو اطمینان ہو جائیگا۔ تمہارے والدین انہیں کس مُنہ سے جواب دے سکتے ہیں۔ تم انہیں سمجھا دو اور ان سے معافی مانگ لو۔

شرن۔ بہت بہتر جو حکم۔

(گورو جی جاتے ہیں)

وہ کمار ہے تو کیا ہُوا۔ کیا اُس کی دولت میری محبّت کو خرید سکتی ہے۔ آج اسے معلوم ہو جائیگا کہ محبّت دولت اور عزّت کو کس نفرت سے دیکھتی ہے۔

(کمار چپت پرسن داخل ہوتا ہے)

شرن۔ آپ نے گورو جی سے سب کچھ سن لیا ہوگا۔ مَیں اس تمام تکلیف کی معافی چاہتی ہوں۔

کمار۔ کیا مَیں پوچھ سکتا ہوں کہ یہ کس تقصیر کی سزا ہے۔

شرن۔ تقصیر آپ کی نہیں میری ہے۔ اور اسی لئے مَیں معافی چاہتی ہوں۔

کمار۔ تقصیر آپ کی ہے اور سزا مَیں بھگتوں۔

شرن۔ سزا تو مَیں بھگتوں گی۔ آپ اگر چاہیں تو سو شادیاں کر سکتے ہیں۔ مگر میری شادی اب نہ ہو سکے گی۔

کمار۔ تو پھر سب کچھ جان بوجھ کر آپ اپنے کو اس مصیبت میں کیوں مبتلا کر رہی ہیں۔

شرن۔ میری قسمت۔

کمار۔ قسمت یا ضد۔

شرن۔ تو ضد ہی سہی۔

کمار۔ تعلیم کا کیا یہی نتیجہ ہے۔

شرن۔ مَیں آپ کے سامنے امتحان دینے نہیں آئی۔

کمار۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو کسی سے محبّت ہے۔

شرن۔ مَیں ایسے الفاظ نہیں سُن سکتی۔ آپ ایک عورت کی توہین کر رہے ہیں۔

کمار۔ ہاں سچ بات ہمیشہ کڑوی معلوم ہوتی ہے۔

شرت۔ سچ بات کہوں۔

کمار۔ میں جانتا ہوں آپ کو منتوش سے محبت ہے۔

شرت۔ (جرأت کرکے) منتوش سے آپ کو کیا نسبت ہو سکتی ہے۔

کمار۔ صرف یہی کہ وہ میرے باپ کا پروردہ ہے۔

شرت۔ وہ اگر آپ کا نوکر ہے تو بھی آپ سے بہتر ہے۔

کمار۔ (اٹھ کر) آپ کو اگر اس سے محبت ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ دوسروں کی بے عزتی کریں۔

شرت۔ مگر آپ کو یہ حق حاصل ہے۔ کہ ایک ایسے شخص کی بے عزتی کریں جو اس وقت آپ کو جواب نہیں دے سکتا۔

کمار۔ آپ جو اس کی طرف سے جواب دینے کو موجود ہیں تو صاف بات یہ ہوئی کہ آپ منتوش کے سوا اور کسی سے شادی نہیں کرینگی

شرت۔ اور کسی کا کیا ذکر۔ میں آپ سے شادی نہیں کرونگی۔

کمار۔ آپ منتوش کا نام لیتے شرماتی کیوں ہیں۔ کہہ بھی ڈالئے۔ کہ منتوش کے سوا آپ کسی سے شادی نہیں کرینگی۔

شرت۔ یہی ہے تو سنئے۔ میں منتوش کے سوا اور کسی سے شادی نہیں کرونگی۔

کمار۔ تو میں بھی جو کچھ کہتا ہوں سن رکھئے۔ میں آپ سے شادی کئے بغیر یہاں سے نہیں جاؤنگا۔

شرت۔ تو کیا زبردستی۔

کمار۔ راجے زبردستی بھی کر لیا کرتے ہیں۔

شرت۔ اوہو اس برتے پر زبردستی کا خیال۔ میں تو کسی راجہ واجہ سے شادی نہیں کرونگی۔ ہمارے لئے تو غریب ہی اچھے ہیں۔

کمار۔ میں نے جو کہہ دیا کہ اب میں آپ سے شادی کرکے ہی جاؤں گا۔

شرت۔ وہ کیسے۔ بس اب آپ تشریف لے جائیے میں بہت باتیں سن چکی۔

کمار۔ تو میں سچ مچ جاؤں کیا؟

شرت۔ ہاں۔

(پیٹھ پھرا کر جانا چاہتی ہے)

کمار (سر کے بال اور مصنوعی لبادہ اُتار کے اصلی آواز میں) شرت۔

شرت (منتوش کو پہچان کر) کیا، منتوش۔

کمار (مُنہ پر اُنگلی رکھے ہوئے) چُپ۔

(دونوں ہم آغوش ہو جاتے ہیں)

پردہ

چھٹا منظر

مراری بابو کے مکان کا برآمدہ

(کانتی بہت غمگین بیٹھی ہے اور سوچ رہی ہے)

کانتی۔ تین سال کے بعد آئے اور صرف آدھ گھنٹہ بیٹھ کر چلے گئے۔ ایسا کونسا قیمتی اسباب تھا۔ جسے لینے کے لئے انہیں خود جانے کی ضرورت ہوئی۔ ماں باپ منتظر ہیں۔ بیوی بیقرار ہے۔ بہن بے چین ہے۔ انہیں کسی کی پروا نہیں۔ میرا گمان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ ضرور کسی میم کو ساتھ لائے ہیں۔ وہ انہیں میرے پاس کیوں آنے دیگی۔

(شرت داخل ہوتی ہے)

شرت۔ بھائی آئے کہ نہیں۔

کانتی۔ کہاں وہ اب یہاں کیوں آنے لگے۔

شرت۔ ایسی مایوسی کی باتیں کیوں کرتی ہو۔ ابھی آتے ہوں گے۔

کانتی۔ نہیں شرت میرا دل کچھ بیٹھا سا جاتا ہے۔ مجھے تو کچھ یقین سا ہو چلا ہے کہ انہوں نے کسی میم سے شادی کر لی ہے اور اسے ساتھ ہی لائے ہیں۔

شرت۔ پھر وہی وہم۔ بھابی اب وہ آگئے ہیں۔ اس شک کو دل سے نکال دو۔ بھائی سنیں گے تو کیا کہینگے۔

کانتی۔ خیر وہ جو کچھ کہیں گے میں سن لونگی۔ تم اپنی فکر کرو۔ اب تو کچھ شکایت نہیں۔ شادی کے دن تو بہ توبہ تم نے کتنا فیل مچایا تھا۔

شرت۔ فیل تھا بھی تو سچا۔ منتوش سے انکو کیا نسبت۔

کانتی۔ یہ کیا بکتی ہو۔ نہیں اب ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں

شرت۔ تو کیا باتیں کروں۔

کانتی۔ کمار، منتوش سے بہت زیادہ خوبصورت ہیں۔

شرت۔ وہ کیسے۔

کانتی۔ کمار کا رنگ کتنا صاف ہے۔ نقش کتنے نازک ہیں۔ وضع قطع کسقدر شریفانہ ہے۔ طبیعت کیسی اچھی ہے۔

شرت۔ بھلا قد میں کون لمبا ہے۔

کانتی۔ کمار کا قد منتوش سے بہت بلند ہے۔

شرت۔ آواز کس کی اچھی ہے۔

کانتی۔ کمار کی آواز کا کیا کہنا۔ کسقدر شیریں ہے۔

شرت۔ میرے خیال میں تو دونوں میں کوئی ایسا فرق نہیں

کانتی۔ تو کیا تم دونوں کو برابری کا درجہ دیتی ہو۔

شرت۔ میں تو دونوں کو ایک ہی نظر سے دیکھتی ہوں۔

کانتی۔ تمہیں شرم نہیں آتی شرت۔ شادی کے بعد بھی منتوش کا خیال۔

شرت۔ منتوش کا خیال تو میری جان کے ساتھ ہے آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔

کانتی۔ اچھا میں ابھی بارا سے کہتی ہوں کہ منتوش کو نکال دیں۔

شرست۔ نہیں نہیں ایسا نہ کر بیٹھنا منتوش گیا تو میں بھی اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔

کانتی۔ شرست۔ تمہاری شرارت اب حد سے زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ جاؤ تم مجھے ستانے کے لئے اپنی عزت کا خیال بھی نہیں کرتیں۔ اب تو مجھے نیند آ رہی ہے۔

شرست (جاتے ہوئے) ہاں بھائی آ گئے ہیں اب نیند ہی تو آئیگی۔

(جاتی ہے)

کانتی (خود بخود) اب ان آنکھوں میں نیند کہاں۔ اب تو میں موت کی نیند ہی سو سکونگی۔

(سریندر نشہ میں مخمور داخل ہوتا ہے)

سریندر۔ پیاری کیا سوچتی ہو۔ کس کے خیال میں ہو۔

کانتی۔ ایک بیوی اپنے شوہر کے سوا اور کس کے خیال میں ہو سکتی ہے۔

سریندر۔ اوہو اتنا پیار۔ اتنی محبت۔ مائی ڈیر ڈیر ڈیر۔

(آگے بڑھتا ہے کانتی گھبرا جاتی ہے)

کانتی (حیران ہو کر) تم کیا شراب پی کر آتے ہو۔

سریندر (بلند آواز سے) شراب تو ہر شریف شخص پیتا ہے۔

کانتی۔ ذرا آہستہ تو بولو۔ اماں برابر کے کمرے میں سو رہی ہیں۔

سریندر (اور زور سے) اماں سو رہی ہیں تو بہت اچھا ہے۔ انہیں خبر بھی نہ ہوگی۔

کانتی۔ ذرا ہوش میں آؤ۔ تم یہ کیا کر رہے ہو۔

سریندر (اور زور سے) تو کیا میں بیہوش ہوں۔ تم ایک جنٹلمین کی ان سلٹ کرتی ہو۔ یو ہندوستانی عورت!

کانتی (بے بسی سے) میں اور آپ کی بے عزتی۔ آپ کیا کہتے ہیں۔

سریندر۔ یہ ان سلٹ نہیں تو کیا ہے۔ آہستہ بولو۔ کیوں آہستہ بولیں۔

کانتی۔ بارا کو معلوم ہو گیا تو وہ کیا کہینگے۔

سریندر۔ معلوم ہو جائے تو کیا تم ہمیں ڈرانا مانگتا۔

کانتی۔ اچھا تو پھر تم یہاں ٹھیرو۔ اور جو چاہے کرو میں جاتی ہوں۔

سریندر۔ اچھا جاتی ہو تو جاؤ مگر ہم کو ایک سو روپیہ دیتی جاؤ۔ بہت ضرورت ہے۔

کانتی۔ سو روپیہ میں تمہیں دوں۔ روپیہ میرے پاس کہاں سے آیا۔

سریندر۔ بس بہت باتیں سننا نہیں مانگتا۔ جلدی

بہت جلدی۔

کانتی۔ میرے پاس روپیہ نہیں اور اگر ہوتا بھی تو نہ دیتی۔

سریندر۔ پھر وہی ان سلٹ۔

کانتی۔ اس میں تمہاری ان سلٹ کیسے ہوگئی۔ تمہیں مجھے روپیہ دینا چاہیئے نہ کہ مجھے۔

سریندر۔ دیکھو اس وقت بہت ضرورت ہے اگر روپیہ نہیں تو کوئی زیور ہی دے دو۔

کانتی۔ نہیں میں نہ دونگی میرے زیور پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔

سریندر۔ حق نہیں۔ میں نے تو ہندو لا میں پڑھا ہے ضرورت کے وقت خاوند کو بیوی کی سب جائداد پر حق حاصل ہوتا ہے۔

کانتی۔ ہاں شراب پینے کے لئے۔

سریندر۔ پھر وہی ان سلٹ۔ دیکھو زبان بند کرو ورنہ تمہارے حق میں اچھا نہ ہوگا۔

کانتی۔ اچھا کیا نہ ہوگا۔ تم کر ہی کیا سکتے ہو۔

سریندر۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟ یہ دیکھو

(زبردستی اس کے ہاتھوں سے کڑے اُتار کر بھاگ جاتا ہے

کانتی روتی ہے مدھو مئی داخل ہوتی ہے)

مدھو (گھبرا کر) کیوں بہو کیا ہوا تم رو کیوں رہی ہو سریندر کہاں ہے۔ میں نے ابھی ابھی اس کی آواز سنی تھی۔

کانتی۔ کچھ نہیں۔

مدھو (بڑھ کر دیکھتے ہوئے) یہ تمہارے ہاتھوں سے خون کیوں بہہ رہا ہے۔ تمہارے کڑے کیا ہوئے۔

(کانتی روتی ہوئی چلی جاتی ہے)

(مراری داخل ہوتا ہے)

مراری۔ کیا ہوا۔ بات کیا ہے۔ کانتی کیوں رو رہی ہے

مدھو۔ ہونا کیا تھا۔ سریندر کے ہاتھوں پر ماتا جانے اس غریب پر کیا کیا آفت آئیگی۔

مراری۔ کیسی آفت۔

مدھو۔ وہ آیا تھا۔ اور اس کے ہاتھوں سے کڑے اُتار کر لے گیا۔

مراری۔ کیا زبردستی۔

مدھو۔ اور نہیں تو کیا۔ اس غریب کی تو بانہیں بھی زخمی ہوگئی ہیں۔

مراری۔ اچھا اتنی دلیری۔ میری موجودگی میں میری بہو پر اتنا ظلم اب وہ اس مکان میں کبھی نہ آئیگا۔

(جاتا ہے مدھو مئی پیچھے پیچھے جاتی ہے)

مدھو۔ اسے سمجھائیے۔ شاید راہ پر آجائے۔

(جاتی ہے)

پردہ

ساتواں منظر

مراری بابو کا کمرہ ملاقات

(کانتی اور شرت بیٹھی باتیں کررہی ہیں)

شرت۔ آؤ بھابی کالج ہی چلو۔ یہاں اکیلی بیٹھ کر سوائے رونے کے نہیں اور کیا کام ہوگا۔

کانتی۔ نہیں شرت اب میں کالج کبھی نہ جاؤنگی۔

شرت۔ تم ذراسی بات سے اتنی مایوس ہوگئیں۔ اٹھو بھی بھائی کو بابا سمجھا کر درست کر لینگے۔

کانتی۔ مجھے اب کچھ امید نہیں۔

شرت۔ اس ناامیدی کی کوئی وجہ تو نظر نہیں آتی۔

کانتی۔ وہ اب بد اخلاقی کی انتہائی گہرائیوں تک پہنچ گئے ہیں۔ ان کے لئے اب کوئی امید نہیں۔

شرت۔ اسی لئے تو بہت کچھ امید ہے۔ ایک چیز کی انتہا دوسری چیز کی ابتدا ہوتی ہے۔

کانتی۔ اب اس قصے کو ہی چھوڑدو۔ تم اپنے شوہر کے متعلق کہو وہ تو

(اندر سے آواز آتی ہے)

مدھومتی (اندر سے) کانتی کانتی۔

کانتی جاتے ہوئے اماں بلارہی ہیں، آئی اماں

(جاتی ہے)

شرت۔ وہ آجاتیں تو بھائی کے سدھارنے کی کوئی تجویز سوچی جاتی۔ کانتی تو اس طرح روتے روتے مرجائیگی۔

(منتوش داخل ہوتا ہے)

لو وہ بھی آگئے۔

منتوش۔ کیا سوچ رہی ہو شرت۔

شرت۔ یہی کہ اگر بھائی کی حالت نہ سنبھلی تو کانتی کا کیا حشر ہوگا۔ کل رات وہ شراب میں بدمست ہوکر آئے اور کانتی کے کپڑے زبردستی اُتار کر لے گئے۔ اس وقت سے کانتی نے رو رو کر بُرا حال کر لیا ہے۔

منتوش (سوچتے ہوئے) تو کیا اس کی حالت اتنی بگڑ گئی ہے۔

شرت۔ بھابی کا خیال ہے کہ وہ ضرور اپنے ساتھ ولایت سے کوئی میم لائے ہیں۔ اور اسی کے ساتھ رہتے ہیں۔

منتوش۔ کانتی کا خیال غلط نہیں۔

شرت۔ تو تم اس کے متعلق کچھ جانتے ہو۔

منتوش۔ بہت کچھ۔

شرت۔ کیا

منتوش۔ وہ اپنی میم صاحب کے ساتھ اسی شہر میں رہتے ہیں۔

شرت۔ تم نے اس میم کو بھی دیکھا ہے کیا۔ کچھ خوبصورت ہے۔

منتوش - جوان ہے، خوبصورت تو اسے مَیں نہیں کہہ سکتا۔

شرت - خوبصورتی کو تم کیا جانو۔ تمہیں تو جوانی سے ہی مطلب ہے۔

منتوش (مسکرا کر) ہاں جوانی سے ہی حسن کی بہار ہے

شرت - تو مَیں خوبصورت نہیں کیا۔ بہت اچھا۔ اب مَیں تمہیں اپنی بُری صورت نہ دکھاؤنگی۔

(گھونگٹ ڈال لیتی ہے)

منتوش - اب تم پہلے سے بھی زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہو۔

شرت (گھونگٹ اُٹھا کر) یعنی گھونگٹ کے بغیر میں بدصورت معلوم ہوتی ہوں۔

منتوش (پیار سے) گھونگٹ کے بغیر تم اور زیادہ خوبصورت معلوم ہوتی ہو۔

شرت - تم بہت شریر ہو۔

منتوش - اور تم . . . . ہاں تو اب تمہارے بھائی کو درست کرنے کے لئے کیا کیا جائے

شرت - بس کسی طرح اس میم سے ان کا پیچھا چھڑا دو۔

منتوش (مسکرا کر) یہ تو تم ہی کر سکتی ہو۔

شرت (کچھ یاد کر کے) مَیں تمہاری ایک چیز چرا لائی ہوں۔

منتوش - میری ایسی چیز کیا ہے جسے تم چرا سکتی ہو۔

شرت - تمہارے مصنوعی بال۔

منتوش - وہ کیوں۔

شرت - تمہاری حقیقت ظاہر کرنے کے لئے۔

منتوش - مگر اس سے تمہاری حقیقت بھی تو کھُل جائیگی۔

(اسے پیار کرنے کے لئے بڑھتا ہے)

(کانتی داخل ہوتی ہے۔ اور منتوش کو شرت سے اسقدر بے تکلف دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔ شرت بھاگ جاتی ہے)

کانتی (منتوش سے) تم اور اتنی جرأت - نکل جاؤ۔ ابھی اس مکان کو چھوڑ دو۔ ورنہ مَیں تمہیں بابا سے بے عزّت کرا کے نکلوا دونگی۔

منتوش - (عاجزی سے) مجھے معاف کر دیجئے پھر مَیں یہ جرأت کبھی نہ کرونگا۔

کانتی - یہ جرم معافی کے قابل نہیں۔ تم چلے جاؤ۔ تم کو اپنی کرتوت پر شرم آنی چاہئے۔

منتوش - تو اس میں صرف میرا ہی قصور تو نہیں، ان سے آپ کچھ نہیں کہتیں۔

کانتی - وہ ایک بیوقوف لڑکی ہے۔ وہ صرف تمہارے احسان سے مجبور ہو کر تم سے کچھ نہیں کہتی، اور تم اس کو اپنے دامِ فریب میں پھنسانے کی کوشش کر رہے ہو۔

منتوش - انسان ہر وقت اپنے دِل پر قابو نہیں رکھ سکتا۔

کانتی - ایک شریف شخص کے دل کو ایک شادی شدہ لڑکی کے متعلق اس سے زیادہ احتیاط کرنی چاہئے۔

منتوش - تو ان کی شادی کو میری محبت سے کیا تعلق ہے۔

کانتی - بس میں ایسی باتیں نہیں سننا چاہتی۔

منتوش - تو اگر آپ ایسی سخت گیر ہیں تو اپنے شوہر کو کیوں نہیں سمجھاتیں۔

کانتی - تم ایک بڑے شخص ہونے کے علاوہ بزدل بھی ہو۔ عورتوں کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہو

(بیزار ہو کر جاتی ہے۔ شرت آکر دو مصنوعی بال منتوش کے سر پر رکھ دیتی ہے۔ اور منتوش اپنا چشمہ لگا لیتا ہے)

شرت - بھائی کہاں جا رہی ہو

کانتی (غصہ سے پلٹ کر) بے شرم ---- بے حیا

(کمار چت پرسن کو دیکھ کر حیران ہو جاتی ہے)

یہ کیا؟

شرت (بہت متانت سے) تم کمار چت پرسن میرے شوہر سے واقف نہیں۔ آؤ میں تمہاری ملاقات کرا دوں۔

کانتی - (سمجھ کر) جیسی تم شریر تھیں تمہیں ویسا ہی شریر شوہر ملا۔

(منتوش مصنوعی بال اور چشمہ اتار لیتا ہے)

منتوش - تو بہن کیا اب بھی میرا جرم ناقابلِ معافی ہے۔

کانتی (مسکرا کر) اب آپ کا جرم پہلے سے بھی زیادہ سخت ہو گیا ہے۔ آپ صرف عورتوں ہی کو نہیں مردوں کو بھی دھوکہ دیتے ہیں۔

شرت - تو میں یہ بال اور چشمہ اپنے کمرے میں رکھ آؤں۔

(جاتی ہے)

کانتی - تو کیا کمار چت پرسن رائے، منتوش ہی بنا رہیگا یا میں سب سے کہہ دوں۔

منتوش - ابھی نہیں۔

کانتی - کیوں۔

منتوش - ابھی ایک مقصد ہے جو پورا نہیں ہوا۔

کانتی - کیا

منتوش - تمہاری بہتری۔ جب تک تمہارا شوہر تم سے جدا ہے۔ منتوش اور کمار چت پرسن راے بھی جدا رہینگے۔

کانتی (منت سے بڑھ کر اور اس کے ہاتھوں کو پکڑ کر) بھائی پرماتما کے واسطے اُن کو ایک بُری زندگی اور مجھ کو ایک بُری موت سے بچا لو۔

(سریندر داخل ہوتا ہے اور کانتی کو منتوش کے ساتھ

اس حالت میں دیکھ کر سخت برہم ہوجاتا ہے)

سریندر (منتوش سے) تم کون ہو۔

منتوش۔ مَیں کوئی بھی ہوں تمہیں اس سے مطلب۔

سریندر۔ مطلب؟ لو دیکھو۔

(منتوش پر حملہ کرتا ہے، منتوش ایک ہی جھٹکے میں اسے گرا دیتا ہے۔ سریندر گر کر جیب سے پستول نکالتا ہے۔ اور منتوش پر فائر کرتا ہے)

تمہاری یہی سزا ہے۔

(گولی منتوش کو لگتی ہے)

منتوش ہا ـــــ

(گر جاتا ہے)

(کانتی بھی صدمے سے بیہوش ہوجاتی ہے اور گرتی ہے)

کانتی۔ ہائے۔

(شرت داخل ہو کر حیران ہوجاتی ہے۔ سریندر اور شرت ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھتے ہیں)

پردہ

آٹھواں منظر

(چیت پرسن رائے بیمار پڑا ہے۔ شرت اس کے قریب بیٹھی ہے۔ کانتی ایک کرسی پر بیٹھی رو رہی ہے)

چیت۔ بہن کیوں رو رو کے جان ہلکان کر رہی ہو۔

کانتی۔ مَیں ہی تو اس مصیبت کا باعث ہوئی۔

شرت (شرارت سے) مگر آخر انہیں ہوا ہی کیا ہے جو تم مصیبت سمجھ رہی ہو۔ بس گولی ایک طرف لگی دوسری طرف نکل گئی۔ نہ کوئی ہڈی ٹوٹی نہ پسلی۔

کانتی۔ مگر پھر یہ اتنے کمزور کیوں ہوگئے ہیں۔

شرت۔ صرف خون ذرا زیادہ بہہ گیا ہے۔ ہاں کانتی ذرا سا دُودھ لانا۔ ان کے کھانے کا وقت ہوگیا ہے۔

(کانتی جاتی ہے)

چیت۔ مجھے کبھی امید نہ تھی کہ مَیں پھر اس زندگی میں تمہیں دیکھ سکونگا۔

شرت۔ تو کیا واقعی تم مجھے پھر دیکھنا چاہتے تھے۔

چیت۔ تم بڑی شریر ہو۔ ہاں یہ تو کہو۔ سریندر کے متعلق کوئی خبر آئی۔ امید تو ہے اس صدمے کا اس کے دل پر اثر ہوگا اور وہ سدھر جائیگا۔

شرت۔ بیماری سے علاج زیادہ تکلیف دہ ہوگیا۔

چیت۔ خیر اگر میرا ذرا سا خون بہہ جانے سے تمہارے بھائی کے گناہ کا کفارہ ادا ہوسکے۔ تو مَیں خوش ہوں۔

(کانتی ایک خط لئے داخل ہوتی ہے)

(شرت خط لے لیتی ہے)

شرت۔ خط تو تمہارے نام ہے۔ اور تم کو پڑھنے کی اجازت نہیں۔

چیت۔ میں اب اتنا کم ور نہیں لاؤ تو

کانتی۔ تو تم ہی کیوں نہ پڑھ کے سُنا دو۔

شرت میں ان کا خط پڑھوں۔

کانتی۔ لاؤ تو میں ہی پڑھ کے سُنا دیتی ہوں۔

(خط لیکر پڑھتی ہے مگر وہی سطر پڑھ کر پھینک دیتی ہے اور چلی جاتی ہے)

چیت۔ معلوم ہوگیا۔ شرت ذرا اس خط کو پڑھنا تو۔

شرت (پڑھتی ہے)

"میں آپ کی اسی کھپریل والی کوٹھری میں رہتا ہوں۔ سریندر بابو اور ان کی میم سے خوب ملاپ کرلیا ہے۔ سریندر بابو سے میں نے آپ کی خطرناک حالت بیان کردی تھی۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ راجہ بہادر نے اس معاملہ کی اطلاع پولیس میں کر دی ہے۔ ان کے ساتھ میرا آدمی گوبند رام رہتا ہے۔ میم صاحب سے میں نے علیحدگی میں کہہ دیا ہے کہ سریندر بابو کی بیوی زندہ ہے۔ اور اگر انہوں نے ولایت میں شادی کر بھی لی ہو تو وہ ناجائز ہے۔ میں نے یہی کہہ دیا ہے کہ انہوں نے اپنے بھنوئی کو پستول سے زخمی کر دیا ہے۔ اور بیوی کو مار پیٹ کے کپڑوں کی جوڑی چوری کی ہے۔ اور یہ وہی جوڑی ہے جو وہ خود پہنے ہوتے ہیں۔ اور اس لئے وہ مال مسروقہ رکھنے کی وجہ سے خود خطرے میں ہیں۔ سریندر بابو کے خسر نے پولیس میں اطلاع کردی ہے۔ پولیس ان دونوں مقدمات کی تفتیش کے لئے کوئی دم میں آیا چاہتی ہے۔ اسی لئے سریندر بابو نے بھاگ کر جان بچائی ہے۔ مگر وہ گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ پولیس ضرور۔ ان کو ماخوذ کرنے کے لئے آئے گی۔

یہ سُنتے ہی میم صاحب رونے لگیں اور سریندر بابو کو برا بھلا کہنے لگیں۔ میں نے ان کو اور ڈرایا۔ وہ کہنے لگیں۔ کہ اگر ان کے پاس روپیہ ہوتا تو اسی وقت ولایت واپس چلی جاتیں۔ میں نے کہا کہ اگر وہ کپڑوں کی جوڑی کو بیچ ڈالیں، تو روپیہ میسر آسکتا ہے۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ انہوں نے کپڑے میرے حوالے کئے۔ اور میں نے روپیہ ادا کر دیا۔ اور اسی وقت بمبئی میل پر ہوڑہ اسٹیشن سے سوار کر دیا۔ میں ان کے ساتھ بمبئی جارہا ہوں۔ جہاز پر سوار کرکے واپس حاضر ہونگا۔ یہ خط ریل ہی میں لکھ رہا ہوں۔

آپ کا نیازمند

ہری لال داس

چتن۔ آدھی بازی تو جیت لی۔ اب سریندر کو کسی طرح یہاں بلانا چاہیئے۔

شرت۔ اگر بھابی تمام خط پڑھ لیتی تو اس طرح نہ بھاگ جاتی۔

چتن۔ میم کا ذکر پڑھتے ہی گھبرا گئی۔

شرت۔ میں ابھی اسے لاتی ہوں۔

(جاتی ہے)

چتن۔ میم کے جانے کے بعد سریندر کا سدھارنا کچھ مشکل نہیں۔

(شرت کانتی کو کھینچتے ہوئے لاتی ہے)

شرت (ایک چھوٹی شیشی دکھاتے) یہ دیکھئے ان کی حرکت۔ باوا کے کھانے کی سنکھیا کی گولیاں جو وہ کبھی کبھی کھاتے ہیں۔ خدا نے خیر ہی رکھ لی۔ کہ میں پہنچ گئی۔ ورنہ آج ان کی جان گئی تھی۔

چتن۔ واہ بھابی کوئی ایسا بھی کرتا ہے۔

کانتی۔ شرت تو نے آج مجھ سے بڑی دشمنی کی ہے۔ ہر روز کے جلنے سے ایک دفعہ کا مر جانا کیا بہتر نہیں ہے۔

چتن۔ کانتی اگر آدھ گھنٹے کے اندر اندر سریندر کو تمہارے قدموں پر نہ گرادوں تو میں تمہیں اپنے ہاتھ سے زہر خرید کے لادونگا۔

کانتی۔ تم نے انہی جھوٹی امیدوں پر ایک دفعہ تو اپنی جان کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ کیا اب پھر کوئی ایسا ہی ارادہ ہے۔ وہ کبھی باز نہ آئینگے۔

(مدہوسی داخل ہوتی ہے)

مدہوسی۔ بیٹا چتن باہر کوئی آدمی آیا ہے۔ اور تم سے کسی ضروری کام کے متعلق ملنا چاہتا ہے۔ کیا اسے تمہارے پاس آنے کی اجازت دے دوں۔

چتن۔ نہیں اماں اسے لائبریری میں بٹھائیے۔ میں خود اس سے وہیں مل لیتا ہوں۔ میں اب ایسا کمزور نہیں کہ چل پھر بھی نہ سکوں۔

مدہو۔ اچھا تو میں اسے وہیں بھجواتی ہوں۔

(جاتی ہے)

شرت۔ نہیں ابھی سے چلنا پھرنا نہیں چاہیئے۔ اسے یہیں بلا لیتے تو بہتر ہوتا۔

چتن۔ نہیں تم نہیں سمجھتیں۔ مجھے کچھ ایسا ہی کام ہے بھابی تم ذرا یہاں بیٹھنا جانا نہیں۔ آؤ شرت مجھے وہاں تک پہنچادو۔

(شرت کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جاتا ہے)

کانتی۔ اتنے دن میم کے ساتھ رہ کر مجھے وہ کہاں پسند کر سکتے ہیں۔ نہ مجھ میں اتنی تہذیب نہ تمیز۔ نہ میں گھوڑے پر چڑھ سکتی ہوں۔ نہ ان کے ساتھ کلب میں جا سکتی ہوں اسی لئے تو میں اپنی جان کی دشمن ہوگئی تھی۔ شرت نے

آہ مجھے مرنے بھی نہ دیا۔ محبت کی امیدوں کو پورا کیا کروں وہ کبھی سدھر نہیں سکتے۔ کیا وہ پھر کبھی پیار سے مجھے کانتی کہہ کر پکاریں گے۔ آہ ان کو کیا ہو گیا ہری! اور کتنا دکھ دوگے۔ اس دکھ سے نجات دو۔ ان کو سیدھی راہ دکھا دو۔

(روتا ہے۔ نڈھال ہو جاتی ہے)

سریندر (داخل ہوتا ہے) کانتی کانتی کیا تم مجھے معاف کر سکو گی۔

(اس کے پاؤں پر گر جاتا ہے)

کانتی (روک کر) آہ مجھے گنہگار نہ کرو۔

(خود اس کے پاؤں پر گرتی ہے)

سریندر (روک کر) ستی تم دیوی ہو۔ تمہارا خاک پا بننے ہی میں میری عزت ہے۔

کانتی۔ تم خواہ کچھ ہی ہو جاؤ۔ تم ہی میرے دیوتا ہو۔

سریندر۔ تو کیا تم اجازت دوگی کہ میں تمہیں چھو سکوں۔

کانتی (ہم آغوش ہو کر) تم نہ چھوؤگے تو یہ آگ کیسے بجھے گی۔

سریندر (روتے ہوئے) کانتی آہ میں نے تمہاری محبت کی قدر نہ کی۔ ہیرے کو چھوڑ کر کانچ کو چن لیا۔

کانتی۔ جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ مگر اب مجھے نہ بھلانا۔ کبھی کبھی میرے پاس بھی آنا۔

سریندر۔ کبھی کیوں کانتی۔ اب تو میں تمہیں چھوڑ کر کبھی نہ جاؤنگا۔

کانتی۔ اور تمہاری بیوی؟

(چت اور سشرت داخل ہوتے ہیں)

چت۔ اس کی فکر نہ کرو بھابی۔ وہ سریندر کی محبت سے گھبرا کر ولایت واپس چلی گئی۔

سریندر۔ تو اسے روپے کس نے دیئے۔

چت۔ تمہیں اس کے دریافت کرنے کی کیا ضرورت۔

سریندر۔ مگر میرا مقدمہ

چت۔ میں خیریت سے ہوں تمہیں اب کسی مقدمہ کا ڈر نہیں۔

سریندر (جھک کر) میں تمہارے احسان کا قرض ادا نہیں کر سکتا۔

چت۔ تم پر میرا قرض کوئی نہیں۔ اگر ہے تو کانتی کا ہے۔ اسے ادا کرو۔

(مدہوسی اور مراری داخل ہوتے ہیں)

ان کا ہے انہیں ادا کرو۔

سریندر (قدموں پر گر کر) ان ہی قدموں کی قسم میں اس قرض کو ادا کرونگا۔

پردہ

خاتمہ

سارا برنارڈ

فرانس کی بہترین اور دُنیا کی ممتاز ایکٹرس سارا برنارڈ نے ۲۶ مارچ ۱۹۲۳ء کو دنیائے فانی تھیٹر سے عالم جاودانی تھیٹر کی طرف نقل مکان کیا۔ سول ملٹری گزٹ لاہور اور ٹائمز آف انڈیا بمبئی سے لیکر یورپ کے تمام مقتدر اخبارات اس باکمال کی وفات پر ماتم کناں ہیں۔

یہ زندہ جاوید ایکٹرس ۲۲۔ اکتوبر ۱۸۴۵ء کے دن پیرس میں پیدا ہوئی۔ اس کے والدین یہودی الاصل تھے۔ جن میں سے ایک فرانس کا اور دوسرا ڈنمارک کا باشندہ تھا تیرہ سال کی عمر میں مسیحی مذہب نے اسے اصطباغ دیکر اپنے حلقہ میں داخل کیا۔ قومیت کے لحاظ سے گو وہ خالص فرانسیسی نہ تھی۔ مگر فرانس کی محبت اس کے رگ و ریشے میں اس طرح رچ گئی تھی کہ خود اہل فرانس کو اس کے فرانسیسی ہونے کا اعتراف کرنا پڑا۔ ایک وقت تھا کہ سارا برنارڈ کو فرانسیسی کہلانے پر ناز ہوا کرتا تھا لیکن آج اس کا نام خود فرانس کے لئے سرمایۂ صد ہزار افتخار ہے۔

۱۱۔ اگست ۱۸۶۲ء کو وہ پہلی مرتبہ ریسائن کے ایک ڈرامے میں سٹیج پر نمودار ہوئی۔ پارٹ جو اس کے تفویض کیا گیا۔ بہت معمولی تھا۔ اور کسی نے محسوس بھی نہ کیا۔ کہ کون سٹیج پر آیا اور کون گیا۔ اور اسی طرح کامیڈی میں بھی وہ اپنے شاندار مستقبل کی ادنےٰ سی جھلک دکھانے سے قاصر رہی۔ اس وقت شاید اس نے یہی غنیمت خیال کیا ہوگا کہ اسے کامیڈی فرانکیس کے ایسے جلیل القدر تھیٹر میں پارٹ کرنے کا موقع ملا۔ اسے کیا معلوم ہوگا کہ وہ دن بھی آئیگا۔ کہ جب ایسے ہزار ہا تھیٹر اس کی ایک نمائش کے لئے لاکھوں روپیہ نثار کرنے کے لئے تیار ہونگے اور صرف اس کا نام ہی کسی تھیٹر کی وقعت کی ضمانت متصور ہوگا۔ ۱۸۶۷ء تک اس کس مپرسی کے عالم میں زندگی بسر کرنے کے بعد وہ اوڈین کے ایک تھیٹر میں ملازم ہوگئی۔ اس وقت شیکسپیئر کا مشہور ڈرامہ کنگ لیئر تازہ تازہ فرانسیسی زبان میں منتقل ہوا تھا۔ اور کمپنی مذکور میں اسی کی ریہرسل جاری تھی۔ اتفاق سے برنارڈ کو کارڈیلیا کا پارٹ مل گیا۔ اور یہی پارٹ اس کی آئندہ بینظیر کامیابی کا دیباچہ ثابت ہوا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد یورپ کے ادبی حلقوں میں اس کا چرچا ہونے لگا۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں دنوں میں جرمن اور فرانس کے مابین ہولناک جنگ چھڑ گئی۔ اور یورپ کے تمام تفریح گاہیں

بند ہوگئیں۔ جب خدا خدا کرکے یہ جنگ ختم ہوئی۔ تو سارا برنارڈ پھر کامڈی فرانکیس تھیٹر میں چلی گئی۔ اور پہلی ہی نمائش میں تمام پیرس کے دل اپنی مٹھی میں لے لئے۔ اس کی شہرت بجلی کی رو کی طرح تمام اکناف یورپ میں پھیل گئی۔ اور مبصرانِ فن نے تسلیم کرلیا۔ کہ وہ اپنے وقت کی قابلِ ترین اور بہترین ایکٹرس ہے۔ اب ملک ملک سے بلاوے آنے لگے۔ اور بالآخر وہ ۱۸۷۹ء میں چند ہفتوں کے لئے عازم لنڈن ہوئی۔ اور گیٹی تھیٹر میں اپنے کمال کے جلوے دکھانے لگی۔ گو وہ تھوڑے عرصے کے لئے گئی تھی۔ مگر قدردانوں نے پیچھا نہ چھوڑا۔ اور سارا موسم وہیں گذارنا پڑا۔ برلن کے تھیٹروں نے بھی ایک ہفتے کے لئے دس لاکھ فرانک پیش کئے۔ مگر حب وطن طلبِ منفعت پر غالب آئی۔ اور اس نے اس دعوت کو پاسِ استحقار سے ٹھکرادیا۔ اظہار جذبات کی حیرت انگیز قوت غیرمعمولی اقتدا　　فطرت کشش حسن سیوری وجدانیات کا انکشاف۔ آواز کی سحرانگیزی اور درد انگیز مناظر کا سوز و گداز پبلک کو مسحور کرنے کے لئے کافی تھا۔ لیکن اس کے کوششوں کے عزم کی انتہا کہاں۔ تصنیف کی طرف متوجہ ہوئی۔ اور ایک کامڈی لکھ کر سٹیج پر لائی۔ جو ناکامیاب ہوئی۔ اسے دوراندیشی سمجھئے۔ یا نسوانیت کا تقاضا۔ کہ پھر اس کوچے میں قدم رکھنے کا خیال تک نہ کیا۔ اور تمام عمر اسی فن کے کسبِ کمال میں صرف کردی۔ جس کے لئے قدرت نے اسے پیدا کیا تھا۔

کامڈی فرانکیس تھیٹر سے اس کے تعلقات مدت سے کشیدہ چلے آتے تھے۔ ۱۸۸۰ء میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا۔ جسے جلتی آگ پر تیل ڈالکر اس تھیٹر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ بات یہ ہوئی۔ کہ ایک رات جب وہ اپنا پارٹ ادا کرکے گرین روم میں لباس تبدیل کرنے کے لئے آئی۔ تو چند ایکٹروں نے اس پر بے محابا اعتراضات کی بوچھاڑ شروع کردی۔ اعتراضات بے معنی تھے۔ اور محض رشک و حسد کا نتیجہ۔ سارا برنارڈ کو بہت صدمہ ہوا۔ اور اس نے دن چڑھتے ہی استعفا داخل کردیا۔ اور نقضِ معاہدہ کی علت میں چار ہزار پونڈ یعنی ساٹھ ہزار روپیہ ادا کرکے کنارہ کش ہوگئی۔ اس مناقشہ کے چند دن بعد وہ لنڈن چلی گئی۔ جہاں چند نمائشوں میں وہ نام پیدا کیا کہ فرانکیس تھیٹر والے مجبور ہوئے۔ کہ اس سے صلح صفائی کرلیں۔ مگر سارا برنارڈ کی خودداری نے اسے گوارا نہ کیا۔ لنڈن سے وہ ڈنمارک۔ امریکہ اور روس کی طرف گئی۔ اور ہر جگہ اپنے کمال کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ۱۸۸۲ء میں وہ لنڈن لوٹی۔ اور وہاں جیکیس ڈمیلا نامی ایک یونانی امیرزادے

ایکٹرس شادی کرلی۔ مگر یہ شادی بامراد ثابت نہ ہوئی۔ اور دوسرے سال کے آغاز ہی میں طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔ اس ازدواج کا خاتمہ کرکے وہ پیرس کو روانہ ہوئی۔ اور پہلی ہی نمائش میں تمام پیرس پر چھا گئی۔ اور ایک تھیٹر خرید کرکے کام شروع کیا۔ اس کے بعد ۱۸۹۳ء میں اس نے ایک اور تھیٹر خریدا۔ اسی عرصے میں اس نے ممالک غیر کے کئی دورے کئے۔ اور یورپ کے تمام دارالسلطنتوں کے علاوہ آسٹریلیا کا بھی چکر لگا آئی۔ ۱۸۹۵ء میں سوڈرمین کے ایک ڈرامے کے ترجمے میں اس حسن و خوبی سے پارٹ کیا۔ کہ خود مصنف کو اس کے کمال کا معترف ہونا پڑا۔ اس کے بعد وہ تقریباً ہر سال لنڈن جاتی رہی اور اہل امریکہ کے پیہم اصرار کے باعث ۱۸۹۶ء میں اسے نیویارک جانا پڑا۔ دسمبر ۱۸۹۶ء میں اہل پیرس نے اس کے کمال کا اعتراف کرنے کے لئے ایک عظیم الشان میلہ منعقد کیا۔ جس میں تمام یورپ کے اکابر نے ہمنوا ہو کر اسے اس عزت کا مستحق ٹھیرایا۔ اس وقت تک وہ ۱۱۲ پارٹ کرچکی تھی۔ جن میں سے ۳۸ خود اس کی تصنیف تھے۔ ۱۸۹۹ء میں اس نے ایک عظیم الشان تھیٹر تعمیر کیا۔ اور اس میں ہملیٹ کے فرانسیسی ترجمے میں ہملیٹ کا پارٹ یعنی مردانہ پارٹ خود ادا کرکے دنیا کو محوِ حیرت کر دیا۔ اسی طرح ۱۹۱۰ء میں لنڈن گئی۔ اور ایک ڈرامے میں نیپولین کے بیٹے کا پارٹ کرکے اپنی جدت طبع کا سکہ بٹھا دیا۔

سن و سال نے اس کے کام پر بہت کم اثر کیا۔ اور ستر سال کی عمر تک وہ برابر پارٹ کرتی رہی۔ اور آخری ایام میں کچھ عرصہ تک سنیما میں کام کیا۔ باوجودیکہ اس کی ایک ٹانگ عمل جراحی کی نذر ہو چکی تھی۔ اس کے کام میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ مرنے سے چند مہینے پہلے اس نے سٹیج کو الوداع کیا۔ ۱۹۱۳ء میں کراس آف لیجین آف آنر اور ۱۹۲۱ء میں آفیسر آف لیجین آف آنر کے گرانقدر اعزازات حکومت کی طرف سے دیئے گئے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس کا نام رہتی دنیا تک تاریخ کی زینت رہیگا۔ اور آئندہ نسلیں اس دل و دماغ کا حال پڑھ کر سبق لینگی۔ کاش کہ ہندوستانی ایکٹر بھی سارا برنارڈ کے حالات سن کر اپنی حالت کو سنواریں۔

۲۹ مارچ ۱۹۲۳ء کو جس دھوم سے اس کا جنازہ اٹھا اس کی کیفیت ہم ریوٹر کی زبان سے عرض کرتے ہیں۔

"عارضی صلح کے بعد سب سے بڑے انبوہ نے میڈم سارا برنارڈ کے جنازے کے سامنے سر نیاز

خم کیا۔ جس راستے سے جنازہ گذرا۔ اس کے دو رویہ دو لاکھ اشخاص تقریباً سیاہ پوش اور کلبینہ برہنہ سر کھڑے تھے پچاس گاڑیوں کے جلوس کے آگے پانچ گاڑیاں صرف پھولوں کے ہاروں سے لدی ہوئی جا رہی تھیں اس کے پیچھے چوب گل کے ایک صندوق میں نعش تھی جو صندوق سارا برنارڈ نے اپنے کفن کے لئے ۳۰ سال ہوئے بنوایا تھا۔ اور ہر سفر میں ہمراہ رکھا تھا سینٹ فرانکیس ڈی سیل کے عظیم الشان گرجے میں نماز جنازہ ادا ہوئی۔ جس میں تمام وزرائے سلطنت افسران جنگی و ملکی اور علمبرداران علوم و فنون شامل تھے گرجے سے نعش کو پیرس کے نامور ایکٹر اپنے کندھوں پر اٹھا کر قبرستان میں لے گئے۔ جب نعش سپرد لحد کی گئی۔ تو پھولوں کی اسقدر بارش ہوئی کہ آناً فاناً سب کچھ نظر سے اوجھل ہو گیا۔

نور الہٰی
محمد عمر

غزل

کہیں اے ننگ عشق اُن کو نہ الزام جفا دینا
محبت گر نہ راس آئے تو ہستی کو مٹا دینا

ہجوم یاس سے گھبرا کے آیا ہوں گلستاں میں
دلِ بیتاب کو تسکیں ذرا بادِ صبا دینا

مرا حسرت بھری نظروں سے تجھ کو دیکھتے جانا
تری چشم حیا پرور کا کچھ کچھ مسکرا دینا

گرا دے ساقیِ سرشار کے پہلو میں جو مجھ کو
مجھے دینا تو ایسی لغزشِ پا اے خدا دینا

بس اک پاؤں کی لغزش یاد ہے پھر کچھ نہیں معلوم
قیامت تھا ترا اک بار چلمن کو اٹھا دینا

سُن اے مستِ شئے عشرت صدا گو غریباں کی
کسی بیکس کی تربت پر بھی دو آنسو بہا دینا

اثرؔ میرا تو دل لبریز ہے جوش محبت سے
یہی شیوہ ہے اپنا دوست دشمن کو دعا دینا

اثر صہبائی

تبصرہ اشاعات جدیدہ

درس عمل :- مولوی محمد حسین صاحب محوی صدیقی کا نام نامی عام رسائل کے ناظرین کے لئے عموماً اور ہزار داستان و نونہال کے ناظرین کے لئے خصوصاً محتاج تعارف نہیں۔ کیونکہ آپ کے مضامین نظم و نثر سے ادبیات رواں کی امواج مشتر زریں نظر آتی رہتی ہیں۔ "درس عمل" موصوف ہی کے جذبات و محسوسات منظوم کا مجموعہ ہے۔ جس کو "دائرہ ادبیہ لکھنو" نے شائع کر کے، شائقین سخن کے لئے ایک دعوت ذوق پیش کر دی۔ امید ہے کہ سخن فہم حضرات، اس مجموعہ میں کافی سامان ذوق پائینگے۔ ضخامت، مختصر تقطیع کے پچاس صفحوں پر مشتمل ہے۔ قیمت صرف ۴ر "دائرہ ادبیہ" محمود نگر لکھنو سے طلب فرمایئے۔

مشرقی ترکستان :- مترجمہ سید محمود اعظم صاحب فہمی۔ تقطیع مختصر۔ حجم ۸۷ صفحات۔ قیمت ۶ر۔ ملنے کا پتہ :- "دائرہ ادبیہ" محمود نگر لکھنو۔

یہ کتاب مشتمل ہے اُن نوٹوں پر جو 'سر اوریل آسٹن' سیاح چینی ترکستان نے اپنی آثار قدیمہ کی تحقیق کے ضمن میں ترتیب دیکر، فارسی میں ترجمہ کرا کے شائع کی ہے۔ فارسی کتاب سے جناب فہمی نے اس کا ترجمہ ہماری زبان میں کر دیا۔ اور دائرہ ادبیہ نے اس کو شائع کیا ہے۔ جناب فہمی کی سعی تو یقیناً مشکور ہے۔ کہ انہوں نے اردو میں ایک کتاب کو منتقل کیا۔ لیکن حیرت ہے اُس محقق سیاح پر، جس نے ایسے غیر مکمل، تشنہ اور علمی حیثیت سے یکسر غیر مفید سیاحت نامہ کو کتابی صورت میں، ناظرین کے لئے پیش کیا ہے لیکن چونکہ اس سیاحت کا بار حکومت ہند نے برداشت کیا تھا۔ اور محقق موصوف کے شریک تحقیق اکثر ہندی افراد تھے اس لئے اس سے دلچسپی لینی ضروری ہے۔

نیرنگ خیال حصہ دوم مصنفہ شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۱۱۲ صفحات قیمت ۱۲ر ملنے کا پتہ :- آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی لاہور۔

نام نیرنگ خیال ہی مشہور ہے پھر مصنف کا نام نامی مزید تعارف سے کتاب کو یکسر مستغنی کر دیتا ہے۔ البتہ جناب آغا محمد طاہر صاحب نبیرہ آزاد مرحوم کی سعی اشاعت قابل داد ہے۔ اور محاسن طباعت و کتابت سے بھی کتاب نہایت خوش منظر ہے۔ امید ہے کہ قدر دانان اردو اس اشاعت کو آنکھوں سے لگائینگے۔

مکتوبات آزاد یعنی شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کے خطوط کا مجموعہ۔ تقطیع $\frac{20 \times 30}{16}$ حجم ۲۶۴ صفحات مجلد قیمت عہ ملنے کا پتہ :- آزاد بک ڈپو۔ اکبری منڈی لاہور۔

یہ مجموعہ ہے مولنا آزاد کے خطوط کا اور کم از کم ہر زبان دان کے لئے اس کا ایک مرتبہ مطالعہ کر لینا ایک فرض انسانی ہے۔

چندن۔ گذشتہ اشاعت میں مسٹر سُدرشن کی اس کتاب پر تبصرہ کیا جا چکا ہے لیکن مسٹر موصوف کا اصرار ہے کہ اس پر پھر ایک نظر ڈالی جائے۔ لہٰذا چندن تیرہ اچھی کہانیوں کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ اس کی کہانیوں میں سے بیشتر صفحات ہزار داستان پر آچکی ہیں۔ "شاعر" "کنول کی بیٹی" سنیاسی وغیرہ دلچسپ افسانے ہیں۔ اور نتیجہ خیز بھی۔ "چھایا" غالباً ڈی۔ ایل۔ رائے کے بنگالی "ڈراما" سے مقتبس ترجمہ ہے۔ غرضکہ مجموعی طور پر مسٹر سُدرشن نے بہت ہی دلچسپ سامان ادب فراہم کر دیا ہے۔ اور عام طور

پر توقع ہے۔ کہ کتاب کے ناظرین کی تعداد اس کے حلقہ خریداری کو وسیع کردیگی۔ حصول کتاب کا پتہ۔ رام کرشنا بک ڈپو لاہور۔

الجامعہ:۔ اس نام سے ایک پندرہ روزہ رسالہ جناب مولوی عبدالرزاق صاحب لکھنوی کی زیر ادارت اور مولانا ابوالکلام آزاد مدظلہ کی زیر رعایت کلکتہ سے شائع ہوا ہے۔ اسکی ظاہری زیبائی شان، تقطیع اور طباعت سے "الہلال" و "البلاغ" کی یاد زندہ ہوتی ہے۔ لیکن اس وقت اس قابل قدر رسالہ کی زبان عربی ہے۔ کیونکہ اجتماع ملت اسلامی کی تحریک اور جمعیت ملل شرقیہ کی دعوت اس رسالہ کے مقاصد اشاعت ہیں۔ رسالہ کا خیر مقدم ہر مسلم اور ہر مشرقی کا فرض اولیں ہے۔ اور ہر عربی کے طالب علم کے لئے اسکا مطالعہ از بس افادات گونا گوں کا ضامن۔ شائع شدہ نمبروں کے عام مضامین کے متعلق کچھ کہنا یقیناً مہر نیمروز کے سامنے ایک دھندلا چراغ روشن کر دینا ہے۔ لیکن جناب مدیر مسئول کی خدمت میں ہم اتنا ضرور عرض کرینگے کہ منشی "المنار" (مصر) کا افتتاحیہ، جن خیالات کا حامل ہے وہ بجائے وسیع اجتماعیت کے نہایت محدود عصبیت پر مبنی ہیں۔ اور یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بلکہ سید رشید رضا صاحب (منشی المنار مصر) کو صوبہ شام کے باہر کی ہر چیز ہمیشہ دھندلی نظر آتی ہے۔ اس افتتاحیہ کے متعلق الجامعہ نے جو نوٹ دیا ہے وہ ایک ناکافی تذبذب ہے۔ امید ہے کہ ایسے مضامین سے اس رسالہ کی وسیع تحریک کو آلودہ نہ کیا جائیگا۔ جن کا محور نہایت ہی تنگ ہو۔ رسالہ کی دوسری اشاعت کا سرورق "مہاتما گاندھی" کی تصویر سے مزین کیا گیا ہے۔ فقہائے دیوبند تو الہلال والبلاغ سے اس لئے ناراض رہتے ہی تھے کہ وہ مصور رسائل تھے۔ لیکن کم ازکم اس اشاعت میں اس تزئین خصوصی کے اسباب ہمارے نزدیک بھی مفقود سے ہیں۔

اسی نمبر میں سر ڈاکٹر محمد اقبال مدظلہ کے قومی ترانہ کا ترجمہ منظوم بزبان عربی بھی شائع ہوا ہے۔ جو جامعہ اسلامیہ علیگڈھ کے مشہور عربی پروفیسر جناب مولانا عبدالحق صاحب بغدادی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اور یقین ہے کہ عرب اور عربی دان طبقہ اس ترجمۂ منظوم کی بدولت اقبال کی پرجوش نظم سے لذت گیر ہوسکیگا۔ الجامعہ کی قیمت سالانہ صرف آٹھ روپے ہے اور فرمائشیں منیجر "الجامعہ" ۴۵۔ رپن لین کلکتہ کے پتہ پر بھیجنی چاہئیں۔

القریش:۔ یہ ماہوار رسالہ امرتسر سے شائع ہوتا ہے۔ مقاصد کی فہرست طویل سرورق پر چھپی ہوئی ہے۔ مگر مقاصد کے اوپر ہی ایک سطر میں ظاہر کیا گیا ہے۔ کہ "قریشیوں کا قومی اسلامی، اصلاحی اور تاریخی رسالہ" جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی جماعتی تحریک کا حامل ہے۔ لیکن مضامین میں یہ بات نہیں پائی جاتی اور بحیثیت مجموعی وہ اردو کا ایک ادبی سا رسالہ ہے ہم جناب رونق علی صدیقی ایڈیٹر "القریش" سے متوقع ہیں۔ کہ موصوف، کاغذ اور طباعت کی طرف بھی جلد توجہ فرمائینگے۔ قیمت سالانہ، چار روپے۔ طلباء سے صرف عا۸ نمونہ مفت۔ منیجر "القریش" امرتسر سے حاصل ہوسکتا ہے۔

الفلاح:۔ یہ ایک پندرہ روزہ رسالہ ہے۔ جو جناب غازی رحمت اللہ صاحب کی ایڈیٹری اور انجمن اشاعت اسلام کی سرپرستی میں جالندھر سے شائع ہوتا ہے۔ مقصد اشاعت دعوت و تبلیغ مذہب ہے۔ اور غالب عنصر بھی مضامین مذہب ہی کا نظر آتا ہے۔ علمی خبروں کی اشاعت بھی داخل مقاصد ہے۔ اگر رسالہ میں مناظرانہ و مباحثانہ انداز کے مضامین نہ درج ہوں، تو غالباً معیار زیادہ بلند ہو جائیگا۔ بہرکیف تبلیغی جذبات کے لوگوں کو اس کا خیر مقدم کرنا چاہیئے۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۸ حجم ۳۲ صفحات چندہ سالانہ چار روپے۔ نمونہ کا رسالہ ۳ر منیجر الفلاح جالندھر سے حاصل ہوسکتا ہے۔

خادم کعبہ:۔ اس نام سے ایک ماہوار رسالہ ہوڑہ کلکتہ سے جاری ہوا ہے۔ جس کے سرورق پر مقاصد کے عنوان

سے "اردو علم ادب" کے الفاظ پڑھے جاتے ہیں۔ مضامین و معیار کے متعلق فی المحال کوئی صحیح رائے ظاہر کرنا اس لئے ضروری نہیں ہے کہ رسالہ بنگال کے مرکزی مقام سے جاری ہوا ہے۔ جہاں امواج اُردو کو ساحل بوسی کے لئے ایک پوری کشمکش کرنی پڑتی ہے اس لئے خریداروں اور اہل قلم کو خدمت زبان کے پورے احساس سے، رسالہ کے بقا و ارتقا میں کوشش فرمانی چاہئے۔ اس وقت تک ہمارے پاس اس کے دو نمبر پہنچے ہیں۔ اور دونوں اشاعتیں تصاویر سے مزین ہیں اور غالباً ہمیشہ تصاویر کا التزام ہوگا۔ کتابت و طباعت بھی گوارا ہے۔ حجم ۳۲ صفحات تقطیع ۲۰×۲۶ قیمت سالانہ صرف ۸ قیمت نمونہ ۴ " نور لائبریری" ۴۸ جلا پاڑہ لین، ہوڑہ۔ کلکتہ سے طلب فرمایئے۔

الہلال:۔ جناب زاہد القادری کی ایڈیٹری میں اس نام سے ایک رسالہ، دلی سے جاری ہوا ہے۔ مضامین ہر موضوع کے ہونگے اور پیش نظر نمبر میں بیشتر مضامین سنجیدہ ہیں۔ کتابت و طباعت بھی اچھی ہے اور حیرت ہے کہ چندہ سالانہ صرف ۲ ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ مینجر "الہلال" دلی، ہے۔

المصباح:۔ یہ علمی و ادبی رسالہ سید احسن رضا صاحب ثاقب کی کاوش ترتیب میں پٹنہ (بہار) سے جاری ہوا ہے۔ مضامین میں عمومیت ہے اور تغزل کا غلبہ۔ پہلے نمبر کے تمام مضامین نگار لائق ہیں اگر یہی التزام و اہتمام رہا۔ تو انشاء اللہ رسالہ کثیر الاشاعت ہو جائیگا۔ حجم ۲۴ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۳۰ قیمت سالانہ صرف تین روپے۔ مینجر المصباح۔ شاہ کی املی۔ پٹنہ سٹی رسالہ کا پتہ ہے۔

راگ:۔ یہ ماہوار رسالہ تفہیمات موسیقی کے مقاصد سے جناب گوردیال سنگھ صاحب کی ایڈیٹری میں لاہور سے جاری ہوا ہے گو یہ فن تحریر و اشاعت سے بلند تر ہے۔ تاہم ایک سرسری و خارجی معلومات شاید اس طرح ہو سکے۔ حامیانِ فن کو رسالہ کی ترقی میں مدد دینی چاہئے۔ اور شائقین کو خریدار ہونا چاہئے تقطیع ۱۸×۲۲ حجم ۴۲ صفحات طباعت گوارا قیمت سالانہ تین روپے نمونہ ۶ مینجر رسالہ "راگ" لاہور کے پتہ سے حاصل ہو سکتا ہے۔

ہم بمبئی میں بھی

آپ کی خواتین کی بے پردگی

کا تحفظ

برقعہ نو ایجاد

ہی کر سکتا ہے۔ پرانی وضع کے بد نما تکلیف دہ اور ناکافی پردہ کے برقعہ بنانے میں اپنا روپیہ ضائع نہ کریں۔ ان ہی داموں میں برقعہ نو ایجاد خرید کریں۔

برقعہ نو ایجاد

کی اختراع آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس صیغہ نسواں کے انعامی اعلان پر ہوئی۔ کانفرنس منعقدہ لکھنؤ ۱۹۰۵ء نے برقعہ نو ایجاد بہترین برقعہ قرار دیکر ہم کو اول انعام طلائی تمغہ دیا۔ دیگر صوبوں کی کانفرنس و نمائش ہائے صیغہ اشیا نسواں سے بھی بارہ طلائی و نقرئی تمغہ سند و انعامات ملے۔

ہندوستان کے ہر طبقہ کے لوگوں میں مقبول ہے۔

آپ بھی بشرطِ واپسی منگوائیں

خود ملاحظہ کریں اور پردہ نشین خواتین کو معائنہ کا موقع دیں۔

پردہ نشین خواتین کو اس کی ضرورت ہے

آج ہی کندھے سے پیر کے ٹخنہ تک کی لمبان اور سر کے دور کی ناپ روانہ کریں۔ قیمت: سفید ۱۵ عہ رنگین ۲۵ عہ - چینی ریشم ۵۰

خاتون اسٹورز

نمبر ۱ رگھوناتھ داداجی لین۔ فورٹ بمبئی

ہندوستان میں ترکی خاتون

کا برقعہ

چارشف

جو مصر، ترکی۔ ایران۔ عرب و دیگر اسلامی ممالک میں رائج ہے۔ خوش وضع و زمانہ کے حسب حال ہونے کے علاوہ پردہ کا پورا محافظ ہے۔

چارشف

صرف ریل کے سفر کے لئے ہی نہیں بلکہ ہر جگہ اور ہر موقع کے لئے موزوں ہے۔ خوبی یہ ہے کہ دیر تک پہنے رہنے سے تکان محسوس نہیں ہوتی۔ ترکی خواتین تو اس کو تمام دن زیبِ تن رکھتی ہیں۔ اور اس کو پہنے پہنے گھر کا کام کاج کرتی ہیں۔

ہندوستان کے انگریزی دان طبقہ کے لوگوں میں مقبول ہے

آپ بھی بشرطِ واپسی منگوائیں

آپ کی خواتین اس کو ضرور پسند کریں گی

پردہ کو ترقی دیں۔ آج ہی منگوائیں

کمر سے پیر کے ٹخنہ تک کی لمبان۔ کمر کا گھیر اور سر کے دور کی ناپ روانہ کریں۔ قیمت:۔ رنگین سوتی ۲۵ عہ الپکہ للعہ۔ چینی ریشم ۵۰

خاتون اسٹورز

نمبر ۱ رگھوناتھ داداجی لین۔ فورٹ بمبئی

ہم بمبئی میں بھی

(مرکنٹائل پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوانچند پرنٹر کے چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے سید افضال علی حسنی پبلشر نے شائع کیا)

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۴۱۲

سالانہ قیمت چھ روپیہ (عہ)

قیمت ششماہی ۳؍ فی پرچہ ۱۰؍

ہزار داستان

ایڈیٹر: حکیم احمد شجاع بی۔ اے (علیگ)

جلد ۲ | اشاعت ماہِ جون ۱۹۲۳ء | نمبر ۶

فہرست مضامین

دریا بہ حباب اندر

صفحۂ ادارت

خداوند عمیم الاحسان کا ہزار ہزار شکر ہے۔ کہ رسالہ ہزار داستان اپنی عمر کے پہلے سال کو بخیر و خوبی ختم کر رہا ہے۔ میں نے جن امیدوں کو دل میں جگہ دیکر اس رسالہ کی طرح ڈالی تھی۔ ان میں سے بہت سی بر آئیں۔ اور بہت سی ابھی تک پایۂ تکمیل کو نہ پہنچ سکیں۔ تاہم ان کے لئے جو بر آئیں میں خدا کا شکر گذار ہوں اور اُن کے لئے جو تکمیل کی منتظر ہیں ہر ممکن جد و جہد کرنے کے لئے تیار۔

ادب لطیف کی جو خدمت ہزار داستان نے کی' اور اپنی طرز کا پہلا اور واحد رسالہ ہونے کی حیثیت سے جو کام اس نے کیا' اس کا اندازہ ناظرین خود ہی فرما سکتے ہیں۔ میں اپنے آپ کو ابھی اس قابل نہیں پاتا کہ ان ناچیز خدمات کو سراہ سکوں۔ جو خواب میں نے دیکھا تھا۔ اس کی تعبیر ابھی بہت دُور ہے۔ لیکن میری شوق تحصیل سے لبریز آنکھیں شاہد مدعا کو آج بھی اسی طرح صاف صاف دیکھ رہی ہیں۔ جیسے اُس دن دیکھتی تھیں۔ جس دن میں پہلی اشاعت کیلئے عرض تمنا سپرد قلم کر رہا تھا۔ سال بھر کی ناکامیاں اور مایوسیاں' بارہ مہینے کے عرصے کا بعد' اور آئندہ خطرات کا احساس ان حسرتوں کو اور بیدار کرنے کے بغیر اور کچھ نہیں کر سکتا۔

اگر میں شائقین کے تغافل کی شکایت کروں تو بے جا ہے۔ اگر میں ابنائے زماں کی بے مہری کا گلہ کروں تو بے محل کہ میں تکمیل کار کے معاملہ میں کشاکش حیات اور بقائے اصلح کا قائل ہوں۔

تاہم خوبیاں نہیں دیکھی جا سکتیں' جبتک انکو دیکھنے کی دعوت نہ دی جائے۔ اور اچھی سے اچھی چیزوں کی قدر نہیں کی جا سکتی جب تک کہ انکو کم از کم نئی چیزوں کو ایک نظر دیکھ لینے کی ترغیب نہ دی جائے۔ میں ہزار داستان کے ناظرین سے بالخصوص اور ادب اُردو کے شائقین سے بالعموم صرف اسی ایک نظر کا متمنی ہوں۔ اور جانتا ہوں کہ ہزار داستان کی ایک سال کی فائیل اسے اس نظر کرم کا مستحق بنانے کے لئے کافی سرمایہ رکھتی ہے۔

میں ہزار داستان کی آئندہ تدوین و ترتیب اور تنظیم و تہذیب میں ان تمام تجربات سے فائدہ اُٹھاؤنگا۔ جو سال گذشتہ میں وقت' روپے اور محنت کی قیمت پر حاصل ہوئے۔ یہ تجربات کیا ہیں' اور انہوں نے کیا سبق دیا۔ اس پر انشاء اللہ سال آئندہ کی اشاعات گواہ ہونگی۔

میں اس سال کی اس آخری اشاعت میں ان تمام معاونین کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے ہزار داستان کو خریدا پڑھا اور دوسروں کو اسے پڑھنے کا موقع دیا۔

خداوند کریم سے دُعا ہے کہ وہ ہزار داستان کو ادب اُردو کی بہترین خدمتوں کا ذریعہ بنائے۔ اور مجھے اس خیر جاری کو حقیقی معنوں میں ایک ادبی برکت بنانے کی قابلیت اور ہمت عطا فرمائے۔

وما توفیقی الا باللہ

چو سال تازہ می شدے مے قدیم داشتم

ایڈیٹر

شہیدِ محبت

پوسٹماسٹر

اولاپور، اگرچہ بہت چھوٹا موضع تھا اور اُس میں کسی ڈاکخانہ کی ضرورت نہ تھی۔ مگر اس کے قریب ہی ایک انگریز کے نیل کا کارخانہ تھا۔ اس لئے اس کے کاروباری مشکلات کو دیکھتے ہوئے یہاں ڈاکخانہ کھول دیا گیا۔

جو پوسٹماسٹر اس ڈاکخانے میں تعینات کیا گیا وہ ایک خوش اخلاق اور ذکی الحس شخص تھا۔ اس کی عمر کا زیادہ حصّہ کلکتے جیسے شہر میں گذرا تھا۔ اُس کے لئے اس موضع میں رہنا اس مچھلی کے اضطراب سے کم نہ تھا جو پانی سے دُور رہ کر اپنی زندگی کی سانسیں پوری کرنے پر مجبور ہو۔ اسکا دفتر اور مکان تالاب کے کنارے گھاس پھوس سے بنا ہُوا تھا۔ جہاں دُور تک شاداب گھاس اُگی ہوئی تھی کارخانے کے مزدور، دن بھر اپنے کاموں میں مصروف رہتے اس کے علاوہ اُن کی صحبت کسی تعلیم یافتہ شخص کیلئے دلچسپی کا شان بھی نہ ہو سکتی تھی، کلکتے کے نوجوانوں میں اکثر یہ نقص ہوتا ہے کہ وہ بہت دیر آشنا ہوتے ہیں۔ اور اجنبی لوگوں سے بہت کم ملتے جُلتے ہیں۔ جس سے اُنہیں دیکھنے والا مغرور خیال کر لیتا ہے۔ اگر خوش قسمتی سے وہ کسی قدر بے تکلف ہو بھی جائیں تو ایک عرصے تک ان کی ہر بات اور طرز انداز میں ایک خودداری اور کشیدگی محسوس ہوتی ہے۔ اور احباب یہ خیال کرتے ہیں کہ شاید اس کو ہماری صحبت سے دلچسپی نہیں۔

یہی بات تھی کہ پوسٹماسٹر باوجود اتنے دن یہاں رہنے کے تنہا تھا۔ اُس کی مشغولیت کے لئے کام بھی زیادہ نہ تھا اس لئے بعض وقت یہ اپنی اس تنہائی کو ولولہ خیز نظموں کے لکھنے میں غرق کرنے کی کوشش کرتا، اس وقت اُس کے ذہن میں اس قسم کے لطیف جذبات ہوتے جنہیں وہ عطیۂ فطرت سمجھتا تھا۔

"پتّوں کی جنبش اور آسمان پر سیہ مست بادلوں کا اجتماع انسانی زندگی کے لئے ایک لازوال نعمت ہے"

لیکن اگر کسی رات کو الف لیلے کا کوئی جن گنجان درختوں اور سبز پتّوں کی بجائے سڑکوں اور شہروں کی طرح اُونچی اُونچی عمارتیں، بنا دیتا تو اُس کی نظروں سے بادلوں کا یہ پُر کیف منظر غائب ہو جاتا۔

پوسٹماسٹر کی تنخواہ اسقدر کم تھی۔ کہ اس کو اپنا کھانا خود

ہی پکانا پڑتا تھا۔ البتہ ایک دیہاتی لڑکی اس کے ان کاموں میں بڑی سرگرمی سے ہاتھ بٹاتی تھی۔ اور چھوٹے چھوٹے خانہ داری کے کاموں کو خود ہی کرلیا کرتی تھی پوسٹماسٹر کا قاعدہ تھا کہ جب شام ہوتی گاؤں کے مکانوں سے تاریک دھواں فضا میں چھانے لگتا اور چڑیں ترانہ رخصتی گانے لگتیں تو یہ اپنا چراغ جلاکر رتن کو بلاتا۔ بھولی رتن دروازے کے باہر شام ہی سے اس کے بلانے کی منتظر رہتی۔ اور جب وہ اُس کو آواز دیتا تو فوراً ہی اندر نہ جاتی۔ بلکہ پہلے اُس سے پوچھتی کہ "کیا آپ نے مجھے بلایا ہے۔ پوسٹماسٹر اس سے پوچھتا کہ تم کیا کر رہی ہو" جس کے جواب میں وہ کہتی کہ اب میں باورچیخانے میں چولہا جلانے کیلئے جا رہی ہوں

"خیر چولہا پھر جلالینا پہلے میری چلم میں آگ رکھ دو"

رتن فوراً چلم میں کوئلہ اور آگ رکھ کر پھونکنے لگتی۔ جس کی محنت سے اُس کے نازک رخسار تمتما اُٹھتے، جب رتن چلم لے کر اندر آتی تو پوسٹماسٹر اس سے اس طرح کی گفتگو شروع کرتا۔

"اچھا رتن بتاؤ کیا تمہیں اپنے ماں باپ یاد ہیں"

یہ سوال رتن کی پریشان خیالیوں کا محرک تھا۔ کیونکہ اب اس کے دماغ میں والدین کی یاد کا ایک دُھندلا سا نقشہ باقی رہ گیا تھا۔ البتہ بہ نسبت ماں کے اُسے اپنے باپ کی کچھ باتیں یاد تھیں۔ کہ وہ روزانہ شام کے وقت اپنا کام ختم کرکے گھر آیا کرتا تھا۔ ایسی ہی اور بہت سی باتیں ہیں۔ جن کی ایک خفیف سی جھلک اس کے دماغ میں نمایاں ہوکر غائب ہوجایا کرتی تھی۔

یہی باتیں کرتے کرتے غریب لڑکی پوسٹماسٹر کے پاؤں کے پاس بیٹھ جاتی، دفعتاً اُس کے دماغ میں گذشتہ واقعات کی ایک ہلچل پیدا ہوتی۔ کبھی وہ اپنے چھوٹے بھائی کو یاد کرتی اور کبھی اُس سادہ دلکش کھیل کو جو وہ شست لیکر اپنے بھائی کے ساتھ تالاب کے کنارے کھیلا کرتی تھی۔

اس قسم کی تاریک مگر الم افزا تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتیں جو اپنے برقی اثر سے اُس پر ایسی کیفیت طاری کر دیتی تھیں کہ وہ سب کچھ بھول جاتی۔ اُسے یہ بھی خبر نہ ہوتی تھی کہ وہ کہاں ہے، کھانا پکانے میں کتنی دیر ہو رہی ہے۔ عالم خیال میں وہ بالکل بھول جاتی اور رات کا بڑا حصہ گذر جاتا۔ حتیٰ کہ پوسٹماسٹر کے لئے کھانا پکانا دشوار ہوجاتا۔ مگر جب اس کی یہ خیالی سیر ختم ہوجاتی تو وہ چونک پڑتی اور اُسے اپنے فرائض یاد آجاتے، فوراً آگ جلاکر صرف روٹیاں پکالیتی اور دونوں ملکر دن کے کھانے کے ساتھ کھالیتے،

کبھی کبھی شام کے وقت پوسٹماسٹر اپنے وسیع اور پھوس کے چھپر میں تنہا بیٹھا ہوا گھر کے خیال میں اسقدر محو ہوجاتا اور گھر والوں کی یاد اُسے اسقدر از خود رفتہ بنادیتی۔ کہ اُس کا اضطراب پسند دل اس غریب الوطنی میں ہمہ تن اضطراب بن جاتا۔ مگر وہ محسوس کرتا تھا کہ میرے ان خیالات سے رتن

بھی پورے طور پر متاثر ہوتی ہے۔ اس لئے کہ رتن پوسٹماسٹر کے گھر والوں کو اس طرح پوچھتی گویا وہ انہیں جانتی ہے۔ اور اُس کے دماغ میں اُن کی خیالی شکلیں موجود ہیں۔

ایک روز شام کو جب پانی برس کر کھل چکا تھا ہوا کے سرد جھونکے چل رہے تھے۔ اور شاداب پتّیاں اس طرح ہل رہی تھیں۔ جس طرح کوئی تھکا ماندہ مسافر تنفس پیہم کیلئے مجبور ہو اور ہر سانس میں اس کی تفریح خاطر کا سامان مضمر پوسٹماسٹر کے خیالات نکھرے ہوئے پتّوں کی صفائی اور برس کر افق پر چھا جانے والے ابر کے پُرکیف نظاروں میں غرق تھے۔ آخر وہ اس نظارے سے متاثر ہو کر کہنے لگا۔ کہ کاش اس وقت یہاں کوئی میرا ہم مذاق رفیق ہوتا یا وہ ہستی میرے پاس ہوتی۔ جس سے مجھے محبت ہے۔ جذبۂ خیال بھی عجب چیز ہے۔ رفتہ رفتہ محویت نے اُس کے ادراک و فہم پر قبضہ کر لیا اور وہ یہ سمجھنے لگا۔ کہ ہر نغمہ سنج طائر میری ہی طرح شکوہ سنج فراق ہے۔ چٹکنے والے غنچے میرے ہم آہنگ اور ہر پتّی میرے متحرک دل کے اثر سے وقفِ اضطراب ہے۔

محویت کی انتہا ایک ٹھنڈی سانس پر ختم ہوئی۔ اُس نے گھبرا کر رتن کو پکارا جو جامن کے درخت کے نیچے کچی جامنیں کھا رہی تھی رتن یہ آواز سُنکر چونک پڑی اور یہ کہتی ہوئی دوڑی کہ "کیا دادا تم نے مجھے بلایا ہے"۔ پوسٹماسٹر نے کہا۔ ہاں' میں خیال کر رہا تھا کہ آج سے تمہیں پڑھایا کروں۔ کیا تم بھی پسند کرتی ہو؟ چنانچہ اُس نے دن کا باقی حصہ رتن کو الف' بے' پڑھانے میں صرف کیا۔

کالے بادلوں کی یورش دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شاید بارش ختم ہی نہ ہو گی۔ جس طرف نظر جاتی تھی پانی ہی پانی نظر آتا تھا۔ ندی نالے چڑھے ہوئے تھے۔ اور انکی پر جوش روانی میں نگاہیں بھی لہروں کے ساتھ دُور تک بہتی ہوئی چلی جاتی تھیں۔ دن کے سناٹے اور رات کی خاموشی میں سوائے مینڈک کے شور و غل اور بارش کے پیہم تقاطر کے کوئی آواز نہ سُنائی دیتی تھی۔ بارش کی کثرت نے راستوں کو یہانتک دشوار گذار بنا دیا تھا۔ کہ معمولی خرید و فروخت کے لئے بھی کشتی کی ضرورت پڑتی تھی۔

ایک روز جب آسمان پر ابر چھایا ہوا تھا۔ رتن پڑھنے کے لئے پوسٹماسٹر کی آواز کی منتظر تھی۔ لیکن آج خلاف معمول اس نے اُسے نہ بلایا۔ انتظار کرتے کرتے تھک کر اُس نے پھٹی ہوئی کتاب اُٹھائی اور آہستہ سے لیکر کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس نے دیکھا کہ پوسٹماسٹر چارپائی پر لیٹا ہوا ہے۔ وہ پلٹنے ہی کو تھی۔ کہ اُس نے اپنے نام کی آواز سُنی۔ اور فوراً پوچھا" دادا کیا تم سو گئے تھے؟" پوسٹماسٹر نے کمزور آواز میں جواب دیا۔ کہ میری طبیعت اچھی نہیں۔ پیشانی پر ہاتھ رکھ کر دیکھو کسقدر جل رہی ہے۔

پوسٹماسٹر کو اس تنہائی اور بارش کے خوفناک سناٹے میں

تیمارداری کے لئے کسی نرم و نازک اور شفیق ہاتھ کی ضرورت تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کی پیشانی پر ایسے ہاتھ ہوں جن کے چوڑیوں کی جھنکار مادرانہ شفقت کی طرح تسلی بخش ہو۔

دیہاتی کمسن رتن بیمار کی یہ تمنا پوری کرنے کے لئے ایک ماں کی طرح شفیق بن گئی۔ اور فوراً قریب کے ایک دیہاتی حکیم کو بلا لائی۔ اور خود ایک شفیق نرس کا فرض انجام دینے لگی۔ اکثر اس نے رات رات بھر جاگ کر صبح کی اور بیمار کی کراہ پر اپنی نیند قربان کر دی۔ وہ اس کے لئے دلیا پکاتی اور برابر اس سے پوچھتی رہتی کہ دادا اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔

رفتہ رفتہ پوسٹماسٹر اچھا ہونے لگا۔ ایک دن اس نے نہایت مطمئن لہجے میں کہا کہ اب میں زیادہ دنوں تک آب و ہوا کی خرابیوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ جلد یہاں سے تبادلہ کرانے کی کوشش کرونگا۔ یہ سوچکر اس نے فوراً ایک درخواست اس مضمون کی بھیجدی کہ یہاں کی آب و ہوا میری صحت کے لئے سخت مضر ہے۔ بہتر ہو کہ میرا تبادلہ کسی دوسری جگہ کر دیا جائے۔

جب پوسٹماسٹر اچھا ہو گیا تو رتن حسب معمول دروازے کے باہر بیٹھنے لگی۔ لیکن اب وہ اُسے پہلے کی طرح اندر نہ بلاتا تھا بلکہ خود رتن کبھی کبھی کمرے میں چپکے سے جھانک کر پوسٹماسٹر کو دیکھ لیتی تھی۔ جو یا تو کرسی پر نہایت گہرے سکوت کے ساتھ بیٹھا ہوتا یا لیٹا ہوا قریب کی دیواروں کو دیکھتا رہتا۔ ادھر رتن منتظر تھی کہ وہ اُسے بلائے۔ اور ادھر پوسٹماسٹر اپنی درخواست کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ رتن اس ندامت کے خیال سے اپنا سبق یاد کرتی رہتی۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جب وہ سبق پڑھنے کے لئے اندر بلائے تو اُسے یاد نہ نکلے۔

آخرکار ہفتے کے انتظار کے بعد پوسٹماسٹر نے رتن کو آواز دی۔ وہ خوش ہو کر اُسی طرح بہ کمتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی کہ "کیا دادا تم مجھے بلا رہے ہو؟"

پوسٹماسٹر نے کہا ہاں رتن میں کل صبح کو یہاں سے چلا جاؤنگا۔

رتن نے گھبرا کر پوچھا "دادا تم کہاں جاؤ گے"

میں اپنے گھر جاؤنگا۔

پھر کب آؤ گے؟

اب کبھی نہ آؤنگا۔

رتن اس کا یہ جواب سُنکر خاموش ہو گئی لیکن پوسٹماسٹر نے کہا کہ میں نے یہاں سے اپنے تبادلے کی درخواست دی تھی۔ مگر وہ منظور نہیں ہوئی۔ اس لئے میں استعفا دیکر گھر جا رہا ہوں۔ یہ کہکر دونوں خاموش ہو گئے چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ چھپر کے ایک کونے میں بارش کا پانی مٹی کے برتن میں ٹپک رہا تھا۔ جو اسی خیال سے رکھ دیا گیا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد رتن باورچی خانے میں کھانا پکانے کے لئے چلی گئی۔ لیکن آہ اب اس میں وہ پہلی سی مسرت آمیز

تیزی نہ تھی۔ نئے نئے خیالات اس کے دماغ میں کشمکش کر رہے تھے۔ جب پوسٹماسٹر رات کا کھانا کھا چکا تو رتن نے اُس سے کہا۔ کہ دادا تم مجھے بھی اپنے ساتھ ہی گھر لیتے چلو

پوسٹماسٹر نے بھولی لڑکی سے یہ کہنا مناسب نہ سمجھا کہ اُس کے لے جانے میں کس قدر دقتیں ہیں۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ کہ "یہ بھی کیسا سادہ خیال ہے"۔ یہی آواز تھی رات بھر اس کے کان میں آیا کی اور کروٹیں بدل بدل کر صبح کا انتظار کرتی رہی۔ صبح کو اُٹھتے ہی پوسٹماسٹر نے حسب معمول نہانے کا پانی گرم پایا۔ کیونکہ اس نے یہاں بھی (باوجود ندی قریب ہونے کے) اپنے نہانے کا طریقہ وہی رکھا تھا جس طرح کہ وہ کلکتے میں نہایا کرتا تھا۔ اُس کو ندی میں غوطہ لگا کر نہانے میں شرم آتی تھی۔

رتن نے اس وقت یہ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ وہ کس وقت یہاں سے جائیگا۔ پوسٹماسٹر نے نہانے کے بعد اُسے بُلایا۔ رتن چپ چاپ اندر چلی گئی۔ اور پوسٹماسٹر کو اس خاموشی سے دیکھنے لگی۔ گویا وہ اس کے کسی حکم کی منتظر ہے۔ پوسٹماسٹر نے نہایت غمگین آواز میں کہا۔ رتن میرے چلے جانے کے خیال سے تم رنجیدہ نہ ہو۔ میں اپنی جگہ پر آنے والے پوسٹماسٹر سے کہتا جاؤنگا۔ کہ وہ تمہارا خیال رکھے۔ پوسٹماسٹر کی یہ گفتگو اُس کے مجروح دل پر نمک کا کام کر گئی۔ آہ شاید وہ نہ جانتا تھا کہ عورتوں کا دل کسقدر لطیف احساسات کا مرکز ہوتا ہے۔ جس میں خوشی اور غم دونوں کی باقاعدہ نشوونما ہوتی ہے

رتن نے اکثر پوسٹماسٹر کے سخت سے سخت الفاظ سُنے تھے۔ اور انہیں آسانی سے ضبط کر گئی تھی۔ لیکن اس تسلی بخش جملے میں خدا جانے وہ کونسی ناقابل ضبط کشش تھی جس نے اُس کے دُکھے ہُوئے دل کو چھیڑ دیا۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بے اختیار کہنے لگی۔ نہیں نہیں میرے متعلق کسی سے کچھ نہ کہیے۔ آپ کے جانے کے بعد میں یہاں نہیں رہ سکتی"

پوسٹماسٹر اس کی یہ باتیں سُنکر حیران ہو گیا۔ اس نے رتن کو واقعات کی ایسی کشمکش میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

آخرکار اُس کی بجائے آنیوالا پوسٹماسٹر اپنے وقت پر آ گیا۔ اور اُس نے دفتر کا جائزہ دیکر چلنے کی تیاری شروع کر دی۔ جب سب سامان کر چکا اور چلنے لگا تو اُس نے رتن سے بُلا کر کہا۔" یہ لو اب غالباً تمہیں کچھ عرصے تک اپنے کھانے کی فکر نہ کرنی پڑیگی۔ یہ کہتے ہُوئے اُس نے اپنی پوری تنخواہ (سوائے اُن چند روپوں کے جو اُس نے سفر کے لئے لے لئے تھے) جیب سے نکال کر رتن کو دینے لگا لیکن اُس نے قدموں پر گر کر کہا۔"

دادا مجھے کچھ نہ دو۔ اور نہ میری فکر کرو۔ یہ کہکر وہ وہاں سے اُٹھی۔ اور کسی طرف کو چل دی۔

پوسٹماسٹر نے ایک ٹھنڈی سانس لیکر اپنا تھیلا اور چھتری کاندھے پر رکھی اور صندوق مزدور کے سر

رکھوا کر کشتی کی طرف چلا۔

ندی خوب چڑھی ہوئی تھی۔ جب وہ بیٹھ گیا اور کشتی چلی تو ندی کا پانی خوفناک تیزی کے ساتھ کشتی کے نیچے بہنے لگا۔ اگرچہ وہ گھر جا رہا تھا لیکن اُس کا دل بے انتہا پریشان تھا غریب رتن کی مغموم صورت اُس کی آنکھوں میں پھر رہی تھی۔ جس سے غضب کا حزن و ملال ظاہر ہو رہا تھا۔

پوسٹ ماسٹر رتن کو عالمِ خیال میں مغموم و رنجیدہ دیکھ کر بیتاب ہو گیا۔ اُس نے چاہا۔ کہ گاؤں جا کر رتن کو اپنے ساتھ لے آؤں لیکن ہوا تیزی سے بادلوں کو پھیلا رہی تھی۔ چند لمحوں میں کشتی ندی کے تیز بہاؤ میں آگئی۔ اور گاؤں نظروں سے غائب ہو گیا۔

اس تیز بہنے والی ندی میں سفر کرنے والا مسافر دُنیا کی بے ثباتی، موت و حیات کی کشمکش اور حوادث انقلاب پر فلسفیانہ انداز میں غور کر رہا تھا۔

لیکن آہ رتن فلاسفر نہ تھی۔ اُس کا دماغ فلسفیانہ نہ تھا۔ وہ پوسٹ آفس کے چاروں طرف مستانہ وار گھوما کرتی اور آنسو اُس کے نازک رخساروں پر بہا کرتے! جھوٹی امیدیں اُسے یقین دلاتیں کہ پوسٹ ماسٹر پھر آئیگا۔ یہی خیال تھا۔ جو رتن سے اُس جگہ کی پرستش کراتا تھا۔ اور وہ اُس سے علیحدہ ہونے میں اپنی موت سمجھتی تھی۔

امید ایک سراب ہے۔ جسے انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں کے ہجوم میں دریا سمجھتا ہے حالانکہ مرتے دم تک اُسے اس دریا سے پانی کی ایک بوند بھی نصیب نہیں ہوتی۔

(ٹیگور)

ثاقب

غزل

جو تری انجمنِ ناز میں داخل ہو جائے
نازشِ جلوہ گہِ طور وہی دل ہو جائے

یہ غنیمت ہے کہ ہیں بزم میں نیچی نظریں
ادھر اُٹھ جائیں تو جینا مجھے مشکل ہو جائے

میں کہوں قصۂ غم اور وہ مخاطب بھی نہ ہوں
بے اثر یوں نہ کسی کی طپشِ دل ہو جائے

دل شکستہ نظر آتا ہے کوئی دل والا
دیکھ بے رنگ نہ قاتل تری محفل ہو جائے

مٹ بھی جاؤں رہِ اُلفت میں تو اے ہمتِ شوق
دل کا ہر ذرّہ حریفِ غمِ منزل ہو جائے

تاقیامت پھر اُسے ہوش نہ آئے سرشار
جو کسی جلوہ گہِ حسن میں غافل ہو جائے

سرشار

قربانی

(ایک حسرتناک قصّہ)

(۱)

مکان کی دوسری منزل میں گیس کی روشنی سے جگمگاتے کمرے میں شوہر اور بیوی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ چاروں طرف روشنی ہی روشنی تھی۔ ایک تو صاف کمرہ، اس پر آراستگی اور غضب ڈھا رہی تھی۔ روشنی کی کرنیں چاروں طرف لگے ہوئے آئینوں پر پڑکر آنکھوں کو چندھیا رہی تھیں۔ لیکن ان سے بڑھ کر اس جوڑے کا جہاں سوز حسن تھا۔ اور اٹھتی ہوئی جوانی کے ماہتاب بشرے جس نے اس کمرے کو بقعۂ نور بنا رکھا تھا۔ اگرچہ ان کے چہروں سے گہری فکر کے آثار ہویدا تھے۔

یکایک بیوی کے خیالات نے پلٹا کھایا۔ اس نے تفکر کے عکس کو اپنے چہرے سے دور کر کے بڑی بڑی آنکھوں سے مسکراہٹ کا اظہار کرتے ہوئے نہایت پیار سے شوہر کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔ اور کہا۔

"تمہیں میرے سر کی قسم۔ میری یہ بات مان لو میں نے آجتک تم سے کسی بات کے لئے تقاضا نہیں کیا۔ آج پہلا دن ہے مجھے ناامید نہ کرنا۔"

شوہر نے سر اوپر اٹھایا اور ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "یہ تقاضا کیا مناسب ہے؟"

کیوں نہیں، بڑے بوڑھوں کے دل کو صدمہ پہنچ رہا ہے۔ اتنے بڑے خاندان کا نام و نشان مٹ جائیگا۔ کیا اس پر بھی میرا تقاضا نامناسب ہے۔ کیا میں سب سے بڑھ کر ہوں۔ جو میرے لئے ناقابلِ برداشت نقصان برداشت کیا جائے۔ اپنے ماں باپ کے آنسوؤں کو دیکھو۔ اور پھر کہو۔ کہ کیا یہ کام نامناسب ہے؟"

نہیں صرف تمہارے لئے نہیں۔ بلکہ اس سے میری راحتِ قلبی کافور ہو جائیگی۔"

"کیا ہوا۔ یہ فرضِ اولاد کی ادائیگی ہے۔ اگر اس کے لئے تمہیں کچھ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی۔ تو شوق سے کرو۔ اور اگر نہیں کر سکتے ہو تو تم مرد کاہے کے ہو۔"

"لیکن اس کا علاج اور بھی ہے۔ لڑکا گود لے لو"

"پھر وہی بات۔ میں اپنا لڑکا چاہتی ہوں۔ بیگانہ نہیں۔"

شوہر نے حسرت بھرے لہجے میں کہا "تو کیا پربھل کوئی اور چارہ کار نہیں؟"

"اور کیا علاج۔ اچھا ہوگا۔ میری ایک اور بہن آ جائیگی۔ میں اکیلی ہوں۔ سہیلی ملیگی۔"

بابو تارا چرن نے خشک ہنسی ہنستے ہوئے کہا "اس کے بعد؟ سوت کو اپنے شوہر کی محبت کے حصہ میں شریک کروگی نا۔ اور حسد تو نہ کروگی۔"

"حسد کیسا۔ میں کیا ایسی غریب ہوں۔ کہ میری دولت وہ لے کر سکتی ہو اور مجھے حسد ہو۔"

تارا چرن نے پربھل کو گلے سے چمٹا لیا۔ اور اس کے چہرے پر محبت کی مہر ثبت کردی۔ پربھل کہنے لگی "ان پیار کی باتوں میں مجھے مت رجھاؤ۔ صاف صاف کہو بیاہ کروگے یا نہیں۔ تاکہ کل ماں سے کہدوں۔"

تارا چرن کہنے لگے "پربھل سوچ لینے دو۔ اور دو دن ٹھیر جاؤ۔" پربھل نے کہا۔ "نہیں اب میں ایک دن بھی انتظار نہیں کرسکتی۔"

(۲)

ماں نے شوہر کو پیغام پہنچا دیا۔ کہ لڑکا شادی کرنے پر رضامند ہوگیا ہے۔ اور ـــــ "بہو کہتی ہے کہ اس کے میکے میں ایک غریب لڑکی ہے۔ اس کا باپ نہیں ہے۔ مگر لڑکی نہایت خوبصورت۔ سادگی مجسم اور حیادار ہے۔ اس لڑکی کے ساتھ بیاہ کردو۔"

پربھل نے ہنستے ہنستے شوہر سے جاکر کہا۔

تارا چرن چپ ہوگئے۔ اور شرم سے گردن نیچی کرلی۔ دونوں ہاتھوں سے شوہر کے منہ کو اوپر اٹھاتے ہوئے پربھل کہنے لگی "چہرے پر یہ پژمردگی کیا مجھے سکھی دیکھ کر تمہیں خوشی نہیں ہوتی؟"

تارا چرن کہنے لگے "پربھل وقت ہے۔ اب بھی مان جاؤ۔ تم نادانی کر رہی ہو۔"

"بس یہ باتیں اس وقت رہنے دو۔"

"دیکھو۔ جسے بیاہ کر لاؤنگا۔ اس کے متعلق بھی میرا کوئی فرض ہوگا۔"

پربھل نے ایک نرالے انداز سے کہا "تو سچ ہی کیا ہے۔ تم اسے بھی میری ہی طرح پیار کرنا۔"

"تم تو پاگل ہو۔ انسان کیا کبھی دو کو ایک جیسا پیار کرسکتا ہے۔ دونوں پلڑے کبھی یکساں نہیں ہوسکتے۔"

"نہیں ہوسکتے۔ تو تم اسی کا پلڑا بھاری رکھنا۔ میں اس میں ناراض نہ ہونگی۔"

بیاہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ کوئی خوشی کا بیاہ تھوڑا ہی تھا۔ جو دھوم دھام ہوتی۔ اس بیاہ سے گھر کی مالکہ۔ مالک۔ نوکر۔ چاکر۔ اڑوسی۔ پڑوسی سب رنجیدہ تھے۔ آہستہ آہستہ بیاہ کا دن نزدیک آگیا۔ ماتھے پر مکٹ

لٹکا۔ سنجیدہ چہرہ بنائے فٹن پر سوار ہو بابو تاراچرن بیاہ کر آئے۔

دولہا دلہن کے آنے پر مالکن آنسو پونچھتے ہوئے ان کی آرتی اتارنے چلی۔ آگے آگے بنارسی ساڑی زیب تن کئے سر سے پاؤں تک زیوروں سے آراستہ ہنستی۔ اتراتی ہوئی پرپھل بھی چلی۔ مدعو شدہ استریوں اور محلے کی عورتوں نے بھی مالکن کی دیکھا دیکھی اپنے آنسو پونچھے۔ پرپھل نے نہایت بے تابانہ انداز میں پہلے نو نہی بہو کا منہ دیکھا۔ اور اس کے بعد اپنے بدن سے یکے بعد دیگرے تمام زیور اتار کر اس کو پہنانے لگی۔ جس نے دیکھا اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ ایک شور مچ گیا۔ "یہ تو ست یگ ہے۔ ورنہ کون ایسی عورت ہے۔ جو اپنی سوت سے اس محبت اس احترام کا سلوک کرے۔" پرپھل نے ان کی بات کاٹ سکراتے ہوئے کہا۔ "کیوں تم بار بار سوت سوت کہہ رہی ہو۔ کلیانی میری چھوٹی بہن ہے۔" مالکن کہنے لگی۔ "بیٹا تاراچرن کہاں جاتا ہے۔ ٹھیر جا۔ آرتی اتار لینے دے ورنہ بدشگونی ہوگی۔" لیکن تاراچرن نے ایک نہ سنی۔ اور باہر چلے گئے۔ اس کے بعد بہو کی چہرہ کشائی کی رسم ادا کی گئی منہ دیکھ کر سب چپ ہو گئیں۔

بہو اگرچہ اچھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ پھر بھی پرپھل سے اس کو کیا نسبت۔ صرف مالکن کہنے لگی بہت خوبصورت ہے۔ آنکھیں بڑی رسیلی ہیں۔ میری لکھشمی بڑھاپے تک سہاگن بنی رہو۔ جس لئے آئی ہو وہ امید پوری کر دو۔ میری بیٹی۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔" مالکن کی یہ بات سن کر سب نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے ماں جی" ایسی ستی لکھشمی اور درگا کی سی بہو ہوتے ہوئے بھلا کوئی شوق سے دوسری بہو بلاتی گئی ہے۔ خیر جو ہونا تھا۔ سو ہو گیا۔ ہم دل سے دعا دیتے ہیں۔ کہ اس کی گود ہری بھری ہو۔ ایک للو ہو۔ خاندان کا نام رہ جاویگا۔ اسی لئے تو بیاہ کیا جاتا ہے۔ ورنہ بہو کا کام ہی کیا ہے۔"

اس کے بعد دوسری رسمیں ادا کی گئیں۔

تاراچرن اپنے کمرے میں بیٹھے کتاب پڑھ رہے تھے۔ پرپھل نے آکر کہا۔ "ذرا سر تو اونچا کرو۔" بات کا مطلب سمجھ کر تاراچرن اور بھی جھک کر کتاب پڑھنے لگے۔ پرپھل نے ترچھی چتون سے کہا۔ "اتنا ڈرتے کیوں ہو۔ میں نے تمہیں کوئی بری چیز تو نہیں دی۔ آنکھیں بھر کر دیکھ تو لو۔" تاراچرن خاموش ہو گئے۔

"نہیں دیکھو گے کیا؟"

تاراچرن کرسی سے اٹھ کھڑے ہوتے۔ اور بولے "مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ میں نیچے جاتا ہوں۔"

پرپھل نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور ہنستے ہوئے کہا۔ "بھاگتے کیوں ہو۔ جس کے ڈر سے بھاگے جاتے تھے۔ وہ خود ہی چلی جا رہی ہے۔ ہاں کلیانی جاؤ۔ انّو بہن کے پاس چلی جاؤ۔"

بات پوری نہ ہونے پائی تھی کہ کلیانی چلی گئی۔ تب پرپھل کہنے لگی۔ "لو اب بیٹھو۔ ہر بات میں تمہارا نخرہ ہے۔ خواہ مخواہ چڑھ جاتے ہو۔"

"کون۔ میں یا تم"؟

"بھلا تم نے شادی کی ہے۔ دوبانہیں بھی نہ کرو گے"؟

"یہ سب کچھ تم نے کیا ہے۔ اس کی ذمہ دار محض تم ہو۔"

آہستہ سے مسکراتے ہوئے شوہر کے گلے میں باہیں ڈال کر پرپھل نے کہا۔ "کیوں۔ کیا اور کوئی پسند نہیں آتی؟"

"نہیں" کہہ کر تارا چرن نے بیوی کا منہ چوم لیا۔

(۲۳)

انّو جیجی ان لوگوں کے خاندان میں سے ہے۔ وہ بیوہ ہے۔ اس لئے ہمیشہ وہیں رہتی ہے۔ نئی بہو کلیانی دوسری منزل کے ایک علیحدہ کمرے میں ہمیشہ اسی کے پاس سویا کرتی ہے۔ انّو بھی اُسے دوسروں کی نسبت زیادہ مانتی ہے۔

نہ سکھ ہے نہ دُکھ۔ نہ رنج ہے نہ راحت۔ یونہی کلیانی کے دن گذر رہے ہیں۔ مفلس اور مفلوک الحال گھر میں پیدا ہونے کی وجہ سے وہ امورِ خانہ داری سے ناواقف تو نہیں ہے۔ وہ محنت اور جفاکشی کی عادی تھی۔ لیکن صبح اُٹھتے ہی جب وہ انو جیجی کے ساتھ کام کے لئے جانے لگتی تو پرپھل آکر اسے ہاتھ پکڑ کر لے جاتی اور کہتی۔ "واہ تم کیوں کام کرتی ہو؟" کبھی مالکن کوئی کام کرتے دیکھتی تو کہہ دیتی۔ "بہو تمہیں یہ کام زیب نہیں دیتے۔ تم اُوپر جاؤ۔"

مصرانی روٹی پکاتی۔ کلیانی اس کے پاس جا بیٹھتی اور اُسے ہاتھ پکڑ کر وہاں سے ہٹا دیتی۔ "بہو یہاں مت بیٹھو۔ دھوئیں کی وجہ سے آنکھیں خراب ہو جائیں گی۔"

کلیانی پرپھل کے پاس جاتی۔ "مجھے ریشم کے بیل بوٹے کاڑھنا سکھا دو۔" پرپھل ہنس کر جواب دیتی۔ "بہن اتنی تکلیف اور محنت کاہے کے لئے۔ میں جو جانتی ہوں۔ اس سے تمہارا کام چل جاوے گا۔ بس تمہاری گود ہری بھری ہو اس سے ہمارے دل کے ارمان پورے ہو جائیں گے۔" یہ باتیں بڑے پیار۔ بڑی محبت سے کہی جاتیں۔ لیکن کلیانی ان کا مطلب نہ سمجھ سکتی۔ اس کے رشتہ دل پر چوٹیں لگتیں اور وہ منہ پھلائے ایک کونہ میں جا بیٹھتی۔

نہ کام ہے نہ دھندا۔ کوئی ایسی بات نہیں جس میں

کلیانی کا جی لگے۔ اس لئے ہر وقت اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی ماں کا پیارا اور خوشنما چہرہ پھرا کرتا۔ اور اس کی یاد میں بیچاری کلیجہ مسل کر رہ جاتی۔

تیسرے پہر اس کے بال گوندھتے گوندھتے پرپھل نے کہا۔ "کلیانی۔ تمہارا چہرہ اسقدر اُتر کیوں گیا ہے؟" کلیانی کیا جواب دیتی۔ خاموش رہ گئی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا مُنہ اُترا ہوا ہے۔ بال باندھ چکنے پر پرپھل نے کہا۔ "تم ذرا بیٹھو۔ مَیں ابھی آتی ہوں"۔

پرپھل کے جانے کے بعد نوکرانی نے پوچھا۔ "کیوں چھوٹی بھابی۔ بھائی کے ساتھ تمہارا دل مل گیا یا نہیں؟ کلیانی نے شرم سے گردن نیچی کر لی۔

"بولتی کیوں نہیں۔ شرم کیوں کرتی ہو۔ باتیں ہوئی ہیں یا نہیں؟"

کلیانی نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "مَیں تو انو جیجی کے پاس رہتی ہوں"۔

"تو کیا بھیا نے ایک دن بھی اپنے پاس بُلا کر تم سے باتیں نہیں کیں!"

"نہیں"۔

نوکرانی محبّت آمیز لہجے میں کہنے لگی۔ اُنہوں نے اشتیاق سے تو شادی نہیں کی ہے۔ اولاد نہیں ہوتی تھی اسی وجہ سے انہوں نے دوسری شادی کی۔ ورنہ پرپھل جیسی عورت کے گھر میں ہوتے کون کسی دوسرے سے محبّت کر سکتا ہے"۔

بات تو سچ کہی۔ کلیانی کم سمجھی پر بھی یہ بات سمجھ سکتی ہے وہ خاموش بیٹھی رہ گئی۔

(۴)

رات کے دس بج چکے۔ تاراچرن سونے کے کمرے میں گئے۔ دیکھا کہ ابھی تک پرپھل نہیں آئی۔ آدھا گھنٹہ گذر گیا۔ وہ حسرت بھرے دل سے پلنگ کی طرف مُنہ پھیرتے ہی کیا دیکھتے ہیں۔ کہ دروازہ کے پاس ایک لمبا گھونگھٹ نکالے ایک لڑکی کھڑی بید کی طرح کانپ رہی ہے تاراچرن کا خون منجمد ہو گیا۔ وہ خاموش کھڑے رہے کلیانی بھی کھڑی رہی کچھ منٹ بعد تاراچرن نے کہا۔ "پرپھل کہاں ہے؟"

کلیانی نے کوئی جواب نہ دیا۔

انہوں نے پھر پوچھا۔ "پرپھل کہاں ہے؟"

کان میں ایک باریک آواز آئی۔ "نیچے"۔

تاراچرن نے کچھ دیر کے سکوت کے بعد کہا۔ "معلوم ہوتا ہے۔ اسی نے بھیجا ہے"۔

"ہاں"

"تم نیچے جاکر اُسے یہاں بھیجدو۔

کلیانی چلی گئی۔ اس وقت بیچاری کے ننھے سے دل میں کیا کیا جذبات اُٹھ رہے تھے۔ کیا کیا خیالات موجزن

تھے۔ تاراچرن ایک ٹھنڈی آہ کھینچ کر رہ گئے۔ اسی وقت برابر والے کمرے سے کچھ مسکراتی اور کچھ سنجیدہ صورت بنائے پرکھل آن موجود ہوئی۔ اور بولی۔ یہ کیا حرکت ہے کیا وہ تمہاری بیوی نہیں ہے۔ ہم لوگ اُسے یہاں سُکھ دینے کے لئے لائے ہیں۔ یا دکھ دینے کے لئے۔ تم بھی جانتے ہو کہ کس فرض کی ادائیگی کے خیال سے تم نے اس سے بیاہ کیا ہے۔ اور اُسی کے لئے میں نے اپنا سب کچھ ـــ تمہیں ـــ اس کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اپنے فرض کو یاد کرو۔ کلیانی سے محبت کرو۔ تمہاری سرد مہری اس کے شیشۂ دل کو چور چور کر دیگی"

تاراچرن نے پرکھل کے یہ الفاظ سُنے۔ اُنہوں نے شرم سے گردن نیچی کر لی۔ اور خاموش ہو گئے۔

پرکھل نے ان کے گلے میں باہیں ڈالتے ہُوئے کہا۔" کیا ناراض ہو گئے"؟

"نہیں پرکھل۔ مَیں ناراض نہیں ہُوا۔ تم نے مجھے اپنا بھُولا ہُوا فرض یاد دلادیا۔ اب مَیں تمہارے ہی بتلائے ہوئے راستہ پر چلونگا"

پرکھل نے نہایت محبت آمیز لہجے میں کہا" میری بتلائی ہُوئی راہ پر؟ آہ یہ نہ کہو۔ مَیں سچ کہتی ہوں۔ مَیں جتنا دکھلاتی ہوں۔ اتنی کلیانی سے محبت نہیں کرتی۔ میرا پیار۔ میری محبت بے غرضانہ نہیں ہے۔ وہ محض اپنے لئے ہے۔ اور تمہارے لئے مَیں تمہاری محبت کی سب سے اُونچی چوٹی پر پہنچ چکی ہوں۔ اس لئے کلیانی پر رحم کا اظہار کرنا چاہتی ہوں۔ اگر ذرا سی محبت سے خاندان کا نام رہ جاوے۔ تو اس میں اپنا کیا ہرج۔ دیکھنا تم اب کلیانی سے زیادہ بے توجہی نہ کرنا"

تاراچرن نے پرکھل کو چھاتی سے چمٹا لیا۔ اور ہنس کر کہا۔" جس کو ایسا وزیر ملا ہے۔ اس کو عقل کی کیا ضرورت۔ اچھا ایسا ہی ہوگا۔

پرکھل کی کوششوں سے کلیانی تاراچرن کے کمرے میں آنے جانے لگی۔ وقت گذرتے دیر نہیں لگتی آہستہ آہستہ ایک سال گذر گیا۔

(۵)

تاراچرن کے گھر میں آج شاہانہ دھوم دھام ہے۔ مکان کا کونہ کونہ آراستہ کیا گیا ہے۔ نوبت بج رہی ہے درگاچرن بابو کی زندگی آج سپھل ہُوئی ہے۔ تاراچرن کی مُنہ مانگی مراد بر آئی ہے۔ سب کے دلوں میں ایک خاص ولولہ ہے۔ ایک خاص جوش ہے۔ اور ایک خاص خوشی ہے ـــ کلیانی کے لڑکا پیدا ہُوا ہے۔

یہ وقت عورتوں کی زندگی کے لئے ایک آزمائش کی گھڑی ہوتی ہے۔ بچہ پیدا ہونے کے بعد ہی کلیانی انتہا درجے کی کمزوری کی وجہ سے بیہوش ہو گئی تھی ہوش

میں آنے کے بعد بھی اس کی حالت خراب ہی رہی۔ پرپھل زچہ خانے میں جاکر نوزائیدہ بچے کو گود میں لے کر بیٹھ گئی۔ اکیلا پاکر اس نے تاراچرن کو بلوایا۔ اور لڑکے کا منہ دکھلا کر ہنستی ہوئی بولی۔ "کیوں کیسا ہے؟" تاراچرن نے بھی اُسی طرح ہنستے ہوئے کہا۔ "بہت خوبصورت ہے۔"

"کیسے؟"

"کیونکہ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے تمہارا ہی بچہ ہے۔"

"ہے تو سہی۔"

تاراچرن نے سنجیدہ صورت اختیار کر لی۔ اور کہنے لگے۔ "کاش ایسا ہوتا۔" تکلیف میں مبتلا کلیانی نے ایک بار گھونگھٹ میں سے ہی شوہر کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ پرپھل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "تم دل کے بہت اوچھے ہو!"

کلیانی کی بیماری اور کمزوری کی وجہ سے بچہ کی پرورش کا بوجھ پرپھل پر پڑا۔ پرپھل کی گود میں ننھا سا بچہ پھول کی کلی کی طرح کھلنے لگا۔

(۶)

آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ برآمدے میں کہیں کوئی نہ تھا۔ بالکل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کلیانی جنگلہ پکڑے نہ معلوم دل میں کیا سوچ رہی تھی۔ بچہ چار مہینے کا ہو گیا لیکن اس نے اس اثنا میں شوہر کا مُنہ تک نہیں دیکھا۔ وہ اتنی سخت بیمار رہ چکی ہے۔ لیکن اس کے شوہر اس کے معبود ایک دن بھی اس کے پاس نہیں آتے۔ کلیانی کو خیال آیا۔ کہ گھر کا کوئی ادنے ملازم جب کبھی بیمار ہوا اس کے سوامی ہمیشہ اس کی پرستش و خاطر تواضع کرتے رہے۔ اس خیال سے کلیانی کا شیشۂ دل چور چور ہو گیا۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی —— وہ ادنے ملازموں سے بھی حقیر تھی؛ —— اسی خیال میں وہ آگے بڑھی —— اس کے کانوں میں کچھ آواز آئی۔ اس نے کھڑکی سے مکان کے اندر جھانک کر دیکھا —— ایک صوفے پر تاراچرن بیٹھے ہیں۔ پرپھل ان کی زانو پر سر رکھے لیٹی ان کا مُنہ تک رہی ہے۔ باتیں پیار و محبت کی ہیں۔ ایک ایک لفظ سے محبت ٹپک رہی ہے۔ مٹھائی کے تھال کو سامنے دیکھ کر جو حالت بھوکے کی ہوتی ہے۔ وُہی کلیانی کی ہوئی۔ مگر بیچاری للچائی اور پیاسی آنکھوں سے دیکھتی رہ گئی۔ اس کے ننھے سے دل میں خون کا فوّارہ اُبل اُٹھا۔

ملازمہ کمرے میں آکر بچے کو دے گئی۔ بچہ کو دیکھتے ہی دونوں شوہر اور بیوی کے چہرے پھول کی مانند کھِل اُٹھے۔ پرپھل کہنے لگی۔ "کلیانی کو آج بخار نہیں آیا۔ اب اچھی ہے۔" تاراچرن خاموش رہے۔

"اچھا، بچّے کا نام کیا رکھا جاوے۔" انّ پراشن کو اب زیادہ دن نہیں رہے۔"

"تمہیں بتلاؤ نا"

"امولیہ کمار۔ یہ نام اچھا ہوگا یا نہیں؟"

"ہاں۔ یہی نام رہنے دو۔ دیکھو نا۔ لڑکا کیسا ہنس رہا ہے۔ اتنا ہنسنا اس نے کہاں سے سیکھا ہے؟

دونوں نے ایک ساتھ ہی بچّے کا مُنہ چوم لیا۔ اسکے بعد تاراچرن نے پرپھل کے مُنہ پر مہرِ محبّت ثبت کر دی پرپھل ہنس پڑی۔ کلیانی نے اپنی جگہ سے ہٹ جانا چاہا لیکن نہ ہٹ سکی۔

پرپھل کہنے لگی۔" اب معلوم ہوتا ہے۔ کلیانی اچھی ہو جائیگی۔"

تاراچرن ذرا رُک رُک کر بولے۔" اتنا فکر کا ہے کا۔ ہمیں جس چیز کی ضرورت تھی۔ وہ تو مل گئی۔

"نہیں نہیں ایسی باتیں نہیں کرتے؟"

کلیانی زیادہ دیر وہاں نہ ٹھیر سکی۔ آہستہ آہستہ جنگلہ پکڑے۔ نیچے اُتر آئی۔ اور اپنے بستر پر پڑ گئی۔ خدا کی قدرت۔ ایک ہی وقت میں دو مختلف ہستیوں کے دل میں کیسے متضاد خیالات اُٹھ رہے تھے۔ ایک طرف پرپھل بچّے کو گود میں پیار کرتے ہوئے کہہ رہی تھی کلیانی کسقدر خوش نصیب ہے۔ دوسری طرف کلیانی کسی اور ہی کی خوش نصیبی پر غور کر رہی تھی۔

دوسری صبح انو نیچی نے پرپھل سے آکر کہا۔" کل رات سے چھوٹی بہو کو بہت زور کا بُخار ہے۔ ابھی تک نہیں اُٹھیں۔"

(۷)

وقت مقررہ پر بچّے کا نام کرن سنکار ہُوا۔ نام امولیہ کمار ہی رکھا گیا۔

کلیانی آہستہ آہستہ بستر کے ساتھ وابستہ ہوتی چلی گئی۔ ڈاکٹر دیکھ جاتا ہے۔ دوا دی جاتی ہے تیمارداری میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی گئی۔ لیکن کلیانی کی بیماری اچھی ہونے میں نہیں آتی۔ لوگ سوچتے ہیں پرماتما سارے سکھ انسان کو نہیں دیتا۔ ورنہ دولتمند لوگ ہی زیادہ بیمار کیوں ہوتے ہیں۔"

انّو نیچے کسی کام میں مصروف تھی۔ کلیانی اپنے کمرے میں اکیلی پڑی تھی۔ کھُلی ہُوئی کھڑکی سے آتی ہُوئی ہوا اس کے زرد چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ کلیانی آنکھیں بند کئے لیٹی تھی۔ یکایک اس کے مُنہ پر کسی کا ٹھنڈا ہاتھ لگا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں دیکھا —— شوہر ہیں۔

کلیانی کے پاس بڑی دیر تک خاموش بیٹھے رہنے کے بعد تاراچرن نے کہا۔" کلیانی کیسی ہو؟" آج کلیانی

کے مُنہ پر اس کا معمولی جواب "اچھی ہوں" نہ آیا۔ آج اس کے شوہر کی آواز میں رقت تھی۔ اور سوز۔ کلیانی نے ایک بار آنکھیں پھاڑ کر شوہر کو دیکھا۔ دیکھتے ہی آنکھیں جُھک گئیں۔ ان سے اشکوں کا دریا بہہ نکلا۔ تاراچرن نے درد بھرے دل سے کہا۔ "روتی کیوں ہو کلیانی؟ ڈاکٹر کہہ گیا ہے تم اچھی ہو جاؤ گی"۔

کلیانی نے ایک گہرا سانس لیا اور کہا۔ "اچھی ہو کر کیا کروں گی؟"

"کیوں کلیانی۔ ایسا کیوں کہتی ہو۔ تم اچھی ہو جاؤ گی۔ اس سے اچھی بات اور کیا ہوگی"۔

"نہیں میرا کام پورا ہو گیا۔ اب جی کر کیا کرونگی؟"

تاراچرن قصوروار مجرم کی طرح چونک کر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ کلیانی کا دُبلا اور مُرجھایا ہُوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر گھبرائے ہُوئے بولے۔ "یہ کیا کہتی ہو۔ ایسی بات زبان پر نہ لاؤ"۔

کلیانی نے کروٹ بدلی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو اُمڈے چلے آرہے تھے۔ جیسے چشمہ پھُوٹ پڑا ہو۔ تاراچرن نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہُوئے کہا۔ "کیوں کلیانی۔ ایسا کیوں کہتی ہو کیا بہت تکلیف ہے؟"

"ہاں"

"کیسی تکلیف"

"بڑی دقّت سے کلیانی نے کہا سر پھٹا جاتا ہے"

"اچھا یہ خوشبو سُونگھو۔ مُنہ نہ پھیرنا۔ خوشبو ناک میں جانے دو۔

دماغ کو ٹھنڈک اور فرحت بخشنے والی خوشبو سے کلیانی کا دل کچھ ٹھکانے آیا۔ محبّت آمیز الفاظ میں کہنے لگی۔ "بس اب آرام سا معلوم ہوتا ہے"۔ کلیانی نے ہاتھ سے شیشی کو دُور ہٹانا چاہا۔ تاراچرن نے اس کا ہاتھ زور سے پکڑ لیا۔ "ہٹاؤ نہیں۔ میری یہ معمولی سی خدمت قبول کرو"۔ کلیانی شوہر کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ بُجھے ہُوئے چراغ میں تیل ڈالنے سے کیا فایدہ۔ سوکھی ہُوئی شاخ پر پانی کے ٹھنڈے چھینٹے دینے سے کیا نفع ـــــ کلیانی نے آنکھیں بند کرلیں۔

تاراچرن کہنے لگے۔ "کلیانی۔ مَیں پہلی دفعہ تمہیں ایک چیز دینے آیا ہوں۔ کیا نہ لوگی؟"

کلیانی نے زور سے آنکھیں بند کرلیں۔ اور غُصّہ آمیز لہجے میں کہا۔ "نہیں لونگی۔ نہیں لونگی"۔ "تم جاؤ۔ چلے جاؤ اس وقت میرے پاس کیا کرنے آئے ہو۔ اب میرے مرنے کی پرواہی کیا ہے۔ نہیں جس چیز کی ضرورت تھی اُسے پالیا ہے ـــــ

کلیانی اور کچھ نہ کہہ سکی۔ غم و غُصّہ کے اظہار سے

نحیف و نزار کلیانی کو غشی طاری ہو گئی۔

(۹)

کلیانی دن بدن کمزور ہونے لگی۔ اب وہ بستر سے اُٹھ نہیں سکتی۔ زیادہ بول نہیں سکتی۔

شام کی دھندلی روشنی میں اتو کلیانی کے لئے گلاس میں دوا ڈال رہی تھی۔ عالم بیہوشی میں پڑی ہوئی کلیانی یکایک بول اُٹھی۔ "اب نہ آنا میں نہیں چاہتی۔"

"کلیانی۔ کیا بکتی ہو؟"

"جیجی وہ چلے گئے۔ کیا ناراض ہو گئے؟"

"یہ کیا بکتی ہو۔ کلیانی۔ یہ لو دوا کھاؤ۔"

"دوا۔ دوا۔ اب تو مجھ سے نہیں کھائی جاتی۔"

"نہیں کھاؤ گی۔ تو بیماری کیسے دُور ہوگی۔"

"بیماری۔ بیماری۔ کیا اب دُور ہوگی۔ کیا اس سے نجات ملیگی۔ یہ وہم ہے۔ یہ خیال ہے۔ انہیں اب میری ضرورت نہیں ہے۔ اس لئے میں نے اُنہیں چھوڑ دیا ہے۔ اب مجھے زندہ رکھنے کی کوشش نہ کرو۔"

اتو کہنے لگی۔ "میں واری۔ کلیانی۔ تمہیں دُکھ کاہے کا ہے۔ تم راجہ کی رانی۔ راجہ کی ماں ہو۔

مرتی ہوئی کلیانی کے چہرے پر مسکراہٹ کے آثار نمودار ہوئے۔

آدھی رات کے قریب کلیانی واہی تباہی بکنے لگی۔

اتو ڈر کے مارے مالکن اور پرپھل کو بلا لائی۔

پرپھل نے آتے ہی کلیانی کا سر اپنی گود میں لے لیا مالکن اسے پنکھا کرنے لگی۔ کلیانی کا اضطراب اور بیچینی بڑھنے لگی۔

"کیوں بہن۔ ایسا کیوں کر رہی ہو۔"

"سخت تکلیف ہے۔"

"بابو تاراچرن بُلائے گئے۔ آدمی ڈاکٹر کو بلانے کے لئے دوڑا۔ گھر میں کہرام سا مچ گیا۔

پرپھل کہنے لگی۔ "امو کو گود میں لوگی؟"

"نہیں بہن"

مالکن نے حسرت آمیز لہجے میں کہا۔ "جاؤ لے آؤ ننھا ہو۔ ذرا بچے کو گود میں لے لو۔"

کلیانی نے جھجکتے ہوئے کہا۔ "بہن۔ مجھے ذرا راحتِ قلبی کے ساتھ مرنے دو۔ اس کی یاد دل سے محو ہونے دو۔ ہائے بہن۔ وہ میرے پیٹ سے کیوں پیدا ہوا تمہارے پیٹ سے کیوں نہ ہوا؟"

آہ۔ کیا حسرت آمیز الفاظ تھے۔ کیا درد بھرے لفظ تھے۔ پرپھل کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگی۔

"کلیانی ٹھیرو۔"

کلیانی کا جوش جیسے روکے نہ رُکتا تھا۔ کہنے لگی۔

"بہت دن ہوئے جب میں ننھی سی لڑکی کی حالت

میں اس گھر میں آئی تھی۔ اس دن سے سُنتی آئی ہوں کہ تم محض بچّے کے لئے مجھ سے محبّت کرتے ہو۔ یہ کیوں۔ کیا میری کوئی حقیقت نہیں۔ نہ سہی۔ مجھ سے تم لوگ محبّت نہیں کرتے۔ لیکن مجھے یہاں کیوں لایا گیا۔ کون لایا؟ میرا اس میں کیا قصور"؟

مالکن کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اور اس نے محبّت آمیز لہجے میں کہا۔ "بہو۔ تم سے کون محبّت نہیں کرتا۔ تم تو میرے گھر کی لکشمی ہو"۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں کوئی نہیں ہوں۔ کوئی نہیں"

ڈاکٹر نے کہا۔ "آخری وقت ہے"۔

مالکن نے روتے روتے کہا۔ "انّو۔ تارا چرن کو بلا لاؤ۔"

انّو روتی ہوئی چلی گئی۔ کلیانی رہ رہ کر دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس وقت بھی اُسے پورا ہوش نہیں تھا۔ انّو واپس آگئی اور کہنے لگی۔ "بھائی تو نہیں آتے۔ نیچے چلے گئے ہیں"۔

مالکن کے آنسو پھُوٹ پڑے۔ عین اس وقت ملازمہ نے آکر کہا۔ "بھابی جلدی آؤ۔ اُمو رو رہا ہے۔ کتنا بہلاتی۔ کتنا پیار کرتی ہوں۔ پر مانتا نہیں ہے"۔

پر پھل جھٹ پٹ واپس چلی گئی۔ کلیانی بولی۔ "بہن کیا وہ نہیں آتے؟ — وہ آتے تھے۔ پر میں نے انہیں واپس جانے کو کہہ دیا۔ اب بلاؤ۔ اب جانے کو نہیں کہونگی۔"

لیکن کوئی بھی نہ آیا۔

انّو اس کے مُنہ کے پاس مُنہ رکھ کر بولی۔ "کلیانی۔ کلیانی۔ کیا کہتی ہو"؟

نیم وا اور نیم بند مُنہ سے کلیانی کہنے لگی۔ "آؤ اب جانے کو نہ کہونگی۔ آؤ"۔

(ترجمہ) رام لال

غزل

او مستِ خوابِ ناز! تجھے بھی خبر ہوئی
بیمارِ غم خموش تھا دُنیا اداس تھی!
پھر برسبیلِ ذکر جو نام اُس کا آگیا
ہر داغ تیری یاد میں رشکِ چمن ہوا
پھوٹے ہوئے نصیب تھے اپنے ہی لے اثر

کیسے شبِ فراق کسی کی بسر ہوئی
آخر سحر ہوئی بھی تو ایسی سحر ہوئی
بزمِ خیال پھر مری زیر و زبر ہوئی
ہر سانس میری نغمۂ بادِ سحر ہوئی
اُس کی نگاہِ لطف تو ہر ایک پر ہوئی

محبّتِ ناکام

(۱)

ایک رات صفیہ اپنے پائیں باغ میں ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ اور میں اُس کے پہلو میں کرسی پر جُھکا ہوا کھڑا تھا۔ بظاہر میرے چہرہ پر سکون تھا۔ مگر میرا دل ماہیِ بے آب کی طرح مضطرب۔ وہ چاہتی تھی کہ کسی طرح باتوں کا سلسلہ شروع ہو۔ لیکن کچھ سوچ کر خاموش ہو جاتی تھی۔ آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ اور میں اپنی ارمان بھری نگاہیں اُس کے چہرہ پر ڈال کر اُس کو مخاطب کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیے۔ میرا ارادہ تھا۔ کہ اپنے جوشِ محبّت کا پیام اُس تک اس طرح پہنچا دوں۔ کہ صرف لبوں کو جنبش ہو۔ اور اس کے بدن کی رگ رگ میں بجلی دوڑ جائے مگر زبان افشائے راز کی مجرم نہ ٹھیرے صفیہ میرے اس ارادہ کو تاڑ گئی۔ اور بڑی متانت سے مجھ سے بولی "میں جو آپ سے اسقدر بے تکلف ہوں تو آپ سمجھتے ہیں کہ میرے دل میں کوئی دوسرا خیال ہے۔"

میں "نہیں۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔"

صفیہ (کسی قدر غصّہ سے) "تو آخر آپ چاہتے کیا ہیں؟"

میں "یوں تو آپ ہر طرح کا خیال رکھتی ہیں۔ مگر اگر یہ رشتہ مضبوط ہو جائے تو اور اچھّا ہے۔"

صفیہ "یعنی"

میں "میرے اُس دن کے سوال کا جواب"

صفیہ خاموش ہو گئی اُس کا چہرہ اوّل زرد اور بعد کو سُرخ ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی خیال میں بالکل غرق ہے۔ کئی منٹ تک اُس کی یہی حالت رہی۔ میں اپنے سوال کو دوبارہ کہنا چاہتا تھا۔ کہ وہ ہی بول اُٹھی "میں اس کے واسطے بالکل تیار نہیں ہوں۔" یہ الفاظ اس قدر بے رُخی اور بے ادائی سے کہے گئے کہ میرے دل کو ایک دھکّا سا لگا۔ میرے چہرہ کا رنگ ایسا ہو گیا جیسا کہ کسی مجرم کو جج حکم سُنا دے۔ اور وہ اپنی آیندہ زندگی کے دردناک منظر کو دیکھ رہا ہو۔ میں سوچتا تھا کہ اب کیا کہوں۔ آخر میں یوں گویا ہوا۔ "انہیں باتوں پر آپ کو دعوئے محبّت اور جذبۂ شوق کا اظہار تھا۔"

صفیہ "میں نے کب یہ دعویٰ کیا تھا۔ اور آپ کو تو ہمیشہ میری طرف سے اظہارِ محبّت کی شکایت رہی اور بالفرضِ محال (کچھ سوچکر) آپ کا دل خوش کرنے

کو میں چند منٹ کے لئے کہہ بھی دوں۔ کہ مجھے آپ سے محبت ہے تو میرے اوپر یہ پابندی کب لازم آتی ہے۔ کہ میں آپ کی ہر جا و بیجا خواہش کو مان لوں"

میں۔ میں نے جو آپ سے شریکِ زندگی ہونے کی درخواست کی تو وہ ایسی بیجا ہے کہ جو نہ پوری ہو سکتی ہے اور نہ آپ پوری کر سکتی ہیں"

صفیہ نے میری اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ اور خاموشی سے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں چلی گئی۔ میں کچھ تو یونہی رنجیدہ تھا اور کچھ اس واقعہ نے کر دیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد میں کچھ دیر باغ میں ٹھیرا اور اس کے الفاظ پر غور کرتا رہا۔ میں ہر فقرہ کو سو سو بار سوچتا تھا۔ اور کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچتا تھا۔ آخر کار تھک کر میں بھی اپنے مکان کو واپس آیا۔

(۲)

ایک زمانہ گذر گیا۔ صفیہ کی شادی لکھنؤ کے ایک رئیس کے ساتھ ہو چکی تھی۔ اور وہ بظاہر اپنے نئے مکان میں خوش وخرّم معلوم ہوتی تھی۔ جس زمانہ کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ اسی زمانہ میں اتّفاق سے مجھے لکھنؤ جانا پڑا۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی جو کچھ سمجھئے اتفاق سے مجھے صفیہ ہی کے سسرال میں ٹھیرنا پڑا۔ میں اپنے دن کے سفر سے اسقدر تھک گیا تھا۔ کہ شام ہی سے صفیہ سے ضروری باتیں کر کے لیٹ رہا۔ جس کمرہ میں صفیہ نے مجھے ٹھیرایا تھا یہ اُس کے کمرہ سے ملا ہوا تھا۔ اور اسی کمرہ سے صفیہ کے کمرہ کو راستہ گیا تھا۔ مجھے لیٹتے ہی نیند آگئی۔ معلوم نہیں کتنے گھنٹہ سویا ہونگا کہ میری آنکھ کسی کی پیر کی آہٹ سے کھل گئی۔ یہ صفیہ کا شوہر وحید تھا مجھے اس کے اس وقت کے آنے پر تعجب ہوتا مگر صفیہ مجھ سے پہلے ہی اس کی شراب نوشی اور بدچلنی کی کیفیت بتا چکی تھی میں نے کبھی کسی شخص کو اسقدر بدحواس اور مخمور نہیں دیکھا تھا۔ مگر صفیہ اس کی عادی ہو گئی تھی۔ ان حضرت کی آواز سُن کر اُس نے دروازہ کی چٹخنی کھول دی۔ دروازہ کھلتے ہی آپ نے نہایت کرخت لہجے میں کھانا لانے کا حکم دیا۔ صفیہ بولی "میں اس حالت میں آپ سے زیادہ گفتگو نہیں کرنا چاہتی۔ کھانا آپ کے کمرہ کی الماری میں رکھا ہے نکال کر کھا لیجئے" اس صاف جواب پر ان حضرت کو بہت غُصّہ آیا۔ اور صفیہ کو اس زور سے دھکّا دیا۔ کہ وہ غریب زمین پر گر پڑی۔ میں نہیں کہہ سکتا میری اس وقت کیا حالت تھی۔ میں جلدی سے اپنے بستر سے اُٹھا اور صفیہ کو اُس کے کمرہ میں لیجا کر بند کر دیا۔ وحید نے میری اس حرکت کو نہایت غور سے دیکھا مگر مہمان کی خاطر سے کچھ کہہ نہ سکے۔ اس کے بعد معاملہ رفع دفع ہو گیا۔

صبح میں کسی قدر دیر سے اُٹھا۔ میری نظر پہلی جس چیز پر پڑی۔ وہ سفری اسباب کا بنڈل تھا۔ میں نے صفیہ سے دریافت کیا۔ یہ کس کا اسباب ہے۔ صفیہ نے جواب میں کہا میرا۔

میں۔ "کہاں کی تیاری ہے"

صفیہ۔ رات کا واقعہ آپ کو معلوم ہے۔ میں اس حالت میں زیادہ زندگی بسر نہیں کرسکتی۔ میں آپ کے ہمراہ اپنے مکان چلونگی"

میں نے ہر چند صفیہ کو سمجھایا کہ وہ اس خیال سے باز آئے۔ مگر اس نے ایک نہ مانی۔ اور آخر شام کو ہم دونوں نے لکھنؤ کو خیرآباد کہا۔

(۳)

صفیہ کو اپنے شوہر کا مکان چھوڑے ایک ہفتہ ہوگیا۔ اور اب اس تبدیلی سے زیادہ خوش معلوم ہوتی ہے۔ میں اکثر اپنی گذشتہ محبت کا حق ادا کرنے کی غرض سے اُس کے پاس جایا کرتا تھا۔ اور آج اسی رات کی طرح چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ اور صفیہ اپنے پائیں باغ میں کرسی پر بیٹھی ہے۔ اور اتفاق سے میں بھی اسی انداز سے اُس کے پہلو میں کھڑا ہوں۔ باتوں باتوں میں میں نے دریافت کیا کہ آخر آپ لکھنؤ اب کب جائینگی؟

صفیہ۔ میں نے وہاں جانے کا قطعی ارادہ نہیں کیا۔"

میں۔" تو آخر کیا سوچا ہے"

صفیہ۔" بتا دونگی جلدی ہی کیا۔ کیا کہیں جانا ہے"

میں۔" نہیں تو۔ مگر تمہیں اس حالت میں دیکھ کر اُلجھن ہوتی ہے۔

صفیہ۔" اچھا تو سنو یہ میرا آخری اور سب سے بڑا فیصلہ ہے۔ مگر سامنے وہ دیکھو کون آرہا ہے۔ میں نے متعجب ہوکر چاروں طرف نگاہ کی۔ مگر حقیقت میں کوئی نہ تھا۔ میں نے کہا "واہ کیا بات بنائی ہے"۔ صفیہ مسکراتی ہوئی میری طرف بڑھی اور اپنے دونوں ہاتھ میرے شانہ پر رکھ دئے۔ اور بہت اطمینان سے بولی۔ کہ پیارے (میرا نام بیکر) میں نے یہ طے کیا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے۔ اور جان اس بدن میں باقی ہے۔ تم سے ایک لمحہ بھر کو جدا نہ ہوں (اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے) اب غالباً تم کو مجھ سے کچھ شکایت نہ رہیگی۔ اور تم قائل ہوگئے کہ تمہاری میری جانب سے تغافل کی شکایت بیجا تھی"۔ میں فرطِ خوشی سے اُس کے چہرہ کو دیکھ رہا تھا۔ کہ میری نظر اُس کے ہونٹوں پر پڑی۔ وہ نیلے ہو رہے تھے۔ اور کانپ رہے تھے اُس کا بدن بھی سرد ہو چلا تھا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ ایکبارگی زمین پر گر پڑی۔ میں نے جھک کر اُس کے چہرہ کو دیکھا۔ مگر اب وہاں کیا رکھا تھا۔

نرگس سی آنکھیں بند ہو چکیں تھیں اور چہرہ پر مردنی چھا گئی تھی میں سمجھا وہ کسی وجہ سے دفعتاً بیہوش ہو گئی ہے۔ اور اُسے اُٹھا کر کمرہ میں لے گیا۔ پنکھا کیا۔ چہرہ پر ٹھنڈا پانی چھڑکا۔ خوشبو سنگھائی۔ دل پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت دیکھی اور چاہتا تھا کہ اس کی بند مٹھی کھولوں کہ اس کے ہاتھ سے ایک چھوٹی سی شیشی گر پڑی اس پر "سمِ قاتل" کا لیبل لگا تھا۔ اب میں سمجھا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ زیادہ دیر نہ گذری تھی کہ صفیہ کو چھینک آئی اور اُس نے آنکھیں کھول کر میری طرف دیکھا۔ پانی کا اشارہ کیا۔ میں نے پانی دیا۔ وہ پی کر کچھ کہا چاہتی تھی کہ زندگی نے جواب دے دیا۔"

کرم شیر خاں

بُوئے گل

نفضائے دامنِ گل میں ملا مقام تجھے
ہُوا نصیب نہ لیکن وہاں قیام تجھے

بہ ایں لطافت و جاں پروری و زیبائی
کیا بوقتِ سحر عزمِ دشت پیمائی

چمن سے دوشِ صبا پر سوار ہو کے چلی
وطن سے مشک فشاں عطر بار ہو کے چلی

ترے نفس سے ہوا مایہ دارِ مستی ہے
یہ فصلِ گل ہے کہ دوران مے پرستی ہے

مے سرور ٹپکتی ہے جام سے تیرے
ہے سب کو بہرہ وری فیض عام سے تیرے

غضب کی اُف! تیری لپٹوں میں ہے فسونکاری
دل و دماغ پہ اک بیخودی سی ہے طاری

ہے مجھ کو تیرے مقدر پہ سخت حیرانی
جہاں کو باعثِ فرحت تری پریشانی

ریاضِ دہر میں خود ہو کے انتشار نصیب
مشامِ خلق کو تو نے کیا بہار نصیب

اُجڑ کے خود جو ہوا کو بسا دیا تو نے
سبق زمانے کو ایثار کا دیا تو نے

محروم

انجام بخیر

ماں نے لاکھ سمجھایا۔ باپ نے بہتیرا کہا۔ جمیلہ نے رو رو کر ہاتھ جوڑے۔ بہن نے منتیں کیں۔ مگر حمید کا دل نہ پسیجا۔ سب کے دیکھتے دیکھتے اپنا اسباب ٹانگے پر رکھوا نہ جانے کہاں چل دیا۔ کمبخت کوئی جاہل نہیں تھا۔ تعلیم یافتہ تھا۔ اور وہ بھی پنجاب یونیورسٹی کا گریجوایٹ۔ میڈیکل کالج کا فارغ التحصیل طالب علم۔ چاہیئے تھا۔ کہ والدین کے حقوق کا خیال رکھتا۔ اُس کا فرض تھا کہ اپنی ذمہ واری کو محسوس کرتا۔ جمیلہ سے محبت نہ سہی۔ اپنی معصوم بہن پر ہی رحم کھاتا۔ مگر عشق کا جِن کچھ اس طرح سے اُس کے سر پر سوار تھا کہ عقل رکھتے ہوئے بھی اُس نے عقل سے کام نہ لیا۔ اور انجام سوچے بغیر اُس گھر سے رخصت ہوگیا۔ جہاں وہ پرورش پاکر جوان ہوا تھا۔ اُدھر ٹانگے نے حرکت کی۔ ادھر بدنصیب ماں کو غش آگیا۔ جمیلہ بیچاری مصیبت کی ماری دوڑی۔ مگر پاؤں کو ٹھوکر جو لگی تو گری اور بہت بری طرح گری۔ سر دیوار سے ٹکرایا۔ اور ٹپ ٹپ خون بہنے لگا۔ ہمّت کرکے اُٹھی۔ مگر تیورا کر پھر گری۔ اور ایسی گری کہ سدھ بدھ نہ رہی۔ بدقسمت باپ گھبرا گیا۔ ننگے پاؤں۔ ننگے سر۔ دیوانہ وار لپکا۔ کہ نزدیک کے ڈاکٹر کو پیغام بھیجے۔ گرتا پڑتا ڈیوڑھی میں آیا۔ دیکھا کہ ملازم ندارد۔ آوازیں دیں۔ مگر صدائے برنخاست۔ ملازم بھی حمید کے ہمراہ جا چکا تھا۔ اس پریشانی کے عالم میں جس حال میں تھا۔ باہر نکلا۔ اور میاں سعید کو پیرانہ سالی میں نالایق بیٹے کے صدقے میں یہ دن دیکھنا پڑا۔ کہ بدحواسی کے عالم میں بھاگا چلا جارہا تھا۔ لوگ دیکھتے تھے اور تعجب کرتے تھے۔ اپنے بیگانے دوست۔ آشنا حیران تھے کہ میاں سعید کو کیا ہوگیا۔ جو اس ہیئت کذائی میں بھاگے چلے جارہے ہیں۔ سب انگشت بدندان کھڑے تک رہے تھے۔ مگر کسی کو جرات نہیں پڑتی تھی۔ کہ خود میاں سعید ہی سے دریافت کرے۔ ایک دو نے قدم بڑھایا بھی۔ کہ پریشانی کی وجہ پوچھیں۔ مگر نہ جانے کیا سوچ کر خاموش ہو رہے۔ مصیبت بھی عجب نامراد شے ہے۔ گھبراہٹ میں یہ بھی یاد نہ رہا کہ ڈاکٹر کی دوکان کہاں ہے۔ بھاگے بھاگے نکل گئے۔ سر اُٹھا کر جو دیکھا تو پھر واپس پلٹے۔ خدا خدا کرکے ڈاکٹر کی دوکان پر وارد ہوئے۔ مگر کس حالت میں۔ دم پھولا ہوا اور پاؤں لہولہان۔ ڈاکٹر علی اُنہیں دیکھ کر خوفزدہ ہوگئے۔ معاً خیال آیا کہ ان کا دماغ چل گیا

تاہم کرسی پر بٹھایا۔ اور ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ کیا معاملہ ہے میاں سعید کو کب ہوش تھا کہ مفصل بتلاتے۔ صرف اتنا کہا کہ میرے ساتھ گھر تک تکلیف کیجیے۔" ڈاکٹر نے ادویات کا سفری بکس ہاتھ میں لیا۔ گاڑی منگوائی اور دونوں مکان پر پہنچے۔

یہاں کی حالت بھی عجیب تھی۔ رونے والا تھا ہی کون ایک خادمہ تھی۔ جو اپنی مالکہ کے سرہانے بیٹھی کف افسوس مل رہی تھی۔ اور دوسری حمیدہ جو چلا چلا کر ماں اور بہن کو رو رہی تھی۔ باپ بیٹی سمجھے بیٹھے تھے کہ دونوں مر چکیں۔ ڈاکٹر نے بھی کمرے میں داخل ہوتے ہی یہی خیال کیا۔ مگر جب نبضوں کو ٹٹولا تو زندگی کی کمزور حرکت محسوس ہوئی۔ جھٹ بکس کھول دوا کی شیشی نکالی۔ اور کاگ اُتار حمیدہ کی ماں کو سونگھائی۔ کمزور مریضہ نے اپنی آنکھیں کھولدیں۔ مگر اجنبی آدمی کو دیکھ کر پھر بند کرلیں۔ ہاتھ دوپٹہ کی طرف بڑھے کہ منہ ڈھانپیں۔ مگر نقاہت نے اجازت نہ دی۔ ادھر سے فارغ ہوکر ڈاکٹر جمیلہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ زخم کو دیکھا گہرائی کو ناپا۔ مرہم پٹی کی۔ پینے کی دوائی دی۔ جب فراغت ہو چکی تو مریضوں کو حمیدہ اور خادمہ کے سپرد کرکے خود میاں سعید کو لئے مردانے میں آئے۔ اور استفسار حال کیا۔

سعید بیچارے ضبط نہ کرسکے۔ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ جب جی ہلکا ہوگیا۔ تو بولے۔" کیا کہوں۔ کہتے بھی ندامت ہوتی ہے۔ منتیں مانیں۔ نذریں چڑھائیں دعائیں مانگیں۔ تب کہیں خدا نے ایک بیٹا دیا۔ جس نے ہوش سنبھالتے ہی خاندان کی عزت ڈبو دی۔ ڈاکٹر صاحب رونے کا مقام ہے۔ کہ سعید کا اکلوتا بیٹا ایک عیسائی لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتا۔ مگر اُن کو جنہوں نے اُسے بڑے چاؤ سے پالا۔ فوراً چھوڑ دیتا ہے۔ میں اسکے عشق جنون انگیز کی داستانیں سن سن کر تنگ آگیا تھا۔ آج صبح سمجھایا اور غصہ کی حالت میں کہہ بیٹھا" تم نے خاندان کی ناک کاٹ ڈالی۔ قریشیوں کی خودداری کو خاک میں ملا دیا۔ خیر چاہتے ہو۔ تو جہاں سینگ سمائیں چلے جاؤ۔ اُس مردود نے میری اس ناصحانہ دھمکی کو پلے ہی باندھ لیا۔ جھٹ پٹ اسباب درست کرکے یہ جا وہ جا۔ کمبخت نے نہ ماں کی التجاؤں کی پروا کی۔ نہ میری نصیحتوں پر کان دھرا۔ نمک حرام عیدا کو ساتھ لئے نہ جانے کہاں چلدیا۔ ماں بیچاری اس صدمہ کو برداشت نہ کرسکی۔ اور غش کھا گئی۔ جمیلہ غریب دوڑی کہ چچی کو سنبھالے۔ مگر ٹھوکر کھا کر گری۔ سر دیوار سے ٹکرایا۔ اور بیہوش ہوگئی۔ یہ ہے مختصر سی کہانی۔ مجھ بدنصیب کی مصیبتوں کی جسے خدا کو یہ دن دکھانا تھا۔ کہ جس بیٹے کو بڑے شوق سے پال کر جوان کیا۔ وہ اپنوں سے رشتہ توڑ کر غیروں کا بن گیا۔

ڈاکٹر علی بھی بے اختیار ہوگئے۔ آنکھوں میں آنسو بھر کر

بولے۔" جانا کہاں ہے۔ کمبخت زہرہ کے ہاں گیا ہوگا ابھی جاتا ہوں اور مردود کو کان سے پکڑ کر لاتا ہوں۔"

سعید۔ بھائی۔ میری کمر تو جیتے جی ٹوٹ چکی۔ سچ پوچھتے ہو۔ مجھے تو امید نہیں۔ کہ وہ اب واپس آئے۔

ڈاکٹر علی۔ اُس کی کیا مجال جو انکار کرے۔ آپ تسلی رکھیں۔ میں اُسے شام سے پہلے پہلے گھر واپس نہ لاؤں تو میرا ذمہ۔

سعید۔ وہ بے طرح زہرہ پر فدا ہو رہا ہے اور اُسے چھوڑ نہیں سکتا۔

ڈاکٹر علی۔ آپ فکر نہ فرمائیں۔ مجھے اس سے ملنے تو دیں۔ ایسا ٹھیک کروں کہ باید و شاید۔

ڈاکٹر علی ضروری ہدایات دے دلا کر رخصت ہوئے گاڑیبان کو مکان کا پتہ بتایا۔ دوائیوں کا بکس راستہ میں دوکان پر چھوڑا۔ اور آدھ گھنٹہ میں مس ڈاکٹر زہرہ کے مکان پر جا پہنچے۔ جوش میں بھرے ہوئے تو تھے ہی۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔ نہ کسی سے پوچھا۔ نہ دریافت کیا۔ جھٹ سے کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اندر داخل ہوگئے۔

ایک آراستہ کمرے میں مس زہرہ ایک کوچ پر لیٹی ہوئی کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف تھی۔ پاؤں کی آہٹ جو سُنی تو دروازہ کی جانب دیکھا۔ اور ڈاکٹر علی کو دیکھ، سنبھل کر ہو بیٹھی۔ ڈاکٹر بیچارے پہلے زمانہ کے سیدھے سادے مسلمان تھے۔ زہرہ کو دیکھتے ہی چال تھے وہاں ہی کھڑے کے کھڑے رہ گئے۔ گویا کسی نے جادو کر دیا۔ اب نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ بُت بنے کھڑے رہے۔ زہرہ نے پھر کہا" آپ تشریف تو رکھیں" یہ کہہ کر اٹھی۔ بڑھ کر ڈاکٹر صاحب کا ہاتھ تھاما اور لے جا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ اب خاموش تھے۔ اور زبانِ حال سے فرما رہے تھے۔ ؎

تو از نکیس من از حیرت نہ ایمائے نہ تقریرے
چناں ماند کہ ہم بزم است تصویرے بہ تصویرے

زہرہ۔" ارشاد"

خدا خدا کر کے ڈاکٹر صاحب نے زبان ہلائی۔

" میں ڈاکٹر حمید کو دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ کیا وہ یہاں ہیں؟"

زہرہ۔ نہیں تو۔

ڈاکٹر۔ پھر میں اجازت چاہتا ہوں۔

یہ کہہ کر اُٹھے اور لڑکھڑاتے ہوئے باہر آئے ٹانگے پر سوار ہوئے۔ مگر ہوش بجا نہ تھے۔ کہتے تھے اور بجا کہتے تھے۔" کہ حمید مجبور ہے۔"

(۲)

شام ہونے کو تھی۔ کہ حمید زہرہ کے مکان پر پہنچا اور بے تکلفی سے اندر داخل ہوگیا۔ پاؤں کی آہٹ پا کر

زہرہ کی منتظر نگاہیں بے اختیار دروازہ کی جانب اُٹھ گئیں۔ اور حمید کو آتا دیکھ کر زہرہ بے اختیار خوشی سے چلّا اُٹھی۔ "ہیلو۔ مسٹر حمید آج تو آپ نے بہت انتظار دکھایا" جواب دینے سے پہلے حمید اس کی چمکدار آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرا دیا جس طرح بادِ بہار کی جنبش غنچوں کو شگفتگی کی دولت سے معمور کر دیتی ہے اُسی طرح سے حمید کے تبسم نے زہرہ کے حسن کو نور کی فراوانیوں سے مالا مال کر دیا۔ وہ جوشِ محبت سے بیتاب ہوگئی۔ اور بیخود ہوکر حمید سے لپٹ گئی۔ حمید نے اُسے آہستہ سے الگ کر کے کوچ پر بٹھا دیا۔ اُس کے نازک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے۔ اور بولا۔ "زہرہ۔ آہ۔ تم پرستش کئے جانے کے قابل ہو۔ کوئی کُنج خلوت ہو۔ جہاں صرف میں ہوں۔ اور تم۔

خُدا کی قسم میری محبت انسانی مصروفیتوں کے شور و غُل کو برداشت نہیں کر سکتی۔ میرا عشق روانی چاہتا ہے ایک مسلسل روانی۔ مگر آبادی کی زندگی کی حرکتیں اُسکی رفتار میں مخل ہوتی ہیں۔

زہرہ۔ حمید۔ تم شاعرانہ زبان میں باتیں کرتے ہو۔

حمید۔ زہرہ۔ شاعر کے تخیل کی پرواز میری محبت کی انتہا کو نہیں پہنچ سکتی۔ اُس کی زبان کی رنگینی میرے جذبات کی گہرائی کو لفظوں میں محدود نہیں کر سکتی۔ میں محویت چاہتا ہوں۔ ایک خاموش محویت۔ جو تمہارے دلفریب تبسّم سے معمور۔ اور تمہارے نورانی جلووں سے آباد ہو۔ اسی لئے میں انسانوں کی پر رونق محفلوں کو ناپسند کرتا ہوں۔ زہرہ۔ جنگل کی سنسانی۔ اور ندی کی روانی ہی میرے عشق کی ترجمانی کر سکتی ہیں۔

زہرہ۔ شعر و شاعری چھوڑو۔ اور یہ تو بتاؤ۔ کہ آج دن بھر تم کہاں رہے۔

حمید (ایک آہ سرد بھر کر) آج ابّا جان ناراض ہوگئے۔ بہت بُرا بھلا کہا۔ آخر گھر سے نکال دیا۔ امّاں بیچاری روتی رہیں۔ حمیدہ ہاتھ جوڑتی رہی۔ مگر میں جی کڑا کر کے نکل ہی آیا۔

زہرہ۔ وہ کیوں اس قدر خفا ہوگئے۔

حمید۔ یونہی۔ خُدا جانے انہیں کیا ہوگیا تھا۔ مسجد سے واپس آتے ہی امّاں سے پُوچھا۔ "حمید کہاں ہے؟" انہوں نے جواب دیا۔ "نماز پڑھ رہا ہے؟" ادھر میں نے سلام پھیرا۔ اُدھر وہ مجھ پر برس پڑے۔ میں سر جُھکائے سُنتا رہا۔ آخر یہی مناسب سمجھا کہ چلدوں۔ اپنا مختصر سا اسباب سمیٹا۔ اور چپکے سے نکل آیا۔ دن بھر مکان کی تلاش ہوتی رہی۔ چنانچہ ایک اچھا سا مکان کرایہ پر لے اپنا بستر رکھ یہاں آگیا۔

زہرہ۔ کہتے کیا تھے۔

حمید۔ کچھ نہیں۔ بہت سخت سست کہتے تھے۔

زہرہ۔ آخر کس بات پر۔

حمید۔ بات کیا ہوتی تھی۔ یہی۔ کہ تمہیں چھوڑ دوں۔

زہرہ کچھ رنجیدہ معلوم ہونے لگی۔ افسوسناک لہجہ میں بولی "حمید میرے لئے تم والدین چھوڑ بیٹھے"۔

حمید۔ "مرتا کیا نہ کرتا۔ مجھے کہنے لگے۔ تو بدچلن ہے۔ بدمعاش ہے۔ اور خدا جانے کیا کیا ہے۔ خیر مجھے تو جو چاہتے کہہ دیتے۔ رنج ہے تو یہ کہ خواہ مخواہ تم سے بھی بدظن ہونے جاتے ہیں۔

زہرہ۔ یہ تو تم نے اچھا نہ کیا۔

حمید۔ اچھا کیا یا بُرا۔ جو ہونا تھا ہو گیا۔ روز کے بکھیڑوں سے نجات ہوئی۔ اب نہ مجھے دیکھیں گے۔ نہ اصرار کرینگے کبتک منتظر رہیں گے۔ آخر جمیلہ کی منگنی کسی اور جگہ کر دینگے چلو چھٹی ہوئی۔

زہرہ۔ تم نے باتوں باتوں میں ہی فیصلہ کر دیا گھر چھوڑنے سے پہلے غور تو کر لیا ہوتا۔ ابا جان سے ناراضگی سہی جمیلہ سے نفرت سہی۔ اماں جان نے کیا گناہ کیا تھا۔ کہ تم انہیں بھی چھوڑ بیٹھے معصوم حمیدہ نے تمہارا کیا بگاڑا تھا۔ کہ اس کی آہ و زاری کی بھی تمہیں پروا نہ ہوئی۔

حمید۔ مجھ سے تو یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں چھوڑ دوں۔

زہرہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئی۔ حمید نے بار بار اُسے بہلانے کی کوشش کی۔ مگر سب بے سود۔ طرح طرح سے اُسے چھیڑا۔ مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ آخر تھک کر بولا "آہ۔ لو۔ زہرہ بھی ناراض ہو گئی۔ اور اس خوشگوار زندگی کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ جسے میری آرزوؤں نے محبت کی مدد سے تعمیر کیا تھا۔ میری زندگی کی ابتدا محبت تھی۔ اور اُس کی انتہا۔ مایوسی۔ اب صرف ایک منزل باقی ہے یعنی فنا۔ موت خود تو آنے سے رہی۔ اُسے لانا ہی پڑیگا"۔

زہرہ چونک اُٹھی۔ اور محبت بھری نگاہوں سے حمید کی طرف دیکھ کر کہا "حمید تم نے اچھا نہیں کیا۔ مناسب یہی ہے کہ گھر واپس جاؤ۔ اور والدین سے اپنی غلطی کی معافی مانگو۔ مَیں ایک آباد گھر کے چین اور آرام کو تباہ نہیں کر سکتی زہرہ تم پر فدا ہے۔ اور خُدا ہی جانتا ہے۔ کہ تمہارے بغیر اُس کا کیا حشر ہونے والا ہے۔ مگر زہرہ پیرانہ سال والدین سے اُن کا اکلوتا بیٹا نہیں چھین سکتی۔ یہ کہکر اُس نے گھنٹی بجائی۔ معاً ایک ملازم آموجود ہوا۔ جسے زہرہ نے گاڑی لانے کے لئے کہا اور خود کپڑے وغیرہ پہنکر تیار ہو گئی۔ حمید نے سب کچھ سُنا اور سوچنے لگا۔ اتنے میں گاڑی کی گڑگڑاہٹ کی صدا کان میں آئی۔ اور زہرہ نے کہا۔ "حمید۔ اُٹھو۔ گھر چلیں"۔ حمید نے تعجب سے زہرہ کی طرف دیکھا۔ وہی پیارا پیارا چہرہ تھا۔ مگر خوشی کی سرخیوں کی بجائے وہاں اب مایوسی اور تفکر کی سفیدیاں حکمران

نہیں۔ وہ پریشان سا ہو گیا۔ اور کچھ کہنا چاہتا تھا۔ کہ زہرہ نے پھر دُھرایا۔" اُٹھو۔ گھر چلیں۔" حمید کچھ سوچکر بادلِ ناخواستہ اُٹھا۔ اور ساتھ ہولیا۔ راستہ بھر دونوں خاموش رہے۔ مستقبل اچانک تاریک ہو گیا تھا۔ اور کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ انجام کیا ہونے والا ہے۔

(۳)

شام کی نماز سے فارغ ہو کر میاں سعید مسجد سے واپس آکر باہر چبوترے پر بیٹھے ہی تھے۔ جو ڈاکٹر علی آ پہنچے۔ مزاج پرسی کے بعد بیمار پرسی کی نوبت آئی۔ اور میاں سعید نے کہا۔" آپ کے دونوں مریض تو بفضلِ خدا رو بصحت ہیں۔ مگر اُس نالائق کا کہیں پتہ نہیں چل سکا۔ ادھر حمیدہ بھائی بھائی پکار رہی ہے۔ اُدھر اُس کی ماں کی عجب حالت ہے۔ رونا ہی نہیں تھمتا۔ مَیں تو عجب مشکل میں مبتلا ہوں حیران ہوں۔ کدھر جاؤں۔ اُس ناشدنی کو کہاں ڈھونڈوں ہاں۔ یاد آگیا۔ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کیا آپ وہاں گئے تھے

ڈاکٹر۔ جی ہاں۔ مگر حمید وہاں نہیں تھا۔ صرف زہرہ موجود تھی

سعید۔ تو آپ نے اس سے ہی پوچھا ہوتا۔

ڈاکٹر۔ پوچھنا کیا خاک۔ اُسے تو پوچھتے ہی میرے اوسان خطا ہو گئے۔ سب کچھ بھول گیا۔ غصّہ میں خیال ہی نہ رہا کہ اطلاع کرانا۔ اتفاق کی بات ہے کہ اُس وقت ملازم بھی کوئی موجود نہ تھا۔ مَیں بغیر سوچے سمجھے جھٹ پٹ اندر داخل ہو گیا۔ ایک چینی کی مورت کوچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھتے ہی میرے تو ہوش وحواس بجا نہ رہے۔ رہا سہا فیصلہ اُس کے تبسّم نے کر دیا۔ جلدی جلدی حمید کی بابت پُوچھا اور نفی میں جواب پاکر گرتا پڑتا باہر نکل آیا۔

سعید (ہنسکر) تو یوں کہیئے آپ بھی دل کھو آئے۔

ڈاکٹر۔ دل کیا کھونا تھا۔ مگر میاں صاحب۔ زہرہ بلا کی حسین ہے۔ سوچتا ہوں۔ تو خیال کرتا ہوں کہ حمید واقعی مجبور ہے۔ اُس کا مرغوب کُن حسن معصومیت اور عصمت کی دولت سے مالا مال ہے۔

سعید۔ خوب کہی۔ حضرت سلامت۔ جب کسی پر دِل آجاتا ہے تو اس کی بُرائیاں بھی نیکیاں ہی دکھائی دیتی ہیں۔ ایک نوجوان۔ حسین۔ بے پردہ عیسائی لڑکی اور اس پر انگریزی تعلیم یافتہ۔ اب خود فیصلہ کر لیجئے۔ کہ کہاں تک اعتبار کے قابل ہو سکتی ہے۔ چلو اس جھگڑے کو نہ کرو۔ اب بتاؤ کہ کیا کریں۔ اور اس کمبخت کو کہاں سے لائیں۔

ڈاکٹر۔" آپ نے خواہ مخواہ اُسے ناراض کر دیا۔ ہرج ہی کیا تھا۔ زہرہ سے ہی شادی کر دیتے۔

سعید۔ لاحول ولا۔ خوب مشورہ دیا۔ اجی حضرت زہرہ عیسائی ہے۔ اپنے بچّے کو اپنے ہاتھ سے کرسٹان بنا دوں۔ خاندان کی رہی سہی عزّت پر پانی پھیر دوں۔ نہ صاحب

مجھ سے تو یہ نہ ہوگا۔

ڈاکٹر۔ عیسائی ہے تو پھر کیا

سعید۔ خدانخواستہ۔ آپ کچھ پی تو نہیں گئے۔ جو اس طرح کی بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ اپنے لڑکے کو ایک عیسائی لڑکی سے بیاہ دوں۔ بھائی میں مسلمان ہوں نیچری نہیں ہوں۔

یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں۔ کہ ایک گاڑی چبوترے کے سامنے آکر رک گئی۔ اور زہرہ حمید کو ساتھ لئے نیچے اُتری۔ اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس لئے میاں سعید اور ڈاکٹر نے نہ پہچانا۔ کہ کون ہیں۔ وہ متعجبانہ نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ جو ایک شیریں آواز یہ کہتی ہوئی سنائی دی۔ "تسلیم۔ میں آپ کا چھینا ہوا بیٹا آپ کو واپس دینے کے لئے آئی ہوں۔ یہاں پر میری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے اور آپ کی شروع۔ تسلیم"۔ زہرہ تو یہ کہہ کر ٹانگے پر سوار ہو چلتی بنی۔ اور میاں سعید اور ڈاکٹر علی حیرت سے ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ کمبخت عیدا بھی نہ جانے اس وقت کہاں سے آگیا تھا۔ دست بستہ ہو کر بولا۔ "حضور۔ چھوٹے میاں آگئے"۔ میاں سعید چونک پڑے۔ دیکھا کہ اکلوتا بیٹا سامنے کھڑا ہے۔ بیتاب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ سعادتمند حمید باپ کے پاؤں پر گر پڑا اور رو رو کر اپنی گستاخی اور غلطی کی معافی مانگی۔ اندر اطلاع ہو چکی تھی۔ کہ حمید میاں واپس آگئے۔ ماں دیکھنے کے لئے بے چین تھی۔ جمیلہ دل ہی دل میں خدا کا شکر کر رہی تھی۔ حمیدہ اُٹھ اُٹھ کر دیکھتی تھی۔ کہ اتنے میں باپ بیٹا داخل ہوئے۔ ماں نے رو رو کر بلائیں لیں۔ حمیدہ اُٹھ کر پاؤں سے لپٹ گئی۔ میاں سعید نے پوچھا "حمید تم نے کیا کیا"۔ حمید کی ماں نے جواب دیا" جو صبح کا بھولا شام کو گھر آجائے۔ اُسے بھولا نہیں کہتے"۔

(۴)

رات تھی اور دُنیا محوِ خواب۔ مگر جمیلہ کروٹیں بدل رہی تھی۔ اگرچہ ڈاکٹر نے خواب آور دوائی پلادی تھی۔ مگر مصیبت زدگان ازلی کو چین کہاں۔ سوچتی تھی۔ اور روتی تھی۔ کہتی تھی۔ کہ میں نصیبوں جلی پیدا ہی کیوں ہوئی ماں زندہ ہوتی۔ تو اس وقت تسلّی دیتی۔ باپ جیتے ہوتے تو اس مصیبت سے بچاتے۔ کوئی بھائی ہوتا تو بہن کی تکلیف دیکھ کر کڑھتا۔ قسمت نے امّاں اور ابّا کی محبّت سے محروم کر دیا تھا۔ تو تسلّی کا کچھ اور ہی سامان کیا ہوتا خدا رکھے۔ چچا میاں اور چچی بیگم بڑی خاطر داری کرتے ہیں۔ مگر جو علاج اُنہوں نے اپنی یتیم بھتیجی کی بیماری کا تجویز کیا ہے۔ اُلٹا پڑیگا۔ حمید نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ چچا میاں کو ناحق اصرار ہے۔ اور مجھ بدنصیب کی زندگی کو اور بھی زیادہ تلخ بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔

کاش مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ اور حمید کو اجازت دیں کہ زہرہ سے شادی کر لیں۔ وہ تو شکر ہے کہ حمید واپس آ گئے۔ ورنہ غضب ہو جاتا۔ میں تو کہیں کی نہ رہتی۔ سب طعنہ دیتے کہ بڑی منحوس ہے۔ بچپن میں اماں اور ابا کو نگل گئی۔ بڑھ کر جوان ہوئی تو خاندان کا اکلوتا وارث اسی کی وجہ سے ناراض ہو کر گھر چھوڑ کر بھاگ گیا۔ اب تو خدا اس دُنیا سے اُٹھا لے تو اچھا ہے۔"

رات گذر رہی تھی اور بدنصیب جمیلہ اپنی آئندہ زندگی کی اُلجھنوں میں گرفتار آنکھیں بند کئے آنیوالی مصیبتوں کا ماتم کر رہی تھی۔ اور وہ تنہا ہی اس خیال میں مصروف نہ تھی۔ بلکہ دوسرے کمرے میں حمید بھی زندگی کے نشیب و فراز پر غور و فکر کر رہا تھا۔ دن بھر کے واقعات پر نظر ڈالتا۔ تو آنکھوں کے سامنے انسانی زندگی کی خوشیوں اور مسرتوں کی ناگوار حقیقت کی تصویر کھنچ جاتی۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اُس کے والد ارادے کے پکّے اور ہٹ کے پورے ہیں۔ اُسے علم تھا کہ وہ جو جی میں ٹھان چکے کر کے رہیں گے۔ اس لئے جب اپنی آئندہ زندگی کا خیال آتا۔ تو تڑپ کر رہ جاتا۔ اور دل ہی دل میں کہتا۔" افسوس۔ میری زندگی جو زہرہ کے حسنِ دلفریب کے جلوؤں سے منوّر تھی۔ تاریک ہو کر رہ گئی۔ وہ دل جو ابتک محبّت کے آغوش میں آرزوؤں کے جانفزا نغمے سُنا کیا۔ ٹوٹ گیا۔ ابّا کبھی نہ مانیں گے۔ مجھے تو سمجھ نہیں آتی۔ کہ اُن کا کیا حق ہے کہ میں چاہوں یا نہ چاہوں۔ پسند کروں یا نہ کروں۔ خواہ مخواہ مجھے جمیلہ سے باندھے دیتے ہیں۔ مجھے خود اس سے بڑی محبّت ہے۔ مگر وہ محبّت کہاں۔ جو تڑپا دے۔ دیوانہ بنا دے۔" سوچتا تھا کہ کیا کرے۔ مگر عقل کام نہیں کرتی تھی۔ لاکھ سر مارتا تھا۔ مگر کوئی تدبیر بن نہ آتی تھی۔ بہتیرا دماغ پر زور دیتا تھا لیکن کچھ سوجھتا نہ تھا۔ بیقراری کی یہ کیفیت تھی کہ کسی پہلو بھی چین نہ آتا تھا۔ رات انہی خیالوں میں مر مر کر کاٹی۔ اُدھر مؤذن نے اذان دی۔ ادھر حمید کی جان میں جان آئی۔ اُٹھا۔ وضو کیا۔ اور نماز پڑھنے لگا۔

میاں سعید بھی رات بھر بیچین رہے۔ صاحبزادے کے واپس آجانے کی خوشی میں اس وقت تو انہیں کچھ خیال نہ آیا۔ مگر جب سونے کے لئے چارپائی پر لیٹے۔ تو دن بھر کے واقعات یاد آ گئے۔ رہ رہ کر زہرہ کا خیال آتا۔ اور بے اختیار مُنہ سے نکل جاتا۔" بڑی شریف اور نیک لڑکی ہے۔ کاش وہ عیسائی نہ ہوتی۔"

کبھی کچھ وقت کے لئے آنکھ لگ جاتی۔ تو خواب میں زہرہ نظر آتی۔ کہ حمید کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں دے رہی ہے۔ اور کہتی ہے۔" کہ اپنی امانت سنبھالئے۔" کبھی حمید اور برقعہ پوش زہرہ دونوں کو دیکھتے کہ ہاتھ میں ہاتھ ڈالے

کھڑے مسکرا رہے ہیں۔ ایکبار دیکھا کہ دونوں کشتی پر سوار ہیں اور وہ خود ساحل دریا پر کھڑے منتیں کر رہے ہیں کہ واپس آ جائیں۔ اُن کے دل کا اضطراب اُن کے خوابوں میں بھی نمایاں تھا۔ وہ بار بار چونک پڑتے۔ دھڑکتے ہوتے دل کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے اور حیران ہوتے کہ سوتے جاگتے زہرہ کا خیال کیوں اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

مگر سب سے زیادہ بے چین زہرہ تھی۔ شمع جل رہی تھی۔ پروانے حسب معمول طواف میں مشغول تھے اور جل مرنے کی آرزو میں اُس کے عریاں شعلوں پر گرے پڑتے تھے۔ اور زہرہ مایوس اور ناکام زہرہ کمرے کے فرش پر بے حس و حرکت خاموش پڑی تھی۔ اس کے بازو بے پروائی سے دائیں بائیں پھیلے ہوئے تھے اُس کے سیاہ لمبے بال بے ترتیبی سے بکھرے پڑے تھے۔ اور وہ حسن پریشان کی ایک ساکت مگر جاندار تصویر دکھائی دیتی تھی۔ مایوسی نے اُس کے خوبصورت چہرے کی رونق کو افسردگی میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور ناکامی نے اس کی زندگی کی مسرتوں کو سرد آہوں میں بدل دیا تھا۔ غنچے شگفتہ ہو کر پھول بن جاتے ہیں۔ مگر قابل رحم ہے اُس کلی کی حالت۔ جو وقت سے پہلے ہی پژمردہ ہو جائے زہرہ نے ہر چند اپنے دل کو سنبھالا۔ لاکھ ضبط کیا۔ مگر قسمت

کی مجبوریوں نے بے بس کر دیا۔ وہ روئی اور پھوٹ پھوٹ کر روئی۔ اس لئے نہیں کہ وہ تنہا تھی۔ نہ اس لئے کہ وہ بے یار و مددگار تھی۔ بلکہ اس لئے کہ اُس کی تمناؤں کا خون ہو گیا تھا۔ اس لئے کہ اُس کی زندگی کی آرزوئیں مر گئی تھیں۔

گذشتہ واقعات ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آئے۔ اور اُسے رُلا کر غائب ہوتے گئے آخری منظر کو وہ نہ دیکھ سکی۔ اور کون ہے۔ جو اپنی پامال شدہ تمناؤں کا مرقع دیکھنا برداشت کر سکتا ہے۔ اُس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ مگر ناکامی کی تصویر پھر بھی سامنے تھی۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ لیا مگر مایوسی کا ڈراؤنا منظر موجود تھا۔ اُٹھی۔ ٹہلی۔ بیٹھی۔ لیٹی۔ مگر نامرادی نے کسی طرح بھی چین نہ لینے دیا۔ آخر ارادہ کیا کہ اس بستی کو جہاں معصوموں کی آرزوئیں اس بیدردی سے پامال کی جاتی ہیں۔ چھوڑ دے۔ اور اُس آبادی کو جہاں محبت کی پاکیزگیوں کو یاس اور ناامیدی سے واسطہ پڑتا ہے ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دے۔ صبح ہو گئی مگر زہرہ اسی طرح پڑی تھی۔ ہوا کے جھونکوں نے اس کی زلفوں کو چھیڑ چھیڑ کر اُسے جگانا چاہا۔ مگر زہرہ بیدار نہ ہوئی۔ شمع جل جل کر خود ہی بُجھ گئی۔ مگر زہرہ کو کچھ خبر نہ ہوئی۔ حمید نماز سے فارغ ہو کر اُسے ملنے کے لئے گیا مگر ملازم

نے کہہ دیا کہ مس صاحبہ سو رہی ہیں۔ وہ دوبارہ گیا۔ تو جواب ملا۔ کہ گھر پر نہیں ہیں۔ وہ پھر گیا۔ مگر باریاب نہ ہو سکا وہ ہر روز جاتا۔ مگر جواب ملتا کہ مس صاحبہ ملاقات نہیں کر سکتیں۔

(۵)

ار ی شبراتن۔ بڑے میاں صاحب کو اطلاع کر دو کہ ایک صاحب ملاقات کو آئے ہیں۔" یہ میاں سعید کے ملازم عیدا کی آواز تھی۔

مردانے میں ایک خوبصورت نوجوان نفیس انگریزی پوشاک پہنے کرسی پر بیٹھا میاں سعید کا انتظار کر رہا تھا۔ کہ میاں صاحب کمرے میں داخل ہوئے۔ نووارد اجنبی تعظیم کے لئے اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اور بولا" معاف کیجیے گا۔ آپ کو تکلیف ہُوئی۔ کیا مجھے خان بہادر میاں سعید صاحب سے مخاطب ہونے کا شرف حاصل ہے"

سعید۔ جی ہاں آپ تشریف رکھیں اور فرمائیں کہ کیا ارشاد ہے۔

نووارد۔ پیشتر اس کے کہ مَیں حاضر ہونے کی غرض و غایت بیان کروں۔ مناسب سمجھتا ہوں کہ اپنا نام اور پتہ آپ کو بتادوں۔ مجھ خاکسار کا نام مجید ہے مجھے یہاں کا انجنیر مقرر کر کے بھیجا گیا ہے۔ مَیں ابھی کل ہی ولایت سے واپس آیا ہوں۔ سُنتا ہوں۔ کہ آپ کی کوٹھی کرایہ کے لئے خالی ہے۔ اگر آپ کو کچھ اعتراض نہ ہو تو اجازت دیجئے کہ اپنا اسباب وغیرہ وہاں لے جاؤں۔

سعید۔ بصد خوشی۔ آپ شوق سے اس کوٹھی کو استعمال کریں۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہم خود تو وہاں رہتے ہی نہیں۔ کرایہ پر ہی دیا کرتے ہیں۔ پچاس روپے ماہوار کرایہ ہے۔ اگر آپ کو منظور ہے تو کوٹھی آپکی ہے۔ مگر کیا آپ اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا ہی رہینگے۔

مجید۔ جی نہیں۔ مَیں اکیلا نہیں ہوں۔ میری ایک بہن بھی ہے جو کچھ عرصہ سے یہاں ڈاکٹر ہے۔

سعید۔ تو آپ مس زہرہ کے بھائی ہیں

مجید۔ جناب۔

سعید۔ آپ کا وطن۔

مجید۔ رنگون۔

سعید۔ آپ کے باقی رشتہ دار وہاں ہی ہونگے۔

مجید۔ ہم صرف دونوں بہن بھائی ہیں۔ باپ جو رنگون میں پادری تھے۔ کئی سال ہُوئے گذر چکے۔ مَیں جیسے پہلے عرض کر چکا۔ ابھی کل ہی ولایت سے آیا ہوں۔ اور یہاں اپنی بہن کے ہاں ٹھیرا ہُوا ہوں۔ مکان تو وہ بھی اچھا ہے مگر مَیں کھلی ہوا میں رہنا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ اب مجھے اجازت دیجئے۔ مجھے ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ یہ کہہ کر مجید اُٹھا۔ جھک کر سلام کیا۔ اور چلنے کو تھا۔ اور اس کی

نگاہ سامنے کی دیوار کی ایک تصویر پر پڑی۔ اور جم کر رہ گئی
اُس کے چہرہ کا رنگ بدل گیا۔ اور وہ تعجب اور حیرانی
میں بے اختیار پکار اُٹھا " یہ کیا معاملہ ہے"
میاں سعید نے گھبرا کر پوچھا " کیوں کیا بات ہے"
مجید۔ یہ تصویر کس کی ہے
سعید۔ میرے والد بزرگوار کی۔
مجید۔ یہ کیا بات ہے تعجب ہے۔ یہ تصویر تو ہو بہو وہی
ہے۔ جو ہمارے پاس تھی۔ اور والد مجھے کہا کرتے تھے
کہ تمہارے دادا جان کی ہے۔
میاں سعید اور بھی متعجب ہوئے اور بے اختیار
ہو کر پوچھا " تمہارے والد کا نام کیا تھا"
مجید۔ اُن کا اسلامی نام تو مجھے یاد نہیں مگر مسیحی نام
مسٹر خورشید تھا۔
یہ سُن کر میاں سعید بیتاب ہو گئے۔ اور " میرا پیارا
بھتیجا" کہکر گلے لگا لیا۔ اور زار زار رونے لگے۔
گھر والوں نے جو رونے کی آواز سُنی تو حیران رہ گئے۔
حمید دوڑتا ہوا نیچے آیا۔ اور دیکھ کر دم بخود ہو گیا۔ پوچھا۔
کہ کیا معاملہ ہے۔ میاں سعید رو رو کر بولے " یہ میرے
کھوئے ہوئے بھائی کی نشانی ہے" حمید نے بھی ماں
سے سُنا ہوا تھا۔ کہ اُس کا بڑا چچا ناراض ہو کر بچپن ہی
میں گھر سے کہیں بھاگ گیا تھا۔ اور اگرچہ بڑی تلاش
کی گئی تھی۔ مگر پتہ نہ ملا تھا۔ وہ بھی مجید سے لپٹ گیا۔
مرنے والوں کا غم۔ بچھڑے ہوؤں سے ملنے کی خوشی
رہ رہ کر بغلگیر ہوتے تھے۔ اور بے اختیار رو رہے تھے
آخر سعید مجید کو اندر لے گئے۔ اور سب ماجرا کہہ سُنایا
اُسی وقت مجید اور حمید دونوں گئے۔ اور زہرہ کو بھی لے
آئے۔ اور چند ہی دنوں میں مجید کا جمیلہ سے اور حمید
کا زہرہ سے نکاح ہو گیا۔
مسٹر خورشید کے کاغذات کی جانچ پڑتال سے
پتہ چلا۔ کہ وہ گھر سے نکلتے ہی پادریوں کے ہتے چڑھ
گئے۔ جنہوں نے انہیں تعلیم دی۔ پالا۔ ولایت بھیجا۔
جہاں سے وہ پادری بن کر آئے۔ اور رنگون میں مقرر
کئے گئے۔ ولایت میں اُنھوں نے ایک شریف
خاتون سے شادی کر لی۔ اور بیس سال بڑی فارغ البالی
سے بسر کئے۔ اس کے بعد اچانک اُن کی بیوی فوت
ہو گئی۔ اُنہیں بہت صدمہ ہوا۔ بیمار ہو گئے۔ اور اسی
غم میں رہگرائے عالم بقا ہوئے۔

امیر حسن ناز

رشید اور قدسیہ

(۱)

رشید کا عہدِ شباب گلستانِ مسرت میں نہیں بلکہ خارستانِ حسرت میں بسر ہوا تھا۔ وہ اپنی محبوبہ کی پیہم طرزِ جفا کا ایسا خوگر ہو گیا تھا کہ دُنیا اور مافیہا کا خیال اُس کے صفحۂ دل سے خطِ باطل کی طرح مٹ چکا تھا۔ اور اُس کی نظروں میں قدسیہ کا جذب محبت ایک طلسم فانی اور ایک سراب خیال سے زیادہ قیمت نہیں رکھتا تھا۔ صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک اُس کے عہدِ ماضی کی دلکش تصویر اُسکی آنکھوں کے سامنے رہتی تھی۔ اور وہ اس کوشش میں ہمہ تن مستغرق تھا۔ کہ جس طرح سے ممکن ہو۔ وہ اپنی نیازمندی قدسیہ کی بے نیازی۔ اپنے انہماک۔ اُسکی لاابالی پن کا ایک صحیح مرقع قائم رکھے۔ اُس کی یہ سعی اس لئے نہیں تھی کہ وہ اپنی نامراد زندگی کے لئے کوئی وجہ مسرت پیدا کرے۔ نہیں۔ بلکہ اس لئے تھی۔ کہ اُن جذباتِ محبت کی جو قدسیہ کے قربانگاہِ حسن پر بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ ایک یادگار قائم رہے۔ اور ان دیرینہ اور حسرت خیز خیالات میں محو رہنا اُس کا صرف ایک مشغلہ تھا۔

رشید تمام دن اپنے کمرے میں رہتا اور عالمِ وارفتگی میں کبھی زمین پر کبھی کسی میز کے پہلو میں کبھی دیوار کے سہارے تخیّلات میں غرق۔ خاموش رہتا تھا۔ کبھی کبھی وہ سوادِ شہر کی طرف نکل جاتا۔ تاکہ وہ اُن مقامات کا مشاہدہ کرے۔ جو اپنے اندر روح فرسا جفا کی یادگار پنہاں رکھتے تھے۔ اور جن سے رشید کے خیالات متوجہ ہو جاتے تھے۔ دو سال اسی طریق پر گذرے زندگی اُس کے لئے مسرت نہیں بلکہ محض ایک تحسّر اور ایک تصوّر تھی۔ رشید اُن تمام انقلابات سے جو اس عرصہ میں ہوئے غافل رہا۔

قدسیہ انٹرنس کے امتحان میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اور کالج میں موجودہ تہذیب کی اعلےٰ تعلیم کی تحصیل کے لئے داخل ہو چکی تھی۔ اور اپنی مجموعی خصوصیاتِ علم حسن۔ کمال کی بدولت شاہراہِ شہرت پر سرعت سے گامزن تھی۔ ساتھ ہی اس کا دل عشق کی لازوال دولت اور محبّت کی ابدی مسرت کا احساس کرنے لگا تھا۔ رشید کی وقعت اُس کے دل میں جاگزین ہونے لگی تھی۔ مگر ایامِ طالب علمی میں قدسیہ نے بدولت اقتضائے عمر یا بہ تقاضائے طبیعت اُس کی چند

پروا نہ کی۔ اور جس قدر رشید کا جذب محبت ترقی کرتا۔ وہ اُس کی التجاؤں کو ٹھکرا دیتی۔ حتٰی کہ وہ اس کا اسقدر خوگر ہوگیا تھا۔ کہ اب قدسیہ کی منتیں اور خوشامدیں کچھ اثر نہ رکھتی تھیں۔ اور اس دھکتی چنگاری نے جو دو سال سے قدسیہ کے دل میں مستور تھی۔ نسیم محبت کی شعلہ نوازی سے آتش فشاں صورت اختیار کرلی تھی۔

قدسیہ کا جنون اب روز بروز بڑھنے لگا۔ اور وہ گھنٹوں بلکہ پہروں رشید کے خیال میں محو کنج عزلت میں جاگزیں رہتی۔ مگر سب سے زیادہ مصیبت یہ تھی۔ کہ خود رشید اب اُس کی درخواستوں کو صریح اور ظاہر طور پر رد کرچکا تھا۔ جب سلسلہ کلام نے یہ صورت اختیار کی تھی۔

قدسیہ۔ رشید۔ کیا تم کو کالج کا زمانہ یاد ہے۔

رشید۔ زمانہ! میرے لئے تو دنیا میں صرف ایک ہی دن کا نام سارا زمانہ ہے۔ اور وہ سراسر ظلمت۔

قدسیہ۔ رشید۔ تو اچھا میرے تمہارے پاس کتنے خطوط ہوں گے۔

رشید۔ خطوط! صرف ایک خط اور ایک مضمون میرے پیش نظر ہے۔ اور وہ تمہارے آخری الفاظ ہیں۔ جن کا خلاصہ میرے لئے خون تمنا ہے۔

قدسیہ۔ مگر قدسیہ اب وہ قدسیہ نہیں رہی۔ جو پہلے تھی۔ اب اُس کی حالت میں ایک تغیر واقع ہوگیا ہے اور وہ اب شکست خوردہ ہے

رشید۔ ہاں! مگر میرے کان سوائے اُن الفاظ کے اور کسی قسم کی گفتگو سے مانوس نہیں ہیں۔

قدسیہ (پہلو بدلکر) اچھا آجکل کیا شغل ہے۔

رشید۔ "بس تنہائی اور کسی کی یاد"

قدسیہ۔ کس کی؟

رشید۔ قدسیہ کے مظالم کی۔

اس گفتگو کے بعد وہ دفعتہً وہاں سے چل دیا....

(۲)

اس گفتگو کو دو مہینے گذر گئے۔ قدسیہ کی بیتابی اور اور ازخود رفتگی اس درجہ تک پہنچ چکی تھی کہ یہ جنون رشید کی وارفتگی سے بھی بڑھ گیا تھا۔ ہر لحہ و ہر لحظ ایک ہی خیال۔ ایک ہی تصور۔ اور ایک ہی نقشہ اس کے سامنے رہتا۔ وہ دُنیا اور مافیہا سے بالکل بیخبر اور بے سروکار تھی۔ دوستوں۔ گھر والوں نے بہت کچھ سمجھایا۔ مگر بے سود۔

آخرکار ایک روز صبح صادق کے وقت جب کہ آفتاب کے طلوع ہونے میں کچھ وقت باقی تھا۔ طائران نغمہ سنج اپنی خوش الحانیوں سے اور مرغان نوا ریز اپنے تراؤں سے ایک خاص ترنم پیدا کر رہے تھے۔

رشید ایک کرسی پر خاموش اور ساکت بیٹھا تھا کہ دفعتہً قدسیہ کی آواز اُس کے کان میں آئی۔ . . . . . .

قدسیہ (جوشِ غضب سے) رشید کیا اب بھی جوشِ جنون باقی ہے۔ واقعی تم اس کے سزاوار تھے۔ کہ تم ٹھوکروں سے ٹھکرائے جاتے۔

رشید (فرطِ خوشی سے) بیشک۔ قدسیہ کی جفاکاریاں مجھ کو عزیز ہیں اور میری زندگی اُن سے وابستہ۔ اور . . . . . .

قدسیہ۔ تو میں نے بھی ارادہ کرلیا ہے کہ پھر پرانی روش پر کاربند ہو جاؤں۔ اور . . . .

رشید۔ تو آ۔ میں تیرا قدیمی پرستار ہوں!

یہ کہکر رشید بیخودی میں قدسیہ کی جانب چلا۔ اور آناً فاناً دونوں ایک دوسرے کی آغوش میں تھے۔

اکرام الحق سلیم

داستانِ زندگی

آئیے اوران سے سُنئے داستانِ زندگی
خفتگانِ خاک ہیں کچھ رازدانِ زندگی!

عہدِ گل ہے، دورِ مُل ہے، اور وہ جانِ زندگی
اہلِ دل ہیں اور لطفِ امتحانِ زندگی

بیخودی نے کرلیا خوب امتحانِ زندگی
اب مری ہستی یہ ہے ناحق گمانِ زندگی

دل شکستہ، میں فسردہ، جان غمگیں، چشم تر
عشق نے غارت کیا سب خان ومانِ زندگی

تشنۂ خوں جب سے تو اے حسن بے پروا ہوا
اور رنگیں ہوگئی ہے داستانِ زندگی

توڑدے دستِ اجل یا پھونکدے برقِ فنا
یہ طلسمِ جسم، یعنی آشیانِ زندگی

کیا ہوئیں دورِ گذشتہ وہ تری رنگینیاں
جن سے تھا ہر ہر نفس دلچسپ جانِ زندگی

اب نہ وہ ہم ہیں نہ وہ دل ہے نہ وہ ذوقِ نگاہ
ہوگیا برباد سارا خانمانِ زندگی

قبر میں بھی حشر تک ہم چین سے سویا کئے
بھولتے کیا لذتِ خوابِ گرانِ زندگی

زہد و تقویٰ حضرتِ محوی کا ہم بھی دیکھتے
گر نقابِ رُخ اُٹھا دیتا وہ جانِ زندگی

محوی

نغماتِ بنگال

(۱)

پیاری دن رات میرا دل تیری ملاقات کا آرزومند رہتا ہے۔ اُس ملاقات کی طرح جو موت کی غارتگر ہے۔

ایک طوفان کی طرح تو مجھے اپنے جھونکے میں اڑا لیجا جو کچھ میرے پاس ہے سنبھال لے میری نیند کا طلسم توڑ دے میری دُنیا مجھ سے چھین لے۔

اس تباہی میں رُوح کی اس عریانی میں ہم دونوں حسن میں ایک ہو جائیں۔

آہ میری نامراد خواہشو! میرے خدا وصال کی یہ امید تیرے سوا اور کس سے وابستہ ہو سکتی ہے۔

(۲)

صبح کے وقت ایک دن گلزار میں ایک اندھی لڑکی آئی اور میرے لئے ایک پھول مالا کنول کے پتے کے نیچے ڈھانک کر لائی۔

میں نے مالا گلے میں ڈالی اور میری آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے میں نے لڑکی کو چوم لیا اور کہا کہ تم بھی پھولوں کی سی اندھی ہو تم کو خود بھی معلوم نہیں کہ تمہارا ہدیہ کتنا خوبصورت ہے۔

(۳)

دن اب نہیں ہے۔ سایہ زمین پر اُتر آیا ہے۔ وقت ہے کہ میں اپنی گاگر بھرنے چشمہ پر جاؤں۔ شام کی ہوا پانی کے غمگین راگ سے مست ہے۔ وہ مجھے تاریکی کی طرف بُلاتی ہے۔ اس سنسان گلی میں کوئی گذرنے والا نہیں ہے۔ ہوا زور پر ہے۔ موجیں دریا میں کثرت سے اُٹھ رہی ہیں مجھے معلوم نہیں کہ میں گھر لوٹ بھی سکونگی یا نہیں۔

کیا خبر مجھے کون راستے میں مل جائے

وہاں پایاب مقام پر ایک چھوٹی سی کشتی میں بیٹھا ہُوا کوئی بے جانا بوجھا آدمی اپنی بانسری بجا رہا ہے۔

(۴)

اے دُنیا میں نے تیرا پھول توڑا۔

میں نے اُسے اپنے دل کے ساتھ چمٹا لیا اور میرے کانٹا چُبھ گیا۔

جب دن تمام ہُوا اور اندھیرا چھا گیا۔ تو میں نے دیکھا کہ پھول تو مرجھا چکا ہے لیکن درد باقی تھا

اے دُنیا تجھ میں اور طرح طرح کے پھول بھی مہک اور شان کے ساتھ کھلینگے۔

لیکن میرا پھول چننے کا وقت گذر چکا۔ اور اندھیری رات میں میرا گلاب کا پھول میرے پاس نہیں.... صرف درد باقی ہے

(ترجمہ ٹیگور) افتخار الرسول بدر

غم نصیب

(گذشتہ سے پیوستہ)

۱۰۔ اگست

اگر مَیں ایسا بیوقوف نہ ہوتا تو یہی جگہ میرے حق میں جنّت بن سکتی تھی۔ اس قدر خوشگوار واقعات، اور پھر ایسے واقعات جن کے ہوتے ہوتے ایک ذی ہوش انسان کا خوش رہنا یقینی امر ہے، شاذ ہی کسی کو میسّر آتے ہونگے لیکن افسوس! کہ میری نادانی نے مجھے خوش نہ رہنے دیا۔ مجھے اس حقیقت کا نہایت گہرا احساس ہے کہ ہمارا دل ہی ہماری تمام خوشیوں کا کفیل ہوتا ہے کسی دوسرے پر کچھ منحصر نہیں۔ ایک ایسے خاندان میں رسوخ حاصل کرنا۔ ایک ایسے شخص کے مشفقانہ عواطف کا منظورِ نظر بننا، اُس کے بچوں میں ہر دلعزیز ہونا، چارلوٹی جیسی خاتون کی نگاہوں میں عزّت پانا!۔ اور پھر نیکدل البرٹ کا دوست بننا، جو کبھی بد مزاجی سے میری خوشی پر بجلی نہیں گراتا۔ مجھ سے سچی اور دلی محبت کا سلوک کرتا ہے۔ اور چارلوٹی کے بعد مجھے ساری دُنیا سے زیادہ عزیز جانتا ہے۔ یہ وہ نعمتہائے غیر مترقبہ ہیں جو کسی کسی کو نصیب ہوتی ہیں۔ ولیمؔ تم ہم دونوں دوستوں کو چارلوٹی کی نسبت گفتگو کرتے ہوئے سُن پاؤ۔ تو تمہیں بیحد خوشی حاصل ہو۔ دنیا بھر میں کوئی چیز ہمارے باہمی تعلق سے بڑھ کر بیہودہ نہ ہوگی۔ پھر بھی اس تعلق کا خیال مجھے اکثر آبدیدہ کر دیتا ہے۔

وہ کبھی کبھی مجھ سے چارلوٹی کی والدۂ مرحومہ کا ذکر کیا کرتا ہے۔ جب وہ نزع کے عالم میں بسترِ موت پر لیٹی تھیں تو اُنھوں نے اپنے گھر بار اور بال بچوں کو چارلوٹی کے سپرد کیا۔ اور البرٹ کو ان سب کا سرپرست مقرر کیا۔ چارلوٹی جس طور پر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہوئی وہ محتاجِ بیان نہیں۔ اُس نے اپنے بھائی بہنوں کی فلاح و بہبود کا ایسا ہی خیال رکھا۔ جیسا کسی حقیقی ماں کو ہو سکتا ہے۔ اور اپنی زندگی کے لیل و نہار اُن کی خدمت و تربیت کے لئے وقف کر دئے۔ اُس کی خوش مزاجی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوگا کہ اس ہجومِ کار کے باوجود اُس کے ماتھے پر کبھی بل نہ آیا۔ اور وہ ہمیشہ ہنسنے اور ہنسانے میں مشغول رہی۔ گویا اُس نے اپنی تمام زندگی عیش و خوشدلی کے نام پر معنون

کر دی تھی۔

البرٹ کی ذات میرے لئے بیشمار دلچسپیوں کی سرمایہ دار ہے۔ مَیں اور وہ آپس میں بہت گھل مل گئے ہیں۔ میں اس کے ہمراہ سیر کو جاتا ہوں۔ کنارِ راہ سے پودوں سے پھول توڑتا ہوں۔ اور انکا ایک لطیف گلدستہ تیار کرتا ہوں۔ پھر میں اُس گلدستہ کو کسی ندی میں پھینک دیتا ہوں۔ اور لب آب کھڑا ہو کر اُسے دھیمی دھیمی رفتار سے بہتے دیکھتا رہتا ہوں۔ یہانتک کہ موجیں اُسے میری نظروں سے دُور لیجاتی ہیں۔ شاید مَیں تمہیں یہ بتانا بھول گیا ہوں کہ البرٹ اب یہیں رہیگا۔ سرکار نے اُسے ایک عہدہ پر فائز کر دیا ہے۔ جس کی تنخواہ نہایت معقول ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بارگاہِ سرکاری میں اس کی مانی جاتی ہے۔ وہ کاروبار کے انصرام میں ایک قابلِ قدر مہارت رکھتا ہے۔ مَیں نے اُس جیسے کارآزمودہ اور سلامت رو کارپرداز بہت کم دیکھے ہیں۔

۱۲۔ اگست

مجھے چار و ناچار البرٹ کے سامنے سرِ ارادت خم کرنا پڑتا ہے۔ اُس جیسا انسان، چراغ لیکر ڈھونڈو تو دُنیا بھر میں نہ ملے گا۔ میرے اُس کے درمیان کل ایک عجیب مباحثہ ہُوا۔ زندگی کی فرسودگیِ روش سے اُکتا کر مَیں مدت سے کسی خوشگوار تنوّع کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ آخر مَیں نے کسی پہاڑ پر جانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ آج مَیں منزلِ مقصود پر بخیر و خوبی پُہنچ گیا ہوں کل جب مَیں وداعی دعا سلام کہنے کی غرض سے البرٹ کے ہاں گیا تو اُس کے کمرے میں ٹہلتے ٹہلتے میری نظر اُس کے پستولوں پر جا پڑی۔ اور مَیں نے اُس سے درخواست کی۔ کہ براہِ کرم یہ پستول مجھے سفر کے لئے عنایت فرمایئے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بڑی خوشی سے لیجئے۔ لیکن آپ کو اُنہیں بھرنے کی زحمت اُٹھانا پڑیگی۔ کیونکہ وہ صرف برائے نام یہاں پڑے ہُوئے ہیں۔ جب سے مَیں اپنی بزدلانہ احتیاط کے ہاتھوں ایک گناہِ بے لذت کا خمیازہ بھگتنے سے بال بال بچا ہوں، مَیں نے بھول کر بھی ان خطرناک ہتھیاروں کو ہاتھ نہیں لگایا۔“

مَیں نے اس اجمال کی تفصیل دریافت کی تو اس نے اس طرح واقعہ بیان کیا۔ ”کچھ کم تین مہینے ہوئے کہ مَیں کسی گاؤں میں اپنے ایک عزیز دوست کے ہاں مقیم تھا میرے پاس خالی پستولوں کی ایک جوڑی ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اس لئے مَیں بلا خوف و خدشہ مزے کی نیند سوتا۔ ایک شام کو موسلادھار مینہ برسا۔ مَیں ہاتھ پر ہاتھ دھرے۔ آرام سے بیٹھا منظر کا مشاہدہ کر رہا تھا کہ میرے دل میں خیال گذرا (مَیں نہیں کہہ سکتا کہ اس خیال

کا محرک کیا تھا) کہ شاید ڈاکو لٹیرے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہمارے گھر پر ٹوٹ پڑیں۔ شائد اُس وقت ہمیں پستولوں کی ضرورت محسوس ہو۔ اور شاید...... خیر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب انسان بیکار ہوتا ہے۔ تو اُس کا فسانہ باف دماغ کس کس طرح کے خیال باندھتا رہتا ہے۔ غرض مَیں نے پستول اُٹھا کر نوکر کو دیئے۔ کہ انہیں صاف کر کے بھر دو۔ وہ میرے دوست کی چھوٹی سی بچّی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اور ہنسی ہنسی میں اُسے پستول سے ڈرا رہا تھا۔ کہ اتنے میں خدا جانے کس طرح، پستول چل گیا۔ گولی تیر کی طرح لڑکی کے داہنے ہاتھ کو چھیدتی ہُوئی پار نکل گئی۔ اور اُس کا انگوٹھا لہولہان ہوگیا۔ اب گھر والے الگ میری جان کو روتے تھے۔ اور ڈاکٹر کی فیس مجھے الگ ادا کرنا پڑی۔ اُس وقت سے مَیں نے توبہ کر لی۔ کہ اب کبھی پستول بھر کر اپنے پاس نہ رکھونگا۔ لیکن میرے دوست، حزم و احتیاط کا فایدہ ہی کیا ہے؛ ہم کسی صورت میں تمام ممکن خطرات کی پیش بندی نہیں کر سکتے یہ ہماری طاقت سے بعید ہے۔ بہرحال......"

مجھ میں زیادہ سُننے کی تاب نہ تھی بس اُس وقت تک کسی شخص کی بات ہمہ تن گوش ہو کر سُن سکتا ہوں جب تک کہ وہ "بہرحال" پر نہ اُتر آئے۔ جہاں کسی کے منہ سے یہ لفظ نکلا اور مَیں نے فوراً قطع کلام کر دیا۔ کیونکہ یہ تو ایک بدیہی امر ہے۔ کہ کوئی کُلیہ مستثنیات سے خالی نہیں ہوتا۔ لیکن البرٹ کچھ اس طرح جانچ تول کر گفتگو کرتا ہے۔ اور اُسے اپنی باتوں کی دُرستی و نادرستی کا اس قدر خیال رہتا ہے کہ اگر اُسے اس کا گمان بھی ہو جائے کہ اس کے مُنہ سے کوئی کلمہ بے سوچے سمجھے نکل گیا ہے، تو وہ بات کو گھٹا بڑھا کر موڑ توڑ کر، اس طرح اپنی غلطی پر پردہ ڈال لیتا ہے کہ کسی کو گرفت کرنے کا موقع نہیں دیتا۔ اس وقت وہ اپنی کہانی سُنانے میں ہمہ تن محو و مستغرق تھا، اور مَیں متوجہ ہونے کی بجائے کسی گہرے خیال میں ڈُوبا ہُوا تھا کہ یکایک ایک فوری حرکت کے ساتھ مَیں نے پستول کی نالی اپنی پیشانی کی طرف جھکا دی۔ اُس نے جھپٹ کر پستول میرے ہاتھ سے چھین لیا۔ اور پُکار اُٹھا۔ "ہیں یہ کیا کرتے ہیں آپ؟" مَیں نے کہا۔ "یہ تو خالی ہے۔" اُس نے بڑی بے صبری سے جواب دیا۔ "اجی چاہے خالی ہی ہو۔ مگر آپ کا مطلب کیا ہے؟ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی شخص کیونکر اتنا پاگل ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ پر وار کرے۔ اس سفاکانہ فعل کے خیال سے میرے بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔" مَیں نے پوچھا "لیکن کسی کو کیا حق حاصل ہے کہ

کسی فعل کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے دیوانگی و دانائی یا نیکی و بدی کا حکم لگائے؛ ایں چہ معنے دارد؟ مجھے بتلائیے کیا آپ نے افعالِ انسانی کے نہاں در نہاں محرکات کا مطالعہ کیا ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں اور سمجھا سکتے ہیں۔ کہ وہ کون سے اسباب و علل ہوتے ہیں۔ جو ہمارے افعال کے موجد ہوتے ہیں۔ اور جن کے ہوتے ہوئے اُن افعال کا وجود میں آنا ناگزیر ہوتا ہے؟ اگر آپ اس سے واقف ہوتے۔ تو ضرور آپ اپنا فیصلہ کن حکم سنانے میں قدرے تامّل سے کام لیتے"

البرٹ نے کہا۔ "آپ بجا کہتے ہیں۔ مگر آپ کو اس سے انکار نہ ہوگا۔ کہ بعض بعض افعال ہر حالت میں قابلِ گرفت ہوتے ہیں، چاہے اُن کے اسباب کسی قسم کے کیوں نہ ہوں" میں نے اپنے سر کی ایک جنبشِ اثبات کے ساتھ اس بات کو تسلیم کر لیا۔ لیکن یہ اعتراض وارد کیا۔ کہ "یہ کلّیہ بھی مستثنیات کے وجود سے بےنیاز نہیں۔ چوری ایک جرم سا جرم ہے لیکن اگر کوئی شخص انتہائی تنگدستی کے ہاتھوں تنگ آ کر چوری کرے۔ اور اس کے سوا اُس کا کوئی مقصد نہ ہو کہ اپنے اہل و عیال کو بھوکوں مرنے سے بچا لے، تو کہئے وہ شخص قابلِ رحم ہے یا لائقِ تعزیر؟ کون ہے ایسا شخص جو اُس انصاف پسند خاوند کو سنگسار کرنے میں پیشقدمی کرے۔ جس نے جائز غیظ و غضب کے جوش میں، اپنی عفّت باختہ بیوی کو اور اُسکے حرامکار آشنا کو جہنّم واصل کر دیا ہو؟ یا اُس نوجوان دوشیزہ کو قابلِ سرزنش ٹھیرائے۔ جس نے سرمستیِ شباب کے پُرکیف لمحوں میں اپنے آپ کو عشق کی ہوشربا خوشبوؤں کے حوالے کر دیا ہو؟ اور تو اور، ہمارے ملکی قانون بھی سخت گیری اور بیدردی کے باوجود، ایسے حالات میں موم دل ہو جاتے ہیں۔ اور سزا سے در گذرتے ہیں"

البرٹ نے کہا۔ "یہ بالکل جدا بات ہے۔ کیونکہ انسان شدّتِ جذبات کے زیر اثر غور و فکر کی قوّت ضائع کر دیتا ہے۔ اور اس لئے اُسے ایسے عالم میں بدمست یا مجنون کہکر پکارا جاتا ہے"

میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ "خدا آپ جیسے بیدرد ہوشمندوں سے پوچھے۔ "دیوانہ۔ سرپھرا۔ بدمست!" یہ الفاظ تو آپ کے تکیہ کلام ہیں۔ آپ بندگانِ اخلاق خدا جانے کس مٹی کے بنے ہوتے ہیں کہ انسانی فطرت کی ہنگامہ خیزیاں آپ کے سکونِ بہیم کی بنیادوں کو متزلزل نہیں کر سکتیں۔ میخواروں کو آپ نظرِ حقارت سے دیکھتے ہیں۔ ذلیل و پست انسانوں سے آپ کو نفرت ہے۔ آپ بائیبل کے بیدرد کاہن کی طرح

لاپروائی کے انداز میں اُن کے پاس سے ہو کر گذر جاتے ہیں۔ اور نخوت فروش فریسی کی طرح خدا کا شکر ادا کرتے ہیں۔ کہ اُس نے آپ کو اُن سے بہتر و برتر بنایا۔ میں ایک چھوڑ کئی مرتبہ شراب کے نشے میں مخمور رہ چکا ہوں۔ اور میرے جذبات شوریدگی کی انتہا تک پہنچ چکے ہیں۔ مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کچھ ننگ و عار نہیں۔ کیونکہ میرے تجربہ نے مجھے سکھا دیا ہے کہ دُنیا ہمیشہ اُن غیر معمولی شخصیتوں پر، جنہوں نے محیر العقول کرشمے اور خارقِ عادت کارنامے کر کے دِکھلائے۔ بدمست اور مدہوش کی پھبتیاں کستی چلی آئی ہے۔ یہ تو تھی اجتماعی زندگی کی حالت۔ اب انفرادی زندگی کو لیجئے۔ وہاں بھی ایسے ہی جگر خراش واقعات دیکھنے میں آتے ہیں۔ کیسی ناقابل برداشت بات ہے کہ کوئی شخص کسی نیک اور فائدہ بخش کام کا بیڑا نہیں اُٹھا سکتا۔ جبتک کہ اُس کا دل گردہ فولاد کا نہ ہو۔ جبتک کہ اُس میں یہ طاقت نہ ہو کہ دُنیا والوں کی بے نقط صلواتیں سُن سکے؟ یہ سب آپ جیسے فہمیدہ اور سنجیدہ لوگوں کی کارستانی ہے۔ شرم کا مقام ہے!"

البرٹ نے یہ کہکر مجھے ٹوکا کہ "دیکھا۔ یہ آپ کی غلو پسندی کی ایک روشن مثال ہے۔ آپکی عادت ہے کہ بات بات میں رائی کو پربت بنا دیتے ہیں۔ اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اس معاملے میں آپ کو یقیناً مغالطہ ہوا ہے۔ کیونکہ موضوعِ بحث تو خودکشی تھا اور آپ گفتگو کو کہیں سے کہیں لے گئے۔ آپ بڑی بڑی کارگذاریوں سے خودکشی کا مقابلہ کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ ایک پرلے درجے کی کمزوری ہے۔ ایک مصیبت بھری زندگی کو صبر و سکون سے بسر کرنا، مرجانے سے بدرجہا مشکل ہے۔"

میں نے چاہا کہ گفتگو کا سلسلہ منقطع کر دوں کیونکہ کوئی چیز میرے لئے اس قدر صبر آزما ثابت نہیں ہوتی۔ جسقدر کہ ایک پامال اور پیش پا افتادہ مقولہ، خصوصاً اُس وقت جب میں اپنے دل کی نہاں ترین گہرائیوں سے سرگرم گفتار ہوں۔ بہرحال، میں نے اپنی طبیعت پر جبر کیا، کیونکہ اس سے پہلے بھی یہ مقولہ کئی مرتبہ میری دل آزاری کا سامان رہ چکا تھا۔ اور مجھے اُس کو سُننے کی عادت ہو گئی تھی۔ تاہم میں نے قدرے جوش کے ساتھ اُسے جواب دیا "آپ اسے کمزوری سے تعبیر کرتے ہیں۔ مگر میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کی سطحی نظر آپ کو دھوکہ دے رہی ہے۔ ایک قوم جس نے مدتوں استبداد کی جفائیں سہی ہیں۔ آخرالامر بر روئے کار آتی ہے اور غلامی کی

محکومی کا غیرت سوز طوق اُتار کر دُور پھینک دیتی
ہے۔ کہیئے آپ اس فعل کو کمزوری پر محمول کرینگے؟
ایک شخص اپنے مال و ملکیت کو آتشزدگی سے بچانے
کے لئے اپنی جان لڑا دیتا ہے، اور جلتی ہوئی آگ میں
بیدھڑک گھس کر ایسی ایسی بھاری بھر کم چیزوں کو
جن کا ہلانا بھی عام حالت میں اُس کے نزدیک
امرِ محال تھا۔ اُٹھا لیتا ہے۔ اور ایک شخص کسی اہانت آمیز
کلمہ سے آگ بگولا ہو کر اپنے سے دس گنا زیادہ دشمنوں
پر اس جوش و خروش سے دھاوا کرتا ہے کہ انہیں
بھاگتے ہی بنتی ہے۔ ایسے شخصوں کو آپ کمزور کہینگے؟
میرے دوست، اگر طاقت مقابلہ ہی کا نام ہے تو مقابلہ
کی انتہا کمزوری کیونکر ہو سکتی ہے؟"

البرٹ نے گہری نگاہ سے مجھے گھور کر کہا "معاف
کیجئے گا۔ مجھے معلوم نہیں ہوتا کہ یہ مثالیں جو آپ نے
پیش کی ہیں۔ موضوعِ بحث سے کیا علاقہ رکھتی ہیں"۔
میں نے جواب دیا "خیر نہ سہی۔ بہت ممکن ہے کہ یہ
مثالیں بے موقعہ ہوں۔ کیونکہ میں اکثر لوگوں سے سُن
چکا ہوں کہ میرا طریقِ تمثیل کچھ کچھ بیہودہ ہوا کرتا ہے۔
لیکن آیئے، نقطہ نظر کو تبدیل کر کے دیکھیں کہ اُس
شخص کے دل کی کیا کیفیت ہوگی۔ جس نے اپنے آپکو
زندگی کے بوجھ سے۔ اس بوجھ سے جو گرانباری کے باوجود
ہمیں اس قدر عزیز ہوتا ہے۔ سبکدوش کرنے کا ارادہ
کر لیا ہو۔ اور تو کسی طریق سے ہم اس مضمون پر بعنوانِ حسن
بحث نہیں کر سکتے۔ فطرت انسانی متعین حدود کے
اندر محصور ہے۔ اُس میں شادی و غم، لذت و کرب وغیرہ
جذبات کو کسی حد تک برداشت کرنے کی طاقت ہے
جب یہ جذبات اُس حد سے متجاوز ہو جائیں۔ تو وہ
انکو سہا نہیں سکتی۔ اور فنا ہو جاتی ہے۔ اس لئے سوال یہ ہے
کہ ہم میں مصائب و حوادث کو جھیلنے کی صلاحیت ہے یا نہیں اور
ہے تو کس حد تک۔ مصائب دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ اخلاقی و طبعی
اور میری رائے لیجئے تو جس طرح اُس شخص کو، جس کی موت
بخار کے باعث واقع ہوئی ہو۔ بزدل کہنا حماقت کی
دلیل ہے۔ عین اسی طرح اُس شخص پر بودے پن کا
الزام لگانا، جس نے کہ تقاضائے بشری سے مجبور
ہو کر خود کو فنا کر دیا ہو، تنگ نظری اور کم سوادی ہے"۔

البرٹ مسکرایا۔ "صاحب، یہ تو ایک معمّا ہے،
معمّا"۔ میں نے جواب دیا "نہیں۔ یہ مسئلہ اس قدر
لاینحل نہیں۔ جسقدر کہ آپ اسے گردانتے ہیں۔ آپ
اس بات سے متفق ہونگے کہ ہم ایک مرض کو اس وقت
مہلک کہتے ہیں۔ جب فطرت ہار مان کر ہتھیار ڈال
دیتی ہے۔ اور اُس کی طاقت ایسی سلب ہو جاتی ہے
کہ حالات کے بگڑتے ہوئے نقشے کو سنوارنے کی

چاہے کتنی ہی کوشش کی جائے، وہ کسی صورت اپنے قدم نہیں جما سکتی۔

"اب اسی بات کو پیش نظر رکھ کر نفسِ انسانی پر نظر ڈالئے۔ایک انسان کو اس کی طبعی اور انفرادی حیثیت میں دیکھئے۔اور غور کیجئے کہ کس طرح خیالات یکے بعد دیگرے اُس کے دماغ میں وارد ہوتے رہتے ہیں۔کس طرح تاثرات اُس کے دل میں جڑ پکڑتے رہتے ہیں تا آں کہ ایک زبردست جذبہ اُس پر غالب آجاتا ہے جس کے اثر سے اُس کی قوتِ فکر یک قلم معطل ہو جاتی ہے۔اور اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اُس کا فنا ہو جانا

"کوئی نصیحت اُس پر کارگر نہیں ہو سکتی۔کوئی تدبیر اُسے اس اٹل انجام سے بچا نہیں سکتی۔صحیح المزاج اور سلیم الطبع لوگ جو صورتِ حالات سے نتیجۂ کار کا پتہ چلا لیتے ہیں۔اسے تباہی و بربادی سے بچانے کی لاکھ کوشش کرتے ہیں۔لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ تو کر ہی نہیں سکتے کہ اپنی عقل اور دور اندیشی اُسے عاریتاً دے دیں۔یہ ناممکن ہے۔بھلا یہ بھی کبھی ہوا ہے کہ کسی تندرست آدمی نے ایک مریض کے جسم میں اپنی طاقت داخل کر دی ہو؟"

البرٹ نے اس کے متعلق رائے ظاہر کی کہ میں نے اس میں بہت زیادہ تعمیم سے کام لیا ہے۔میں نے اُسے ایک لڑکی کا واقعہ یاد دلایا جس نے چند روز پیشتر اپنے آپ کو پانی میں ڈبو دیا تھا۔اور اُس کی سرگذشت بیان کی۔

وہ ایک بھولی بھالی الھڑ لڑکی تھی۔جس نے خانہ داری کے کام کاج اور محنت و مشقت کی تنگ فضا میں تربیت پائی تھی۔اُس نے آنکھ کھول کر کبھی دنیا کی گوناگوں عشرتیں نہ دیکھی تھیں۔اور اُس کے مشاغلِ دلچسپی ہاتھ کی انگلیوں پر گنے جا سکتے تھے۔اتوار کا دن اُس کے لئے ایک تیوہار ہوتا تھا۔اُس دن وہ اپنی بہترین پوشاک زیبِ تن کر کے اپنی گنتی کی واقفکاروں اور سہیلیوں کے ہمراہ سیر کو جاتی۔اس کے سوا رات بجائے دن جاتے وہ تھی اور گھر کا کام کاج۔ہاں کبھی کبھی گاؤں میں کوئی میلہ لگتا تو وہ ناچ میں شریک ہو جاتی۔اُس کا وقتِ فرصت زیادہ تر کسی پڑوسن کے ساتھ دور و نزدیک کی باتوں گاؤں کی بے تکی افواہوں اور آئے دن کے لڑائی جھگڑوں کے متعلق گفتگو کرنے میں گزرتا۔یہ تھے وہ سیدھے سادے مشاغل جن کے اندر اُس کا سیدھا سادہ دل ایک جہانِ عیش پنہاں پاتا تھا۔آخر کار وہ وقت آتا ہے۔جب اُس کے سینے میں نئی نئی اور نامانوس خواہشیں ایک مجہول سی خلش پیدا کرتی ہیں۔لوگوں سے اپنے حسن و جمال کی تعریفیں سنتے سنتے وہ اپنی موجودہ زندگی سے بیزار ہو جاتی ہے اور اُس میں کسی شے کی کمی محسوس کرنے

لگتی ہے۔ یہانتک کہ ایک دن اُس کی آنکھیں ایک نوجوان سے دوچار ہوجاتی ہیں۔ اور ایک ناقابلِ بیان کشش اُسے اُس کے ساتھ وابستہ کردیتی ہے۔ اُس کی آوارہ آرزوئیں اور تمنائیں بالآخر اپنے لئے ایک محور ڈھونڈ نکالتی ہیں۔ اور وہ نوجوان اُس کی تمام امیدوں کا ملجاؤ ماویٰ بن جاتا ہے۔ وہ دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہوکر صرف اُس سے لو لگالیتی ہے۔ وہی اُسے ہر جگہ نظر آتا ہے۔ اُسی کی آواز وہ ہر جگہ سنتی ہے۔ اور اُسی کو وہ ہر وقت چاہتی ہے۔ وہ اکیلا اُس کے خیالات کی وسیع دُنیا پر حاوی ہو جاتا ہے۔ وہ خود بینی جو لوگوں کی تحسینِ ناشناس نے اُس کے دل میں پیدا کردی تھی۔ محبّت کی فروتنی کے سامنے کافور ہوجاتی ہے۔ غرور میں کمزوری ہوتی ہے۔ اور انکسار میں طاقت۔ اس لئے اب اُس کی محبّت پوری ثابت قدمی سے اپنے منتہائے مراد کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اُسے کامل امید ہوتی ہے کہ ایک دن وہ اُسکی بن رہیگی۔ اور اُس کے ساتھ مواصلتِ دائمی پاکر وہ تمام خوشی جسے وہ مدت سے ڈھونڈھتی تھی۔ اور نہ پاتی تھی وہ تمام راحت جس کے لئے اُس کا دل بیتاب تھا اُسے مل جائیگی۔ بار بار کے دُہرائے ہوئے وعدے، تشفیاں اور تسلّیاں اُس کی امیدوں کو اور بھی راسخ کردیتی ہیں۔ راز و نیاز کی باتیں، پُرمزہ بوس و کنار، اور آغازِ الفت کی دلنوازیاں اُس کے ننھّے سے دل میں اُمنگوں کے طوفان اُٹھا اُٹھا کر اُس کی تمام رُوح کو تسخیر کرلیتی ہیں۔ اُس کا دماغ امیدِ کامرانی کی ہوا میں پرواز کرتا رہتا ہے۔ اور اُس کے احساسات بیتابی و اضطراب کی انتہا تک پہنچ جاتے ہیں۔ آخرکار وہ بازو پھیلاکر اپنے شاہدِ مقصود کو آغوش میں لے لینا چاہتی ہے لیکن آہ، اُس کا بیوفا محبوب طوطے کی طرح آنکھیں پھیرلیتا ہے وہ دُنیا میں حیران و پریشان اور بے مونس و غمخوار رہجاتی ہے جس طرح کوئی شخص اندھیری رات میں کسی اُونچے پہاڑ کی چوٹی پر تنہا کھڑا ہو۔ اور سہم سہم کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے اردگرد کے منظر کو دیکھ رہا ہو۔ اُسے چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے۔ ویران۔ سنسان۔ اور بھیانک تاریکی۔ کوئی امید نہیں، کوئی تسلّی نہیں۔ کوئی آسرا نہیں، آہ یہ ہمہ سوز مصیبت کیا کم ہے کہ اُس شخص نے جو اس کا مدارِ زیست تھا۔ اور جسکے عہد و پیمان میں وہ ایک فردوسِ موعود کے خواب دیکھا کرتی تھی اُس سے بیوفائی کی اور اُسے اس حالت میں چھوڑکے چلدیا! دُنیا کی بھری نگری اس کی آنکھوں کے سامنے آباد ہے لیکن اُسے کچھ نظر نہیں آتا۔ کچھ نہیں سُوجھتا، اور وُہ اُن بیشمار لوگوں کا مطلق خیال نہیں کرتی۔ جو متمنّی ہیں۔ کہ اُس کے دِل کے خلاء کو پُر کردیں۔ وہ یہی محسوس کرتی

ہے۔ کہ غدّار زمانے نے اُس سے دغا کی اور امیدوں کے سبز باغ دکھا دکھا کر آخرکار اُسے رنج بیوفائی کے کانٹوں بھرے جنگل میں ڈال دیا۔ اس رُوح فرسا صدمہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ سمندر میں کود پڑتی ہے۔ کہ موت کے آغوشِ راحت میں دُنیا کی ترکتازیوں سے پناہ پائے۔ دیکھو' البرٹ' یہ ہے ہزاروں لاکھوں بدنصیبوں کی سرگزشت۔ اور اب مجھے بتاؤ کیا یہ طبعی کمزوری کا نتیجہ نہیں ؟ فطرت گردابِ بلا میں پھنس گئی ہے۔ اس کو بچ نکلنے کی کوئی صُورت نظر نہیں آتی۔ اُسکی قوتِ مقابلہ درماندہ ہو چکی ہے اور اب بچاری رُوح کا مرنا لازمی ہے۔

وہ شخص انسان نہیں' درندہ ہے' جو ٹھنڈے کلیجے سے اس حادثہ کو دیکھے اور حکم لگا دے کہ " لڑکی بیوقوف تھی۔ اُسے صبر کرنا چاہیئے تھا۔ وقت خود اُسکے دِل سے نقشِ ناکامی مٹا دیتا' اُس کی مایوسیاں امیدوں سے بدل جاتیں' اور اُسے کسی نئے دلدار کے آغوش میں آرام جان نصیب ہو جاتا۔" اس طرح تو کوئی شخص یہ بھی کہہ سکتا ہے۔ کہ " بیوقوف تھا۔ بخار سے مرگیا! پاگل کو انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ اُس کے جسم میں خود بخود طاقت آجاتی' اور اُس کے خون کی حرارت ٹھنڈی پڑ جاتی۔ اللہ اللہ خیر صلاح' وہ اب تک اچھا بھلا بھی ہو گیا ہوتا۔ اور اب زندہ ہوتا۔"

البرٹ اب بھی قائل نہ ہُوا۔ اُس نے بہت سے اعتراض وارد کئے۔ اُن میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ مَیں نے ایک جاہل اور دہقانی لڑکی کی مثال پیش کی تھی۔ وہ تو جہالت کی آڑ میں الزام سے محفوظ رہ سکتی ہے لیکن اگر کوئی ذی ہوش آدمی جس نے دُنیا کو اچھی طرح دیکھا بھالا ہو۔ اور جس کا دائرہ نظر کافی وسیع ہو' اس فعل کا ارتکاب کرے۔ تو وہ کیونکر الزام سے بری کیا جا سکتا ہے ؟ مَیں نے جوش میں آکر جواب دیا " میرے دوست' انسان آخر انسان ہے۔ اور چاہے اسکے قوائے عقلیہ کیسے ہی زبردست کیوں نہ ہوں۔ وہ جذبات کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بالکل بیدست وپا ہو جاتا ہے۔ اور محسوس کرتا ہے کہ اپنی وسعتِ نظری کے باوجود وہ فطرت کی تنگ حدود کے اندر مقیّد ہے۔ اس لئے بہتر ہو' اگر —— خیر' ہم اس معاملے کے متعلق کسی دوسرے وقت گفتگو کریں گے۔" یہ کہکر مَیں نے اپنی ٹوپی اُٹھالی۔ اور رخصت چاہی۔ میرا جی بھر آیا تھا' اور مجھ میں زیادہ بولنے کی تاب نہ تھی۔ اس لئے ہم ایک دوسرے کو قائل کئے بغیر جُدا ہو گئے۔ یہ دُنیا بھی کیسی غلط فہمیوں کی دُنیا ہے! اس میں شاذو نادر ہی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے مافی الضمیر کو ٹھیک ٹھیک سمجھتے ہوں۔

محمدؐ ہادی حسین

خطاب بہ نفس

اللہ جل شانہٗ نے ہر انسان میں مختلف طاقتیں ودیعت کی ہیں۔ ان طاقتوں کا دانشمندانہ استعمال کرنا کثرت استعمال سے ان کو کامل نشوونما بخشنا۔ اُن کو تضیع وتخریب سے محفوظ رکھنا اور عزم واستقلال پر عمل پیرا ہونا ہر انسان کا مذہبی فرض اور حقیقی مقصدِ حیات ہے۔ تمام کامیابیوں کا راز صفائی قلب میں مضمر ہے۔ قلب کو تمام خواہشات ذمیمہ سے پاک کرنے کے بعد ہی تم کو تمہاری زندگی کی غرض وغایت بھی معلوم ہوگی۔ اُس وقت خود تم پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جائیگی۔ کہ یہ سیل حیات تمہیں کس منزلِ مقصود کی طرف لے جا رہا ہے۔ جن حوادث کو تم فضول وعبث بلکہ ظلم وستم تصور کرتے ہو۔ خود تم سمجھنے لگوگے کہ یہ تمہارے لئے تازیانۂ عبرت ہیں۔ تاکہ تم خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر چشم بصیرت سے کام لو۔ موجودات سامعہ نواز نغموں اور روح پرور رنگ وبو میں صانع قدرت کی سحر کاریاں جلوہ افروز نظر آئیں۔ تمہارے قلب میں اضطراب پیدا ہو۔

ہر انسان اعلیٰ ترین منزلِ مقصود تک پہنچنے پر قادر ہے۔ بشرطیکہ اُس میں اس امر کا احساس ہو کہ حوادثِ مخالف سے متصادم ہونا عزم واستقامت کی استواری کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اگر تجھ کو اپنے جذبات پر پورا قابو ہے۔ تیری فطرت میں اولوالعزمی ہے۔ تیرے بھٹکتے ہوئے قدم بالآخر شاہراہِ حکمت وعمل پر جم گئے تو تو نہ صرف اپنے دامنِ تمنا کو گوہر مراد سے معمور کریگا۔ بلکہ برادرانِ وطن اور عزیزانِ ملت کی مسرت وکامرانی کے لئے دستِ مدد بھی دراز کریگا۔ اپنے ہمدردانہ خیالات اور مخلصانہ طرز کلام سے پژمردہ دلوں میں امید اور قوتِ عمل کی لہر دوڑا دیگا۔ تیری شرافت نفسی اور اولوالعزمی اپنے غلبہ وتاثر سے اس جوہر شرافت کو جو روزِ ازل سے ہر انسان کی فطرت میں داخل ہے ظلمتِ جہالت سے باہر لائیگی۔ اور خوابِ غفلت سے بیدار کریگی۔ اُس وقت ہر طرف تجھے اُسی نورِ شرافت کی تجلی نظر آئیگی۔ منزلِ حیات کے ہر موقع پر اُسی کی شعاعیں ضیاپاش ہونگی۔ تو پھر نہ کبھی مغموم ہوگا نہ تنہائی کے ناگوار تاثرات سے مضمحل۔ تیری نگاہِ تجسس ہر شے میں حسن وخوبی ہی مشاہدہ کریگی۔ تیرے قلب میں محبت

کا چشمہ جاری ہوگا۔ خلق خدا کی بہبودی کے جذبات سے تیرا سینہ پُر ہوگا۔ آفتاب کی پرتعش کرنیں۔ چڑیوں کی زمزمہ سنجی۔ برگہائے گل کی سرگوشیاں۔ بلوریں فواروں کا ترنم۔ زمین و آسمان۔ سمندر یا فضائے بسیط کے تمام بوقلموں نظارہائے حسن و جمال تیرے مرکز روح ہیں ہو جائینگے۔ اُس وقت تو اپنی ذات کو اُن غیر محدود قوتوں سے مربوط و مخلوط پائیگا۔ جو تمام کائنات میں اہتزازات جلی یا تموجات خفی کے ساتھ جاری و ساری ہیں کاش ہر شخص اسی لائحہ عمل پر کاربند ہوتا تو دنیا کس سرعت کے ساتھ منزلِ ارتقا سے گذر کر اوجِ کمال تک پُہنچ جاتی! اشجارِ نو بہار ہم پر نئی نئی صداقتیں منکشف کرتے۔ گنبدِ اخضر کے ثوابت و سیارے ہمیں پابندیِ قوانین کی تعلیم دیتے۔ بزمِ آفرینش میں ہم بھی اپنی مقررہ جگہ کو معمور کرتے۔ اور نغمۂ جاوید کے ہمنوا و ہم آہنگ ہو جاتے!

جس طرح چھوٹی چھوٹی ندیاں بڑے بڑے دریاؤں کی خوراک ہیں۔ جس طرح ہر آبشار اپنی خفیف حرکت اور ناتواں قوت کو اُس تیز رو سیلاب پر نثار کر دیتا ہے۔ جسکی خارا شگاف روانی میں اس کی ہستی مدغم ہو کر کالعدم ہو جاتی ہے۔ جس طرح کوہستان کی ترنم ریز نہریں اُن عظیم الشان دریاؤں کی عظمت و شان کو بڑھاتی ہیں۔ جن پر کھیتوں کی شادابی، مرغزاروں کی لہلہاہٹ اور باغوں کی رونق اور نکہت بیزی کا دارومدار ہے۔ اسی طرح جو قوتیں اور نعمتیں تونے پائی ہیں۔ تبسّم و خندہ روئی سے اُس بحرِ بیکراں پر نثار کر دے جو بغیر کسی مزاحمت و رکاوٹ کے پیہم رواں ہے جس کی شوکت حیرت خیز ہے اور جس کی قوتِ لاتناہی، تاکہ تیری قوتِ ناتواں بھی اُس قوتِ غیر محدود میں مدغم ہو کر پژمردہ دلوں کی خشک کھیتوں کو شاداب کر دے۔ اور تیرے الفاظ بھی چشمہائے مترنم کے دلآویز زمزموں کی طرح سامعین کو امید و مسرت کا پیغام سُنائیں۔

اگر انسان میں عزمِ راسخ اور وجدانِ کامل پیدا ہو جائے۔ تو تمام وہ زنجیریں خود بخود شکستہ ہو جائیں۔ جو اُس کو انحطاط و زوال کی طرف گھسیٹتی ہیں۔ جنگل کی خزاں دیدہ پتّیاں جھڑ جاتی ہیں لیکن شاہ بلوط اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ اپنی جگہ پر جما رہتا ہے۔ اسی طرح وہ تمام چیزیں جن کو تو اپنی کامیابی و مسرت کے لئے لازمی تصوّر کرتا تھا۔ افسردہ ہو کر فنا ہو جائینگی۔ جذباتِ فاسدہ مٹ جائینگی۔ عارضی خیالات نقش بر آب کی طرح معدوم ہو جائینگے لیکن تو یکہ و تنہا اپنے عزمِ راسخ کے ساتھ اٹل پہاڑ کی طرح کھڑا رہیگا۔ ممکن ہے کہ تجھ کو اُن

محبوب تریں اشیاء سے بھی علیحدگی اختیار کرنی پڑے
چمن سے بغیر (تیرے خیال سے) بزم حیات میں عیش و
نشاط کی ایک مجلس بھی ناممکن تھی۔ لیکن اب کسی عزیز
کی ناگہانی موت۔ کسی حبیب کی دائمی مفارقت یا مصیبت
خزاں کی آمد۔ تیرے دل پر کوئی دیرپا صدمہ نہیں پہنچا
سکتی۔ اگر تو زندگی کے مختلف تغیرات سے گذر کر فولادی
عزم کا مجسمہ بن چکا ہے۔ تو موجودہ امیدوں کی موت
تیرے لئے حیاتِ تازہ اور غنچۂ نو کا مژدۂ جانفزا لائیگی۔
تیرے چہرہ پر ایک شان ہوگی تیری ہر ادا آئینۂ استقامت
ہوگی۔ تو قوتِ عمل کا ایک مرقع ہوگا۔

تمام قوانین قدرت حکمت بالغہ پر مبنی ہیں۔ ان کی
صداقت پر غیر متزلزل اعتقاد رکھنا ہر انسان کا فرضِ
اولین ہے۔ رنج و غم لذت و مسرت نظام عالم کے
ضروری شرائط ہیں۔ کامیابی کے لذائذ سے شاد کام
ہونے کے لئے نامرادی کے آلام کی تلخ کامی بھی ضروری
ہے۔ اشکہائے غم سے مسرتوں کی آبیاری ہوتی ہے
فنا شدہ امیدوں کی خاکستر سے نئی مرادوں کی تعمیر
ہوتی ہے۔ حسرت و یاس کے سیاہ پردوں پر خود اعتمادی
اور خود شناسی کی سحر طراز تصویر کھینچتی ہے۔ قدرت کی
کرشمہ سازیاں شعوری و ارادی ہیں۔ انسان کے افعال
و حرکات کے نیک و بد نتائج کا بہترین فیصلہ قدرت
ہی کر سکتی ہے۔ انسان کا فرض یہی ہے کہ وہ اپنی مسلسل
حرکت کو جاری رکھے۔ اور ہر نتیجہ کو بھگتنے کے لئے سینہ سپر رہے
اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کرے کہ تو اس حیاتِ جاوید
کا ایک نقطۂ موہوم ہے۔ جو تمام عالم پر حاوی ہے اس حیات
عالمگیر سے جتنی صداقتیں منسوب ہیں وہ سب تیری
ذات سے بھی ملحق ہیں۔ فطرت کے تمام مد و جزر، آشوب و
انقلاب کسی خاص مدعا کی تکمیل کے لئے عالمِ شہود میں
آتے ہیں۔ افق مغرب میں سیاہ بادلوں کا متواتر ہجوم
آفتاب کی وداعی ضوفشانیوں کی دلکشی کو دوچند کرتا
ہے۔ جاڑے کے یخ بستہ چٹانوں میں قدرت اپنی
متعدد ذراتِ حیات کو مقفل رکھتی ہے۔ جو موسمِ بہار
کے روح پرور تنفس سے حسن کی نوع بنوع صورتوں میں
نمایاں ہوتی ہیں۔ تیرے مصائب کے بادلوں سے بھی
امید کی شعاعیں برآمد ہونگی۔ تیرے حسرت و یاس کی
برف باری بھی کبھی موسم بہار کی رنگینی اور زمزمہ سنجی کا
پیام لائیگی۔ تیرا رفیق کامل یعنے عزم راسخ تجھے
منزل مقصود کے نزدیک تر لیتا جائیگا لیکن تو کبھی
دم نہ لے۔ آگے ہی بڑھتا جا۔ کامیابی کا تاج تیرے
ہی سر ہوگا۔

محمد امیر الحسن

حسینۂ مصر

(گذشتہ سے پیوستہ)

شامر۔ اے باعظمت بادشاہ۔ میں ایک خوشخبری لائی ہوں مجھ پر رحم کر۔

فرعون ۔" بلا خوف بیان کر" اس وقت دھیما پڑا۔ اور خوشخبری سننے کے لئے تیار ہوگیا۔

شامر "طھوسر جس کی تلاش میں آپ کے پیامبروں نے تمام مصر چھان ڈالا۔ اُس کی موجودہ جائے پناہ مجھے معلوم ہے۔"

طھوسر کے پیارے نام پر فرعون چونک پڑا۔ اور اُس کی جان میں جان آگئی اور تیزی کے ساتھ اس سربسجود جسم کی طرف بڑھا۔

فرعون ۔" اگر اس وقت تو سچ کہہ رہی ہے تو میرے خزانہ سے جسقدر زر و جواہر لیجا سکے لے جا۔"

شامر۔ اے بادشاہ میں اُسے حضور کے حوالے کر دونگی۔ حضور اپنے قلب کو تسکین دیں۔ میں حضور کے لئے یہ خدمت انجام دے سکتی ہوں۔" یہ کہکر وہ سنگدلی کے ساتھ ہنسنے لگی۔

اس غداری سے شامر کا کیا منشاء تھا؟ وہ اس انتہا کو روکنا چاہتی تھی جس سے اُسے سخت نفرت تھی۔ وہ مصریوں سے بلا سوچے سمجھے اور بُری طرح نفرت کرتی تھی۔ طھوسر کا دل توڑنے میں اُسے یقیناً بڑی خوشی ہوئی۔ کیونکہ یہ حسین لڑکی جہاں ایک بار فرعون کے ہاتھ لگ گئی۔ وہاں اس کی رہائی پھر کبھی نہ ہوگی۔ اور وہ کبھی راحیل کی رقیب نہ بن سکیگی۔ قصر شاہی میں شکار کی حفاظت کا کافی سامان ہے۔

فرعون (جوش میں) " وہ کہاں ہے۔ میں اُسے فوراً دیکھنا چاہتا ہوں۔"

شامر "جہاں پناہ میں ہی حضور کو وہاں لیجا سکتی ہوں۔ میں اُس بدنصیب مقام کے راستے اور گلیوں سے واقف ہوں۔ جہاں حضور کے ادنےٰ ترین غلام جاتے ہیں۔ وہیں ایک غریب جھونپڑے میں طھوسر موجود ہے۔"

فرعون ۔" اچھا اطانت ایک گاڑی تیار کر۔ اے عورت میں تیری بات کا اعتبار کرتا ہوں۔"

گاڑی آگئی اور فرعون سوار ہونے کے لئے چلا۔ اسرائیلی عورت پیچھے پیچھے ساتھ تھی وہ شاہی تھان پان

کے ساتھ گاڑی پر سوار ہوا۔ اور اپنی ہما کو پیچھے ہٹتے دیکھ کر اس نے حکم دیا کہ وہ بھی ساتھ بیٹھے۔ گاڑی تیزی کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

باعظمت فرعون کی بغل میں ایک بڈھی خرانٹ کم خمیدہ عورت ایک عجیب منظر پیش کرتی تھی لیکن اس کا اظہار کرنے والا ستاروں کے سوا کوئی نہ تھا۔

شاہی کوچوان "یہی راستہ ہے؟"

ثامر "ہاں"

گھوڑوں پر تابڑ توڑ کوڑے پڑنے لگے اور وہ اس تیزی سے چلنے لگے۔ جیسے اُن پر کوئی بار نہیں ہے گاڑی کے پہیئے پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر جھنک رہے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ پیتل کے بنے ہوئے ہیں

اس اثنا میں طھوسر راحیل کے بغل میں بے خبر سو رہی تھی۔ اور ایک عجیب خواب دیکھ رہی تھی۔ خواب یہ تھا۔

مصر کے قدیم دیوتا اس کے سامنے تھے۔ اور اسقف اعظم پٹامونات بھی موجود تھا جس نے اپنی لڑکی سے کہا۔ "اگر یہ خدا ہیں تو ان سے خود پوچھو" طھوسر نے پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم اصلی خدا نہیں ہیں۔ اس کے بعد پوتری آیا اور وہ ایک ایسی چوندھیا دینے والی روشنی کی طرف اُسے لے گیا۔ جسکے سامنے سورج کی روشنی بھی ماند پڑ جاتی۔ اس روشنی کے درمیان میں غیر معلوم الفاظ کا ایک مثلث تھا۔۔۔۔۔

ادھر تو یہ خواب دیکھ رہی تھی۔ اور اُدھر فرعون کی گاڑی تیزی کے ساتھ بڑھتی ہوئی آ رہی تھی۔

ثامر۔ "میں آپ سے التجا کرتی ہوں۔ کہ اسقدر تیز نہ چلیے اس خاموش مقام پر پہیوں کی سخت آواز لوگوں کو ہوشیار کر دیگی۔ اور ممکن ہے کہ طھوسر پھر ہاتھ سے نکل جائے۔"

اس مشورہ پر عمل کیا گیا کیونکہ یہ بہت ہی مناسب بات تھی۔ اور پہیوں کو الگ کر کے رفتار کم کر دیگئی حتیٰ کہ ثامر چلا اٹھی۔

ثامر "یہی مکان ہے۔ دروازہ بند نہیں ہے۔ آپ اندر جائیں میں آپ کی گاڑی دیکھے ہوں"

بادشاہ آگے بڑھا اور آخر کار طھوسر کو پالیا اور اپنے طاقتور ہاتھوں میں لئے ہوئے باہر آیا۔ طھوسر جاگ پڑی اور اُوپر نظر اُٹھا کر دیکھا۔ تو فرعون کا چہرہ اس کے سامنے چمک رہا تھا۔ پہلے تو خیال کیا کہ یہ بھی اُس کے عجیب و غریب خواب کا ایک جزو ہے لیکن جب رات کی سرد ہوا اُس کے مُنہ میں لگی تو اُس نے سمجھا کہ یہ واقعہ ہے۔ اُس نے چیخنا چاہا لیکن آواز نہ نکلی علاوہ بریں

فرعون کے خلاف اس کی امداد کون کر سکتا تھا؟

بادشاہ کودکر گاڑی میں بیٹھا اور جلدی جلدی لگام لپیٹ کر اپنی کمر میں باندھ لی۔ طھوسر خوف و ہراس کے مارے یونہی نیم جان ہو رہی تھی۔ فرعون نے اور سینہ سے چمٹا لیا۔

تیز رفتار گھوڑے پھر رات کی تاریکی میں چوکڑی بھرنے لگے۔ اب فرعون خود راستہ جانتا تھا۔ اور تھوڑی ہی دیر بعد اُس نے محل کے قریب پہنچکر رفتار سست کی۔

تمام جھونپڑے پیچھے ہی رہ گئے۔ اور آہستگی سے راحیل کے پاس لیٹ گئی۔ جواب تک سو رہی تھی۔

باب سیزدہم

فرعون کی خدائی

رات کے اس تیز سفر میں طھوسر کے دماغ میں کیا خیالات چکر لگا رہے تھے؟ اصل یہ ہے کہ اس کی اس وقت وہی حالت تھی جو عقاب کے سامنے قمری کی ہوتی ہے۔ ایک ہولناک دہشت اس کے اوپر طاری تھی جس نے اُس کا خون سرد کر دیا تھا۔ اور سارے حواس معطل کر دئے تھے۔ دو بار اس نے اچھی طرح محسوس کیا۔ کہ دو گرم گرم لبوں نے اُس کے لبوں کو مس کیا۔ لیکن اُس نے ان سے بچنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ خوف نے شرم و حیا کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔

جب اُس نے قصر کی ایک محراب کو پہچانا تو اس کے دل پر مایوسی چھا گئی۔ اُس نے کوشش کی۔ کہ فرعون کے آہنی بازوؤں کو چھڑا کر نکل بھاگے لیکن یہ کوشش بے سود تھی۔ بلکہ حماقت۔ بادشاہ اس وقت مزے میں تھا اور غرور سے مسکرا رہا تھا۔ اور طھوسر کو اور سختی سے دبا لیا۔ اُس نے شور مچایا لیکن ایک طویل بوسے نے اُس کا منہ بند کر دیا۔ اب سفر ختم ہو گیا تھا۔ اور گھوڑے ایک وسیع صحن میں کھڑے تھے۔ اور کئی سائیس انہیں گاڑی سے علیحدہ کر رہے تھے۔ طھوسر کو بادشاہ نے گاڑی پر سے اس طرح اُٹھا لیا۔ جیسے کوئی چھوٹی سی لڑکی کو اٹھاتا ہے۔ اور نہایت احتیاط سے اپنے پیروں پر رکھ لیا۔ یہ دیکھ کر کہ طھوسر کانپ رہی ہے فرعون نے کہا۔

فرعون "یقین مانو کہ تم فرعون پر حکومت کرتی ہو۔ اور فرعون ساری دنیا پر حاکم ہے"

یہ معنی خیز الفاظ سب سے پہلے الفاظ تھے جو فرعون نے طھوسر سے کہے۔ اگر محبت عقل کے مشورہ ہوتی تو اس میں کوئی شک نہ تھا کہ طھوسر لوپٹری پر فرعون کو ترجیح دیتی بادشاہ غیر معمولی طور پر حسین تھا۔ اور موزوں خط و خال تصویر کی طرح صاف تھے۔ اور حکمرانی کی عادت نے اُنکھوں میں ایک پُر اثر روشنی پیدا کر دی تھی۔ اس کے لب سرخی مائل نیلگوں تھے۔ اور جس وقت وہ مسکراتا تھا۔ اُس وقت ہر شخص

اس پر نثار ہو جانے کو آمادہ ہو جاتا تھا۔ اُس کا جسم نسبتاً بہت لانبا تھا۔ اور سر سے پاؤں تک ایک شاہانہ شان تھی۔ جب وہ پورے لباس سے آراستہ ہو کر نکلتا تھا اُس وقت انسانوں کی ہستی سے بالاتر معلوم ہوتا تھا۔ ایسے شخص کے سامنے پوٹری کی کوئی حقیقت نہ تھی لیکن طھوسر پوٹری کو چاہتی تھی۔

طھوسر کا ہاتھ پکڑے ہوئے فرعون کئی کمروں میں ہوتا ہوا ایک کمرہ میں جاکر تخت شاہی پر بیٹھ گیا۔ یہ کمرہ تصویروں اور قیمتی فرش وفروش سے آراستہ تھا۔ وسط میں ایک میز تھی۔ جو قیدیوں کی تصویروں پر کھڑی ہوئی تھی۔ اور اس پر بڑے بڑے خوشنما پھولوں کا ڈھیر تھا۔ جن سے خوشگوار خوشبو نکل کر اس وسیع کمرے کی ہوا کو معطر کر رہی تھی

اس شاندار مقام پر ہر چیز فرعون کی غیر فانی عظمت کا راگ گا رہی تھی۔ تاہم پٹاموناف کی لڑکی پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ وہ پوٹری کی دلفریب بارہ دری کا تصور کر رہی تھی۔ اور اس چھوٹے سے جھونپڑے کا خیال کر رہی تھی۔ جس سے وہ جبراً محروم کر دی گئی تھی۔ طھوسر فرعون کے سامنے کھڑی ہوئی تھی۔ اور فرعون اس کا ہاتھ پکڑے ہوئے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ اس نوجوان لڑکی کا لباس وہی کپڑا تھا جو راحیل نے اُسے دیا تھا لیکن اس کا حسن بجائے کم ہونے کے اور بڑھ گیا تھا۔ اُس کا بدن نصف عریاں تھا اور وہ ایک ہاتھ سے اُس لبادہ کو پکڑے ہوئے تھی جو گو کہ اُس کے خوبصورت جسم کے عنبری اور دیگر خوشنما رنگوں کو کھول دینا چاہتا تھا۔ فرعون کے حرم میں بہت سی حسین عورتیں تھیں اور ہمیشہ رہیں لیکن طھوسر کا حسن ان سب پر دوبالا تھا۔ اور بادشاہ کی نگاہیں خوشی سے جھلک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں کی تیز اور چمکتی ہوئی روشنی کے سامنے طھوسر نے اپنی آنکھیں جھکالی تھیں۔

دل ہی دل میں اُسے ناز تھا۔ کہ اُس نے اتنے بڑے شخص کو اپنی محبت میں کھینچ لیا۔ وہ کون عورت ہے۔ جو غرور سے بالکل خالی ہو۔ تاہم وہ نوجوان عبرانی کیساتھ جنگلوں کی خاک چھاننے کو ترجیح دیتی۔ بادشاہ کے سامنے وہ محو حیرت تھی۔ وہ اس کی شاندار عظمت اور جوش سے بھرے ہوئے شوق کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کے پیر جواب دے رہے تھے۔ فرعون نے اُس کی نگاہوں سے اس کی تکلیف کو تاڑ لیا۔ اور ایک مسند پر اپنے پیروں کے پاس بٹھالیا۔ اور اس کے بعد کہا:۔

فرعون: "آہ طھوسر میں تجھ سے محبت کرتا ہوں۔ (اتنا کہہ کر وہ جھکا اور طھوسر کے بالوں کو بوسہ دیا) جب میں نے پہلی بار تجھے اس وقت دیکھا جبکہ میں اپنے افسروں کے

شانوں پر فاتحانہ شان و شوکت کے ساتھ سکہ پال پر آ رہا تھا۔ تو اُسی وقت میرا جی لوٹ گیا۔ میں جس کی چھوٹی سی چھوٹی خواہش خیال سے پہلے پوری ہوتی ہے۔ کسی چیز کا دل سے خواہاں ہُوا۔ اس وقت میں نے سمجھا کہ میں سب سے اوپر اور سب سے بڑا اور ہر چیز پر قادر نہیں ہوں، اس کے پیشتر میں اپنی شوکت اور قوت میں مست تھا ان عظیم الشان محلات میں میرا دل تنہا تھا۔ اور کبھی کبھی میرے گرد چند مسکراتی ہوئی تصویریں آ جاتی تھیں۔ جو اپنے کو عورتیں کہتی تھیں۔ اور ان کا اثر میرے دل پر اُسی قدر ہوتا تھا جسقدر پتھر کے بنے ہوئے ان مجسموں کے جلوس کا۔ میں دُور سے اُن اقوام کی آوازیں اور فریاد سُن رہا ہوں جن کے سروں پر میں نے اپنے جوتے کی خاک جھاڑی ہے۔ یا جنہیں سر کے بالوں سے گھسیٹ کر میں نے قید کیا ہے۔ جیسا کہ میناروں کے نقش و نگار سے واضح ہوتا ہے۔ سنگِ سیاہ سے بنی ہُوئی ایک دیوتا کی تصویر کی طرح اپنے سرد اور سخت سینہ میں دل کی حرکت کی آواز بھی میں نہیں سُننا چاہتا تھا۔ مجھے یہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ سرزمین دُنیا پر میرے برابر کوئی نہیں ہے اور ایسا کبھی کوئی نہ پیدا ہوگا۔ جو میرے دِل پر اثر ڈال سکے۔ جب میں غیر اقوام پر مہم لیکر جاتا تھا تو وہاں سے چُن چُن کر حسین عورتیں لاتا تھا۔ جو اپنے ملک میں حسن کے لئے شہرہ آفاق ہوتی تھیں

لیکن تھوڑے دن بعد یہ میرے دل سے اس طرح اُتر جاتی تھیں جس طرح سُونگھا ہُوا اور پژمردہ پھُول۔ ان میں سے کسی کو پھر دیکھنے کی خواہش میرے دل میں نہیں پیدا ہُوئی۔ جب وہ موجود ہوتی تھیں۔ تو شاید ہی کبھی اُن کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھ لیتا ہوں اور جب وہ نہیں ہوتی تھیں تو فوراً بھُول جاتی تھیں۔ طویہ اور امینسی اور حانت ریشی، جنہیں میں نے چار و ناچار اس لئے رکھ لیا ہے۔ کہ بار بار ایسوں کی تلاش نہ ہو۔ جو کل میری نظر سے اُتر جائیں۔ میرے سامنے کبھی جھوٹے واہمے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں اور گو ان کے جسم معطر اور خوشنما ہیں۔ تاہم میرے نزدیک یہ ایسے طبقہ کی ہیں۔ جس کے ساتھ میں شیر و شکر نہیں ہو سکتا۔ اور جس کا میں پابند نہیں ہو سکتا۔ شیر ہرن سے نہیں مِل سکتا۔ اور ہوا کی چیزیں پانی کی چیزوں سے نہیں مِل سکتیں۔ میرا خیال تھا کہ ہم فانی انسانوں سے بالاتر دیوتاؤں کے برابر ہوں۔ اور انسانی رنج و مسرت میں حصّہ نہیں لے سکتا۔ جب میں اپنے تخت پر سنگِ مرمر کے مجسمے کی طرح بیٹھ کر غیر ممکنات اور غیر محدود اور غیر فانی کا خواب دیکھتا تھا۔ اُس وقت میں ایک بہت بڑے خمار میں مست ہو جاتا تھا۔ میں نے اکثر خواب دیکھا کہ میں نے قوس قزح کی دیوی کی نقاب اُلٹ دی ہے۔ اور اس خطرہ کو دھیان میں نہیں لایا۔ کہ اُس کے قدموں پر

مردہ ہوکر گر نہ پڑوں۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے۔ غالباً صرف یہی ایک پر اسرار صورت ہے جس کا میں خواب دیکھتا ہوں کہ وہ میرے دل میں محبت ڈال دے۔ اگر دنیا میں مجھے خوشی نہ ملیگی تو میں آسمان پر چڑھ جاؤنگا۔ . . . لیکن جب میں نے تجھے دیکھا۔ تو مجھے معلوم ہوا کہ کوئی ایسی ہستی ہے جو میری دسترس سے بالاتر ہے۔ اور ایک لازمی ہستی ہے۔ اور جو مجھ پر حاکمانہ حقوق رکھتی ہے۔ اور فانی ہے اور مجھے نہیں معلوم کہ میں اسے کیونکر نظر انداز کر سکتا ہوں یا بھول سکتا ہوں۔ اور وہ ہستی مجھے بدنصیب بنانے کی قوت رکھتی ہے۔ میں فرعون تھا' بادشاہ اور مالک اور قریب قریب خدا۔ آہ طہوسر تو نے مجھے انسان کر دیا!"

غالباً اس سے پیشتر کبھی فرعون نے اتنی طویل تقریر نہیں کی تھی۔ عموماً ایک لفظ یا آنکھ کا اشارہ اس کے حکم کی تعمیل کے لئے کافی تھا۔ طہوسر کے سامنے اس نے اپنی غیر قابل اثر اور سنگین شان و شوکت کو خیرباد کہہ دیا۔ اس وقت اس نے گفتگو کی اور سمجھایا۔ اور بظاہر معمولی فانی انسانوں کی طرح متاثر بھی ہوا۔

طہوسر کا دل اس وقت طرح طرح کے بےچین کرنیوالے خیالات سے لبریز تھا۔ گو اس عزت پر خوش ہو رہی تھی کہ اس نے امن را کے چاہتے کے دل میں محبت پیدا کر دی جس کی طرف نظر اٹھانے کی اسے جرأت نہ تھی۔ کیونکہ وہ نہایت ہی بارعب اور باوقار تھا۔ گرانقدر متین اور پرشکوہ تھا۔ طہوسر کو اس کے ساتھ بالکل ہمدردی نہ تھی جس کے بغیر محبت غیر ممکن ہے۔ اس کی ہوکر رہنے کے خیال سے طہوسر کے دل میں خوف پیدا ہوتا تھا۔ فرعون کو جس نے واقعتاً اپنے جذبات پورے کرنے کے لئے اس کا جسم غصب کر لیا تھا۔ وہ اپنا دل نہیں دے سکتی تھی۔ دل پوٹری اور راحیل کے پاس تھا۔

چنانچہ اس نے بادشاہ کو جواب دیا۔

"اے بادشاہ مجھے تعجب ہے کہ سرزمین مصر کی تمام لڑکیوں میں آپ کا دل میری طرف مائل ہوا۔ حالانکہ حسن اور قابلیت اور دیگر صفات میں مجھ سے بہت بڑھی چڑھی عورتیں موجود ہیں۔ کنول کے تمام کھلے ہوئے پھولوں کو چھوڑ کر اپنے معمولی زمین کے ایک پھول کو انتخاب کیا۔ جس میں کوئی امتیاز کی بات نہیں ہے!"

فرعون۔ یہ خیر اس سے میرا کوئی مطلب نہیں لیکن یاد رکھو کہ تمام دنیا میں میرے لئے صرف تمہیں ہو۔ میں بادشاہوں کی لڑکیوں کو تمہاری لونڈیاں بنا کر رکھونگا۔"

طہوسر (سر جھکا کر) اور اگر میں آپ سے محبت نہ کرتی ہوں؟

فرعون۔ جب میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تو اس کی کچھ پروا نہیں۔ جسقدر تم مجھ سے نفرت کروگی اور دور بھاگوگی اسی قدر مجھے زیادہ دلفریب معلوم ہوگی۔ پہلی ہی بار جب میری

نہیں۔ جسقدر تم مجھ سے نفرت کروگی۔ اور دُور بھاگوگی اُسی قدر مجھے زیادہ دلفریب معلوم ہوگی پہلی ہی بار جب میری مرضی میں کوئی رکاوٹ حائل ہوگی۔ تو مَیں اُسے دور کرنا سیکھ لونگا۔"

طھوسر (اپنی جرأت سے جی کڑا کرکے) "اور اگر مَیں کسی دوسرے سے محبت کرتی ہوں؟"

فرعون کی پیشانی پر شکن پڑگئی۔ اور وہ اپنے ہونٹ چبانے لگا۔ اس نے طھوسر کا ہاتھ اس زور سے دبایا کہ درد ہونے لگا لیکن بڑی کوشش کے بعد اُسے ذرا سکون حاصل ہُوا۔ اور وہ طھوسر کی مستعجب نگاہوں کو پھر بغور دیکھنے لگا۔ اور آہستگی کے ساتھ نہایت ہی متین لہجہ میں کہا۔

"جب تم اس محل میں اس شان و شوکت کیساتھ رہوگی اور چاروں طرف سے میری محبت تمہارا حلقہ کئے ہوگی۔ اُس وقت تم سب بھول جاؤگی۔ جس طرح لوگ بھولا دینے والی دوا کو کھا کر گم ہوجاتے ہیں تمہاری زندگی ایک خواب کی طرح گذریگی تو پچھلے جذبات تمہارے دل سے اس طرح اُڑ جائینگے جیسے عودوان سے دُھواں نکل جاتا ہے۔ جس عورت سے بادشاہ محبت کرے۔ وہ کسی اور کو نہیں یاد کرسکتی۔ فرعونی شان و شکوہ کی عادت ڈالو میرے خزانے خالی کرڈالو۔ سونے کو پانی کی طرح بہاؤ۔ حکمرانی کرو۔ بناؤ اور بگاڑو۔ اور اپنی مرضی سے جسے چاہے عزت دو اور جسے چاہے ذلیل کرو لیکن میری بیوی، میری بیگم اور میری ملکہ بن جاؤ۔ مَیں تمہیں مصر اور اُس کے مذہبی پیشوا اور اسکی فوجیں اور اُسکے غلام اور بیشمار آبادی اور محلات اور معبد اور باغات سب کچھ دیدونگا۔ اگر تم چاہو تو اُنہیں ریشم کے ٹکڑوں کی طرح پارہ پارہ کردو۔ مَیں تمہیں اس سے بھی زیادہ دلفریب شاندار اور زرخیز ممالک دُونگا۔ تمہیں اکیلی ہو جسے مَیں چاہتا ہوں۔ طھوسر جو محض پٹا مونافٹ کی لڑکی تھی اب نہیں رہی۔ تم تو وہ ہو جس سے مَیں محبت کرتا ہوں۔ تم فرعون کی ملکہ ہو۔"

باب چہاردہم

ثامر کا انعام

جب راحیل بیدار ہُوئی۔ تو اُسے طھوسر کو اپنے پہلو میں نہ پاکر سخت حیرت ہُوئی۔ وہ اس خیال سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ کہ نوجوان مصری پہلے ہی اُٹھ چکی ہے۔ ایک کونے سے لگی ہُوئی ثامر سو رہی تھی۔ یا بنی ہُوئی لیٹی تھی۔ اگر کوئی بغور دیکھتا تو اُس کی آنکھیں بیرحمانہ خوشی سے چمکتی ہُوئی نظر آتیں۔ کیونکہ دغابازی کی کامیابی پر فطرتاً خوشی ہوتی ہے۔

راحیل (چلّاکر) "ثامر! طوسر کو کیا ہوا؟ ....."

بڑھی عورت اس طرح چونک پڑی جیسے اپنی بیوی کی آواز سے اُس کی آنکھ یکایک کُھل گئی ہے۔ اور کھڑی ہوکر آنکھیں ملنے لگی۔ اور مصنوعی استعجاب کے لہجے میں کہا۔

"کیا واقعی وہ اب ہمارے یہاں نہیں ہے؟"

راحیل "نہیں۔ اور اگر میرے بستر پر اس کے لیٹنے کی جگہ نہ بنی ہوتی اور اس کے کپڑے نہ چھوٹ رہے ہوتے تو میں یہ سمجھتی کہ گذشتہ شب کے حیرت انگیز واقعات محض خواب تھے۔" ثامر نے مکاری کے ساتھ جھونپڑے کے اندر اور گرد و پیش تلاش کرنا شروع کیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آئی اور کہا۔ کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔

راحیل (متفکر ہوکر) "یہ عجیب واقعہ ہے۔"

ثامر (راحیل کے قریب جاکر) "بیوی تم جانتی تھیں کہ اس اجنبی سے میں خوش نہیں تھی۔"

راحیل۔ (مسکراکر) "ثامر تم تو ہر شخص سے ناخوش ہو"

ثامر "بیوی سوا تمہارے"

راحیل "ہاں میں جانتی ہوں کہ مجھ سے تمہیں انس ہے۔"

ثامر "لیکن کیا میں نے غلط کہا تھا؟ یہ طوسر ایک شیطان تھی۔ جو ایک اسرائیلی کی اولاد کو ورغلانے کے لئے بھیجی گئی تھی۔"

راحیل "لیکن اس کے آنسو اصلی تھے۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ طوسر دوزخ سے بھیجا ہوا شیطان تھا؟"

ثامر "بیشک۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اسقف اعظم کی لڑکی پوٹری سے محبت کرے۔ اور اُسے فرعون پر ترجیح دے۔ کیونکہ جیسا لوگ کہتے ہیں وہ اس کا خواہاں ہے؟ اگر وہ پوٹری سے اسقدر محبت کرتی تھی۔ تو وہ کیوں اسکی دوسری بیوی نہ بنی؟ نہیں اُسے اپنے جھوٹے دیوتاؤں کو چھوڑنا پڑتا۔ اور یہودی کی پرستش کرنی پڑتی۔ یہی وجہ ہوئی کہ اس مصنوعی شیطان نے راہِ فرار اختیار کی"

راحیل۔ "جسے تم شیطان کہتی ہو اُس کی آواز نہایت شیریں تھی۔ اور آنکھیں بیحد خوشنما تھیں۔" ثامر نے سودا سلف کا بہانہ کرکے قصرِ شاہی کا راستہ لیا۔ اور اپنے ساتھ اس امید میں ایک فلالین کا بڑا تھیلا لیتی گئی۔ کہ اسے سونے سے بھر لائیگی۔ طمافت نے پھر اُسے بادشاہ کے حضور میں حاضر کیا۔ اور بادشاہ نے اپنا وعدہ ایفا کیا۔ اور اجازت دیدی کہ شاہی خزانے سے جسقدر سونا لیجا سکے لیجائے۔ تھوڑی ہی دیر میں سونے کا ایک بہت بڑا ڈھیر اس کے سامنے چمک رہا تھا۔ اور وہ اس پر مجنونانہ ٹوٹ پڑی۔ اُس نے شانے تک اپنے ہاتھ سونے کے ڈھیر میں ڈال دیئے۔ اور اس قیمتی چیز کو گلے سے لگایا۔ اور اُلٹا پلٹا اور قریب پرستش کی۔

اُس کے لب حرکت کر رہے تھے۔ اور وہ کمینہ پن کی مسرت کے ساتھ لرز رہی تھی۔ اُس نے بدحواسی کے ساتھ مٹھیاں بھر بھر کر بڑے تھیلے میں بھرنا شروع کیا۔ اور چیخ چیخ کر کہتی جاتی تھی۔ "اور! اور!! اور!!!" یہانتک کہ تھیلا منہ تک بھر گیا۔ طماقت اُس کی حرکات دیکھ دیکھ ہنس رہا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ یہ کسی طرح اس تھیلے کو نہ اُٹھا سکیگی لیکن جب اُس نے اُٹھا کر اپنی پیٹھ پر رکھ لیا۔ تو طماقت کو سخت تعجب ہوا۔ لالچ نے ضعیف جسم میں غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی۔ آخرکار کسی نہ کسی طرح وہ لڑکھڑاتی ہوئی محل کے باہر پہنچی اب یہ سونے کا گٹھر اُس کی ملکیت تھا۔ تھوڑی دیر بعد دو اسرائیلی اُدھر سے گذرے۔ ثامر نے انہیں معقول رقم اُجرت دینے کا وعدہ کیا۔ تو وہ اس بار کو اُٹھا کر لے چلے تھوڑی دیر بعد وہ شہر کے مضافات میں پہنچ گئے۔ اور مٹی کے بنے ہوئے ایک جھونپڑے میں اُنہوں نے بوجھ اُتار کر رکھ دیا۔ ثامر نے کئی بار گن کر انہیں موعودہ رقم دی۔ اور یہ دونوں اُسے دولتمند عورت چھوڑ کر چلتے ہوئے۔

. . . .

اسی اثنا میں طھوسر ایک نہایت خوبصورت شاہی کمرے میں بٹھا دی گئی۔ جو ہر طرح سے خود فرعون کے کمرے کے برابر تھا۔ اس کمرے میں جو نادر چیزیں رکھی ہوئی تھیں اُنکی قیمت بجائے خود ایک بادشاہت کے برابر تھی۔ طھوسر ہاتھی دانت کی ایک کرسی پر بیٹھ کر ان قیمتی اشیاء اور جواہرات کو دیکھنے لگی۔ جو کئی ملازمہ لڑکیاں اُسے دکھا رہی تھیں غسل کے بعد جب خوشبودار اوبٹن اس کے جسم پر ملا گیا تو اس کا جسم اور نکھر آیا۔ اور وہ ہیرے کی طرح چمکنے لگی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کا حسن قریب قریب انسانی حسن سے بالاتر تھا۔ اور اسوقت آئینہ میں اپنی صورت دیکھ کر وہ خوشی سے مُسکرانے لگی۔ ململ کا ایک لبادہ اُس کے جسم پر لپٹا ہوا تھا۔ لیکن اُس کا دلفریب حسن اس لبادہ سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا تھا۔ زیورات میں سے اُس نے صرف جواہرات کا ایک طوق انتخاب کیا تھا۔

تھوڑی دیر میں فرعون دروازے پر نظر آیا۔ اُسے دیکھ کر طھوسر سربسجدہ ہونے والی تھی لیکن بادشاہ اُس کے پاس آیا۔ اور اُٹھا لیا۔ اور بیٹھنے کا حکم دیا۔

فرعون (نرم لہجہ میں) "طھوسر اس طرح عاجزی نہ کرو۔ مَیں تمہیں اپنے برابر بنانا چاہتا ہوں۔ مَیں دنیا میں تنہا رہتے رہتے تھک گیا ہوں۔ گو مَیں قادر و توانا ہوں۔ اور تم پر پوری طرح قابض ہوں۔ تاہم مَیں اُس دن کا انتظار کر رہا ہوں۔ جب تم مجھ سے محض انسان سمجھ کر

محبت کروگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خوف وہراس کو دور کرو عورت بنجاؤ۔ اور عورتوں کی تمام خواہشات اور احساسات اور لغزشوں کو اختیار کرو۔ اور جب آخر کار تمہارا دل تم سے میری سفارش کرے۔ اُس وقت جب میں تمہارے کمرے میں داخل ہوں تو جو کنول کا پھول تمہارے بالوں میں لگا ہُوا ہے۔ وہ میرے سامنے پیش کرو۔"

عین اس وقت طافت نے حاضر ہونے کی التجا کی اُسے اجازت مل گئی اور وہ آتے ہی بے چینی کے ساتھ چلا اُٹھا:۔

"جہاں پناہ ایک عجیب وغریب شخص حضور سے ملنا چاہتا ہے۔ اس کے ساتھ کوئی غیر محسوس یا فوق الانسانی قوت ہے۔ محافظ اُسے روک نہیں سکتے۔ اور تمام دروازے اُس کے مس سے کھُلتے جاتے ہیں۔ اس کے حکم کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔ میں حضور کے پاس حاضر ہونے پر مجبور ہُوا!"

فرعون: "اس کا کیا نام ہے؟"

طافت: "موسےٰ"

باب پانزدہم
موسےٰ کی پیشنگوئی

بادشاہ ملاقات کے کمرہ میں گیا۔ اور ایک تخت پر بیٹھ گیا۔

موسیٰ آیا اور اُس کے ساتھ ایک اور عبرانی ہارون تھا۔ موسےٰ بلا سر جھکائے ہوئے قدم بڑھاتا ہُوا تخت کے پاس پہنچا۔ اور کہا۔

"اسرائیل کا خدا فرماتا ہے کہ ہمارے لوگوں کو جانے دو۔ تاکہ وہ جنگل میں ہماری پرستش کریں"۔

فرعون: "اسرائیل کا خدا کون ہے؟ میں اُسے نہیں جانتا اور میں اسرائیلیوں کو نہ جانے دُونگا"

موسےٰ: "عبرانیوں کا خدا ہم پر جلوہ افروز ہے۔ ہم تین دن کا سفر کرکے جنگل کو جانا چاہتے ہیں۔ اور اپنے غیر فانی خدا کے نام سے قربانی کرنا چاہتے ہیں۔ تاکہ وہ ہمیں طاعون یا تلوار سے ہلاک نہ کرے"

اس کے بعد فرعون بولا۔ اور اس نے پوچھا کہ وہ کیوں اسرائیلیوں کو اُن کے کام سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ اور غصّہ کے ساتھ اُنہیں ڈانٹ کر رخصت کر دیا۔ لیکن وہ واپس آتے۔ اور بادشاہ کے سامنے معجزے دکھاتے جس پر خود طھوسر نے غریب عبرانی غلاموں کی سفارش کی۔ لیکن فرعون نے ایک نہ سُنی۔

فرعون: "ان مہمل خیالات کو بھُول جاؤ۔ اور آرام کرو ہمیں یہاں سکون کے ساتھ رہنا چاہیے۔ اور تمہیں صرف میری محبت کا خیال کرنا چاہیے۔ یہ خیال دل میں جماؤ

کہ فرعون عبرانیوں کے غیر ممکن خداؤں سے زیادہ طاقتور ہے"۔

طھوسر:۔" ہاں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ قیدی لوگوں کے مالک اور آقا ہیں۔ اور آپ کے سامنے آدمی اسی طرح بے حقیقت ہیں۔ جس طرح ہوا کے سامنے غبار۔ لیکن ——"

فرعون (مسکرا کر) " لیکن اس پر بھی میں تمہیں اپنی محبت پر مائل نہیں کر سکتا"۔

طھوسر:۔" ہرن شیر سے خائف ہے۔ اور قمری عقاب سے ڈرتی ہے۔ اور آنکھ سورج سے لرزتی ہے محض انسانی کمزوری مدتوں میں بادشاہ کا چہرہ دیکھنے کی جرأت کر سکیگی دیوتا ہمیشہ فانی ہستی کو ڈرا دیتا ہے"۔

فرعون:۔" طھوسر مجھے افسوس ہے کہ تمہیں میرا کچھ خوف ہے لیکن اگر میں بادشاہ کو تم سے محبت کرنے کے لئے محض آدمی نہیں بنا سکتا۔ تو عورت کو میں ملکہ بنا سکتا ہوں۔ مصر کی ملکہ اپنے بادشاہ سے خائف نہ ہوگی!"

طھوسر:۔" اگر آپ مجھے اپنے ساتھ تخت شاہی پر بھی بٹھالیں۔ تو بھی میرے خیالات آپ کے قدموں کی طرف مائل ہونگے لیکن آپ اس قدر نیکدل ہیں۔ اور آپ کا حسن انسانی ہستی کے حسن سے اسقدر بالاتر ہے کہ غالباً آخر کار میرا دل مضبوط ہو جائیگا۔ اور آپ کے قریب حرکت کرنے کی جرأت کریگا"۔

فرعون اسی طرح عشق و محبت کی باتیں کرتا رہا۔ اسقفِ اعظم کی لڑکی پوٹری کو نہیں بھولی۔ وہ خوشامد سے اور بادشاہ کے جوش محبت کو ٹھنڈا کرکے وقت گذارنا چاہتی تھی۔ کیونکہ بھاگ کر پوٹری سے ملنا ناممکن تھا۔

راحیل بیشک باوجود اپنی نیکدلی کے خطرناک رقیب تھی۔ علاوہ بریں فرعون کی محبت کا واقعی اس پر اثر ہُوا۔ ..... وہ اُس سے محبت کرنا پسند کرتی تھی۔ اور اس وقت جو جگہ فرعون نے اس کے دل میں پیدا کرلی تھی۔ اُس کا اُسے پہلے سے وہم و گمان بھی نہ تھا۔

باب شانزدہم

فرعون کی شکست اور غرقابی

مصر میں اس وقت ہولناک طاعون پھیل گیا تھا۔ جسے موسےٰ اور ہارون نے اپنے جادو اور منتر کے زور سے فرعون کو ڈرانے کے لئے بُلایا تھا۔ آخر کار فرعون نے زچ آکر کہا:۔

" جاؤ۔ جہاں چاہو اور جس طرح چاہو اپنے خدا کے نام پر قربانی کرو!"

یہ سُنکر طھوسر نے محبت سے اپنے ہاتھ بادشاہ کے گلے میں ڈال دئے اور کہنے لگی۔

"اب میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ کیونکہ تم آدمی ہوگئے ہو۔ اب تم پتھر کے دیوتا نہیں رہے۔"

فرعون نے طہوسر کو فوراً جواب نہیں دیا۔ طاعون نے اس کے پہلے لڑکے کو ہلاک کر دیا تھا۔ باوجود تجربے کے اس کا غرور جوش مار رہا تھا۔ اپنے دل میں وہ عبرانیوں کے غیر فانی خدا کا بالکل معتقد نہ تھا۔ اور طاعون کی اُس نے یہ وجہ بیان کی کہ یہ ایسے جادو کے زور سے پھیلا ہے۔ جو مصریوں کے جادو سے زیادہ طاقتور ہے ......

طہوسر کی کیا حالت تھی؟ کیا وہ اپنے عبرانی حبیب کو بھول گئی تھی؟ نہیں بلکہ اُسے خوف تھا۔ کہ فرعون اسرائیلیوں کے قتل عام کا حکم دیدیگا۔ اور پوٹری اور حسین احیل مصیبت میں پڑ جائینگے۔ اس لئے وہ بادشاہ کے غصّہ کو پیار اور میٹھی میٹھی باتوں میں بھلانا چاہتی تھی۔

ایک دن فرعون نے طہوسر سے کہا "طہوسر! میرے کوئی لڑکا نہیں ہے۔ اگر میں مر جاؤنگا تو تم مصر کی ملکہ ہوگی"

طہوسر "تم اپنی موت کو کیوں یاد کرتے ہو؟ امتداد زمانہ تمہارے اوپر کوئی اثر نہیں ڈالتا اور تمہارے گرد وپیش نسلیں اس طرح فوت ہوئی ہیں۔ جس طرح کسی بڑے درخت کے گرد وپیش پھول جھڑتے ہیں۔"

فرعون (رنجیدہ ہوکر) "میں غیر قابل شکست تھا لیکن کیا اب مجھے شکست نہیں ہوئی؟ قصروں اور معبدوں کی دیواروں پر میری تصویریں منقش ہیں۔ جن میں کوڑا اور عصائے شاہی لئے اپنی جنگی گاڑی پر سوار لاشوں پر سے گذر رہا ہوں۔ لیکن یہ تصویریں کس کام کی۔ اگر اس اسرائیلی قوم کے غیر معلوم خدا کے خلاف میرے دیوتاؤں نے مدد نہ کی تو میں ان دونوں اجنبی جادوگروں کے کرشموں کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاؤنگا۔ میری قوت اور شوکت ہمیشہ کے لئے جاتی رہی۔ میری قوم شاکی ہے اور میں محض ایک بیکار سایہ کی طرح ہوں۔ لیکن اب چونکہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔ اس لئے میں کوشش کرونگا کہ یہ سب بھول جاؤنگا۔ اور ہم دونوں کا جلد عقد ہو جائیگا۔"

اس خوف سے کہ فرعون اپنے الفاظ واپس نہ لیلے۔ عبرانی روانہ ہونا شروع ہوگئے۔ اس وقت فرعون پر خون سوار ہوا۔ اور اس نے ان کا تعاقب کرنے کا تہیہ کر لیا لیکن وہ معہ اپنی فوج کے سمندر میں غرقاب ہوگیا اور طہوسر مصر کی ملکہ ہوگئی۔

تتمہ

طہوسر چندے مایوسی کے ساتھ فرعون کی منتظر رہی اور مصر پر حکومت کرتی رہی۔ اور اس کے تھوڑے ہی دن بعد انتقال کیا۔ اور بادشاہ کے لئے جو قبر تیار کی گئی، اُسی میں دفن کی گئی۔ کیونکہ بادشاہ کی لاش سمندر

میں لاپتہ ہوگئی تھی۔ طھوسر کی تاریخ کا کیو مورخ نے بھوج پتر کے پتوں پر لکھی اور ہر باب کا عنوان سرخی سے لکھا اور اس کی قبر میں اس کے سینہ بند کے پاس رکھد یا طھوسر کو فرعون کا زیادہ قلق تھا یا پوٹری کا؟ اس کے متعلق مورخ کا کیو نے کچھ نہیں لکھا۔ اور ڈاکٹر ہفیس جس نے کا کیو کے لکھے ہوئے مسودہ کا ترجمہ کیا۔ اس امر کا فیصلہ کر کے اصل کاغذ میں اضافہ کرنے کی ذمہ واری اپنے اوپر نہیں لینا چاہتا تھا۔

لارڈ رانڈیل نے اپنی شادی نہیں کی اور کہا کہ اُسے اس کی خواہش نہیں ہے۔ یہ بات اس کے احباب کو ناگوار معلوم ہوئی۔ کیونکہ یہ اپنی نسل کا سب سے آخری رکن تھا۔ انگلستان میں اس کے طبقہ کی عورتیں اپنے ساتھ اُس کے عجیب برتاؤ کی علت نہیں سمجھ سکتی تھیں۔ لیکن اُن کا یہ یقین کسی طرح قرین قیاس تھا کہ لارڈ ایوانڈیل رجعت قہقری کے ذریعہ سے اسقف اعظم پٹامونا ف کی لڑکی طھوسر پر عاشق تھا جس کے انتقال کو ساڑھے تین ہزار برس ہو چکے تھے! تاہم انگریزوں کی بعض حماقتیں اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوتی ہیں۔ (م۔ص)

غزل

سلسلہ داری زندان و سلاسل ٹوٹی
مشکلوں سے یہ سبکساری مشکل ٹوٹی

سبدِ گل ہیں کہاں سے ہوئی سختی پیدا
کس خلش سے تری منقار عنادل ٹوٹی

بے حجاب آئی جو لیلےٰ تو کہا مجنوں نے
آج قسمت سے مری بندشِ محمل ٹوٹی

خرمنِ شوق و تمنا ہوا بہ بادِ جمال
ہمتِ دیدنِ جاناں سرِ محفل ٹوٹی

سلسلہ گیسوے پیچاں کا نہ سنبھلا آخر
گرہِ موج بھی آکر لبِ ساحل ٹوٹی

حرزِ جاں قیدِ رسن میں تھا جو تعویذ ترا
آج بازو کی مری بندشِ کامل ٹوٹی

دل کی بیتابیاں بڑھ بڑھ کے ہوئیں مجبوری
ہمتِ چشمِ تمنا سوئے منزل ٹوٹی

جوہرِ عقل سے پیدا ہے تصوّر تیرا
نازشِ کاملِ فطرت سے یہ مشکل ٹوٹی

روشِ تیزیِ رفتار قلم اے جعفر
ختم کر کے کششِ نالۂ بسمل ٹوٹی

تبصرہ اشاعات جدیدہ

اُسوۂ صحابیات :- مؤلفہ مولوی عبدالسلام صاحب ندوی حجم ۹۰ صفحات۔ تقطیع ۲۰×۲۶/۸ قیمت صرف ایک روپیہ۔

زبان اُردو کو تاریخ اسلام سے مالامال کرنے کی جو مساعی مشکورہ علامہ شبلی مرحوم نے فرمائی ہیں اُنہیں مساعی کے سچے وارث ہونے کا شرف علامہ موصوف کے تلامذہ کو نصیب ہوا ہے اور رفقائے دارالمصنفین نے اسکے غیر فانی ثبوت بھی دئے ہیں۔ اور برابر دیتے جا رہے ہیں۔ اُسوۂ صحابیات کے نامور مؤلف اسی موضوع کی ایک کتاب اُسوۂ صحابہ کے نام سے، دو جلدوں میں شائع فرما چکے ہیں۔ جو باریابان بارگاہ رسالت کے حالات پر مشتمل ہے۔ کتاب ماسبق میں مردوں کے حالات نمایاں کئے گئے تھے۔ اور عورتوں (صحابیات) کے احوال منتشر طور پر بیان ہوئے تھے۔ اب اُسی تصنیف سے صحابیات کے حالات جمع فرما کر مستقل کتاب کی صورت میں مؤلف موصوف نے شائع فرمائے ہیں۔ تالیف مذکور کا انداز تحریر، سوانح نگاری کے طریقہ پر نہیں ہے۔ بلکہ اخلاقی روحانی مذہبی و معاشرتی وغیرہ ابواب قائم کرکے اُنہیں حالات میں صحابیات کو تمثیل کیا ہے۔ جس سے بمقتضائے غایت باب، صحابیات کے متفرق و متعدد، لیکن بہتر سے بہتر جواہر حیات نمایاں ہو گئے ہیں۔ پیرایۂ بیان دلچسپ، اور تقسیم ابواب پُر مغز ہے۔ تاریخ اسلام کے طلباء کے لئے یہ کتاب اشارات منضبط کا کام دیگی۔ اور اُن لوگوں کے لئے ازبس مفید ہے۔ جو ہندوستانی قدامت پرستی کی تاریکی میں تعلیم و آزادیٔ نسواں کو غیر مفید سمجھتے ہیں۔ نیز ہر مسلم عورت کا فرض ملی ہوگا۔ کہ کتاب مذکور کا کم از کم ایک مرتبہ ضرور مطالعہ کرے۔ اور اپنے لئے صحابیاتؓ کی زندگی کو نمونہ بناکر اپنے جائز مرتبہ کے حصول میں سرگرم ہو۔

اسرار ادویہ :- یہ ایک مختصر سی تقطیع کی ۷۶ صفحات کی کتاب ہے۔ جس کو "سیکرٹ ریمیڈیز" نامی کسی انگریزی کتاب کا ترجمہ کہا جاتا ہے۔ اس میں یورپ اور امریکہ کی چند پیٹنٹ دواؤں کے نسخے، معہ ترکیب تیاری درج ہیں۔ بعض ڈاکٹروں اور انگریزی دواسازوں کے لئے کتابچہ مذکور بعض فوائد سے خالی نہیں۔ قیمت ایک روپیہ، ملنے کا پتہ: سید رحمت علی شاہ، مینیجر مسلم جنرل و بک ایجنسی حلقہ ۲۲ ٹکسالی دروازہ لاہور

زمانہ :- اس مشہور رسالہ کی چالیسویں جلد کے پانچویں نمبر پر تبصرۂ مکرر کی توجہ دلائی گئی ہے جس میں سب سے پہلا مضمون "راجپوت مسلمانوں کی شدھی" کے عنوان سے درج ہے اور یہ مضمون ملک ہند کے مشہور ہندو افسانہ نگار منشی پریم چند

کے قلم سے نکلا ہے۔ اور اسی مضمون کی وجہ سے، مگر تبصرہ کی فرمائش بھی ہوئی ہے۔

"زمانہ" ہمیشہ ایک سنجیدہ ادبی رسالہ کے معیار پر شائع ہوتا ہے۔ اس کے موجودہ ایڈیٹر مسٹر دیا نرائن نگم بی اے مشہور ہندو ادیب، اُردو ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ موجودہ فتنہ کے دور میں ایک ایسے رسالہ میں جو ایک لائق ہندو کی زیر ادارت شائع ہوتا ہے۔ ایک ہندو مضمون نگار کے بروقت مضمون نے اس نمبر کو وقیع اور قابل تبصرہ کر دیا ہے۔ پہلے ہم مسٹر دیا نرائن نگم کی اس ادارتی دیانت کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کہ موصوف نے باوصف ہندو ایڈیٹر ہونے کے ایک ایسے مضمون کو اپنے رسالہ میں جگہ دی ہے، جو روادارانہ اور مصلحانہ ہونے کی حیثیت سے موجودہ عام ہندو مصالح کے یکسر خلاف ہے۔ اُسکے بعد منشی "پریم چند" بے حد قابل ستائش ہیں۔ جن کے ہندو قلم سے ایسا صلح کوش مضمون نکلا ہے۔ جس کو ہندو مبلغین نام سل کی اصلاح کے لئے یقیناً ایک صدائے غیب و حق تصور کرنا چاہئے۔ لائق مضمون نگار نے مضمون کی بنیاد نہ صرف اس خیال پر رکھی ہے۔ کہ "ہندو مسلم اتحاد" از بس ضروری ہے۔ بلکہ اُنہوں نے تبلیغ کے نتائج کے اعداد و شمار وغیرہ سے ثابت کیا ہے کہ اس تحریک میں فایدہ کم، اور مضرات کثیر ہیں۔ اس کے ساتھ ہی موصوف نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ تحریک ارتداد، سیاسی نقطۂ خیال پر مبنی ہے۔ اور ہندو، اپنے سیاسی حقوق کے ازدیاد و تحفظ کے لئے، زیادتی شمار چاہتے ہیں۔ غرضیکہ مضمون کا عام لب و لہجہ سنجیدہ ہے اور موضوع صلح کوشی۔ لیکن مضمون کے ابتدائی دو صفحے بعض غلط فہمیوں، اور غلطیوں کی توثیق کر رہے ہیں مثلاً وہ لکھتے ہیں۔ کہ "ابتک تبلیغ کے میدان میں مسلمان یکہ تاز تھے۔ کوئی ان کا رقیب نہ تھا۔ لیکن یہ صورت حال بہت سرعت سے تبدیل ہوتی جارہی ہے۔ اور مسلمانوں کو یہ اندیشہ ہونے لگا ہے۔ کہ کہیں یہ تحریک ہمارے قومی زوال کا پیش خیمہ تو نہیں ہے۔"

یہ توجیہہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ مسلمان تو ایک تبلیغی مذہب کے حامل ہونے کی حیثیت سے اپنے آپ کو ہمیشہ، اور اب بھی میدانِ تبلیغ میں یکّہ تاز ہی یقین کرتے ہیں۔ وہ دُنیا کی کسی تبلیغی جماعت کی رقابت سے گھبراتے نہیں۔ کیونکہ اُن کو محض اپنی تبلیغ پر اعتماد ہے۔ اور دوسری ساری تبلیغوں کو باطل، اس لئے کمزور اور نقش برآب سمجھتے ہیں۔ چہ جائیکہ وہ ایک ایسی تحریک سے خائف ہوں۔ جس کے حاملین مطلقاً غیر تبلیغی مذہب کے "گنبدِ بے در" میں محبوس ہوں۔ اور یہ کہنا کہ مذہبی توہین کا سب سے مہلک پہلو یہی ہے۔ کہ کوئی آدمی اُس

سے منحرف ہو جائے۔ یہ گویا اُس مذہب کی خامی کا اعلان ہے۔ اور ایسے شخص کی زبانی جو ہمیشہ سے اس کا مطیع رہا ہے "اسلامی نقطۂ خیال سے یکسر غلط ہے اگر کوئی شخص دین سے پھر جاتا ہے تو اس میں دین کی کوئی اہانت نہیں۔ بلکہ اُس بیدین کی شقاوت ہے اسلام کی کوہ ثبات صداقت کو کسی خام نظرت قلب و دماغ کے امیال سے ٹھیس نہیں لگتی، وہ مرتد کو اس لئے واجب القتل نہیں قرار دیتا کہ اس کے ارتداد نے دین کو کوئی صدمہ پہنچایا ہے۔ بلکہ اس لئے واجب القتل ٹھیراتا ہے۔ کہ جو شخص سچائی اور نیکی سے اس طرح گریزاں ہو۔ اس کو قدرتی طور پر زندگی کا کوئی حق ہی باقی نہیں رہتا۔

ایک جگہ فاضل مضمون نگار رقمطراز ہیں "کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ وہاں ہندوؤں کو آسائش واطمینان میسّر نہیں۔ اُن کی بیوائیں ہمیشہ اسلامی دست برد کا شکار ہوتی رہتی ہیں۔" یہ الزام ہی الزام ہے۔ اور متعصبانہ کم، ورنہ یقین اس الزام کا ماخذ ہے۔ اس کا بار ثبوت مضمون نگار پر ہے۔ نیز لڑکیوں اور بیوؤں کے شکار کے معاملہ میں جبر اور تراضیٔ طرفین کی صورتیں قابل لحاظ ہونگی۔ اور مستزاد براں یہ کہ اگر اس میں مسلمانوں کی زیادتی ثابت ہوئی تو اُس کو "اسلامی دست برد" قرار دینا شوخ کلامی ہے۔ کیونکہ ایسا فعل مذہب سے علاقہ نہیں رکھتا بلکہ اس کو کسی خاص مسلمان کی غیر "اسلامی دست برد کہا جا سکتا ہے۔

مضمون کے بقیہ حصّہ سے ہم کو یکسر اتفاق ہے اور ہم "زمانہ" کی اس اشاعت کا دلی خیر مقدم کرتے

آئینہ:۔ اس نام کا ایک علمی اور ادبی ماہانہ رسالہ الہ آباد سے زیر ترتیب ابو المعالی سیّد وحید الدین احمد صاحب کر دی جاری ہوا ہے۔ جس کی اولین اشاعت پیش نظر ہے۔ یہ اشاعت سر تیج بہادر سپرو کی شبیہ سوانحمری اور ان کی شان میں ایک مدحیہ قصیدہ سے مزین ہے۔ رسالہ کے پہلے مضمون "سارے ہندوستان کی ایک زبان" سے فاضل مضمون نگار کے تعمق علم السنہ کا نشان ملتا ہے۔ باقی مضامین نظم و نثر کے معیار اور ترتیب وغیرہ کے متعلق ابھی کوئی رائے ظاہر کرنی قبل از وقت ہے۔ کئی نسوانی مضامین بھی جمع کئے گئے ہیں۔ اور مرتب رسالہ اس عنصر کو التزاماً مقصد رسالہ قرار دیتے ہیں۔ امید ہے کہ رسالہ بزم ادب اردو میں اپنی مزید و مسلسل کوششوں سے، کوئی وقیع حیثیت پیدا کر لیگا۔ تقطیع $\frac{20\times30}{8}$ حجم ۶۴ صفحات۔ چندہ سالانہ پانچ روپیہ۔ نشان حصول:۔ مینجر رسالہ "آئینہ" الہ آباد

کلکتہ کے مشہور ڈاکٹر ایس کے برمن کی تیار کردہ ۱۹۲۳ء کی کافوری جنتری نہایت خوبصورت چکنے کاغذ پر چھپی ہے اگر دیکھنا چاہتے ہیں تو ایک خط لکھکر بھیج دیجئے۔ مذکورہ بالا جنتری آپکی خدمت میں روانہ کردی جائیگی

خاص ڈاکٹر ایس کے برمن کے کیمیا خانہ کا تیار کردہ کیش راج تیل

فائدہ اور خوشبو کے لحاظ سے یہ ایک ہی تیل ہے

آج کل سینکڑوں قسم کے خوشبودار تیل بازاروں میں بکتے ہیں جو ظاہری چمک رنگ اور خوشبو میں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر ہوتے ہیں۔ مگر ان تیلوں میں وائٹ آئل عموماً جز ہوتا ہے۔ جو بجائے فائدہ کے دماغ اور بالوں کو سخت نقصان پہنچاتا ہے ایسے تیلوں کے چند روزہ استعمال سے بال بیوقت سفید ہو جاتے ہیں۔ آنکھ اور دماغ سے خاص تعلق ہے اسلئے ایسے تیل دماغ میں گرمی پہنچا کر آنکھ کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ آجکل کے نوجوانوں کو بیوقت چشمہ کی ضرورت ہو جاتی ہے ان سب خرابیوں کو مدنظر رکھکر کیش راج تیل کی تیاری میں خوشبو سے زیادہ فائدہ کا خیال رکھا گیا ہے۔ اسکے لگانے سے جڑیں مضبوط اور بال مثل بھونرے کے سیاہ اور گھونگر والے ہو جاتے ہیں۔ دماغ کو ٹھنڈک اور دل کو فرحت پہنچاتا ہے قیمت فی شیشی عہ محصولڈاک ۶

ہیلک

یہ ہر قسم کے گھاؤ۔ درد۔ ہاتھ موچ۔ گانٹھ گلٹی۔ جھائی۔ مہاسہ۔ چکنتہ ہاتھ پاؤں کا پھٹنا۔ روکھاپن۔ بواسیر آگ سے جلے ہوئے گھاؤ۔ جلن چوٹ کی وجہ سے درد یا خون کا بہنا وغیرہ وغیرہ کے لئے حکمی دوا ہے۔ چوہے۔ بلی۔ مکڑی۔ برنی۔ بچھو وغیرہ کے کاٹے ہوئے جگہ سے زہر دور کرنے کے لئے ہیلک ایک شرطیہ دوا ہے۔ فٹ بال۔ کرکٹ۔ جمناسٹک کے کھلاڑیوں کے لئے ہیلک روزانہ استعمال کی چیز ہے۔ اس کے لگانے سے کسی قسم کی جلن وغیرہ نہیں ہوتی۔ زمانہ اس قسم کی تمام دوائیوں کے تجربہ کرنے پر ہیلک سب سے زیادہ مفید ثابت ہوئی ہے۔ ہر گرہست کو ہیلک کی ایک ڈبیہ ضرور رکھنی چاہئے قیمت فی ڈبیہ ۱۰؍ محصولڈاک ۶

ایجنٹ: مینجر صاحب پیسہ اخبار لاہور

ڈاکٹر ایس کے برمن نمبر ۵ تاراچند دت اسٹریٹ کلکتہ

(مرکنٹائل الیکٹرک پریس لاہور میں باہتمام لالہ دیوانچند پرنٹر چھپا اور دارالاشاعت ادب لطیف کے لئے سید افضال علی حسنی پبلشر نے شائع کیا)